"میری کہانی"

(جلد دوم)

جواہر لال نہرو

فہرستِ مضامین

فہرستِ تصاویر



(۳۸)

گول میز کانفرنس

حال ہی میں ایک انگریز اخبار نویس نے ایک کتاب شائع کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہندوستان میں بھی اور لندن میں گول میز کانفرنس کے وقت بھی انھیں گاندھی جی سے خوب ملنے جلنے کا موقع ملا۔ اس کتاب میں یہ لکھتے ہیں "ملتان جہاز پر جو لیڈر سفر کر رہے تھے وہ سب جانتے تھے کہ خود کانگریس کی مجلس عاملہ میں مسٹر گاندھی کے خلاف ایک سازش ہے۔ یہ جانتے تھے کہ جب وقت آئے گا تو کانگریس مسٹر گاندھی کو نکال باہر کرے گی لیکن کانگریس سے انھیں نکالا تو ساتھ ہی غالباً اپنے آدھے ممبروں کو بھی نکالنا ہوگا۔ اور یہی وہ نصف تھا جسے سر تیج بہادر سپرو اور مسٹر جیکر اپنے لبرل مسلک کا ساتھی بنانا چاہتے تھے۔ یہ لوگ اس بات کو کبھی نہیں چھپاتے کہ مسٹر گاندھی (خود ان کے الفاظ میں) ذرا الجھے دماغ کے آدمی ہیں لیکن جو الجھی کھوپڑی والا لیڈر اپنے ساتھ کوئی دس لاکھ الجھی کھوپڑی کے پیرو بھی لا سکے اس کو اپنی طرف ملانے کی کوشش تو بہر حال کرنے کی چیز ہے[1]"

---

[1] گلوری بولٹن کی کتاب سے مقتبس۔ میں نے یہ اقتباس اس کتاب کی ایک تنقید سے لیا ہے۔ اصل کتاب پڑھنے کا مجھے موقع نہیں ملا۔ مجھے امید ہے کہ اس اقتباس کو پیش کر کے میں مصنف کے ساتھ اور ان صاحبان کے ساتھ جن کا نام اس میں آیا ہے کوئی ناانصافی نہ کر رہا ہوں گا (بقیہ بر صفحہ دیگر)

میں نہیں کہہ سکتا کہ اس اقتباس سے سر تیج بہادر سپرو اور مسٹر جیکر کے خیالات کی صحیح ترجمانی ہوتی ہے یا نہیں یا گول میز کانفرنس کے ان ارکین کے خیالات کی جو ۱۹۳۱ء میں لندن تشریف لئے جا رہے تھے۔ البتہ مجھے اس پر حیرت ضرور ہے کہ کوئی شخص بھی اخبار نویس ہو کہ "لیڈر" جو ہندوستانی سیاست سے ذرا بھی واقف ہو

(صفحہ ۹ کا بقیہ نوٹ) یہ لکھ چکنے کے بعد میں نے اصلی کتاب بھی پڑھ لی۔ بہت سی باتیں جو مسٹر بولٹن نے لکھی ہیں اور بہت سے نتیجے جو انھوں نے نکالے ہیں میری رائے میں نا واجب ہیں۔ بیان واقعات میں بھی بہت سی غلطیاں ہیں خصوصاً اس سلسلہ میں کہ دلی کے معاہدے کی بات چیت کے زمانے میں اور اس کے بعد کانگریس کی مجلس عاملہ نے کیا کیا اور کیا نہیں کیا۔ کیا ان کا ایک عجیب سا مفروضہ یہ بھی ہے کہ مسٹر ولبھ بھائی پٹیل کو ۱۹۳۱ء میں کانگریس کی صدارت اور یوں اس کی قیادت جو ملی تو وہ گاندھی جی کے مدمقابل کی حیثیت سے حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ پچھلے پندرہ سال میں گاندھی جی کی حیثیت کانگریس میں اور ظاہر ہے کہ ملک میں بھی اس سے کہیں بلند رہی ہے جتنی کانگریس کے کسی صدر کی ہونی ممکن ہے۔ وہ صدر گزرتے ہیں اور ان کا کہنا ہمیشہ مانا گیا ہے۔ بارہا انھوں نے جو صدارت کرنے سے انکار کیا ہے۔ اور اسے ترجیح دی ہے کہ ان کا کوئی دوسرا ساتھی یا چیلا صدر ہو جائے۔ میں جو کانگریس کا صدر ہوا تو تمام تر ان کی ہی وجہ سے۔ دراصل انتخاب گاندھی جی کا ہوا تھا۔ مگر انھوں نے اپنا نام واپس لے لیا اور میرے انتخاب پر لوگوں کو مجبور کیا۔ ولبھ بھائی پٹیل کا انتخاب ذرا خلاف معمول تھا۔ اس لئے ہم لوگ اس وقت قید سے چھوٹے تھے اور کانگریس کمیٹیاں اس وقت خلاف قانون جماعتیں تھیں اور معمولی طور پر کام نہیں کر سکتی تھیں۔ اس وجہ سے مجلس عاملہ نے کراچی کانگریس کے صدر کا انتخاب اپنے ذمے لے لیا۔ ساری مجلس نے جس میں ولبھ بھائی پٹیل بھی تھے (بقیہ صفحہ ۱۱ پر)

وہ اس قسم کی بات کیسے کہہ سکتا ہے۔ میں تو اسے پڑھ کر ششدر رہ گیا۔ پہلے کبھی اس کا ذکر بھی سنا نہ تھا۔ مگر اس لاعلمی کا سمجھنا تو یوں مشکل نہیں کہ اس وقت کے بعد سے میں زیادہ تر قید میں رہا ہوں۔

یہ سازش کرنے والے آخر تھے کون اور ان کا ارادہ آخر کیا تھا کبھی کبھی

گاندھی جی سے التجا کی کہ وہ صدارت قبول فرمائیں کہ واقعی طور پر تو وہ سردار تھے ہی۔ اس مشکل کے سال میں نام کے لحاظ سے بھی کانگریس کے سردار وہی ہوں۔ لیکن وہ نہ مانے اور اصرار کیا کہ ولبھ بھائی پٹیل صدارت قبول کریں۔ مجھے یاد ہے کہ اس موقع پر کسی نے گاندھی جی سے کہا تھا کہ آپ خود ہمیشہ مسولینی کی طرح رہنا چاہتے ہیں اور دوسروں کو عارضی طور پر بادشاہ اور دکھاوے کا سردار بناتے رہتے ہیں۔

یوں تو مسٹر بولٹن کی بہتیری اور غلط فہمیوں سے اس حاشیہ میں بحث کرنی ممکن نہیں لیکن ذرا شخصی معاملہ ہے۔ اس کا ذکر کر دینا چاہتا ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ انھیں اس بات کا پورا یقین ہے کہ میرے والد صاحب کی سیاسی زندگی میں جو تغیر ہوا تھا اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ ایک یورپین کلب میں ان کا انتخاب نہ ہو سکا تھا اور اس وجہ سے وہ سیاسیات ہی میں انتہا پسند نہیں ہو گئے تھے بلکہ انگریزوں کی صحبت سے بھی پرہیز کرنے لگے تھے۔

یہ قصہ بارہا بیان ہو چکا ہے مگر ہے بالکل غلط۔ اصلی واقعات کی چنداں اہمیت نہیں لیکن میں یہاں اس کا ذکر اس لئے کئے دیتا ہوں کہ بات صاف ہو جائے۔

بیرسٹری کے ابتدائی زمانے میں سر جان ایج جو اس وقت الہ آباد ہائی کورٹ کے چیف جسٹس تھے والد صاحب کو بہت چاہنے لگے تھے۔ ایک دفعہ سر جان نے والد سے کہا کہ الہ آباد یورپین کلب میں شریک ہو جاؤ میں خود تمہارا نام رکنیت کے لئے پیش کروں گا۔ والد صاحب نے ان کی مہربانی کا شکریہ ادا کیا (بقیہ بر صفحہ دیگر)

یہ بھی کہا گیا ہے کہ صدر ولبھ بھائی پٹیل اور میں مجلس عاملہ کے انتہا پسندوں میں تھے۔
اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ ہو نہ ہو ضرور ہم ہی کو اس سازش کے سرغنوں میں گنا
گیا ہوگا۔ حالانکہ شاید ہی سارے ہندوستان بھر میں گاندھی جی کا کوئی اور ساتھی ولبھ بھائی
جیسا وفادار ہو۔ ولبھ بھائی اپنے کام میں ضرور مضبوط اور نہ دبنے والے آدمی ہیں مگر

لیکن یہ جتا دیا کہ اس میں لازمی طور پر بڑی دقت ہوگی۔ بہت سے انگریز ان کے ہندوستانی
ہونے کی وجہ سے اعتراض کریں گے اور ممکن ہے مخالفت میں رائے دیں۔ فوج کا کوئی بھی
چھوٹا موٹا افسر رائے دینے کے وقت ان کی مخالفت کر سکتا ہے۔ ان حالات میں بہتر یہی ہوگا کہ وہ
اپنا نام انتخاب کے لئے پیش نہ کرائیں۔ سر جان نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ والد کے نام کی تائید الہ آباد
کے فوجی حلقے کے بریگیڈیر جنرل سے کرائیں گے مگر آخر میں یہ معاملہ یوں ہی چھوڑ دیا گیا اور نام اس
لئے پیش نہیں ہوا کہ والد نے صاف کہہ دیا کہ میں اس سلسلے میں اپنی کوئی ہتک کرانے کو تیار
نہیں ہوں۔ اس واقعہ سے ان کے دل میں انگریزوں کی طرف سے تلخی تو کیا پیدا
ہوتی۔ ہوا یہ کہ سر جان سے ان کے تعلقات اور گہرے ہو گئے اور اس کے بعد کے
زمانے ہی میں اکثر انگریزوں سے ان کی دوستی ہوئی اور تعلقات بڑھے۔ یہ کوئی ۱۹۰۰ء
کے قریب کی بات تھی۔ اور وہ انتہا پسند سیاسی اور ترک موالات ہوئے کوئی چوتھائی صدی
گزرنے کے بعد جا کر۔ یہ ضرور ہے کہ یہ تبدیلی یکایک پیدا نہیں ہوئی تھی۔ البتہ پنجاب کے مارشل لا
نے اس میں ذرا جلدی کرا دی اور ٹھیک وقت پر گاندھی جی کے اثر نے بھی فرق پیدا کیا۔
مگر پھر بھی ان کا یہ ارادہ کبھی نہ تھا کہ وہ انگریزوں سے ملنا جلنا چھوڑ دیں۔ البتہ جہاں انگریز
زیادہ تر سرکاری عہدہ دار ہی ہوں وہاں ترک موالات اور سول نافرمانی سے لازمی طور
پر ان تعلقات میں رکاوٹ پیدا ہوتی۔

شخصی طور پر وہ گاندھی جی کے اور ان کے خیالات اور طریقہ کار کے دلدادہ بھی ہیں
میں اپنے متعلق یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں نے بھی گاندھی جی کے خیالات کو انھیں کی
طرح قبول کیا ہے لیکن گاندھی جی کے ساتھ نہایت قریبی طور پر مل جل کر کام کرنے کا شرف
مجھے بھی حاصل رہا ہے اور ان کے خلاف سازش کرنے کا خیال بھی میرے لئے ہر حال میں
ناممکن اور لغو ہے اور میں کیا ساری مجلس عاملہ کا یہی حال ہے۔ یہ مجلس عملاً انھیں کی بنائی
ہوئی ہے۔ انھیں نے چند ساتھیوں کے مشورہ سے اسے نامزد کیا تھا انتخاب تو بس
ایک ضابطہ کی کارروائی تھی۔ اس مجلس کا بڑا اور با اثر حصہ تو ان ارکین پر مشتمل تھا جو
اس میں برسوں سے کام کر رہے تھے اور اب مستقل سے ممبر سمجھے جانے لگے تھے بے شک
ان میں باہمی سیاسی اختلافات تھے نقطۂ نظر کے اختلاف تھے طبیعتوں کے اختلاف
تھے لیکن انھوں نے برسوں ایک ساتھ کام کیا تھا۔ مل کر بوجھ اٹھائے تھے مل کر خطروں
کو انگیز کیا تھا اور ان باتوں نے انھیں باہم جوڑ سا دیا تھا ان میں دوستی رفاقت اور
ایک دوسرے کی عزت کے رشتے پیدا ہو گئے تھے۔ اور اب یہ مجلس مختلف الخیال لوگوں
کا محض ایک مجموعہ نہ تھی بلکہ ایک نامی وحدت بن گئی تھی۔ اور یہ بات وہم و گمان میں بھی
نہیں آسکتی تھی کہ ان میں سے کوئی بھی کسی دوسرے کے خلاف سازش کرے گا۔ گاندھی جی
اس مجلس پر پوری طرح حاوی تھے۔ اور ہر شخص ہدایت کے لئے بس انھیں کی طرف
دیکھتا تھا۔ یہ صورت حال کئی سال سے یوں ہی تھی اور ۱۹۳۰ء کی عظیم الشان کامیابی
کے بعد ۱۹۳۱ء میں تو یہ بات اور بھی صاف دکھائی دیتی تھی۔

اچھا گاندھی جی کو "نکال باہر کرنے" کی کوشش سے مجلس عاملہ کے ان انتہا
پسندوں کی غرض کیا ہو سکتی تھی؟ شاید یہ سمجھا جاتا ہو گا گاندھی جی چونکہ سمجھوتہ کرنے والے
آدمی ہیں اس لئے یہ لوگ انھیں راہ میں حائل جانتے ہوں گے۔ لیکن گاندھی جی کے
بغیر یہ تحریک ہی کہاں ہوتی۔ سول نافرمانی کا پتہ کہاں ہوتا، اور ستیا گرہ کا نشان

کہاں ملتا؟ وہ تو خود اس زندہ تحریک کے ایک جزو تھے۔ نہیں سچ تو یہ ہے کہ تحریک ہی وہ تھے۔ جہاں تک اس تحریک کا تعلق تھا سب کچھ ان پر منحصر تھا۔ یہ ضرور ہے کہ قومی تحریک ان کی آفریدہ نہیں تھی۔ نہ وہ کسی ایک شخص پر منحصر ہو سکتی ہے۔ اس کی جڑیں تو اس سے کہیں زیادہ گہری ہیں۔ مگر تحریک کی یہ خاص شکل جس کا علم سول نافرمانی ہے خصوصیت کے ساتھ ان سے وابستہ تھی۔ ان سے جدا ہونے کے معنی یہ تھے کہ اس تحریک کی ساری بساط ہی تہہ کر دی جائے۔ اور نئے سرے سے نئی بنیادوں پر کوئی نئی عمارت کھڑی کی جائے۔ یہ تجویز کسی وقت بھی کی جائے تو خاصی دشوار ہے ۱۹۳۱ء میں تو اس کا خیال بھی کسی کو نہیں آسکتا تھا۔

۱۹۳۰ء

یہ خیال کر کے بھی ہنسی آتی ہے کہ بعض لوگوں کے نزدیک ہم میں سے چند ہیں گاندھی جی کو کانگریس سے نکال باہر کرنے کی سازش کر رہے تھے۔ بھلا ہمیں اس سازش کی ضرورت ہی کیا تھی جب ایک ذرا سا اشارہ ہی کافی ہوتا؟ گاندھی جی کی طرف سے جب بھی ذرا یہ ظاہر ہوا ہے کہ وہ سیاست سے کنارہ کش ہونا چاہتے ہیں تو مجلس عاملہ اور سارے ملک میں تہلکہ سا مچ گیا۔ وہ تو ہمارے جہاد آزادی کا ایسا جزو بن گئے ہیں کہ یہ خیال تک برداشت نہیں ہوتا کہ وہ ہم سے الگ ہو جائیں گے۔ ہم تو لندن بھیجتے بھی جھجکتے تھے کہ ان کی غیر حاضری میں سارا بوجھ ہم پر آن پڑے گا۔ اور اس کا خیال بھی ہمیں بھلا نہ لگتا تھا۔ ہم لوگ تو اپنے بوجھ کو ان کے کندھوں پر منتقل کرنے کے ایسے عادی ہو گئے تھے۔ ہم میں سے بہتوں کے لئے مجلس عاملہ کے اندر اور اس کے باہر گاندھی جی سے وابستگی کے رشتے کچھ ایسے تھے کہ ہم اسے ترجیح دیتے تھے کہ ان کے ساتھ رہ کر ہار جائیں بہ نسبت اس کے کہ ان سے الگ ہو کر کوئی عارضی کامیابی حاصل کر لیں۔

اس بات کا فیصلہ کہ گاندھی جی اچھے دماغ کے آدمی ہیں یا نہیں ہم اپنے

دوستوں ہی پر چھوڑتے ہیں۔ بے شک یہ سچ ہے کہ ان کی سیاست کبھی کبھی بہت ہی فلسفیانہ اور حقائق سے دور ہو جاتی ہے اور اس کا سمجھنا مشکل ہوتا ہے مگر انھوں نے اپنے کو ایک نہایت ہی عملی آدمی ثابت کیا ہے۔ غیر معمولی ہمت اور جرأت کا آدمی اور ایسا آدمی کہ جو کچھ کہتا ہے اسے کر بھی دکھاتا ہے۔ پھر اگر الجھے ہوئے دماغ کے ایسے عملی نتائج نکل سکتے ہوں تو یہ الجھاؤ اس "عمل سیاست" سے کیا برا ہے جو مطالعہ کے کمروں اور خواص کے حلقوں میں شروع ہوتی ہے۔ اور وہیں ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ ان کے لاکھوں پیرو بھی الجھے دماغ کے لوگ ہیں۔ وہ نہ سیاست کو سمجھتے ہیں، نہ قانونِ دستوری سے آشنا ہیں۔ وہ سوچتے ہیں تو بس اپنی انسانی ضرورتوں کے اعتبار سے یعنی کھانے پینے، گھر در، کپڑے لتے اور زمین کے اعتبار سے۔

مجھے ہمیشہ اس پر تعجب ہوتا ہے کہ ممتاز پردیسی اخبار نویس، جنھیں فطرتِ انسانی کے مشاہدے کی خوب مشق ہوتی ہے، یہاں ہندوستان میں آ کر کیوں غلطی کر جاتے ہیں۔ اس کی وجہ کہیں ان کے بچپن کا یہ راسخ خیال تو نہیں کہ مشرق میں دنیا ہی نرالی ہے اسے معمولی معیاروں سے جانچا ہی نہیں جا سکتا۔ یا انگریزوں کے معاملہ میں کہیں یہ بات تو نہیں ہے کہ سامراج سے ان کی نظر میں ٹیڑھ پیدا ہو جاتی ہے اور نظارہ کو مسخ کر دیتی ہے۔ کوئی بات ہو، کیسی ہی بعید از قیاس، وہ اسے بلا تعجب کے یقین کر لیتے ہیں۔ اس لئے کہ مشرق کے اسرارستان میں ہر چیز ممکن ہے۔ وہ کتابیں شائع کرتے ہیں جن میں نہایت اچھے تبصرے اور نہایت گہرے مشاہدے بھی ملتے ہیں لیکن بیچ بیچ میں ایسی غلطیاں بھی ہوتی ہیں کہ بس حیرت ہو جاتی ہے۔

مجھے یاد ہے کہ سنہ ۱۹۳۱ء میں جب گاندھی جی یورپ جا رہے تھے تو میں نے لندن کے ایک اخبار میں اس کے پیرس نامہ نگار کا ایک مضمون پڑھا تھا۔ یہ مضمون ہندوستان کے متعلق تھا۔ اس میں نامہ نگار نے ایک واقعہ کا ذکر کیا تھا جو

اس کے نزدیک ۱۹۳۱ء میں ترک موالات کے زمانے میں پیش آیا تھا۔ اس وقت جب شہزادہ ویلز ہندوستان آئے تھے۔ لکھا تھا کہ کسی مقام پر (غالباً دہلی میں) مہاتما گاندھی ایک مرتبہ بلا اطلاع شہزادے کے سامنے جا پہنچے۔ گھٹنوں پر گر پڑے۔ شہزادے کے پیر پکڑ لئے۔ ڈہاڑیں مار مار کر رونے لگے اور ان سے التجا کی کہ اس ناشاد ملک کو امن و سکون ارزانی فرمائیں۔ ہم میں سے کسی نے، خود غریب گاندھی جی نے یہ قصہ نہ سنا تھا۔ میں نے ان نامہ نگار صاحب کو خط لکھا اور انھیں یہ بتایا کہ یہ بات بالکل غلط ہے۔ انھوں نے اس پر افسوس ظاہر کیا لیکن ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ انھیں یہ قصہ ایک معتبر ذریعہ سے پہنچا تھا۔ مجھے جس بات پر تعجب ہوا وہ یہ کہ اس نامہ نگار نے ایسے قصہ کو باور کر لیا اور حقیقت دریافت کرنے کی ذرا کوشش نہ کی حالانکہ قصہ بادی النظر میں ہی اس قدر بعید از قیاس ہے کہ کوئی شخص جو گاندھی جی کو، یا کانگریس کو یا ہندوستان کو ذرا بھی جانتا ہو اسے یقین نہ کرتا۔ بدنصیبی سے بہت سے انگریز جو ہندوستان ہی میں عرصہ سے رہتے ہیں وہ بھی اس ملک کے متعلق یا کانگریس کے متعلق یا گاندھی جی کی بابت کچھ نہیں جانتے۔ بہرحال یہ قصہ بالکل ہی ناقابل یقین اور مضحکہ خیز تھا جس کے مقابلہ میں بس اس فرضی واقعہ کی روداد پیش کی جا سکتی ہے جبکہ کنٹربری کے لاٹ پادری صاحب یکایک مسولینی کے سامنے جا پہنچے، سر نیچا کیا اور ٹانگیں اوپر اور سلام اور دعا کی جگہ لگے فضا میں اپنی دونوں ٹانگوں کو حرکت دینے۔

حال ہی میں ایک اور اخبار میں ایک اطلاع شائع ہوئی جس میں ایک اور ہی قسم کا قصہ پیش کیا گیا ہے۔ کہا گیا ہے کہ گاندھی جی کے پاس بے حساب رقمیں ہیں جن کا شمار لاکھوں پونڈ تک پہنچتا ہے۔ یہ رقمیں خفیہ طور پر دوستوں کے یہاں رکھی ہیں اور کانگریس کی نظر اس روپیہ پر ہے۔ اگر گاندھی جی کانگریس سے ہٹے تو ڈر ہے کہ یہ خزانے ہاتھ سے نکل جائیں گے۔ یہ افسانہ بھی سراپا لغو ہے۔ اس لئے کہ گاندھی جی کبھی کسی

قسم کا فنڈ اپنی تحویل میں نہیں رکھتے، نہ خود اپنے پاس نہ چھپا کر کسی دوسرے کے پاس جو کچھ جمع کرتے ہیں کسی پبلک ادارے کے سپرد کر دیتے ہیں۔ حساب کتاب ٹھیک رکھنے کے باب میں ان کی جبلت بنئے کی ہے اور ان کی جمع کی ہوئی رقموں کے حسابات کی ہمیشہ باضابطہ جانچ ہوتی رہتی ہے۔

یہ افواہ غالباً اس مشہور ایک کروڑ روپیہ والے قصہ پر مبنی ہے جو کانگریس نے ۱۹۲۱ء میں جمع کئے تھے۔ یہ رقم جو یوں خاصی بڑی معلوم ہوتی ہے مگر سارے ہندوستان پر پھیلائی جائے تو کچھ ایسی بڑی نہیں۔ قومی یونیورسٹیوں، مدرسوں کے لئے استعمال ہوئی اور دیہی صنعتوں خصوصاً کھدر کو فروغ دینے میں یا اچھوتوں کے کام اور دوسری تعمیری تجاویز کے سلسلہ میں۔ اس میں سے بہت تو پہلے سے مختلف کاموں کے لئے مخصوص تھی اور یہ فنڈ اب تک موجود ہیں اور ان مخصوص اغراض میں کام آرہے ہیں۔ باقی حصہ مقامی کمیٹیوں کے سپرد کر دیا گیا تھا اور کانگریس کے تنظیمی اور سیاسی کام میں صرف ہوا۔ ترک موالات کی تحریک کے مصارف اس سے پہلے اور چند سال بعد تک کانگریس کا کام بھی اسی روپیہ سے چلا۔ گاندھی جی نے اور پبلک کے افلاس نے ہمیں یہ سکھایا ہے کہ اپنی ساری تحریک کو بہت ہی محدود وسائل سے چلائیں۔ ہمارے کام کا بڑا حصہ تو بلا معاوضہ رہا ہے اور جب کبھی کوئی رقم بقدر معاوضہ دی تو بس مشکل سے پیٹ بھرنے کے قابل۔ ہمارے بہترین کام کرنے والوں کو۔ یونیورسٹی کے فارغ التحصیل لوگوں کو جن کے ذمے پورے خاندان کے مصارف بھی تھے ہم نے اس سے کم دیا ہے جتنا کہ انگلستان میں ایک بے روزگار مزدور کو بطور الاونس دیا جاتا ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ شاید ہی کوئی سیاسی یا مزدوروں کی تحریک بڑے پیمانہ پر کہیں بھی اس قدر کم خرچ میں چلی ہے جیسے کہ پچھلے پندرہ برس میں کانگریس کی تحریک سال بہ سال کانگریس کے تمام حسابات کی باضابطہ علی الاعلان جانچ ہوتی ہے۔ ان کا

کوئی حصہ خفیہ نہیں رہا ہے۔ سوائے سول نافرمانی کے زمانے میں جب کہ کانگریس کو خلاف قانون جماعت قرار دیا گیا تھا۔

گاندھی جی لندن کی گول میز کانفرنس میں کانگریس کے تنہا نمائندہ کی حیثیت سے گئے تھے۔ بہت کچھ بحث مباحثہ کے بعد ہم لوگوں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ کوئی اور نمائندہ نہ بھیجا جائے۔ کچھ تو اس کی وجہ یہ تھی کہ ہم اپنے بہترین آدمیوں کو اس کٹھن زمانہ میں ہندوستان ہی میں رکھنا چاہتے تھے کہ اس زمانہ میں نہایت ہوشیاری سے ساری تحریک کو ہاتھ میں رکھنا تھا۔ ہم محسوس کرتے تھے کہ گول میز کانفرنس کے باوجود اصل مرکز ثقل ہندوستان ہی میں ہے۔ اور یہ ہندوستان میں جو صورت حال پیدا ہوگی اس کا اثر لازمی طور پر لندن میں پڑے گا۔ ہم چاہتے تھے کہ ناموافق حالات کو پیدا ہونے سے روکیں اور اپنی تنظیم کو درست حالت میں برقرار رکھیں۔ لیکن صرف ایک نمائندہ بھیجنے کی اصل وجہ یہ نہ تھی۔ اگر ہم ضرورت سمجھتے اور غایت جانتے تو ضرور اور نمائندے بھی بھیجتے مگر ہم نے قصداً ایسا نہیں کیا

ہم گول میز کانفرنس میں کچھ اس لئے تو شرکت کر نہیں رہے تھے کہ جاکر دستور ملکی کی ضمنی تفصیلات سے متعلق وہ بحثیں چھیڑیں جو کبھی ختم ہی ہونے میں نہ آئیں۔ اس وقت ان تفصیلات میں ہمیں ذرا دلچسپی نہ تھی اور ان پر تو غور اس وقت ہو سکتا تھا کہ برطانوی حکومت سے بنیادی معاملات پر کوئی سمجھوتہ ہو جاتا۔ اصل سوال یہ تھا کہ جمہوری ہند کو کتنی طاقت منتقل کرتی ہے۔ تفصیلات کھڑے کرنے اور انھیں قلمبند کرنے کا کام تو کوئی بھی قانون داں بعد کو کر سکتا تھا۔ ان بنیادی امور میں کانگریس کا مسلک صاف اور سیدھا تھا اور اس میں بحث اور دلیل کی زیادہ گنجائش نہ تھی ہم نے سوچا کہ ہمارے لئے باوقار طریقہ یہی ہے کہ ہمارا بس ایک نمائندہ اور وہ خود ہمارا قائد جائے اور وہ ہمارے مسلک کو پیش کرکے بتا دے کہ وہ کس قدر معقول ہے اور کس قدر

مل ۔ اور ہو سکے تو اس مسلک کے لئے برطانوی حکومت کی حمایت حاصل کرے۔
کام مشکل تھا، یہ ہم خوب جانتے تھے اور معاملات کی جو صورت اس وقت تھی اس میں
مشکل ہی سے اس کے کرنے کا امکان تھا۔ مگر کیا کرتے کوئی دوسری صورت بھی
ہمارے سامنے نہ تھی۔ ہم اپنے مسلک کو، اپنے اصول کو، اپنے مطمح نظر کو تو چھوڑ نہیں
سکتے تھے۔ ہم ان کے پابند تھے اور ان پر پکا یقین رکھتے تھے۔ اگر حسن اتفاق سے
ان بنیادی اصولوں پر سمجھوتہ کی صورت نکل آتی تو پھر باقی کام بہت سہل تھا بلکہ ہم
میں یہ طے ہو چکا تھا کہ اگر سمجھوتہ ہو گیا تو گاندھی جی فوراً مجلس عاملہ کے چند یا سب
اراکین کو لندن بلا لیں گے تاکہ تفصیلات پر بات چیت میں سب شریک ہو سکیں۔ ہمیں
ہدایت تھی کہ ہم تیار رہیں اور ضرورت ہو تو ہوائی جہاز سے سفر کریں۔ یوں گویا بلاوے
کے دس دن کے اندر ہم لوگ گاندھی جی کے پاس پہنچ سکتے تھے

لیکن اگر بنیادی باتوں پر سمجھوتہ نہ ہو تو پھر مزید گفتگو کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا
نہ کانگریس کو ضرورت ہوتی کہ گول میز کانفرنس میں اور نمائندے بھیجے۔ لہٰذا فیصلہ یہی
ہوا کہ اکیلے گاندھی جی کو بھیجیں۔ مجلس عاملہ کے ایک اور رکن یعنی مسز سروجنی نائیڈو نے
بھی گول میز کانفرنس میں شرکت کی۔ مگر کانگریس کے نمائندے کی حیثیت سے نہیں
انھیں ہندوستانی عورتوں کی نمائندے کی حیثیت سے دعوت دی گئی تھی اور
مجلس عاملہ نے انھیں جانے کی اجازت دے دی تھی۔

مگر برطانوی حکومت اس معاملے میں ہماری خواہشوں کو پورا کرنا نہیں چاہتی تھی
اس کی تدبیر یہ تھی کہ بنیادی امور پر غور و بحث کو برابر ٹالیں تاکہ کانفرنس کم و بیش
ضمنی اور غیر اہم باتوں پر بحث کر کر کے تھک جائے۔ کہیں کوئی اہم معاملہ سامنے
آ ہی گیا تو حکومت جھجکی رکی رہی۔ اپنے کو کسی بات پر قطعی طور پر پابند نہ کیا، اور
بس یہی وعدہ کر دیا کہ مزید غور و خوض کر کے بعد کو اپنی رائے ظاہر کرے گی۔

ان کا ترپ کا پتہ فرقہ وارانہ مسئلہ تھا اور اسے انھوں نے خوب کھیلا ساری کانفرنس پر ایک یہی مسئلہ حاوی رہا۔

کانفرنس کے ہندوستانی ممبروں میں سے بڑی اکثریت، زیادہ تر ارادۃً کچھ بے ارادہ، اس سرکاری چال کا ساتھ دے رہی تھی۔ اور یہ مجمع تھا بھی نرالا ان میں کون تھا جو اپنی ذات کے سوا اور کسی کا نمائندہ ہو۔ بعض ان میں سے ضرور قابل اور معزز لوگ تھے، اور بہت سے ایسے تھے جن کے متعلق یہ بھی نہیں کہا جاسکتا سیاسی اور معاشرتی اعتبار سے یہ لوگ بہ حیثیت مجموعی ہندوستان کے سب سے زیادہ ترقی دشمن عناصر کے نمائندے تھے۔ اور ایسے رجعت پسند اور تغیر دشمن کہ ہمارے ہندوستانی لبرل تک، جو یہاں اس درجہ محتاط اور معتدل لوگ سمجھے جاتے ہیں۔ وہاں ان کے مقابلے میں ترقی خواہ کی حیثیت سے چمکتے رہے یہ لوگ ہمارے ملک کے ان اہل غرض گروہوں کی نمائندگی کر رہے تھے جن کا مفاد برطانوی سامراج سے وابستہ ہے اور اپنی غرضوں کی تکمیل اور تحفظ کے لئے یہ اسی سامراج کا منہ تکتے ہیں۔ سب سے ممتاز نمائندگی مختلف اقلیتوں اور اکثریتوں کی طرف سے فرقہ وارانہ مسئلہ کے متعلق تھی۔ ان میں اونچے طبقے کے کچھ لوگ تھے۔ جو کسی کی بات نہیں مانتے اور جن کے متعلق مشہور تھا کہ آپس میں بھی متفق نہیں ہو سکتے تھے۔ سیاسی لحاظ سے یہ سب کٹر ترقی دشمن تھے اور ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ کچھ فرقہ داری فائدہ حاصل کرلیں چاہے اس میں ملک کی سیاسی ترقی کو یکسر ہاتھ سے دینا ہی کیوں نہ پڑے۔ چنانچہ انھوں نے صاف اعلان ہی کر دیا تھا کہ کسی ایسی کارروائی پر جس سے ملک کو کچھ اور سیاسی آزادی ملے یہ اس وقت تک راضی نہ ہوں گے جب تک ان کے فرقہ وارانہ مطالبات پورے نہ ہو جائیں۔ کیا نرالا نظارا تھا۔ اور کیسی تکلیف دہ وضاحت سے یہ بات روشن ہوتی تھی کہ ایک

محکوم قوم کس قدر نیچے جا سکتی ہے اور کس طرح اسے سامراجی بساط کا مہرا بنایا جا سکتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ راجوں، مہاراجوں، لاٹ صاحبوں، سروں اور بااقتدار لوگوں کا یہ انبوہ ہندوستانی قوم کا نمائندہ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ یہ بھی سچ ہے کہ گول میز کانفرنس کے اراکین کو برطانوی حکومت نے نامزد کیا تھا اور اپنے نقطۂ نظر سے واقعی خوب انتخاب کیا تھا۔ یہ سب صحیح۔ مگر پھر بھی اس بات سے کہ برطانوی حکام ہمیں یوں برت سکتے اور اپنے کام میں لا سکتے ہیں۔ ہماری قوم کی کمزوری ظاہر ہوتی تھی اور پتہ چلتا تھا کہ ہمیں کس آسانی سے بہکایا جا سکتا ہے۔ اور ایک سے دوسروں کی کوششوں کا کیسے کاٹ کرایا جا سکتا ہے۔ ہمارے اونچے طبقے کے لوگ ابھی تک سامراجی حکمرانوں کی ذہنیت میں ڈوبے ہوئے ہیں اور انھیں کا کام کرتے ہیں۔ کیا انھیں اس کی حقیقت نہیں دکھائی دیتی؟ یا یہ بات ہے کہ اس کی حقیقت کو جانتے ہیں اور جان بوجھ کر اس لئے اسے قبول کرتے ہیں کہ ملک میں جمہوریت اور آزادی کے قیام سے انھیں ڈر لگتا ہے۔

بہت ہی ٹھیک بات تھی کہ اغراض کے اس ہجوم میں سامراجی منصب داری مالیاتی، صنعتی، مذہبی، فرقہ داری اغراض کے اس جھمگٹ میں برطانوی ہند کے نمائندوں کی سرداری عموماً آغا خاں کے حصہ میں آئی تھی۔ اس لئے کہ اغراض کچھ نہ کچھ سب ہی ان کی ذات میں یکجا جمع ہیں۔ ایک نسل سے زیادہ عرصہ سے یہ برطانوی سامراج اور برطانوی حکمراں طبقے کے ساتھ وابستہ رہے ہیں۔ رہتے سہتے بھی زیادہ تر انگلستان ہی میں ہیں۔ یہ ہمارے حکمرانوں کے مفاد اور ان کے نقطۂ نظر کو واقعی خوب سمجھ سکتے ہیں اگر گول میز کانفرنس میں سامراجی انگلستان کی طرف سے یہ آتے تو اس کے نہایت ہی قابل نمائندے ثابت ہوتے۔ مگر ستم ظریفی یہ تھی کہ یہ ہندوستان کی نمائندگی فرما رہے تھے۔

کانفرنس میں ہمارا مقابل پلڑ بہت بھاری تھا، اور ہمیں اس سے کوئی زیادہ توقع بھی نہ تھی۔ پھر بھی اس کی کارروائی کو دیکھ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی اور گھن آتی تھی۔ ہم قومی اور معاشی مسائل کی بڑی سطح کو کھرچنے کی لغو اور جھوٹے موٹے کی کوششوں کو دیکھتے تھے۔ معاہدوں اور سازشوں اور چالوں کو دیکھتے تھے۔ برطانوی کنزرویٹو پارٹی کے ترقی دشمن حصہ سے اپنے بعض اہل وطن کا ساز باز دیکھتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے معاملات پر لامتناہی بک بک سنتے تھے۔ دیکھتے تھے کہ اصلی معاملات کو کیسے جان بوجھ کر ٹالا جا رہا ہے۔ اور ہمارے ہی آدمی برابر کس طرح اہل غرض اور خصوصاً برطانوی سامراج کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں۔ آپس کی جھک جھک دیکھتے تھے اور اسی کے ساتھ ساتھ جشن اور دعوتیں اور باہمی مدح و ثنا کا طوفان! شروع سے آخر تک خدمتوں کی تلاش تھی۔ بڑی ہوں کہ چھوٹی، ہندوؤں کے لئے خدمتیں اور نشستیں مسلمانوں کے لئے خدمتیں ہوں اور نشستیں سکھوں کے لئے بھی ہوں۔ اینگلو انڈین جماعت کے لئے بھی اور یوروپین گروہ کے لئے بھی۔ مگر ہوں سب اعلیٰ طبقہ کے لئے بے چارے عوام کو ان میں ذرا دخل نہ ہو۔ ابن الوقتی کا دور دورہ تھا اور مختلف گروہ بھوکے بھیڑیوں کی طرح شکار کی گھات میں تھے۔ بس یہی فکر تھی کہ نئے دستور اساسی میں پھلے مرتبہ۔ خود آزادی کے تصور نے بڑے پیمانہ پر خدمت طلبی کی شکل اختیار کر لی تھی۔ جسے (Indianisation) یا ہندیانا، کہتے تھے یعنی فوج میں ہندوستانیوں کو زیادہ خدمتیں ملیں۔ سول سروس میں بھی زیادہ ملیں وغیرہ وغیرہ۔ خود مختاری حقیقی آزادی، جمہوری ہند کو طاقت اور اختیار کی منتقلی، یا ہندوستانی قوم کے کسی اہم اور ضروری معاشی مسئلہ کے حل کا وہاں ذکر ہی نہ تھا۔ کیا اسی کے لئے ہندوستان نے یوں مردانہ وار جد و جہد کی تھی؟ اور کیا ایثار و قربانی کی اس لطیف فضا کو کانفرنس کی کثیف ہوا سے بدلنا ضروری تھا؟

اس سنہرے اور بھرے ہوئے ہال میں گاندھی جی بیٹھے تھے۔ یکہ و تنہا بیٹھے تھے ان کا لباس یا بے لباسی انھیں اوروں سے ممتاز کرتی تھی۔ مگر ان میں اور ان کے خوش لباس ہم نشینوں میں افکار اور نقطۂ نظر کا فرق اس سے بھی زیادہ تھا۔ اس کانفرنس میں ان کی حیثیت بڑی ہی مشکل کی تھی اور ہم یہاں دور سے بیٹھے حیرت کرتے تھے کہ یہ اسے کس طرح برداشت کر رہے ہیں۔ لیکن وہ حیرت انگیز صبر کے ساتھ اپنا کام کئے گئے اور پیہم کوشش کرتے رہے کہ سمجھوتہ کی کوئی صورت پیدا ہو۔ انھوں نے ایک خاص بات کی جس نے ایک مرتبہ یہ راز فاش کردیا کہ فرقہ پروری کے پردے میں دراصل ترقی دشمنی نہاں ہے۔ کانفرنس کے مسلمان نمائندوں نے جو فرقہ وارانہ مطالبات پیش کئے تھے گاندھی جی ان میں سے بہتوں کو پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا اور ان کے سلمان قوم پرور ساتھیوں کا بھی یہی خیال تھا کہ ان مطالبات میں سے بعض آزادی اور جمہوریت کی راہ میں حائل ہوں گے پھر بھی انھوں نے کہہ دیا کہ میں بلا پوچھے گچھے اور بے دلیل و حجت ان سب مطالبوں کو مان لوں گا۔ اگر مسلمان نمائندے سیاسی مطالبہ یعنی خود مختاری کے مطالبہ میں میرے ساتھ اور کانگریس کے ساتھ مل جائیں۔

یہ بات انھوں نے بالکل شخصی طور پر کہی تھی۔ اس لئے کہ وہ اس وقت تو کانگریس کو اس کا پابند نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن انھوں نے وعدہ کیا تھا کہ میں کانگریس کو اس کے تسلیم کرنے پر آمادہ کردوں گا اور کوئی شخص جو کانگریس میں ان کی حیثیت کو جانتا ہو شبہ نہیں کر سکتا تھا کہ وہ کانگریس سے اس بات کو منوانے میں ضرور کامیاب ہو جاتے۔ لیکن ان کی بات کسی نے نہ مانی اور سچ بھی ہے آغا خاں کو آزادیٔ ہند کی حمایت میں کمربستہ تصور کرنا بھی ذرا مشکل ہے۔ غرض اس سے ظاہر ہو گیا کہ چاہے فرقہ وارانہ مسائل ہی کانفرنس پر چھائے ہوئے معلوم ہوں مگر اصل

وقت فرقہ پروری نہیں ہے ۔اصل میں سیاسی ترقی دشمنی راہ میں حائل تھی اور فرقہ وارانہ مسائل کی آڑ میں کام کرتی تھی کانفرنس کے اراکین کو نہایت احتیاط سے نامزد کرکے برطانوی حکومت نے یہ سارے ترقی دشمن عناصر ایک جگہ جمع کردیئے تھے ۔ اور ضابطہ کارروائی چونکہ خود ان کے ہاتھ میں تھا اس لئے اس فرقہ وارانہ مسئلہ کو کانفرنس کا اہم مسئلہ بنا دیا تھا اور ایسا مسئلہ کہ جس پر وہ لوگ جو وہاں جمع تھے کبھی متفق ہو ہی نہیں سکتے تھے ۔

برطانوی حکومت کو اپنی اس کوشش میں کامیابی ہوئی اور یہ ظاہر ہوگیا کہ اس کے پاس سلطنت کے قائم رکھنے کے لئے صرف قوت ہی نہیں ہے بلکہ کچھ عرصہ تک سامراجی رجحانات کے برقرار رکھنے کے لئے ابھی کافی چالاکی اور تدبر بھی باقی ہے ۔ہندوستانی قوم ناکام ہوئی ۔ ہرچند کہ گول میز کانفرنس نہ ان کی نمائندہ نہ اس سے ان کی قوت کا اندازہ ہو سکتا تھا ۔مگر قوم ناکام ہوئی اس لئے کہ اپنی کوشش کے مقصود کو متعین کرنے کے لئے جس ذہنی پس منظر کی ضرورت ہے وہ اس کے پاس نہ تھا ۔ اس لئے انہیں بہکا کر غلط راستے پر ڈال دینا آسان تھا ۔قوم ناکام ہوئی اس لئے کہ اس نے اپنے میں اتنی قوت نہیں پائی کہ جو اہل غرض اس کی ترقی میں حائل ہیں انہیں راہ سے ہٹا پھینکے ۔ قوم ناکام ہوئی اس لئے کہ اس میں غلط مذہبیت کی زیادتی ہے ۔ اور اس میں فرقہ وارانہ جذبات کو نہایت آسانی سے بھڑکایا جا سکتا ہے ۔مختصر یہ کہ قوم ناکام ہوئی اس لئے کہ وہ ابھی اتنی آگے نہ بڑھی تھی اور ابھی اتنی مضبوط نہ تھی کہ کامیاب ہوتی ۔

خود اس گول میز کانفرنس میں کامیابی اور ناکامی کا کوئی سوال نہ تھا ۔اس سے ایسی زیادہ امید ہی کسے تھی ۔مگر پھر بھی اس سے ایک فرق ضرور پیدا ہوا ۔اس سے پہلے جو کانفرنس ہوئی تھی اپنی قسم کی پہلی کانفرنس ۔اس کی طرف نہ ہندوستان

میں زیادہ توجہ کی گئی نہ اور کہیں۔ اس لئے کہ اس وقت سب کا دھیان سول نافرمانی کی تحریک میں لگا تھا۔ برطانوی حکومت کے نامزد کئے ہوئے لوگ جب ۱۹۳۱ء کی کانفرنس کو جا رہے تھے تو کالی جھنڈیوں کے جلوس اور مذمت کی آوازوں کے ساتھ انھیں رخصت کیا گیا تھا۔ لیکن ۱۹۳۱ء میں بات ہی کچھ اور تھی۔ اور یہ فرق اس لئے تھا کہ اس مرتبہ گاندھی جی کانگریس کے نمائندہ کی حیثیت سے گئے تھے۔ ایک قائد کی حیثیت سے جن کی پیروی لاکھوں آدمی کر رہے تھے اس وجہ سے کانفرنس کا رتبہ بڑھا اور ہندوستان کے لوگوں کو اسکی کارروائی سے بہت زیادہ دلچسپی ہوگئی۔ اس کی ناکامی، چاہے اس کا سبب کچھ ہی ہو ہندوستان کی مخالفت پڑتی تھی۔ اس وقت سمجھ میں آیا کہ برطانوی حکومت کو گاندھی جی کی شرکت پر اتنا اصرار کیوں نہ تھا۔

کانفرنس خود تو اپنے سارے ساز باز، ابن الوقتی اور بے سود بے راہ روی کے باوجود، ہندوستان کے لئے ناکامی نہ تھی۔ یہ تو بنائی ہی اس طرح گئی تھی کہ ناکام ہو اور اس کی ناکامی کی ذمہ داری ہندوستانی قوم پر نہیں ڈالی جا سکتی۔ ہاں اسے یہ کامیابی ضرور ہوئی کہ اس نے ہندوستان کے اصل مسائل کی طرف سے دنیا کی توجہ ہٹا دی۔ اور خود ہندوستان کے اندر اس سے مایوسی، ہراس اور ذلت کا احساس پیدا ہوا۔ اس سے ترقی دشمن قوتوں کو ایک سہارا ملا اور وہ اس قابل ہوئیں کہ پھر ذرا سر اٹھائیں۔

ہندوستان کے لوگوں کو کامیابی یا ناکامی تو ہندوستان کے واقعات سے حاصل ہو سکتی تھی۔ دور دراز لندن کے ساز باز سے قومی تحریک کچھ کھلا تو سکتی نہ تھی۔ ہندوستانی قومی تحریک یہاں کے متوسط طبقے اور یہاں کے کسانوں کی ایک حقیقی اور فوری ضرورت ہے اور یہ اس کے ذریعہ اپنے مسائل

کا حل تلاش کر رہے ہیں۔ اس لئے یا تو یہ ہو سکتا ہے کہ یہ تحریک کامیاب ہو کر اپنا مقصد پورا کر دے اور اس کی جگہ کوئی دوسری ایسی تحریک لے لے جو قوم کو ترقی اور آزادی کی شاہراہ پر اور آگے لے جا سکے۔ یا پھر اسے کچھ دنوں کے لئے دبایا جا سکتا ہے۔ یہ کشمکش ہندوستان میں فوراً ہی شروع ہونے کو تھی اور اس کا نتیجہ عارضی طور پر ہماری شکست ہونے کو تھا۔ مگر دوسری گول میز کانفرنس کا اس کشمکش کے نتیجے پر چنداں اثر نہیں ہو سکتا تھا۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ اس نے ہمارے ناموافق ایک فضا پیدا کر دی۔

(۳۹)

صوبجات متحدہ کے کسانوں کی پریشانیاں

کانگریس کے جنرل سکریٹری اور مجلس عاملہ کے رکن کی حیثیت سے مجھے کام ہندوستانی سیاست سے تعلق تھا۔ کبھی دوسرے بھی کرنے پڑتے تھے۔ مگر جہاں تک بن پڑتا میں ان سے بچتا تھا۔ ذمہ داریاں بڑھیں تو مجلس عاملہ کے جلسے بھی جلد جلد ہونے لگے۔ اور آخر میں تو باضابطہ دو دو ہفتے کے اجلاس کی نوبت آگئی۔ بات یہ تھی کہ اب محض تنقیدی قرار دادیں منظور کرنے کا معاملہ تو تھا نہیں ایک وسیع اور متنوع نظام کے مختلف تعمیری کاموں کو چلانا تھا اور روز ایسے مشکل مسائل سے سابقہ تھا جن پر یہ بات منحصر تھی کہ قومی پیمانہ پر کشمکش شروع ہو کہ نہ ہو۔

مگر میرا خاص کام صوبۂ متحدہ میں تھا۔ یہاں کسانوں کی پریشانیوں نے کانگریس کی تمام تر توجہ کو جذب کر رکھا تھا۔ صوبہ کی کانگریس کمیٹی میں کوئی ۵۰ سے اوپر رکن تھے اور ہر دوسرے تیسرے مہینہ ان کا جلسہ ہوا کرتا تھا۔ اس کی مجلس انتظامیہ میں کوئی ۱۵ رکن تھے۔ ان کے جلسے بھی جلد جلد ہوتے تھے اور کانگریس کا دیہی شعبہ انھیں کے ہاتھ میں تھا۔

۱۹۳۱ء کے نصف آخر میں اس مجلس نے ایک خاص دیہی کمیٹی مقرر کر دی تھی۔ اور یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ اس مجلس انتظامیہ اور دیہاتی کمیٹی سے برابر بہت سے زمیندار خاص طور پر وابستہ تھے۔ چنانچہ جو کچھ کیا گیا ان کی منظوری سے کیا گیا یہی نہیں بلکہ اس سال ہماری صوبہ کانگریس کمیٹی کے صدر اور اس

عہدہ کی وجہ سے اس کی مجلس انتظامیہ اور دیہی کمیٹی کے صدر مسٹر تصدق حسین خاں شیروانی تھے۔ جو ایک مشہور زمینداری خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہمارے جنرل سکریٹری، سری پرکاش جی، اور مجلس انتظامیہ کے بہت سے ممتاز رکن خود زمیندار تھے۔ یا زمینداری خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ باقی ممبر متوسط طبقہ کے پیشہ ور لوگ تھے۔ صوبہ کی مجلس انتظامیہ میں ایک بھی آسامی یا غریب کسان نمائندہ نہ تھا۔ کسان ہماری ضلع کی کمیٹیوں میں ضرور ہوتے تھے۔ لیکن صوبہ کی مجلس انتظامیہ تک پہنچنے کے لئے جو کئی انتخابات ہوتے ہیں۔ یہ غریب ان سے نکل کر آگے نہیں بڑھ پاتے تھے۔ چنانچہ ہماری مجلس انتظامیہ میں تمام تر متوسط طبقہ کے تعلیم یافتہ لوگوں کا غلبہ تھا اور اس میں زمینداروں کی بھی کافی آمیزش تھی اس لئے کسی معنی میں بھی یہ انتہا پسند جماعت نہ تھی اور کسانوں کے مسئلہ پر تو ہرگز نہیں۔

صوبہ میں میری حیثیت بس مجلس انتظامیہ اور دیہی کمیٹی کے رکن کی تھی۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ باہمی مشوروں اور مجلس کے دوسرے کاموں میں خوب حصہ لیتا تھا۔ مگر میرے کام کو رہنمائی کا کام کسی طرح نہیں کہہ سکتے اور واقعہ یہ ہے کہ ہمارے صوبہ میں تو کسی کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے رہنمائی کی۔ اس لئے کہ ہم لوگوں نے عرصہ سے مِل جُل کر کام کرنے کا خوگر بنا لیا تھا۔ اور ہمارے یہاں زور ہمیشہ نظام پر دیا جاتا ہے فرد پر نہیں۔ سال بھر کے لئے جو صدر ہوتا وہ عارضی طور پر ہمارا سردار ہوتا اور ہماری نمائندگی کرتا تھا مگر خود اس کو بھی کوئی خاص امتیاز حاصل نہ تھا۔

میں مقامی طور پر الہ آباد ضلع کی کانگریس کمیٹی کا رکن بھی تھا۔ دیہی مسئلہ کی نشوونما میں اس کمیٹی نے اپنے صدر پرشوتم داس ٹنڈن کی قیادت میں بڑا اہم حصہ

بنا تھا۔ ۱۹۳۰ء میں اسی نے ٹیکس نہ دینے کی تحریک شروع کی تھی۔ وجہ یہ نہ تھی کہ الہ آباد کے ضلع میں زرعی کساد بازاری کا اثر کچھ اور جگہ سے زیادہ تھا۔ یوں تو اودھ کے تعلقداری اضلاع کی حالت کہیں ابتر تھی۔ بات اصل یہ تھی کہ الہ آباد کا ضلع زیادہ منظم تھا اور یہاں سیاسی احساس زیادہ تھا۔ اس لیے کہ الہ آباد شہر سیاسی کاموں کا مرکز تھا اور ممتاز کام کرنے والے اکثر آس پاس کے گانوؤں میں جاتے رہتے تھے۔

مارچ ۱۹۳۱ء میں دہلی کے سمجھوتہ کے فوراً ہی بعد ہم نے دیہات میں چھپے ہوئے اعلان بھیجے اور اپنے کام کرنے والے بھی کہ کسانوں کو بتا دیں کہ سول نافرمانی اور سیاسی تحریک روک دی گئی ہے۔ لہذا سیاسی وجہ سے لگان ادا کرنے میں اب کوئی چیز مانع نہیں ہے۔ اور انھیں یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ لگان ادا کر دیں مگر ساتھ ہی یہ ضرور کہہ دیا تھا کہ چونکہ قیمتوں میں بے حساب کمی ہو گئی ہے اس لئے ہمارا خیال ہے کہ انھیں بہت کچھ چھوٹ ملنی چاہیئے۔ اور یہ تجویز کی تھی کہ ہم سب مل کر اس چھوٹ کے حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ معمولی زمانہ میں بھی لگان کا بوجھ اکثر ناقابلِ برداشت ہوتا تھا لیکن اب تو قیمتوں کے یوں گرنے سے بالکل ناممکن ہو گیا تھا کہ پورا لگان یا اس کے کچھ بھی لگ بھگ ادا کیا جا سکے۔ ہم نے کسانوں کے نمائندوں سے مل کر مشورے کیئے اور آزمائشی طور پر یہ تجویز کی کہ پچاس فیصدی اور بعض صورتوں میں اس سے بھی زیادہ کی چھوٹ لگان میں دی جائے۔

ہماری کوشش تھی کہ کسانوں کے مسئلہ کو عام سول نافرمانی کے مسئلہ سے بالکل الگ کر دیں۔ کم سے کم ۱۹۳۱ء میں ہماری خواہش یہ تھی کہ اس مسئلہ کو سیاست سے جدا کر کے خالص معاشی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے۔ یہ بات تھی مشکل اس لئے کہ دونوں میں چولی دامن کا ساتھ ہے اور پہلے بھی یہ دونوں پہلو باہم وابستہ رہ چکے تھے۔ ہم لوگ خود بحیثیت کانگریس کے بالکل سیاسی جماعت

تھے۔ وقتی طور پر ہم ضرور یہ کوشش کر رہے تھے کہ کسانوں کی یونین کا کام کریں (جس پر قابو غیر کسانوں بلکہ زمینداروں تک کا تھا)، مگر ہم نہ اپنے سیاسی رنگ کو چھوڑ سکتے تھے نہ چھوڑنا چاہتے تھے۔ ادھر حکومت تھی کہ ہمارے سب کاموں کو سیاسی کام گردانتی تھی۔ آنے والی سول نافرمانی کا سایہ آگے آگے چلتا دکھائی دیتا تھا اور اگر نوبت آتی تو اس میں کیا شک تھا کہ سیاست اور معیشت دست در دست آگے بڑھیں۔

ان تمام کھلے ہوئے موانع کے باوجود دہلی کے سمجھوتہ کے بعد سے برابر ہماری یہ کوشش رہی کہ ہم کسانوں کے مسئلہ کو سیاسی کشمکش سے الگ رکھیں۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ دہلی کے سمجھوتہ نے اس مسئلہ کو طے نہیں کیا تھا، اور ہم اس بات کو حکومت اور قوم دونوں پر پوری طرح واضح کر دینا چاہتے تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ دہلی کی بات چیت کے وقت گاندھی جی نے لارڈ ارون کو یقین دلایا تھا اگر میں گول میز کانفرنس میں نہ بھی گیا تو بھی کانفرنس کے دوران میں سول نافرمانی شروع نہ کروں گا اور کانگریس سے درخواست کروں گا کہ کانفرنس کو پورا پورا موقع دے اور اس کے نتیجہ کا انتظار کرے۔ لیکن اس وقت بھی گاندھی جی نے یہ بات صاف کر دی تھی کہ اس وعدہ کا اطلاق کسی ایسی مقامی کشمکش پر نہ ہوگا جس پر کہ ہم بعد کو مجبور ہوں صوبجات متحدہ کے کسانوں کا مسئلہ تو اس وقت ہم سب کے سامنے ہی تھا اس لئے کہ یہاں منظم کارروائی ہو چکی تھی۔ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ سارے ہندوستان میں کسانوں کی حالت یہی تھی۔ شملہ کی گفتگو میں گاندھی جی نے اس بات کو پھر دہرایا تھا اور اس کا ذکر شائع شدہ خط و کتابت میں آچکا ہے[۱]۔ عین اس وقت کہ وہ یورپ

---

[۱] ذیل کے خطوط ۲۷ اگست والے شملہ کی مفاہمت نامہ کا جزو تھے (ملاحظہ ہو صفحہ ۴۲۱)

جارہے تھے گاندھی جی نے یہ بات کہ گول میز کانفرنس سے اور سیاسی مسائل سے قطع نظر کانگریس کو اس بات کی ضرورت ہو سکتی ہے کہ معاشی کشاکش میں وہ قوم کے اور خصوصاً کسانوں کے حقوق کی حفاظت کرے۔ انھیں اس کشاکش میں پڑنے کی خواہش نہ تھی بلکہ وہ تو اس سے بچنا چاہتے تھے۔ لیکن اگر یہ ناگزیر ہو جائے تو پھر تو کرنا ہی چاہیے کہ ہم قوم کے عوام کو نہیں چھوڑ سکتے۔ ان کا کہنا تھا کہ دلی کا

مسٹر گاندھی بنام مسٹر ایمرسن سکریٹری ہوم ڈپارٹمنٹ حکومت ہند

شملہ

۲۷ اگست ۱۹۳۱ء

ڈیر مسٹر ایمرسن!

آپ کا آج والا خط ملا، جس کے ساتھ آپ نے ایک نیا مسودہ بھیجا ہے۔ اس کا شکریہ۔ سرکاؤس جی نے بھی مجھے ان ترمیموں کی اطلاع دی تھی جو آپ نے تجویز کی ہیں میرے ساتھیوں نے اور میں نے اس ترمیم کئے ہوئے مسودہ پر غور کر لیا ہے اور مندرجہ ذیل ملاحظات کے ساتھ ہم اسے قبول کرنے کو تیار ہیں۔

پیراگراف ۱۱ میں میرے لئے ممکن نہیں کہ میں کانگریس کی طرف سے اس بات کو قبول کرلوں جو حکومت نے پیش کی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ہمارے خیال میں اگر سمجھوتہ پر کاربند ہونے کے سلسلہ میں کانگریس کی رائے میں کوئی شکایت پیدا ہو تو اس کی تحقیقات تو لازم ہی ہے، اس لئے کہ جب تک دہلی کا سمجھوتہ نافذ ہے سول نافرمانی بند رہے گی لیکن اگر حکومت ہند یا صوبجاتی کومتیں تحقیقات کو منظور نہ کریں تو میرے ساتھی اور میں اس دفعہ کے رکھنے پر اعتراض نہ کریں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کانگریس ان دوسرے معاملات کے متعلق جو اس کی طرف سے اب تک اٹھائے جا چکے ہیں تحقیقات پر تو اصرار نہ کرے گی لیکن اگر

سمجھوتہ جو عام اور سول نافرمانی سے متعلق ہے ہمیں اس سے نہیں روک سکتا۔
میں اس بات کا ذکر اس لیے کرتا ہوں کہ صوبہ متحدہ کی کانگریس کمیٹی اور اس
کے رہنماؤں کے برابر یہ الزام لگایا گیا ہے کہ ٹیکس روکنے کی مہم شروع کرکے انھوں
نے دہلی کے سمجھوتہ کو توڑ دیا۔ الزام لگانے والوں کو الزام لگانے میں یہ

بدقسمتی سے کوئی شکایت اس قدر شدت سے پیدا ہوئی کہ تحقیقات نہ ہونے کی صورت میں
کانگریس نے اپنا فرض جانا کہ تلافی کی کوئی فوری تدبیر براہ راست مدافعانہ عمل کی قسم سے تلاش کرے تو اس
وقت کانگریس اس تدبیر کے اختیار کرنے کے لئے آزاد سمجھی جائے گی، ہرچند سول نافرمانی بند کی جا چکی ہے
میں حکومت کو اس بات کا یقین دلانے کی چنداں ضرورت نہیں سمجھتا کہ کانگریس برابر یہ کوشش
کرے گی کہ براہ راست کارروائی سے بچے اور باہمی بحث و گفتگو ترغیب وغیرہ سے کام نکالے یہاں
جو کانگریس کے نقطۂ نظر کا اظہار کر دیا گیا وہ اس لیے کہ آئندہ غلط فہمی نہ ہو اور کانگریس پر عہد
شکنی کا الزام نہ لگایا جائے۔ اگر اس وقت کی گفت گو ئیں کامیابی کے ساتھ ختم ہوں تو میں سمجھتا
ہوں کہ سرکاری بیان، یہ خط اور آپ کا جواب سب ایک ساتھ شائع کر دیئے جائیں گے۔ آپ کا مخلص
م۔ک۔ گاندھی

مسٹر ایمرسن بنام مسٹر گاندھی!

شملہ

۲۷ر اگست سنہ ۱۹۳۱ء

ڈیر مسٹر گاندھی! آپ کے آج والے خط کا شکریہ جس میں آپ نے
سرکاری بیان کے مسودوں کو قبول فرما لیا ہے۔ ان ملاحظات کے ساتھ جو آپ کے خط میں
درج ہیں، گورنر جنرل بہادر اجلاس کونسل نے نوٹ فرما لیا ہے کہ کانگریس کا ارادہ ان
معاملات کی تحقیقات پر اصرار کرنے کا نہیں ہے جو اب تک (بقیہ صفحہ دیگر پر ملاحظہ ہو)

سہولت تھی کہ جن کے خلاف الزام تھا اور جو اس کا جواب دے سکتے تھے وہ سب قید خانوں میں بند پڑے تھے اور ہر اخبار اور ہر مطبع پر سخت سرکاری نگرانی تھی۔ اس واقعہ سے بالکل قطع نظر کر کے ۱۹۳۱ء میں صوبہ متحدہ کی کانگریس نے ٹیکس نہ دینے کی کوئی مہم سرے سے شروع ہی نہیں کی۔ میں جس بات کو صاف کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ معاشی غرض کے لئے سول نافرمانی سے الگ ایسی کوئی تحریک شروع بھی کی جاتی تو اس سے دہلی کے سمجھوتہ کی خلاف ورزی نہ ہوتی۔ خود حالات کی بنا پر ایسا کرنا حق بجانب ہوتا یا نہ ہوتا یہ دوسری بات ہے مگر کسانوں کو اس تحریک کے شروع کرنے کا ایسا ہی حق ہے جیسا اپنی معاشی شکایت رفع کرنے کے لئے کسی کارخانے کے مزدوروں کو ہڑتال کرنے کا ہوتا ہے۔ وہی سے کر

(بقیہ نوٹ صفحہ ۳۲) اس کی طرف سے اٹھائے گئے ہیں۔ جہاں آپ یہ یقین دلاتے ہیں کہ کانگریس برابر اس بات کی کوشش کرے گی کہ براہ راست کارروائی سے احتراز کرے اور باہمی بحث و مباحثہ ترغیب اور اسی قسم کی تدابیر سے مداوا چاہے اسی کے ساتھ آپ ان آیندہ کارروائیوں کے متعلق کانگریس کی حیثیت کو واضح کر دینا چاہتے ہیں جن کے اختیار کرنے کی کبھی آگے جا کر ضرورت ہو سکتی ہے۔ مجھے عرض کرنا ہے کہ گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل اس امید میں آپ کے ہم نوا ہیں کہ کوئی براہ راست کارروائی نہ کی جائے گی حکومت کے تمام رویہ سے متعلق ہیں۔ حضور وائسرائے بہادر کے اس خط کا حوالہ دینا چاہتا ہوں جو ۱۹ اگست کو آپ کے نام ارقام فرمایا تھا۔ مجھے یہ بھی کہنا ہے کہ سرکاری بیان، آپ کا آج والا خط اور اس کا یہ جواب حکومت کی طرف سے سب ساتھ ساتھ شائع کر دئے جائیں گے۔

آپ کا مخلص

ہ۔ و۔ ایمرسن

شلہ تک ہمارا کہنا بھی نہ تھا اور حکومت سمجھتی ہی نہ تھی ٹھیک بھی مانتی تھی ۔

۱۹۲۹ء میں اور اس کے بعد زرعی قیمتوں میں جو سخت اتار ہوا وہ دراصل بگڑتے ہوئے حالات کی آخری منزل تھی۔ پہلے کئی سال تک تو زرعی پیداوار کی قیمت بڑھتی اور ہندوستانی زراعت چونکہ دنیا کی منڈی سے وابستہ ہے اس لئے اس چڑھاؤ میں شریک رہی۔ ساری دنیا میں صنعت اور زراعت کے درمیان نشو ونما کا جو تفاوت تھا اس نے ہر جگہ زرعی پیداوار کی قیمتوں کو چڑھا دیا تھا۔ ہندوستان میں بھی جب قیمتیں چڑھیں، تو سرکاری مال گذاری اور زمینداری لگان بھی بڑھا اور بونے اور جوتنے والوں کو قیمتوں کے اس بڑھنے سے بمشکل کوئی فائدہ پہنچا بلکہ بعض خوش قسمت علاقوں کو چھوڑ کر عام طور سے تو کسانوں کی حالت کچھ ابتر ہوئی۔ صوبجات متحدہ میں لگان مالگذاری سے کہیں زیادہ تیزی سے بڑھا۔ ان دونوں میں اضافہ کی امتیاز کی نسبت اس صدی کے پہلے ۳۰ برس (میں حافظہ سے لکھتا ہوں) پانچ اور ایک کی نسبت ہے۔ یوں اگر زمین سے حکومت کی آمدنی میں معقول اضافہ ہوا تو زمیندار کی آمدنی میں اس سے بہت زیادہ ہوا اور بے چارہ کسان ہمیشہ کی طرح اسی مر بھکوں والی سطح پر رہا۔ کہیں قیمتیں کم بھی ہوئیں یا مقامی قدرتی مصیبت کا سامنا رہا جیسے خشک سالی، طغیانی، ٹیڑھی اولے وغیرہ تو بھی لگان اور مالگذاری وہی رہی۔ کہیں کچھ چھوٹ دی بھی گئی تو بہت رک رک کر اسی ایک فصل کے لئے یوں تو اچھے سے اچھے زمانے میں بھی لگان ضرورت سے زیادہ تھا۔ پھر وقت جو ذرا بگڑا تو مہاجن کی مدد کے بغیر یہ مطالبہ ناقابل برداشت ہوگیا اور دیہاتی قرض خوب بڑھا۔

سارے زرعی طبقے زمیندار، مالک آراضی کسان اور آسامی سب کے سب مہاجن کا شکار رہے۔ اس لئے کہ مہاجن ان حالات میں گاؤں کی ابتدائی حیثیت

میں ایک لازمی فرض انجام دے رہا تھا۔ چنانچہ اس فرض کی انجام دہی میں اس نے خوب خوب بے جا فائدے اٹھائے اور زمین سے تعلق رکھنے والوں پر اس کی گرفت اور بھی مضبوط ہو گئی۔ روک ٹوک اس پر کچھ تھی نہیں۔ قانون تھا سو اس کا مددگار۔ وہ بس اپنے معاہدے کے لفظوں پر اڑتا (اور شاہلاک یہودی کی طرح) بس اپنے پونڈ بھر گوشت کا مطالبہ کرتا اور پاتا تھا۔ رفتہ رفتہ زمین بھی اس کے ہاتھ میں پہنچ گئی۔ چھوٹے چھوٹے زمینداروں اور کسان مالکان آراضی کی زمین اور یہ مہاجن صاحب خود ایک بڑے مالک آراضی، زمیندار اور طبقہ اشراف کے رکن کی حیثیت سے نمودار ہوئے۔ کسان مالک آراضی جو اب تک خود اپنی زمین جوتتا بوتا تھا اب اس بنئے زمیندار یا ساہوکار کا غلام بن گیا۔ اسامیوں کا حال کچھ اس سے بھی برا تھا۔ یہ بھی یا تو ساہوکار کے غلام تھے یا بے زمین مزدوروں تاریات کی بڑھتی ہوئی فوج میں شامل تھے۔ اس مہاجن یا ساہوکار کو جو اب زمیندار بن بیٹھا تھا زمین سے یا اسامیوں سے کوئی زندہ تعلق نہ تھا۔ یہ عموماً شہر کا رہنے والا ہوتا تھا وہیں اپنا لین دین کا کاروبار کرتا۔ لگان جمع کرنے کا کام اپنے کارندوں پر چھوڑ دیتا اور یہ اس کام کو مشینوں کی سی بے دردی اور بے رحمی سے انجام دیتے۔

دیہی قرضہ کا اس طرح بڑھنا خود اپنی جگہ پر نظام زرعی کے غلط اور ناپائدار ہونے کا ثبوت ہے۔ آبادی کی بڑی اکثریت کے پاس کسی قسم کا پس انداز نہیں نہ جسمانی نہ مادی۔ نہ اس میں گھاٹے کی طاقت۔ بس فاقہ اور بھوک کے کٹے ہوئے زندگی ۱ ہے۔ ناموافق قسم کا کوئی غیر معمولی واقعہ ہوا تو یہ اس کی تاب کیسے لائیں۔ کوئی وبا آ جائے تو لاکھوں کو ختم کر جائے۔ ۱۹۲۹ء اور ۱۹۳۰ء میں خود سرکار کی مقرر کی ہوئی سموبجاتی "ساہوکارہ کی تحقیقاتی کمیٹی" نے تخمینہ کیا تھا کہ ہندوستان بھر کا جس میں برما بھی شامل ہے، دیہی قرضہ ۹۰۰ کروڑ روپیہ ہے۔ اس میں زمیندار

کسان، مالکان آراضی اور آسامیوں سب کے قرضے شامل ہیں۔ مگر زیادہ تر قرض انہی پر ہے جو جوتنے والے ہوتے ہیں۔ زر رائج سے متعلق حکومت کی جو سیاست ہے وہ تمام تر قرض خواہوں کے موافق ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ قرض کا بوجھ اور بڑھ گیا ہے۔ مثلاً سخت ہندوستانی مخالفت کے باوجود روپیہ کی قیمت ۱۶ پنس کی جگہ ۱۸ پنس مقرر کرنے کے معنی کیا تھے؟ یہی نا کہ ایک اشارے میں دیہی قرض ۱۲½ فیصدی یا تقریباً ۱۱۰ کروڑ کا اضافہ ہو گیا[1]۔

جنگ کے بعد پہلے تو قیمتیں بڑھی تھیں مگر پھر رفتہ رفتہ برابر گرتی گئیں اور دیہات کا حال بگڑتا گیا۔ مصیبت پر مصیبت سنہ ۱۹۲۹ء اور اس کے بعد کے حالات سے آئی۔

سنہ ۱۹۳۱ء میں صوبجات متحدہ کی بابت ہمارا کہنا یہ تھا کہ لگان قیمتوں کے مطابق ہونا چاہئے یعنی لگان کو گھٹا کر اتنا کر دینا چاہئے جتنا اس زمانے میں تھا جب قیمتیں سنہ ۱۹۳۱ء کی سی تھیں۔ اور یہ صورت کوئی ۳۰ سال پہلے سنہ ۱۹۰۱ء میں تھی۔

---

[1] سارے ہندوستان کے دیہی قرض کے لئے ۸۶۰ کروڑ کا تخمینہ غالباً بہت کم ہے اور بہر حال پچھلے ۴، ۵ سال میں اس میں بہت کچھ اضافہ ہوا۔ اس قرض میں پنجاب کے حصہ کا تخمینہ پنجاب کی ساہوکارہ کمیٹی نے سنہ ۱۹۲۹ء میں ۱۳۰ کروڑ کیا تھا۔ پھر قرض کا بار ہلکا کرنے کے لئے پنجاب میں قانون کا جو مسودہ اکتوبر سنہ ۱۹۳۴ء میں پیش ہوا تھا اس پر مجلس قانون ساز کی منتخبہ کمیٹی نے جو رپورٹ دی ہے اس میں لکھا ہے کہ اہل زراعت پر قرض کا بوجھ اتنا ہے کہ آدمی دنگ رہ جاتا ہے۔ کم کم تخمینہ سے بھی کوئی "۲۰۰ کروڑ" یہ نیا عدد ساہوکارہ کمیٹی کے تخمینہ سے کوئی ۵۰ فیصدی زیادہ ہے۔ اگر قرض میں اضافہ کی رفتار دوسرے صوبوں میں بھی یہی ہے تو اس وقت (سنہ ۱۹۳۴ء) سارے ہندوستان کے دیہی قرض کا تخمینہ کوئی ۱۲۰۰ کروڑ روپیہ سے اوپر ہوگا۔

یہ ایک موٹا سا معیار تھا اور اس سے جانچنا اس لئے بھی مشکل تھا کہ آسامیوں کا بہت سی قسمیں تھیں۔ موروثی، غیر موروثی، شکمی وغیرہ اور سب سے زیادہ مصیبت میں وہ تھے جو سب سے نیچے درجے میں تھے۔ اس کے علاوہ بس ایک معیار اور تھا اور بلاشبہ وہی سب سے زیادہ منصفانہ معیار یعنی یہ کہ کسان کے مصارف پیدائش اور اس کی اجرت کو منہا کر دینے کے بعد اس کی لگان ادا کرنے کی صلاحیت کو دیکھا جائے۔ لیکن اس دوسرے معیار سے تو ہندوستان کا بہت کچھ زرعی کاروبار بالکل غیر منفعتی ہو جاتا ہے۔ چاہے آپ کسان کی زندگی گذارنے کے مصارف کو کتنا ہی کم کیوں نہ لگائیے۔ اور جیسا کہ ہم نے ۱۹۳۲ء میں صوبجات متحدہ کی چند مثالوں سے ظاہر کیا تھا۔ بہت سے کسان لگان ادا کر ہی نہیں سکتے جب تک کہ اپنی املاک نہ بیچیں (اگر کچھ بیچنے کو ہو) یا بہت زیادہ شرح سود پر روپیہ ادھار نہ لیں۔

ہمارے صوبہ متحدہ کی کانگریس کمیٹی نے پہلی اور گویا آزمائشی تجویز جو کی وہ یہ کہ موروثی آسامیوں کو عام طور پر ۱۵ فی صدی کی چھوٹ ملے اور دوسرے آسامیوں کے لئے جن کا حال ان سے بھی گیا گزرا تھا۔ اس سے بھی زیادہ جب گاندھی جی مئی ۱۹۳۱ء میں صوبجات متحدہ میں آئے اور گورنر سر میلکم ہیلی سے ملے تو اس وقت ان میں کچھ اختلاف رائے تھا اور وہ دونوں کسی ایک بات پر متفق نہ ہو پائے تھے۔ اس کے جلد ہی بعد گاندھی جی نے صوبہ کے زمینداروں اور اسامیوں کے نام اپیلیں شائع کیں۔ آسامیوں والی اپیل میں انھوں نے کہا تھا کہ جس قدر ادا کر سکتے ہو ادا کر دو۔ اور کچھ حساب بھی بنایا تھا جو اس عدد سے جو ہم پہلے پیش کر چکے تھے کچھ زیادہ ہوتا تھا۔ ہمارے صوبے کی کمیٹی نے گاندھی جی والے حساب کو منظور کر لیا۔ مگر اس سے بھی کچھ زیادہ کام نہ چلا۔ اس لئے کہ حکومت نے تو

اسے بھی نہ مانا۔

اس میں شک نہیں کہ صوبہ کی حکومت بڑی مشکل میں تھی۔ مالگذاری اس کی آمدنی کا خاص جزو تھا۔ اسے غائب ہو جانے دے یا بہت گھٹا دے تو دیوالے کا سامنا۔ دوسری طرف اسے یہی بے چینی کا ڈر بھی تھا۔ اور جہاں تک ہو سکتا تھا لگان میں چھوٹ دے کر یہ کسانوں کو مطمئن بھی کرنا چاہتی تھی۔ دونوں باتوں کا ایک ساتھ کرنا سہل نہ تھا۔ حکومت اور کسان کے بیچ میں تھا زمیندار معاشی لحاظ سے بالکل بے سود اور غیر ضروری اضافہ۔ یہ ہو سکتا تھا کہ اس سے چھٹکارا کر حکومت اور کسان دونوں کا کام چل جائے لیکن برطانوی حکومت جیسی کچھ کہ ہے اس کے ساتھ میں ہی کتنے طبقے، وہ اپنے سیاسی مفاد کی خاطر، ان کو کہ ابھی اس سے لپٹے ہوئے ہیں کس طرح دھتکار سکتی تھی۔

آخر کار صوبہ کی حکومت نے زمینداروں اور آسامیوں دونوں کے لئے چھوٹ کا اعلان کیا۔ اس چھوٹ کا حساب ایک پیچیدہ سے قاعدہ پر مبنی تھا۔ اور پہلے پہل تو یہ سمجھنا بھی دشوار تھا کہ کتنی چھوٹ ملی۔ یہ بات البتہ صاف تھی کہ جتنی چھوٹ ملنی چاہیئے تھی اس سے بہت کم تھی۔ اس کے علاوہ اس چھوٹ کا تعلق بس اس وقت کے مطالبہ سے تھا اور کسان پر جو بقایا تھا یا جو قرض تھا اس کا ذکر ہی نہ تھا۔ بات بالکل صاف تھی کہ اگر آسامی اس ایک ششماہی کا لگان ادا نہیں کر سکتا تو پچھلے برسوں کا بقایا اور قرضہ تو اور بھی نہ دے پائے گا اور زمینداروں کا طریقہ معمولاً یہی تھا کہ جو کچھ وصول ہوتا ہے اسے پچھلے بقایا کی وصولی میں ڈال دیتے تھے۔ آسامی کے نقطۂ نظر سے اس میں بڑا خطرہ تھا۔ اس لئے کہ اس غریب پر ہر وقت مقدمہ چل سکتا تھا اور واجب الادا رقم کا کوئی حصہ بھی اگر ادا ہونے سے رہ گیا تو اسے بے دخل کرایا جا سکتا تھا

صوبۂ کانگریس مجلس انتظامیہ سخت مشکل میں پڑ گئی تھی۔ ہمیں یقین تھا کہ اسامیوں سے جو سلوک ہو رہا ہے ناروا ہے۔ لیکن ہم بے بس تھے اور اپنے اوپر یہ ذمہ داری نہ لینا چاہتے تھے کہ کسانوں سے کہہ دیں کہ جاؤ کچھ ادا نہ کرو۔ ہم تو بس یہ کہتے رہے کہ جس قدر بھی ادا کر سکتے ہو کر دو۔ ہاں ان کی مصیبت میں عام طور سے ہمدردی کرتے اور ان کی ڈھارس ضرور بندھاتے رہے۔ ہم ان کے اس خیال سے بالکل متفق تھے کہ چھوٹ کے بعد بھی مطالبہ بہت زیادہ ہے۔

اب وہ وقت آیا کہ جبر کی مشین نے قانونی اور غیر قانونی شکل میں اپنا کام شروع کیا۔ ہزاروں کے خلاف بے دخلی کے مقدمات دائر ہوئے۔ گائے، بیل، شخصی جائداد سب کی قرقی ہونے لگی۔ زمینداروں کے آدمیوں نے ٹھکائی شروع کی۔ بہتیرے اسامیوں نے مطالبہ کا ایک حصہ بھی ادا کر دیا اور ان کا کہنا یہ تھا کہ جتنا دے سکتے تھے سب دے دیا۔ بہت ممکن ہے کہ بعض لوگ اس سے زیادہ بھی ادا کر سکتے ہوں۔ مگر یہ بات بالکل صاف تھی کہ بڑی اکثریت کے لئے یہ مطالبہ بہت زیادہ تھا۔ اور یوں تھوڑا تھوڑا لگان ادا کر کے بھی انھیں بچنا نہ تھا۔ قانون کا بھاری بھرکم رولر تھا کہ بڑھا چلا جاتا تھا اور جو راہ میں آتا اسے بے رحمی سے کچلتا جاتا تھا۔ بے دخلی کے مقدمے ڈگری ہو رہے تھے چاہے لگان کا ایک حصہ دیا بھی جا چکا ہو۔ شخصی املاک اور مویشی کی قرقیاں اور نیلام جاری تھے۔ آسامی اگر کچھ ادا نہ کرتے تو بھی اس سے برے حال میں تو نہ ہوتے کچھ ایسے ہی رہتے۔ اس لئے کہ کم سے کم دو روپیہ تو بچ رہتا جو لگان میں ادا کر دیا۔

ہمارے پاس کسان جوق جوق آتے تھے۔ شکایت کی کہ آپ کا کہنا مانا جو دے سکتے تھے دے دیا اور نتیجہ یہ ہوا۔ اکیلے الہ آباد کے ضلع میں

ہزاروں کسان بے دخل کئے گئے تھے اور ان کے علاوہ اور ہزاروں پر کسی نہ کسی قسم کی قانونی کارروائی کی گئی تھی۔ ضلع کی کانگریس کمیٹی کا دفتر دن بھر ایک پریشان حال انبوہ سے گھرا رہتا تھا خود میرا گھر بھی گھرا رہتا۔ اور اکثر یہ جی چاہتا تھا کہ بھاگ جاؤں اور جہاں بن پڑے اپنے کو چھپا لوں اور اس دردانگیز صورت حال سے بچ نکلوں۔ جو کسان ہمارے پاس آتے ان میں سے بہتوں کے جسم پر چوٹوں کے نشان ہوتے تھے وہ ہمیں بتاتے تھے کہ زمیندار کے آدمیوں نے مارا ہے۔ ہم ہسپتال میں ان کا علاج کراتے تھے۔ یہ غریب کیا کر سکتے تھے۔ ہماری کمیٹی نے گووند بلبھ پنتھ کو نینی تال اور لکھنؤ میں صوبہ کی حکومت سے تعلق قائم رکھنے کے لئے درمیانی افسر مقرر کر رکھا تھا۔ یہ بھی برابر حکومت کو لکھتے رہتے تھے۔ ہمارے صوبہ کے ممبر تصدق احمد خاں شیروانی بھی وقتاً فوقتاً لکھتے تھے اور میں بھی۔

جون جولائی میں بارش شروع ہوئی تو ایک اور دشواری پیدا ہوئی۔ یہ جوتنے بونے کا زمانہ ہوتا ہے۔ جو کسان بے دخل کر دئے گئے تھے۔ وہ کیا کرتے؟ کیا بیٹھے منہ تکا کرتے اور اپنے کھیتوں کو بنجر پڑا رہنے دیتے؟ کسان کے لئے تو یہ بڑی مشکل بات تھی اسے الٹی چھری سے کاٹنا تھا۔ اکثر صورتوں میں بے دخلی بس قانون اور ضابطہ کی بات تھی۔ یہ کچھ زمین سے واقعی طور پر تو ہٹے نہیں گئے تھے۔ بس عدالت کی ڈگری ہو گئی تھی۔ اس کے بعد اور کچھ نہ ہوا تھا۔ کیا یہ لوگ اپنی زمین جوت لیتے؟ اس میں مداخلت بیجا کا جرم سرزد ہو جاتا اور چھوٹے موٹے بلوے کا ڈر تھا۔ مگر بیٹھے بیٹھے یہ دیکھنا بھی تو دشوار تھا کہ دوسرے اس کی پرانی زمین کو جوتیں۔ کسان بھلا اسے کیسے برداشت

کرے؛ جب بچارے ہمارے پاس مشورے کو دوڑے آتے تھے۔ ہم کیا مشورہ دیتے!

گرمیوں میں جب گاندھی جی کے ساتھ شملہ گیا تو حکومتِ ہند کے ایک اعلیٰ عہدہ دار سے میں نے یہ دشواری بیان کی اور ان سے پوچھا کہ آپ ہماری جگہ ہوتے تو ان کسانوں کو کیا مشورہ دیتے؟ ان کے جواب سے معاملہ پر خوب روشنی پڑتی ہے۔ فرمایا کہ اگر کوئی کسان جسے بے دخل کر دیا گیا ہے مجھ سے یہ سوال کرے تو میں جواب دینے سے احتراز کروں گا یعنی یہ اعلیٰ عہدہ دار صاحب تک اس کے لئے تیار نہ تھے کہ کسان سے بس یہ کہہ دیں کہ کھیت نہ جوتو۔ ہر چند کہ قانوناً کسان کھیت سے بے دخل کیا جاچکا ہو وہ شملہ کی بلندیوں پر تھے۔ ان کے لئے آسان تھا کہ مسلوں پر اس طرح احکام جاری کیا کریں گویا ریاضی کے کسی مجرد مسئلہ کے متعلق کچھ تحریر فرمارہے ہیں۔ مسئلہ کے انسانی پہلو سے نہ انہیں واسطہ تھا نہ نینی تال کے اعلیٰ حکام کو نہ ان کی آنکھوں کے سامنے انسانی تکلیف و فلاکت کی وہ تصویر آتی تھی جو معاملہ کے ساتھ وابستہ تھی۔

شملہ میں ہم سے یہ بھی کہا گیا تھا کہ تم کسانوں کو بس ایک مشورہ دو یعنی یہ کہ کل مطالبہ ادا کردو یا جتنا بھی ادا کرنا ممکن ہو۔ گویا ہمیں زمینداروں کے کارندوں کا کام کرنا تھا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ ہم نے جب ان سے کہا تھا کہ جتنا دے سکتے ہو دے دو تو ہم اس فرمایش کی تعمیل پہلے ہی کر چکے تھے۔ ہاں، ہم نے ساتھ ہی اتنا اور ضرور کہا تھا کہ اپنے مویشی نہ بیچنا اور قرض نہ لینا اس کا نتیجہ جو ہوا تھا وہ ہم دیکھ چکے تھے۔

ہم سب کے لئے یہ گرمی کا موسم بڑا ہی سخت تھا اور سر پر وہ بوجھ

تھا کہ الاماں

ہندوستانی کسان میں مصیبت جھیلنے کی حیرت انگیز صلاحیت ہے۔ اور اس کے حصہ میں مصیبت آتی بھی بہت رہتی ہے۔ قحط، طغیانی، بیماری اور مسلسل افلاس اور فلاکت۔ اور جب یہ انھیں نہیں جھیل پاتا تو ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں چپ چپاتے حرف شکایت زبان پر لائے بغیر پڑا رہتا ہے اور مرجاتا ہے اس کا مصیبت سے بچنے کا طریقہ بس یہ ہے۔ ان وقتی مصیبتوں کے مقابلہ میں تو ۱۹۳۱ء میں گویا کچھ بات ہی نہ ہوئی تھی۔ لیکن پھر بھی اسے ۱۹۳۱ء کے یہ واقعات قدرت کے بن بوجھے ارادوں کا نتیجہ نہیں معلوم ہوتے تھے کہ اس وجہ سے انھیں صبر کے ساتھ جھیل لیتا۔ وہ سوچتا تھا کہ یہ تو سب آدمیوں کی کارستانی ہے اور اس وجہ سے ان پر بگڑتا تھا۔ اس کی نئی سیاسی تعلیم کا پودا پھل لا رہا تھا۔ ۱۹۳۱ء کے یہ واقعات ہمارے لیے بھی خاص طور سے تکلیف دہ ہوں تھے کہ ہم اپنے کو کچھ نہ کچھ ان کا ذمہ دار جانتے تھے۔ کیا یہ بات نہ تھی کہ کسانوں نے ہماری نصیحت مانی تھی؟ لیکن پھر بھی مجھے پورا یقین ہے کہ اگر ہم برابر ان کی مدد نہ کرتے تو کسانوں کی حالت اور بھی ابتر ہوتی۔ ہم ان کا جتھا بنائے رہے اور اس لیے وہ ایک قوت بنے رہے جس کا نظر انداز کرنا ممکن نہ تھا۔ اور اس وجہ سے انھیں اس سے زیادہ چھوٹ مل گئی جتنی کہ دوسرے حالات میں ملتی۔ وہ جبر اور بدسلوکی جو ان غریبوں کے حصہ میں آئی ہر چند کہ بہت بری تھی۔ پر ان ناشاد لوگوں کے لئے کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ فرق تھا تو کچھ تو درجہ کا کہ اس زمانے میں بہت کچھ سختی ہوئی اور کچھ اس بدسلوکی کی تشہیر کا۔ معمول تو یہ ہے کہ اگر زمیندار کے آدمی سلے کسان سے بدسلوکی کی یا اسے ایذا بھی پہنچائی تو لوگ سمجھتے ہیں کہ ایسا تو ہونا ہی ہے اور

اگر اس مار توڑ میں وہ بے چارہ مر ہی نہ جائے تو اس علاقہ کے باہر کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہو۔ لیکن اب ہمارے نظام کی وجہ سے معاملہ اور ہو گیا تھا۔ کسانوں میں ایک نیا احساس تھا۔ جس کی وجہ سے یہ متحد بھی تھے اور ہر واردات کی خبر کانگریس کے دفتر کو دیتے رہتے تھے۔

گرمیوں کا موسم ذرا اور گذرا تو جبریہ تحصیل وصول میں کمی ہوئی اور ظالمانہ کارروائیاں بھی کچھ گھٹیں۔ اب جو سوال ہمیں پریشان کر رہا تھا وہ یہ کہ جو کسان بے دخل ہوئے ہیں ان کا کیا ہو؟ ان کے لئے کیا کیا جائے؟ ہم حکومت پر زور ڈال رہے تھے کہ ان کے کھیت انھیں واپس مل جائیں کہ یہ کھیت اکثر یوں ہی خالی پڑے تھے۔ اس سے زیادہ اہم سوال مستقبل کا تھا۔ اب تک جو چھوٹ ملی تھی وہ بس پچھلی فصل کے لئے تھی آیندہ کا کوئی فیصلہ نہ ہوا تھا۔ اکتوبر سے اگلی تحصیل وصول کا زمانہ شروع ہونے کو تھا اس وقت کیا ہوگا؟ اس پر غور کرنے کے لئے صوبے کی حکومت نے ایک چھوٹی سی کمیٹی مقرر کی جس میں کچھ تو خود اس کے عہدے دار تھے اور کچھ سرکاری کونسل کے زمیندار ممبر۔ اس کمیٹی میں کسانوں کا کوئی نمایندہ نہ تھا۔ بالکل آخر وقت میں جب کہ کمیٹی اپنا کام شروع کر چکی تھی حکومت نے گووند بلبھ پنتھ سے کہا کہ ہماری طرف سے کمیٹی میں شریک ہو جائیں۔ اتنی دیر کے بعد جب کہ اہم معاملات پر فیصلے ہو چکے تھے۔ انھوں نے شرکت کو بے سود سمجھا۔

صوبجات متحدہ کی کانگریس کمیٹی نے ایک چھوٹی سی کمیٹی اس غرض سے مقرر کی تھی کہ اس وقت کے اور پچھلے زمانے کے دیہاتی امور پر معلومات جمع کرے اور موجودہ صورت حال پر رپورٹ دے۔ اس کمیٹی نے ایک لمبی رپورٹ پیش کی جس میں صوبے کی زرعی حالت پر نہایت اچھا تبصرہ ہے اور

قیمتوں کے گرنے سے جو مصیبت نازل ہوئی تھی اسے نہایت خوبی سے کھول کر بتایا ہے۔ ان کی سفارشیں بھی بڑی دور رس تھیں۔ اس رپورٹ پر جو کتابی شکل میں شائع ہو چکی ہے گووند بلبھ پنتھ۔ رفیع احمد قدوائی اور وینکٹیش نرائن تواری کے دستخط ہیں۔

اس رپورٹ کے نکلنے سے بہت پہلے گاندھی جی گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیئے لندن جا چکے تھے۔ وہ بہت ہی پس و پیش کے بعد گئے تھے۔ اور اس پس و پیش کی ایک وجہ صوبجات متحدہ کے دیہاتی حالات بھی تھے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اگر گول میز کانفرنس کے لیئے ولایت جانا نہ ہوتا تو وہ فیصلہ کر چکے تھے کہ صوبجات متحدہ میں جاؤں گا اور پیچیدہ مسئلہ کو سلجھانے میں لگ جاؤں گا۔ شملہ میں حکومت سے جو آخری گفتگو ہوئی ان میں منجملہ اور امور کے صوبجات متحدہ کا معاملہ بھی بحث میں آیا تھا۔ ان کے تشریف لے جانے کے بعد ہم لوگ انھیں سب باتوں سے برابر مطلع کرتے رہے۔ پہلے مہینے دو مہینے تک تو میں انھیں ہر ہفتہ خط لکھتا تھا۔ ہوائی ڈاک سے بھی اور معمولی ڈاک سے بھی۔ ان کے قیام لندن کے آخری زمانے میں میں اتنا پابند نہ رہا تھا۔ اس لئے کہ ان کے جلد لوٹنے کی امید تھی۔ انھوں نے ہمیں توقع دلائی تھی کہ اگر بہت دیر بھی ہوئی تو بھی وہ دو تین مہینے کے اندر اندر لوٹ آئیں گے یعنی نومبر کی کسی تاریخ کو اور ہمیں امید تھی کہ اس وقت تک ہندوستان میں کوئی غیر معمولی صورت حال پیدا نہ ہو گی۔ ان کی غیر موجودگی میں ہم حکومت سے خاص طور پر کوئی لڑائی مول لینا نہیں چاہتے تھے لیکن جب ان کی واپسی میں دیر ہوئی اور دیہات کے معاملات نے تیزی سے بڑھنا شروع کیا تو ہم نے انھیں ایک لمبا تار بھیجا جس میں سب باتوں سے انھیں باخبر کر دیا اور یہ بتا دیا کہ ہمیں کس کس طرح

مجبور کیا جا رہا ہے۔ انھوں نے تار ہی سے جواب دیا کہ میں اس معاملہ میں بے بس ہوں اور یہاں سے تمھارے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔ تم اپنی سمجھ سے کام لے کر آگے بڑھو۔

صوبہ کی مجلس انتظامیہ بڑی مجلس عاملہ کو بھی برابر اطلاع دیتی رہی میں خود اس مجلس میں سب باتیں بتانے کے لیے موجود تھا۔ لیکن معاملہ چونکہ ذرا بڑھتا جاتا تھا اس لیے مجلس عاملہ نے ہمارے صوبہ کے ممبر تصدق احمد خاں شیروانی اور الہ آباد ضلع کے صدر پرشوتم داس ٹنڈن سے بھی مشورہ کیا۔

اسی اثنا میں حکومت کی دیہاتی کمیٹی نے اپنی رپورٹ شائع کی۔ اس میں کمیٹی نے بہت سی سفارشیں کیں، جو پیچیدہ تھیں اور مبہم تھیں اور جن سے معاملہ بہت کچھ مقامی حکام ہی پر رہتا تھا۔ مجموعی طور پر جو چھوٹ تجویز کی گئی تھی وہ پچھلی فصل کے مقابلہ میں ضرور زیادہ تھی۔ مگر ہمارے خیال میں اب بھی کافی نہ تھی۔ ہمیں ان سفارشوں کے اصول پر بھی اعتراض تھا اور ان کے عمل پر بھی۔ ایک بات یہ بھی تھی کہ اس رپورٹ میں صرف مستقبل کا ذکر تھا پچھلے بقایا، قرض اور بے دخل کیے ہوئے کسانوں کا نام نہ تھا۔ سوال یہ تھا کہ ہم کیا کریں؟ بس یہی جیسے پچھلے موسم بہار اور گرمیوں میں کیا تھا کہ کسان کو مشورہ دیا جائے کہ جتنا ادا کر سکتے ہو کرو اور پھر انھیں نتائج سے دو چار ہونا جن سے پہلے ہوئے تھے؟ مگر ہم اب یہ سمجھ گئے تھے کہ یہ مشورہ تو صرف صرف ذلت کا مشورہ ہے اور اسے دہرانا کسی طرح ممکن نہیں۔ اب تو صورت بس یہ تھی کہ یا تو کسان اپنی کوشش کر کے اپنے مطالبے کو پورا پورا چکا دے یا یہ نہ ہو سکے تو فی الحال کچھ ادا نہ کرے اور دیکھے کہ کیا ہوتا ہے۔ مطالبہ میں سے کچھ تھوڑا سا ادا کر دینا تو کچھ بات نہ ہوئی، نہ ادھر نہ ادھر۔ کسان بے چارے کے ہاتھ سے جو کچھ رہ بچ رہا

وہ بھی نکل گیا اور پھر زمین بھی چھن گئی۔

صوبۂ کانگریس کی مجلس انتظامیہ نے خوب اچھی طرح اور توجہ سے اس معاملہ پر غور کیا اور اس فیصلہ پر پہنچے کہ اگرچہ حکومت کی نئی تجویز پہلی گرمی والی چھوٹ کے مقابلے میں بہتر ہیں۔ مگر پھر بھی ایسی نہیں کہ انھیں اسی صورت میں قبول کر لیا جائے۔ ان میں اب بھی ایسی تبدیلیوں کا امکان تھا جن سے کسانوں کو فائدہ ہوتا۔ چنانچہ ہم نے حکومت کے یہاں اسی پر زور دیا۔ لیکن وہاں محسوس ہوا کہ اب امید نہیں رکھنی چاہیئے اور ہم جس جھگڑے کو ٹالنے کی کوشش میں ہیں وہ تیزی سے سامنے بڑھا آرہا ہے۔ صوبہ کی حکومت اور حکومتِ ہند دونوں کا رویہ کانگریس کی طرف سے برابر بدلتا جارہا تھا اور روز بروز اس میں سرد مہری ظاہر ہورہی تھی۔ ہم لمبے لمبے خط لکھتے تھے وہاں سے نہایت مختصر جواب آتے تھے۔ جن میں مقامی عہدہ داروں سے رجوع کرنے کو کہہ دیا جاتا تھا۔ یہ بات صاف دکھائی دیتی تھی کہ حکومت کسی طرح ہماری ہمت بڑھانا نہیں چاہتی۔ حکومت کی ایک شکایت اور ایک مشکل یہ تھی کہ کسانوں کو چھوٹ ملنے سے کانگریس کا اقتدار بڑھ جائے گا۔ حکومت عادت سے مجبور، اقتدار اور اثر کے نقطۂ نظر ہی سے سوچ سکتی تھی اور اس خیال سے کہ عوام چھوٹ ملنے کی وجہ کانگریس کو قرار دیں گے اسے الجھن ہوتی تھی وہ چاہتی تھی کہ جہاں تک بن پڑے ایسا نہ ہو۔

اسی زمانے میں دہلی اور دوسرے مقامات سے ہمیں خبریں مل رہی تھیں کہ حکومتِ ہند کل کانگریس کی تحریک کے خلاف بڑے پیمانہ پر یلغار شروع کرنے والی ہے۔ خبریں گرم تھیں کہ بی چھنگلیا اب دراز ورد کھائیں گی اور بچھوؤں کے ڈنک ہمیں سزا دیں گے۔ نومبر کے مہینے میں ڈاکٹر انصاری

نے مجھے (اور علیحدہ ولبھ بھائی پٹیل صدر کانگریس کو بھی) ایک پیام بھیجا جس میں ان بہت سی خبروں کی تصدیق تھی جو ہمیں ملتی رہتی تھیں اور خاص کر کے اُن آرڈیننسوں کی تفصیل دی تھی جو صوبہ سرحدی اور صوبجات متحدہ میں نافذ ہونے والے تھے۔ میرا خیال ہے کہ بنگال کو تو اس وقت ایک نئے آرڈیننس کا تحفہ مل ہی چکا تھا۔ یا شاید عنقریب ملنے والا تھا۔ کئی ہفتے بعد جب اس شان سے کہ گویا کوئی نئی صورت حال پیدا ہو گئی ہے نئے آرڈیننس نکلے تو ڈاکٹر انصاری کے پیام کی پوری تصدیق تفصیلات تک میں ہو گئی۔ عام خیال یہ تھا کہ گول میز کانفرنس میں جو خلاف توقع طوالت ہوئی اس کی وجہ سے حکومت نے اپنی کارروائی شروع کرنے میں ذرا دیر کی۔ حکومت چاہتی تھی کہ جب تک گول میز کانفرنس کے لوگ میٹھی میٹھی مگر لایعنی کاناپھوسیوں میں مبتلا ہیں بس اس وقت تک ہندوستان میں کھلم کھلا تشدد کو ٹالے۔

چنانچہ کھینچ تان بڑھتی ۔ اور ہم سب کو یہ محسوس ہونے لگا کہ ہماری ننھی ننھی بے حقیقت ہستیوں کے باوجود واقعات اپنی راہ پر تیزی سے گامزن ہیں اور ان کی مقدار رفتار کو کوئی بھی روک نہیں سکتا۔ ہمارے بس میں بس یہ تھا کہ اس سے دوچار ہونے کے لئے اپنے کو تیار کریں اور زندگی کے اس ڈرامے میں غالباً المناک ڈرامے میں الگ الگ اور مل کر اپنا اپنا حصہ لیں۔ مگر ہمیں یہ امید ضرور تھی کہ قوتوں کے تصادم کے اس ڈرامے کا پردہ اٹھنے سے پہلے گاندھی جی لوٹ آئیں گے اور اپنے کندھوں پر ذمہ داری لے لیں گے۔ چاہے امن کی ذمہ داری ہو، چاہے جنگ کی ان کی غیر حاضری میں اس بوجھ کو اٹھانے کے لئے ہم میں سے کوئی تیار نہ تھا۔

صوبجات متحدہ میں حکومت نے ایک قدم اور اٹھایا جس سے سارے

دیہات میں ہل چل مچ گئی۔ کسانوں میں چھوٹ کے متعلق پرچیاں بانٹی گئیں جن میں لکھا تھا کہ کتنی چھوٹ دی گئی ہے اور ساتھ ہی یہ دھمکی بھی تھی کہ اس چھوٹ کے بعد جو رقم واجب الادا ہے وہ اگر مہینہ بھر کے اندر (اور بعض حالتوں میں یہ مدت اس سے بھی کم رکھی گئی تھی) ادا نہ ہو گئی تو چھوٹ منسوخ پھر پورا مطالبہ قانونی طور پر وصول کیا جائے گا یعنی وہی بے دخلی، قرقی وغیرہ معمول یہ تھا کہ آسامی دو یا تین مہینے میں تھوڑا تھوڑا کر کے لگان ادا کر دیتے تھے۔ اور اب تو اتنی مہلت بھی انھیں نہیں دی گئی۔ سارے دیہات میں ایک سخت مصیبت کا سامنا تھا اور غریب آسامی ہاتھ میں پرچی لئے ادھر سے اُدھر بھاگے بھاگے پھرتے تھے کہیں بگڑتے کہیں شکایت کرتے کہیں صلاح مشورہ کرتے۔ حکومت اور مقامی افسروں کی طرف سے یہ دھمکی بڑی حماقت کی بات تھی اور بعد میں تو ہمیں یہ بھی بتایا گیا کہ اس پر عمل کرنا مقصود نہ تھا بس یوں ہی دھمکی دی گئی تھی! لیکن اس نے پر امن تصفیہ کے امکانات کو بہت دور کر کے رفتہ رفتہ مقابلہ اور کشمکش کو ناگزیر بنا دیا۔

اب موقع وہ آ گیا تھا کہ کسانوں کو اور کانگریس کو فیصلہ کرنا تھا، یا ادھر یا اُدھر اور گاندھی جی کی واپسی تک معاملہ کو ٹالا نہ جا سکتا تھا۔ ہاں تو کرنا کیا چاہئے تھا؟ کیا مشورہ دینا چاہئے تھا؟ کیا ہم بجا طور پر کسانوں سے یہ کہہ سکتے تھے کہ جو تھوڑا سا وقت تمھیں دیا گیا ہے اس میں مطلوبہ رقم ادا کر دو اور یہ ایسی حالت میں کہ ہم خوب جانتے تھے کہ ان میں بہتیروں کے لئے ایسا کرنا ممکن ہی نہیں اور پھر جو بقایا ہے اس کا کیا کیا جاتا؟ کیا اس کا اندیشہ نہ تھا کہ اگر مطلوبہ رقم کا بڑا حصہ بھی ادا کر دیا۔ یا اس ایک قسط کا پورا مطالبہ بھی ادا کر دیا تب بھی اسے بقایا کے حساب میں ڈال کر بے دخل

نہ کرادیا جائے۔

الہ آباد ضلع کانگریس کمیٹی نے جس میں کسان بھی خاصی تعداد میں شریک تھے مقابلہ کی ٹھانی۔ اس نے طے کیا کہ وہ کسی حال میں کسانوں کو یہ مشورہ نہیں دے سکتی کہ مطالبہ ادا کردو۔ لیکن اسے بتایا گیا کہ صوبہ کی مجلس انتظامیہ اور کانگریس کی مجلس عاملہ کی باضابطہ اجازت کے بغیر اسے کوئی جارحانہ قدم اٹھانے کا حق نہیں ہے۔ چنانچہ معاملہ مجلس عاملہ کے سامنے گیا۔ تصدق شیروانی اور پرشوتم داس ٹنڈن دونوں صوبے اور ضلع کی طرف سے معاملہ سلجھانے کے لیے وہاں موجود تھے ہمارے سامنے سوال بس ایک الہ آباد ضلع کا تھا۔ اور معاملہ تھا خالص معاشی۔ لیکن ہم نے سوچا کہ اس وقت ملک میں جو عام سیاسی ہیجان ہے اس میں ہماری کارروائی کے نتائج بہت دور تک پہنچ سکتے ہیں۔ کیا ایسی حالت میں الہ آباد ضلع کی کمیٹی کو یہ اجازت دینے میں کچھ مضائقہ تھا کہ کسانوں کو مشورہ دے کہ فی الحال اس وقت تک لگان اور مال گزاری روک دیں جب تک کہ بات چیت ہو کر بہتر شرائط طے نہ ہو جائیں۔ اصلی معاملہ بس اتنا ہی تھا اور ہم چاہتے بھی تھے کہ بس اسی تک رہیں آگے نہ بڑھیں۔ مگر ایسا ممکن بھی تھا؟ مجلس عاملہ اس بات کی ہر چند کوشش کرنا چاہتی تھی کہ گاندھی جی کی واپسی سے پہلے حکومت سے ان بن نہ ہو اور خاص کر ایک معاشی معاملہ پر وہ اس ان بن کو اس لیے اور بھی ٹالنا چاہتی تھی کہ یہ پھر مختلف طبقات معاشی کا معاملہ بن سکتا ہے۔ مجلس عاملہ سیاسی اعتبار سے بہت آگے ہو۔ مگر معاشی اعتبار سے اتنی آگے نہ تھی اور اسے یہ پسند نہ تھا کہ آسامی اور زمیندار کا سوال اٹھایا جائے۔

میری طبیعت کا رجحان چونکہ اشتراکیت کی طرف تھا اس لیے معاشی

اور معاشرتی امور پر صلاح و مشورے کے لئے مجھے کچھ بہت مناسب آدمی نہیں سمجھا جاتا تھا۔ ادھر میں خود بھی چاہتا تھا کہ مجلس عاملہ سمجھ لے کہ صوبہ متحدہ کا معاملہ ایسا ہے کہ ہمارے معتدل مزاج اراکین خود باوجود مخالف میلان طبع کے واقعات کے ہاتھوں کچھ نہ کچھ کرنے پر مجبور ہیں۔ چنانچہ میں بہت خوش تھا کہ مجلس عاملہ کے جلسہ میں ہمارے صوبے سے شیروانی (ہمارے صوبے کے صدر) اور دوسرے لوگ موجود ہیں۔ اس لئے کہ شیروانی کوئی شعلہ مزاج انتہا پسند نہ تھے۔ سیاسی اور معاشی لحاظ سے وہ کانگریس کے اعتدال پسندوں میں تھے۔ اور سال کے شروع شروع میں صوبہ کانگریس کمیٹی کی دہقانی سیاست کے خلاف رائے رکھتے تھے۔ لیکن جب یہ خود کمیٹی کے صدر ہوئے اور ذمہ داری کا بوجھ خود ان پر آن پڑا تو انھوں نے سمجھا کہ ہمارے لئے تو کوئی اور راہ ہے ہی نہیں۔ اس کے بعد سے صوبے کی کمیٹی نے جو کچھ بھی کیا اس میں ان کی پوری پوری مدد شامل تھی۔ اور اکثر کارروائیاں تو بحیثیت صدر انھیں کی وساطت سے ہوئیں۔

چنانچہ تصدق شیروانی نے جب مجلس عاملہ کے سامنے ہماری وکالت کی تو اس کا ممبروں پر بڑا اثر ہوا۔ اس سے کہیں زیادہ جتنا اگر میری وکالت سے ہوتا۔ بہت کچھ رک رک کر لیکن یہ جان کر کہ انکار نہیں کیا جا سکتا مجلس عاملہ نے صوبے کی کمیٹی نے اختیار دے دیا کہ جس علاقہ میں چاہے لگان اور مالگذاری کا ادا کرنا رکوا دے۔ مگر ساتھ ہی اس پر بھی زور دیا کہ صوبے والے جہاں تک ہو سکے اس بات سے بچیں اور صوبے کی حکومت سے بات چیت جاری رکھیں۔

یہ نامہ و پیام کچھ دنوں ہوا کیا مگر بے نتیجہ۔ میرا خیال ہے کہ اس سے



پنڈت جواہر لال نہرو اور تصدق احمد خاں شیروانی

الہ آباد ضلع میں چھوٹ کی تعین کچھ بہتر ہو گئی۔ حالات معمولی ہوتے تو ممکن تھا کہ کوئی تصفیہ بھی ہو جاتا یا کم سے کم لڑائی تو ٹل ہی جاتی۔ اس لئے کہ اختلاف خیال کی خلیج تنگ ہو رہی تھی۔ لیکن حالات بہت غیر معمولی تھے اور دونوں طرف حکومت کی طرف بھی اور کانگریس کی طرف بھی یہ گمان تھا کہ جو مقابلہ سامنے آ رہا ہے وہ ٹلنے نہیں ٹل سکتا اور یہ نامہ و پیام سب بے حقیقت ہے۔ جو قدم بھی اٹھتا تھا، ادھر سے ہو یا ادھر سے تو سمجھا یہ جاتا تھا کہ فریق مخالف اپنے مورچہ کی مضبوطی کی تدبیریں کر رہا ہے۔ حکومت کی تیاریاں تو چھپے چھپے راز میں پوری ہو سکتی تھیں اور چنانچہ ہوئیں بھی۔ ہماری قوت عام لوگوں کے حوصلہ اور امنگوں کی بلندی پر منحصر تھی اور اسے خفیہ کارروائیوں سے پیدا کرنا یا ابھارنا معلوم۔ ہم میں سے بعض (اور ان مجرموں میں میں بھی تھا) اپنی تقریروں میں بار بار کہہ چکے تھے کہ آزادی کی جنگ ابھی ختم نہیں ہوئی ہے۔ جلد ہی بہت سی آزمائشوں اور مشکلوں کا سامنا کرنا ہوگا اور ہم اپنی قوم سے کہتے تھے کہ ان مصیبتوں کے لئے تیار رہے اور اس وجہ سے لوگ ہمیں جنگ جو کہنے لگے تھے اور سچی بات تو یہ ہے کہ ہمارے متوسط طبقے کے کانگریسی کام کرنے والے حقیقی واقعات کا سامنا کرنے سے بچتے تھے اور امید رکھتے تھے کہ جیسے بھی ہو پھر مقابلہ کی نوبت نہ آئے گی۔ یہ لوگ اخبار پڑھتے تھے ان کی توجہ گاندھی جی کے لندن میں ہونے کی وجہ سے ادھر بٹ گئی تھی۔ لیکن پھر بھی تعلیم یافتہ طبقہ کی اس بے عملی کے باوجود واقعات تیزی سے بڑھتے چلے آتے تھے خصوصاً مغربی بنگال میں، صوبہ سرحدی میں اور صوبہ متحدہ میں۔ چنانچہ نومبر میں تو بہتوں کو دکھائی دینے لگا تھا کہ توڑ کا وقت آن پہنچا۔

صوبہ کی کانگریس کمیٹی نے اس ڈر سے کہ واقعات قبل از وقت سے

پہلے سامنے نہ آجائیں اور جنگ شروع نہ ہو جائے اپنے کچھ نجی انتظامات بھی کر لیے تھے۔ الہ آباد کی کمیٹی نے ایک کسان سبھا بھی کی۔ جس میں یہ قرار داد منظور ہوئی کہ اگر بہتر شرائط حاصل نہ ہو پائیں تو کسانوں کو یہ مشورہ دینا چاہیے کہ لگان اور مالگذاری ادا کرنا بند کر دو۔ اس قرار داد سے صوبہ کی حکومت بہت بگڑی اور اسے وجہ جنگ قرار کر دیتے انھوں نے کہہ دیا کہ بس اب ہم تم سے کوئی معاملہ نہیں کرنا چاہتے۔ اس طرز عمل کا اثر ادھر صوبہ کی کانگریس پر بھی ہوا۔ انھوں نے اسے آنے والے طوفان کا پیش خیمہ جانا اور جلدی جلدی اپنی تیاریاں شروع کر دیں۔ الہ آباد میں ایک کسان سبھا اور منعقد ہوئی اور اس میں پہلے سے ذرا زیادہ سخت اور واضح قرار داد منظور کی گئی۔ اس میں کسانوں سے کہا گیا تھا کہ مزید گفتگو کے ختم ہونے اور بہتر شرطوں کے طے پانے تک سب ادائگیاں روک دو۔ اس وقت بھی ہم نے جو رویہ اختیار کیا اور اس وقت کیا بالکل آخر تک، وہ یہ نہیں تھا کہ لگان ادا ہی نہ کیا جائے بلکہ یہ تھا کہ مناسب لگان ادا کیا جائے۔ ہم برابر نامہ و پیام کی درخواست بھی کرتے رہے۔ ہر چند دوسرا فریق تو نہایت طنطنہ کے ساتھ ہمیں چھوڑ کر الگ جا چکا تھا۔ الہ آباد والی قرار داد زمینداروں اور آسامیوں کے لئے یکساں تھی۔ مگر ہم جانتے تھے کہ دراصل اس کا اطلاق صرف آسامیوں اور کچھ چھوٹے چھوٹے زمینداروں ہی پر ہوگا۔

نومبر کے آخر اور دسمبر ۱۹۳۱ء کے شروع میں صوبۂ متحدہ میں صورت حال یہ تھی۔ ادھر بنگال اور صوبہ سرحدی میں بھی معاملات دگرگوں تھے۔ بنگال میں تو ایک نیا اور سخت ہمہ گیر آرڈیننس جاری کر دیا گیا تھا۔ یہ سب نشانیاں امن کی نہ تھیں۔ جنگ کی تھیں۔ اور سوال بس یہ تھا کہ گاندھی جی کب واپس آئیں گے؟ حکومت نے اتنے دنوں سے جس یلغار کی تیاری کی تھی کیا اس کے شروع

ہونے سے پہلے گاندھی جی ہندوستان پہنچ جائیں گے؟ یا اس وقت آئیں گے کہ ان کے ساتھی قید میں پہنچ چکے ہوں گے اور معرکہ چل رہا ہوگا؟ معلوم ہوا کہ وہ واپس آرہے ہیں اور سال کے آخری ہفتہ میں بمبئی پہنچ جائیں گے ہم میں سے ایک ایک کیا صدر مقام پر، کیا صوبوں میں کانگریس کا ایک ایک رکن چاہتا تھا کہ ان کی واپسی تک معرکہ کو ٹال لے۔ خود اس معرکہ کے خیال سے یہ بہتر تھا کہ ہم ان سے مل لیتے۔ ان سے ہدایت اور مشورہ لے لیتے۔ لیکن یہ ایک دوڑ تھی جس میں ہم بے بس تھے کہ چال برطانوی کی حکومت کے ہاتھ میں تھی۔

عارضی صلح کا خاتمہ

صوبجات متحدہ میں اپنی مشغولیت کے باوجود مجھے عرصہ سے یہ فکر تھی کہ طوفان کے ہر دو مرکزوں یعنی صوبہ سرحد اور بنگال، کسی طرح وہاں پہنچوں۔ میں چاہتا تھا کہ موقع پر جا کر حالات کا مطالعہ کروں، اور پرانے ساتھیوں سے بھی ملوں کہ ان میں سے بہتوں سے تو اب کوئی دو سال سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ لیکن اس سب سے زیادہ میری خواہش یہ تھی کہ ان صوبوں کے لوگوں نے جو ہمت اور شجاعت دکھائی ہے اور قومی جنگ میں جو قربانیاں کی ہیں ان پر خود جا کر اپنا خراج عقیدت پیش کروں۔ اس زمانہ میں صوبہ سرحد تو میری پہنچ سے باہر تھا اس لئے کہ حکومت ہند اس بات کو پسند نہیں کرتی تھی کہ کوئی ممتاز کانگریسی وہاں جائے اور حکومت کی اس ناپسندیدگی کے باوجود ہم جانا نہیں چاہتے تھے کہ کہیں خواہ مخواہ کوئی گتھی نہ پڑ جائے۔ بنگال میں معاملات بد سے بدتر ہوتے جاتے تھے اور اگرچہ دل اس صوبہ کی طرف بہت کھنچتا تھا مگر جانے سے پہلے میں بہت کچھ جھجکا۔ میں جانتا تھا کہ وہاں بے بس ہوں گا اور کچھ زیادہ فائدہ نہ پہنچا سکوں گا۔ اس صوبہ میں دو کانگریسی جماعتوں میں بہت سے ایک افسوسناک جھگڑا چلا آتا تھا۔ باہر کے کانگریس والے اس سے ڈرتے تھے اور الگ الگ رہتے تھے۔ اس ڈر سے کہ کہیں خود ایک طرف یا دوسری طرف سے اس جھگڑے میں الجھ نہ جائیں۔ یہ طریقہ تھا کمزوری کا اور وہی شترمرغ کا سا۔ اس سے نہ بنگال میں سکون پیدا ہو سکتا تھا نہ وہاں کے مسائل حل ہو سکتے تھے

گاندھی جی کے لندن جانے کے کچھ عرصہ بعد دو واقعات ایسے پیش آئے کہ سارے ہندوستان کی توجہ بنگال کے معاملات کی طرف ہو گئی یہ حادثے ہجلی اور چاٹگام میں ہوئے۔

ہجلی میں نظر بندوں کے رکھنے کے لیے ایک خاص جیل تھا سرکاری طور پر اعلان ہوا کہ اس جیل میں بلوہ ہوا تھا۔ نظر بندوں نے جیل کے اسٹاف پر حملہ کیا اور اسٹاف والے گولی چلانے پر مجبور ہوئے۔ ایک نظر بند گولی سے مارا گیا اور زخمی تو بہتیرے ہوئے۔ واقعہ کے فوراً ہی بعد مقامی طور پر ایک سرکاری تحقیقات ہوئی جس میں اسٹاف والوں کو گولی چلانے اور اس کے نتائج سے بالکل بری الذمہ کر دیا گیا لیکن اس واقعہ میں بہت سی نرالی باتیں تھیں بعض واقعات جو رفتہ رفتہ ظاہر ہوئے تو وہ سرکاری بیان سے مطابقت نہ کھاتے تھے لہذا تفصیلی تحقیقات کے لیے بڑا سخت مطالبہ شروع ہوا۔ ہندوستان میں جو عام سرکاری رسم ہے اس سے بالکل خلاف حکومت بنگال نے اعلیٰ عدالتی عہدہ داروں کی ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کر دی۔ یہ کمیٹی بالکل سرکاری تھی مگر اس نے جو شہادتیں لیں اور معاملہ پر پوری طرح غور کیا تو معاملہ کو جیل کے اسٹاف کے خلاف پایا۔ انھوں نے قرار دیا کہ غلطی زیادہ تر اسٹاف کی تھی اور گولی کا چلانا ناواجب تھا۔ یوں گویا اس باب میں حکومت کے جملہ سابقہ بیانات سراسر جھوٹے پڑے۔

یوں تو ہجلی کے حادثہ میں کوئی بہت غیر معمولی بات نہ تھی۔ بدقسمتی سے ایسے واقعات یا حادثات ہندوستان میں کوئی نادر چیز نہیں ہیں جیل کے بلووں کا ذکر اکثر پڑھنے میں آتا ہے جن میں نہتے اور بے بس قیدیوں کو مسلح نگراں اور دوسرے لوگ بہادری سے دبا دیتے ہیں ہجلی میں جو غیر معمولی بات تھی وہ یہ کہ اس واقعے نے اس قسم کے حادثات سے متعلق سرکاری بیانات کے یکطرفہ ہونے بلکہ جھوٹا ہونے کو

کھول کر ظاہر کر دیا اور لطف یہ کہ سرکاری طور پر ظاہر کر دیا۔ پہلے بھی لوگ ان سرکاری بیانات کو کچھ بہت باور نہ کرتے تھے لیکن اب تو بالکل پول ہی کھل گیا۔

بجلی کے واقعہ کے بعد سے ہندوستان بھر میں بہت سے ایسے جیل کے حادثات ہوئے ہیں، کبھی گولی چلی ہے۔ کبھی اور قسم کا تشدد کیا گیا ہے اور یہ عجیب بات ہے کہ ان بلوؤں میں ہمیشہ بس قیدی ہی ضرر اٹھاتے ہیں۔ تقریباً ہمیشہ ایک سرکاری بیان شائع ہوا ہے کہ قیدی طرح طرح کی بدکرداریوں کے مرتکب تھے اور اسٹاف سرتاسر بے قصور تھا۔ شاذ ہی ایسا ہوا ہے کہ اسٹاف والوں کو محکمہ کی طرف سے کوئی سزا دی گئی ہو تفصیلی تحقیقات کے سب مطالبوں کا جواب بس ٹکا سا نفی میں ملا۔ صرف محکمہ کی طرف سے دریافت حال کو کافی سمجھا گیا۔ ظاہر ہے کہ بجلی کا سبق حکومت نے خوب اچھی طرح سیکھا تھا یعنی یہ کہ باضابطہ اور غیر جانبدار تحقیقاتیں کرانا ٹھیک نہیں اور یہ کہ الزام لگانے والا ہی بہترین فیصلہ کرنے والا بھی ہوتا ہے۔ پھر کیا عجب ہے کہ لوگ بھی بجلی کے واقعہ سے یہ سبق سیکھیں کہ سرکاری بیانات میں بس وہ ہوتا ہے جو حکومت منوانا چاہتی ہے۔ اصل بات سے انھیں کچھ سروکار نہیں ہوتا۔

چاٹ گام کا معاملہ اس سے بہت سخت تھا کسی تشدد پسند نے ایک مسلمان پولیس کے انسپکٹر کو گولی سے مار ڈالا تھا۔ اس پر ہندو مسلم فساد ہوا یا کم سے کم اسے ہندو مسلم فساد بتایا گیا۔ یہ بات واضح تھی کہ معاملہ اس سے بہت کچھ زیادہ تھا اور معمولی فرقہ وارانہ فساد سے ذرا مختلف تھا۔ یہ تو ظاہر تھا کہ تشدد پسند کے فعل کو فرقہ داری سے کوئی واسطہ نہ تھا وہ تو بس ایک پولیس کے افسر کے خلاف تھا۔ بالکل اس سے قطع نظر کہ وہ افسر ہندو تھا یا مسلمان۔ پھر بھی اس قتل کے بعد کچھ ہندو مسلم فساد ضرور ہوا تھا۔ فساد کیسے شروع ہوا اور فساد کا یہ موقع کیا تھا۔ یہ بات صاف نہ ہوئی۔ ہرچند کہ اس باب میں ذمہ دار لوگوں نے سخت سخت الزام لگائے۔

اس فساد میں ایک اور خاص بات یہ تھی کہ بعض بعض خاص گروہوں نے مثلاً اینگلو انڈین ملازمین ریلوے نے اور دوسرے سرکاری ملازموں نے اس میں بڑا حصہ لیا اور کہا جاتا ہے کہ ان لوگوں نے نہایت وسیع پیمانے پر انتقامی کارروائیاں کیں۔ جے ایم سین گپتا اور بنگال کے دوسرے رہنماؤں نے چاٹ گام کے واقعات کے متعلق معین الزامات لگائے اور مطالبہ کیا کہ ان کی تحقیقات کرلی جائے، یا ہمارے خلاف ازالۂ حیثیت عرفی کا مقدمہ چلایا جائے۔ مگر حکومت ٹس سے مس نہ ہوئی اور یہی مناسب سمجھا کہ کچھ نہ کرے۔

چاٹ گام کے ان ذرا غیر معمولی واقعات نے دو خطرناک امکانات کی طرف خاص طور پر توجہ دلائی۔ تشدد پسندی کو یوں تو مختلف پہلوؤں سے برا بتایا جاچکا ہے حتیٰ کہ جدید انقلابی طریقۂ کار کے نزدیک بھی یہ بری قرار پاچکی ہے لیکن اس کے امکانی نتائج میں سے ایک نے مجھے ہمیشہ متوحش رکھا ہے یعنی ہندوستان میں غیر منظم اور فرقہ وارانہ تشدد کے پھیل جانے کے خطرے نے۔ میں کچھ ایسا بودا اہنسہ نہیں ہوں کہ تشدد سے اس لئے خائف ہوں کہ وہ تشدد ہے۔ مگر یہ تشدد مجھے پسند نہیں۔ کیونکہ میں محسوس کرتا ہوں کہ ہندوستان میں ابھی انتشار کی قوتیں بہت ہیں اور بے ضابطہ تشدد سے انھیں تقویت پہنچے گی اور ایک متحدہ اور منظم قوم کی تعمیر کا کام جتنا دشوار ہے اس سے دشوار تر ہوجائے گا جب لوگ مذہب کے نام پر قتل کریں یا بہشت میں اپنی جگہ محفوظ کرلینے کے لئے تو انھیں سیاسی تشدد پسندی کا عادی بنانا ذرا خطرے کی بات ہے۔ سیاسی قتل بھی بری چیز ہے لیکن پھر بھی سیاسی تشدد پسند کے ساتھ دلیل و بحث ممکن ہے اور اسے دوسری راہ پر ڈالا جاسکتا ہے اس لئے کہ گمان یہ ہے کہ وہ جس مقصد کے لئے کوشاں ہے وہ دنیاوی مقصد ہے شخصی نہیں بلکہ قومی مقصد ہے مگر مذہبی قتل اس سے بھی بری چیز ہے۔ ... اس لئے کہ

اس کا تعلق دوسری دنیا سے ہے اور اس کے متعلق بحث و دلیل کی کوشش بھی نہیں کی جا سکتی۔ بعض وقت ان دونوں قسموں کا فرق بہت باریک ہو جاتا ہے بلکہ تقریباً کچھ نہیں رہتا اور سیاسی قتل بھی کسی فوق الطبعی عمل سے نیم مذہبی قتل بن جاتا ہے۔

چاٹ گام میں ایک پولیس افسر کے قتل اور اس کے نتائج سے صاف صاف سامنے آگیا کہ ایسے تشدد کی کارروائیوں کے کیسے خطرناک امکانات ہیں اور اس سے ہندوستانی اتحاد اور آزادی کو کیا سخت نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اس قتل کے بعد جو انتقامی کارروائیاں ہوئیں ان سے پتہ چلا کہ ہندوستان میں بھی فاشسٹی طریقے پہنچ گئے ہیں۔ اس کے بعد سے خصوصاً بنگال میں اس قسم کی انتقامی کارروائیوں کی بہت سی مثالیں پیش آچکی ہیں اور یہاں کے یورپین اور اینگلو انڈین باشندوں میں فاشسٹی روح بلاشبہ پھیل چکی ہے۔ برطانوی سامراج کے بعض ہندوستانی دم چھلوں نے بھی اس روح کو اپنایا ہے۔

عجب بات یہ ہے کہ خود سیاسی تشدد پسندوں میں یا ان میں سے بہتوں میں بھی فاشسٹی روح کارفرما ہے لیکن اس کا رُخ دوسری طرف ہے۔ ان کا فاشزم قومی ہے اور یورپین، اینگلو انڈین اور بعض اوپر کے ہندوستانی طبقہ کے سامراجی فاشزم کا مدمقابل ہے۔

میں نومبر ۱۹۳۱ء میں چند روز کے لیے کلکتہ گیا۔ ان دنوں مصروفیت بہت رہی۔ نجی طور پر بہت سے افراد اور جماعتوں سے ملنے کے علاوہ کئی عام جلسوں میں تقریریں بھی کیں۔ ان سب جلسوں میں میں نے سیاسی تشدد پسندی پر بحث کی اور یہ بتانے کی کوشش کی کہ یہ تشدد کس قدر غلط اور بے سود ہے اور ہندوستانی آزادی کے لیے کس قدر مضر۔ میں نے تشدد پسندوں کو بُرا بھلا نہیں کہا۔ نہ انھیں نامرد اور بزدل بتایا جس طرح ہمارے بعض وہ ہم وطن کہا کرتے ہیں جن سے شاید ہی

کبھی کوئی ایسا کام اتفاق سے بھی سرزد ہوا ہو جس میں بہادری یا خطرے کا ذرا بھی شائبہ ہو۔ میں نے اسے ہمیشہ بڑی حماقت کی بات جانا ہے کہ کسی ایسے مرد یا عورت کو جو ہر دم جان جوکھوں میں ڈالتا ہو کوئی بزدل کہے۔ اس شخص پر اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے بودے نکتہ چینوں کو جو دور سے پڑے چلاتے ہیں اور خود کچھ نہیں کر سکتے ذرا اور حقارت کی نظر سے دیکھنے لگتا ہے۔

کلکتہ کے قیام کے آخری دن شام کو رخصت ہو کر اسٹیشن جانے سے ذرا پہلے دو نوجوان مجھ سے ملنے آئے۔ یہ دونوں بہت کم عمر تھے۔ کوئی بیس بائیس سال عمر ہوگی۔ ذرا گھبرائے گھبرائے چہرے اور چمکتی ہوئی آنکھیں۔ مجھے خبر بھی نہ تھی کہ یہ کون تھے ان کے آنے کا مقصد میری سمجھ میں آگیا۔ یہ مجھ سے بہت خفا تھے کہ میں نے سیاسی تشدد کے خلاف تلقین کی تھی۔ انھوں نے بتایا کہ نوجوانوں پر اس کا بہت برا اثر ہو رہا ہے اور وہ اس قسم کی مداخلت کو گوارا نہیں کر سکتے۔ ان سے کچھ بحث ہوئی بہت تیاری جلدی میں اس لئے کہ میری روانگی کا وقت قریب تھا۔ شاید دوران بحث میں ہمارا لہجہ سخت ہو گیا تھا اور مزاج میں کچھ گرمی پیدا ہو گئی تھی اور میں نے شاید کچھ سخت باتیں بھی ان سے کہیں۔ جب ان سے رخصت ہوا تو چلتے چلتے انھوں نے مجھے تنبیہ کی کہ اب آگے ذرا خیال رہے ایسی باتیں نہ ہوں ورنہ ممکن ہے تمہارے ساتھ بھی وہی کیا جائے گا جو اوروں کے ساتھ کیا گیا ہے!

میں یوں کلکتہ سے رخصت ہوا۔ رات کو جب ریل گاڑی میں لیٹا تو دیر تک ان دونوں لڑکوں کے گھبرائے گھبرائے چہرے نظر کے سامنے رہے۔ یہ زندگی سے بھرپور اور عصبی قوت سے بھرے ہوئے تھے۔ کیا ہی اچھا سامان تھا اگر انھیں کوئی ٹھیک راہ پر لگا دے۔ مجھے افسوس تھا کہ میں نے ان سے اس قدر عجلت میں اور ذرا درشتی سے برتاؤ کیا اور جی چاہتا تھا کہ ان سے دیر تک بات چیت کا موقع ملا ہوتا۔

شاید میں انھیں سمجھا سکتا کہ اپنی ہونہار زندگیوں کو کسی اور راہ پر ڈالیں۔ ہندستان اور آزادی کی خدمت کی کسی راہ پر کہ ان راہوں میں جرأت اور قربانی کے مواقع کی کیا کمی ہے۔ پچھلے برسوں میں مجھے اکثر ان نوجوانوں کا خیال آیا ہے۔ مجھے کبھی ان کے ناموں کا علم نہ ہوا۔ نہ پھر کبھی ان کا کوئی اور پتہ چلا۔ اور کبھی کبھی مجھے یہ خیال ہوتا ہے کہ کیا معلوم وہ مر گئے کہ کالے پانی میں جیل کی کسی کوٹھری میں جیتے ہیں۔

دسمبر کا مہینہ تھا۔ الہ آباد میں دوسری کسان سبھا کا جلسہ ہوا اور میں بہت جلدی جنوب میں کرناٹک پہنچا۔ اپنے پرانے ساتھی ہندستانی سیوادل والے ڈاکٹر ان ایس ہرڈیکر سے ایک پرانا وعدہ یاد تھا اسے پورا کرنا تھا۔ سیوادل قومی تحریک کے رضاکاروں والا حصہ ہے اس کا انتظام بالکل الگ تھا مگر یہ برابر کانگریس کے ساتھ رہا تھا۔ ۱۹۳۱ء کے موسم گرما میں کانگریس کی مجلس عاملہ نے اسے کانگریس کے نظام میں بالکل ملانے اور اسے کانگریس کا شعبہ رضاکاراں بنا لینے کا فیصلہ کیا چنانچہ یہ ہو گیا اور ہرڈیکر اور میرے سپرد اس کا کام کیا گیا۔ دل کا صدر مقام وہی ہوتے کرناٹک میں ہبلی رہا اور ہرڈیکر نے مجھے آمادہ کیا کہ وہاں جا کر دل کے مختلف تقریبوں میں شریک ہوں۔ پھر وہ مجھے کچھ دن کے لیے کرناٹک کے دورے پر لے گئے اور مجھے ہر جگہ کے لوگوں کا جوش دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی۔ واپسی میں میں شولاپور گیا جو مارشل لا کے نفاذ کی وجہ سے مشہور ہو چکا تھا۔

کرناٹک کے اس دورے کی حیثیت ایک الوداعی رسم کی سی ہو گئی۔ میری تقریریں گویا ہنس کا آخری گیت تھیں۔ اگرچہ تھیں ذرا تیز و تند اور میں تو سمجھتا ہوں کہ ان میں ایسی موسیقی بھی نہ تھی۔ صوبہ متحدہ سے جو خبریں آئی تھیں وہ بالکل قطعی اور واضح تھیں۔ حکومت نے وار کر دیا تھا اور وار بھی کاری۔ الہ آباد سے کرناٹک جاتے ہوئے میں کملا کے ساتھ بمبئی بھی گیا تھا۔ وہ پھر بیمار تھی۔ میں نے بمبئی میں

اُن کے علاج کا انتظام کیا۔ الٰہ آباد سے بمبئی پہنچنے کے بعد ہی ہمیں خبر ملی تھی کہ حکومتِ ہند نے صوبجات متحدہ کے لئے ایک خاص آرڈیننس جاری کر دیا ہے۔ گاندھی جی جہاز میں تھے اور عنقریب بمبئی پہنچنے والے تھے، مگر حکومت نے یہی فیصلہ کیا کہ ان کی واپسی کا انتظار نہ کرے۔ آرڈیننس کی غرض تو وہی شورش کو دبانا بتائی گئی تھی مگر اس کا جال اتنی اتنی دور تک پھینکا گیا تھا کہ ہر قسم کی سیاسی زندگی ناممکن ہو گئی تھی۔ حد یہ ہے کہ قدیم انجیل والی رسم کو پلٹ کر اس نے اولاد کے گناہوں پر والدین اور سرپرستوں کو سزا دینے کا اہتمام تک کیا تھا۔

اسی زمانے میں گاندھی جی کے اس انٹرویو کی خبر پڑھنے میں آئی جس کے متعلق کہا جاتا تھا کہ انھوں نے روما کے اخبار جورنال اطالیہ کو دیا ہے۔ اس پر بڑی حیرت یوں ہوئی کہ یوں سرسری طور پر روما میں کوئی انٹرویو دے دینا گاندھی جی کی عادت کے بالکل خلاف بات تھی۔ پھر جو اس بیان کو غور سے پڑھا تو اس میں بہت سے لفظ اور فقرے ایسے ملے جو گاندھی جی کے ہو ہی نہ سکتے۔ چنانچہ قبل اس کے کہ ان کی طرف سے کوئی انکار ہوتا ہم پر ظاہر ہو چکا تھا کہ انٹرویو جس شکل میں شائع ہوا ہے اس میں تو ہرگز نہیں دیا گیا ہوگا۔ ہم سمجھتے تھے کہ انھوں نے جو کچھ فرمایا ہوگا اسے بہت توڑ مروڑ کر شائع کیا گیا ہے۔ اتنے میں گاندھی جی کی طرف سے اس کی تردید نکلی اور ان کا بیان شائع ہوا کہ انھوں نے روما میں سرے سے کوئی انٹرویو دیا ہی نہیں۔ اس وقت یہ بات صاف ہو گئی کہ کسی نے گاندھی جی کے ساتھ چال چلی ہے۔ لیکن حیرت تو اس پر ہوئی کہ برطانوی اخباروں اور سیاسی کارکنوں نے گاندھی جی کی تردید کو باور نہیں کیا اور حقارت کے ساتھ انھیں جھوٹا کہہ کر پکارا اس سے بڑا ہی دکھ ہوا اور بہت غصہ آیا۔

میرا جی بہت چاہتا تھا کہ کرناٹک کا دورہ چھوڑ دوں اور الٰہ آباد پہنچوں۔

دل کہتا تھا کہ میری جگہ صوبہ متحدہ میں اپنے ساتھیوں کے دوش بدوش ہے۔ جب گھر میں یہ کچھ ہو رہا ہے تو خود دورہ ہونا بڑی تکلیف دہ آزمائش تھی۔ لیکن میں نے فیصلہ یہی کیا کہ کرناٹک کے پروگرام کی پابندی کروں۔ بمبئی واپس آیا تو بعض دوستوں نے صلاح دی کہ گاندھی جی ٹھیک ہفتہ بھر میں آجائیں گے۔ ان کے پہنچنے تک بمبئی ہی میں ٹھہروں۔ لیکن یہ ہونا ممکن نہ تھا۔ الہ آباد سے پرشوتم داس ٹنڈن اور دوسرے لوگوں کی گرفتاریوں کی خبر آئی تھی۔ اس کے علاوہ ہمارے صوبے کی کانفرنس کا اجلاس اسی ہفتہ اٹاوہ میں ہونا قرار پایا تھا۔ چنانچہ میں نے الہ آباد کی واپسی کا فیصلہ کیا کہ اگر آزاد رہا تو چند روز میں بمبئی لوٹ آؤں گا۔ گاندھی جی سے بھی مل لوں گا اور مجلس عاملہ کے جلسے میں بھی شریک ہو جاؤں گا۔ کملا کو بھی وہیں بمبئی میں بستر علالت پر چھوڑا۔

ابھی الہ آباد پہنچا بھی نہ تھا کہ چھیوکی کے اسٹیشن پر نئے آرڈیننس کے ماتحت ایک حکم کی تعمیل مجھ پر کی گئی۔ الہ آباد کے اسٹیشن پر پھر اسی حکم کے مثنے کی تعمیل کی گئی اور گھر پہنچا تو ایک تیسرے صاحب نے تیسری مرتبہ کوشش فرمائی۔ بات صاف تھی کہ بھول چوک کا احتمال بھی نہیں رکھا گیا۔ اس حکم نے مجھے الہ آباد میونسپلٹی کے حدود میں نظر بند کر دیا تھا اور مجھے ہدایت کی گئی تھی کہ میں کسی عام جلسے میں یا تقریب میں شریک نہ ہوں۔ نہ کسی جلسہ میں تقریر کروں، نہ کسی اخبار یا پرچے میں کچھ لکھوں اس کے علاوہ اور بھی بہت سی پابندیاں تھیں۔ پھر معلوم ہوا کہ ایسا ہی حکم بہت سے ساتھیوں کو ملا تھا جن میں تصدق شیروانی بھی تھے۔ دوسرے دن صبح میں نے مجسٹریٹ ضلع کو جس نے یہ حکم جاری کیا تھا خط لکھا جس میں ان کے حکم کی رسید دی اور ان کو اطلاع دی کہ میں ان سے اس بات کی ہدایات لینے کا قصد نہیں رکھتا کہ کیا کروں اور کیا نہ کروں۔ میں اپنے معمولی طریق پر اپنا

معمولی کام کرتا رہوں گا اور اسی کام کے سلسلے میں میرا ارادہ ہے کہ جلد بمبئی واپس جاؤں کہ وہاں گاندھی جی سے ملوں اور مجلس عاملہ کے جلسہ میں شریک ہوں جس کا میں سکریٹری ہوں۔

اب ایک نئے مسئلہ کا سامنا تھا۔ صوبے کی کانفرنس کا جلسہ اسی ہفتہ اٹاوہ میں ہونا مقرر تھا۔ میں بمبئی سے اس ارادے سے آیا تھا کہ جلسہ کو ملتوی کرنے کی رائے دوں گا۔ اس لئے کہ اس کی تاریخیں گاندھی جی کے پہنچنے کی تاریخوں سے ٹکراتی تھیں اور اس لئے بھی کہ میں حکومت سے مقابلہ کرنے کو بچانا چاہتا تھا۔ لیکن میرے الہ آباد واپس آنے سے پہلے ہمارے صدر شیروانی کے نام صوبہ کی حکومت کا ایک تاکیدی پیام پہنچ چکا تھا۔ ان سے دریافت کیا گیا تھا کہ کانفرنس میں دیہی مسئلہ پر بحث ہوگی یا نہیں۔ اس لئے کہ اگر بحث ہونے والی ہو تو حکومت کانفرنس ہی کو روک دے۔ یہ بات تو سب جانتے تھے کہ کانفرنس کا خاص مقصد ہی دیہی مسئلہ پر بحث کرنا تھا کہ اس سے سارے صوبے میں ہلچل تھی۔ جلسہ کرنا اور اس مسئلہ پر بحث نہ کرنا تو حماقت اور اپنے کو معطل کر دینے کی انتہا ہوتی۔ اور بہرحال ہمارے صدر، کو یا کسی شخص کو تو یہ اختیار تھا ہی نہیں کہ کانفرنس کو یوں پہلے سے پابند کر دے۔ حکومت کی دھمکی سے بالکل قطع نظر ہم میں سے بعض کا ارادہ خود کانفرنس کو ملتوی کرا دینے کا تھا مگر اب جو دھمکی ملی تو بات اور ہی ہو گئی ایسے معاملوں میں ہم میں سے اکثر ذرا ضدی واقع ہوئے ہیں اور یہ خیال کہ حکومت جو چاہتی ہے کروا لیتی ہے کچھ خوش آئند نہ تھا۔ مگر بہت کچھ ردوبدل و بحث کے بعد ہم نے فیصلہ یہی کیا کہ اپنے غرور کو دبا جائیں اور کڑوا گھونٹ پی ہی لیں۔ کانفرنس کو ملتوی کر دیں۔ یہ اس لئے کیا کہ ہم سب جانتے تھے کہ جن داموں بھی ممکن ہو گاندھی جی کے آنے تک اس جھگڑے کو جو شروع تو ہو ہی گیا تھا بڑھنے

نہ دیں۔ ہم یہ نہ چاہتے تھے کہ جب وہ آئیں تو انھیں ایک ایسی صورت حال کا سامنا ہو جس میں وہ رہنمائی کا کام اپنے ہاتھ میں نہ لے سکیں۔ ہماری طرف سے کانفرنس کے ملتوی کیے جانے کے باوجود الٰہ آباد میں پولیس اور فوج کا بڑا مظاہرہ ہوا۔ کچھ ایکے دُکے نمایندے بھی گرفتار کیے گئے اور فوج نے سودیشی نمائش پر قبضہ کر لیا۔

شیروانی نے اور میں نے ۲۶ دسمبر کی صبح کو الٰہ آباد سے بمبئی جانے کا فیصلہ کیا۔ شیروانی کو مجلس عاملہ نے خاص طور پر بلایا تھا کہ صوبہ متحدہ کے حالات پر مشورہ کرے۔ ہم دونوں کو آرڈیننس کے ماتحت حکم مل چکا تھا کہ الٰہ آباد شہر سے باہر نہ جائیں۔ کہا یہ جاتا تھا کہ آرڈیننس الٰہ آباد اور صوبہ متحدہ کے بعض اور ضلعوں کے دیہات میں لگان روکنے کے کام کے خلاف نافذ کیا گیا ہے۔ اس لئے یہ بات تو آسانی سے سمجھ میں آ سکتی تھی کہ حکومت ہمیں ان دیہی علاقوں میں نہ جانے دے لیکن یہ بات تو صاف تھی کہ ہم بمبئی شہر میں یہ شورش برپا نہ کر سکتے اور اگر آرڈیننس کا مقصد واقعی دیہات کی شورش سے متعلق تھا تو ہمارے صوبے سے باہر جانے پر تو اور خوش ہونا چاہیے تھا۔ جب سے آرڈیننس نافذ ہوا تھا ہم لوگوں کا طرز عمل بالکل مدافعت کا تھا۔ اور اگرچہ کہیں کہیں انفرادی طور پر احکام کی نافرمانی ہوئی تھی مگر فی الجملہ ہم نے اس نئے قانون سے قوت آزمائی کو ٹالا تھا۔ جہاں تک صوبے کی کانگریس کا تعلق تھا یہ بات بالکل صاف تھی کہ یہ کم سے کم اس وقت حکومت سے لڑائی کرنے سے بچنا یا اس کو ملتوی کرنا چاہتی تھی۔ شیروانی اور میں بمبئی اس لئے جا رہے تھے کہ وہاں گاندھی جی اور مجلس عاملہ ان معاملات پر غور کریں گے اور کسی کو خبر نہ تھی۔ کم سے کم مجھے تو ہرگز یقین نہ تھا کہ ان کا آخری فیصلہ کیا ہوگا؟

ان سب باتوں سے تو یہ خیال ہوتا تھا کہ ہمیں بھی جانے دیا جائے گا اور نظر بندی کے حکم کی محض ضابطہ کی نافرمانی کو کم سے کم اس وقت حکومت گوارا کرلے گی مگر دل کچھ اور ہی گواہی دیتا تھا۔

ریل گاڑی میں بیٹھے ہی تھے کہ صبح کے اخبارات میں صوبہ سرحد کے نئے آرڈیننس کا ذکر اور عبدالغفار خان اور ڈاکٹر خان صاحب کی گرفتاری کی خبر پڑھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہماری گاڑی مبئی میل بیچ کے ایک اسٹیشن ارادت گنج پر کھڑی ہوگئی جہاں معمولاً یہ گاڑی نہیں ٹھہرا کرتی تھی اور پولیس کے افسر ہمیں گرفتار کرنے کے لئے گاڑی میں چڑھ آئے۔ جیل خانے کی ایک گاڑی لائن کے پاس کھڑی تھی۔ شیروانی اور میں قیدیوں کی اس بند گاڑی میں سوار ہوئے اور ہچکولے کھاتے نینی پہنچے۔ انگریز پولیس کپتان جس نے ہمیں ۲۶ دسمبر کی صبح کو کہ تحفہ تحائف دینے کا دن ہوتا ہے گرفتار کیا تھا کچھ گم سم اور افسردہ افسردہ سا تھا۔ شاید ہم نے اس غریب کا بڑا دن خراب کیا۔

غرض ہم یوں قید خانے کو چلے۔ بقول شاعر

"راحت و شادمانی سے اب ذرا منہ موڑو
اور کچھ دن کرب و الم کے سانس کھینچو"

گرفتاریاں تعزیری قوانین اور ضبطیاں

ہماری گرفتاری کے دو دن بعد گاندھی جی یورپ سے بمبئی پہنچے۔ اس وقت انہیں تازہ واقعات کا علم ہوا۔ لندن میں انھوں نے یہ تو سن لیا تھا کہ بنگال میں تعزیری قانون نافذ ہوگیا ہے اور اس سے انھیں سخت تشویش تھی لیکن یہاں پہنچ کر انھیں علم ہوا کہ صوبۂ متحدہ اور صوبہ سرحد کے تعزیری قوانین کی شکل میں ان کے لئے بڑے دن کے چند تحفے اور موجود ہیں اور ان دونوں صوبوں میں ان کے عزیز ترین رفقا گرفتار کرلئے گئے ہیں۔ معاملہ حد سے گذر چکا تھا اور صلح کی تمام امیدیں ختم ہوگئی تھیں۔ پھر بھی انھوں نے اس گتھی کو سلجھانے کی آخری کوشش کی اور لارڈ ولنگڈن وائسرائے سے درخواست کی کہ مجھے ملاقات کا موقع دیا جائے۔ نئی دہلی سے ان کے پاس یہ جواب پہنچا کہ چند شرائط کے ماتحت ملاقات ممکن ہے۔ میرے پاس وائسرائے کے جواب کی نقل موجود نہیں ہے۔ لیکن جہاں تک مجھے یاد ہے شرائط یہ تھیں کہ بنگال صوبہ متحدہ اور صوبہ سرحد کے تازہ واقعات، تعزیری قوانین اور ان کے ماتحت گرفتاریوں کا اگر آپ کوئی ذکر نہ کریں تو تشریف لا سکتے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ گاندھی جی یا کسی کانگریسی رہنما کے لئے ان ممنوعہ مسائل کو چھوڑ کر جن سے سارے ملک میں ایک ہیجان برپا تھا وائسرائے سے بات چیت گفتگو کرنے کا اور کون سا موضوع باقی رہ جاتا ہے۔ اب یہ صاف ظاہر تھا کہ

حکومت ہند کانگریس کو کچل ڈالنے پر تلی ہوئی ہے اور اس سے کوئی معاملہ کرنے لئے تیار نہیں ہے۔ ورکنگ کمیٹی کو اب اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ سول نافرمانی پھر شروع کر دے۔ اس کے ممبر جانتے تھے کہ ان کے لئے ہر وقت گرفتاری کا خطرہ ہے اس لئے فطرتاً ان کی خواہش تھی کہ جیل میں جانے سے پہلے قوم کے سامنے ایک صحیح راہ عمل پیش کر دیں۔ پھر بھی سول نافرمانی کی قرارداد محض عارضی طور پر منظور کی گئی اور گاندھی جی نے وائسرائے سے ملنے کی ایک اور کوشش کی۔ انھوں نے وائسرائے کو دوسرا تار بھیجا کہ غیر مشروط ملاقات کا شرف بخشا جائے۔ اس کے جواب میں حکومت نے گاندھی جی اور کانگریس کے صدر دونوں کو گرفتار کر لیا اور وہ بٹن دبا دیا جس سے سارے ملک میں تشدد کی مشین کام کرنے لگی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ چاہے اور کوئی لڑائی کا خواہش مند ہو یا نہ ہو لیکن حکومت لڑنے پر ادھار کھائے بیٹھی تھی۔

ہم جیل میں تھے اور یہ تمام خبریں مبہم اور بے ربط شکل میں ہمارے پاس پہنچی تھیں۔ ہمارا مقدمہ نیا سال شروع ہونے تک ملتوی ہو گیا تھا اس لئے زیر سماعت حوالاتی کی حیثیت سے ہم عام قیدیوں کے مقابلہ میں باہر والوں سے زیادہ مل سکتے تھے۔ ہم نے سنا کہ ملک میں یہ اہم بحث چھڑی ہوئی ہے کہ آیا وائسرائے نے ملاقات سے انکار کر کے غلطی کی یا نہیں؟ گویا ان کے ملاقات کرنے یا نہ کرنے پر ہر بات کا دارو مدار تھا۔ اس وقت ملاقات کا یہ مسئلہ تمام دوسرے معاملوں پر چھا گیا تھا۔ کہا یہ جاتا تھا کہ اگر لارڈ ارون یہاں موجود ہوتے تو ہرگز انکار نہ کرتے اور اگر وہ اور گاندھی جی مل بیٹھتے تو سب معاملہ ٹھیک ٹھاک ہو جاتا۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ ہندوستانی اخبارات کتنی سطحی نظر سے اس مسئلہ کو دیکھ رہے ہیں اور اصل حقیقت کو نظرانداز کر رہے ہیں۔

ہندوستانی قوم پرستی اور برطانی سامراج دراصل دو متضاد چیزیں ہیں۔ اس لئے ان دونوں کا ٹکرانا ضروری ہے تو کیا یہ جنگ چند افراد کے ذاتی رویہ پر منحصر ہے؟ کیا ان دونوں تاریخی قوتوں کی ٹکر باہمی اخلاق اور دل آویز مسکراہٹ سے رک سکتی ہے؟ گاندھی جی نے ایک خاص طرز عمل اس وجہ سے اختیار کیا کہ ہندوستان کی قومی تحریک خودکشی نہیں کر سکتی تھی۔ یعنی زندگی اور موت کے معاملہ میں برطانیوں کے احکام کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کو تیار نہ تھی اسی طرح ہندوستان کے برطانوی وائسرائے نے ایک دوسرا رویہ اس لئے اختیار کیا کہ قومی تحریک کا مقابلہ اور برطانوی مفاد کی حفاظت کی کوشش کرے پھر اس کا کیا سوال ہے کہ اس وقت کون وائسرائے تھا کون نہیں تھا۔ اگر لارڈ ارون وائسرائے ہوتے تو وہ بھی یہی کرتے جو لارڈ ولنگڈن نے کیا کیونکہ دونوں برطانوی سامراج کے آلہ کار تھے۔ اور ذاتی طور پر مقررہ پالیسی میں محض جزوی ترمیم کر سکتے تھے لارڈ ارون خود اس وقت حکومت برطانیہ کے ایک رکن تھے اس لئے ہندوستان میں حکومت نے جو قدم اٹھایا اس میں وہ بھی شریک تھے۔ ہندوستان میں برطانوی حکمت عملی کے معاملہ میں کسی وائسرائے کو ذاتی حیثیت سے اچھا یا برا کہنا بالکل لغویات ہے اور ہمارا ان فضولیات کو اہمیت دینا یہ ظاہر کرتا ہے کہ یا تو ہم حقیقت حال کو سمجھتے ہی نہیں یا جان بوجھ کر اس سے اعراض کرتے ہیں۔

۴ جنوری ۱۹۳۲ء ایک یادگار تاریخ تھی۔ اس روز دلیل اور بحث کا خاتمہ ہو گیا۔ صبح تڑکے گاندھی جی اور کانگریس کے صدر ولبھ بھائی پٹیل گرفتار کر لئے گئے اور شاہی قیدی کی حیثیت سے بغیر عدالتی تحقیقات کے نظر بند کر دئے گئے۔ چار نئے تعزیری قانون نافذ جن کی رو سے

مجسٹریٹوں اور پولیس افسروں کو نہایت وسیع اختیارات مل گئے۔ شہری آزادی کا خاتمہ ہو گیا۔ کیونکہ حکام اپنی مرضی سے افراد کو قید اور املاک کو ضبط کر سکتے تھے۔ گویا سارے ہندوستان میں ایک طرح فوجی محاصرے کا اعلان ہو گیا رہی اس محاصرے کی وسعت و شدت، وہ مقامی حکام کے اختیار تمیزی پر چھوڑ دی گئی تھی[1]

اسی روز صوبۂ متحدہ کے ضابطہ اختیارات ہنگامی کے ماتحت نینی جیل میں ہمارے مقدمے کی پیشی ہوئی۔ شیروانی کو چھ مہینے کی قید با مشقت اور ڈیڑھ سو روپے جرمانے کی سزا ملی اور مجھے دو سال کی قید با مشقت اور پانچسو روپے جرمانہ (بصورت عدم ادائگی مزید چھ ماہ) کی سزا ہوئی۔

ہم دونوں کا جرم ایک تھا دونوں کو حکم دیا گیا کہ الہ آباد شہر سے باہر نہ نکلیں۔ ایک ساتھ بمبئی جانے کی کوشش کر کے دونوں نے یکساں ان کی خلاف ورزی کی تھی۔ دونوں ساتھ ساتھ گرفتار کئے گئے تھے اور ایک ہی دفعہ کے ماتحت مجرم قرار دیے گئے تھے۔ اس کے باوجود ہمیں سزائیں مختلف ملیں۔ البتہ ایک فرق ضرور تھا۔ میں نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو یہ تحریری اطلاع دے دی تھی کہ میں اس حکم کے باوجود بمبئی جانے والا ہوں۔ شیروانی نے اس قسم کی کوئی اطلاع نہیں دی تھی لیکن ان کی روانگی کا بھی سب کو علم تھا اور اخباروں میں بھی یہ خبر شائع ہو گئی۔ سزا کا حکم سننے

---

[1] وزیر ہند سر سیمول ہور نے ۲۴ مارچ ۱۹۳۲ء کو دارالعوام میں یہ اقرار کیا تھا "مجھے تسلیم ہے کہ ہم نے جو تعزیری قوانین نافذ کئے ہیں وہ نہایت سخت ہیں اور ہندوستانیوں کی زندگی کے قریب قریب ہر شعبہ پر حاوی ہیں"۔

کے بعد ہی شیروانی نے مجسٹریٹ سے ایک نہایت ہی دلچسپ سوال کیا کہ جس سے سارا مجمع کھل کھلا کر ہنس پڑا اور بے چارہ مجسٹریٹ گھبرا گیا۔ انھوں نے پوچھا کر کیا مجھے کم سزا دینے میں فرقہ وارانہ تناسب کا لحاظ رکھا گیا ہے۔

اس تاریخی دن یعنی ۲۶ جنوری کو سارے ملک میں بہت سے اہم واقعات پیش آئے ہم سے تھوڑی دور پر یعنی الہ آباد شہر میں بہت بڑے مجمع کا پولیس اور فوج سے مقابلہ ہو گیا۔ حسب معمول لاٹھی چارج ہوا۔ جس سے بہت سے لوگ ہلاک و زخمی ہوئے۔ سول نافرمانی کے قیدیوں سے جیل پھر بھرنے شروع ہو گئے۔ پہلے یہ ڈسٹرکٹ جیلوں میں اور نینی کے سنٹرل جیل میں بھیجے گئے۔ اور جب وہاں گنجائش نہیں رہی تو دوسری سنٹرل جیلوں کی باری آئی۔ آخر جیل بھر گئے اور بڑے بڑے جیل کیمپ کھولنا پڑے۔

نینی میں ہمارے چھوٹے سے احاطہ میں بہت کم لوگ آئے یعنی صرف میرے پرانے ساتھی نربدا پرشاد، رنجیت پنڈت اور میرے رشتے کے بھائی موہن لال نہرو۔ چند روز کے بعد بارک نمبر ۶ کی اس چھوٹی سی برادری میں ایک اور مہمان کا اضافہ ہوا۔ جن کے آنے سے ہم سب کو بہت تعجب ہوا۔ ہمارے سیلون کے نوجوان دوست برنرڈ الیو وہارے تھے جو حال ہی میں انگلستان سے بیرسٹری پاس کرکے آئے تھے۔ میری بہن نے انھیں خوب سمجھا دیا تھا کہ تم مظاہروں میں نہ پڑنا۔ لیکن جوش میں آکر وہ کانگریس کے جلوس میں شریک ہو گئے اور قیدیوں کی گاڑی نے انھیں جیل خانے پہنچا دیا۔ کانگریس خلاف قانون قرار دے دی گئی۔ فہرست میں سب سے اوپر ورکنگ کمیٹی کا نام تھا اس کے بعد صوبہ کی کمیٹیاں اور بے شمار مقامی کمیٹیاں تھیں کانگریس کے ساتھ ساتھ وہ تمام ادارے بھی خلاف قانون ٹھہرائے گئے

جو اس سے کسی قسم کا تعلق رکھتے تھے یا محض اس لئے کہ ہمدرد تھے یا انتہا پسند سمجھے جاتے تھے۔ کسان سبھائیں، کاشتکاروں کی انجمنیں، نوجوانوں کی انجمنیں، طلبا کی ایسوسی ایشن انتہا پسند سیاسی ادارے، قومی یونیورسٹیاں اور اسکول، قومی اسپتال، سودیشی ادارے، کتب خانے سبھی کچھ اس کی لپیٹ میں آ گئے۔ فہرست بہت طویل تھی اور ہر بڑے صوبہ کے ذیل میں سینکڑوں نام درج تھے۔ سارے ہندوستان کی میزان لگائی جاتی تو یقیناً ہزاروں تک پہنچتی۔ خلاف قانون اداروں کی اتنی بڑی تعداد خود کانگریس اور قومی تحریک کی کامیابی کی ایک روشن دلیل تھی۔

میری بیوی بمبئی میں بیمار پڑی تھیں اور سول نافرمانی میں حصہ لینے کے لئے تڑپ رہی تھیں۔ میری والدہ اور دونوں بہنیں بہت جلد ایک ایک سال کی سزا پاکر جیل پہنچ گئیں۔ ہمیں نئے آنے والوں کے ذریعے باہر کی تھوڑی سی خبریں مل جاتی تھیں۔ یا کچھ حال ایک مقامی ہفتہ وار پرچے سے جو ہمیں پڑھنے کو ملتا تھا معلوم ہو جاتا تھا۔ لیکن باہر کے واقعات کا پورا اندازہ کرنے کے لئے ہمیں قیاس سے کام لینا پڑتا تھا۔ کیونکہ ہم جانتے تھے کہ خبروں کا احتساب بڑی سختی سے ہوتا ہے اور اخباروں اور خبر رساں ایجنسیوں کو ہمیشہ بھاری سزاؤں کا ڈر لگا رہتا ہے۔ بعض صوبوں میں تو گرفتار ہونے والوں یا سزا پانے والوں کا نام لکھنا بھی جرم تھا۔

غرض ہم نینی جیل میں باہر کی جنگ سے دور تھے۔ پھر بھی ہمارا دل اسی میں پڑا تھا۔ ہم وقت گزارنے کے لئے چرخہ کاتتے، کتابیں پڑھتے، دوسرے شغل میں مصروف رہتے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے اور دل میں ہر وقت یہی سوچتے رہتے کہ جیل خانے کی دیواروں کے باہر کیا ہو رہا ہے۔ غرض ہم اس تحریک سے جدا ہونے کے باوجود اس میں شریک تھے۔ کبھی انتظار کی خلش

دل کو بے چین کرتی۔ کسی غلطی پر غصہ آجاتا، کمزوری یا کمینے پن کی حرکت سے نفرت ہوتی اور کبھی ہم جذبات سے الگ ہو کر نہایت سکون اور غیر جانبداری سے تمام حالات پر غور کرتے اور یہ سمجھ لیتے کہ جب بڑی بڑی قوتیں کام کر رہی ہوں اور قہر و غضب کی چکیاں چل رہی ہوں تو چھوٹی چھوٹی انفرادی غلطیاں اور کمزوریاں لازمی ہیں۔ ہم سوچتے تھے کہ دیکھیں اس جنگ و جدل، اس شور و شغب، اس دلیرانہ جوش و خروش، اس ظالمانہ جبر و تشدد اور نفرت انگیز بزدلی کا کیا رنگ رہتا ہے اور ان سب چیزوں کا کیا انجام ہونے والا ہے۔ مستقبل ہم سب کی نظروں سے پوشیدہ تھا۔ اور یہی اچھا تھا۔ بلکہ ہم قیدیوں کو تو حال کی بھی خبر نہ تھی لیکن اتنا ہم ضرور جانتے تھے کہ ہمیں جنگ و مصیبت اور قربانی کا آج بھی سامنا ہے اور کل بھی رہے گا۔

میتھو آرنلڈ نے کیا خوب کہا ہے

"لوگ کل میدان میں نکل کھڑے ہوں گے اور جنگ از سر نو شروع ہو جائے گی"

"زینتھس[1] کا سارا میدان خون سے سرخ نظر آئے گا"

"ہکٹر[1] اور اجکس[1] پھر میدان میں اتریں گے"

"اور ہیلن پھر دیوار پر کھڑے ہو کر اس خوں چکاں منظر کا تماشا دیکھے گی"

---

[1] یونان کے شاعر ہومر نے اینتھس اور ٹرائے کا جنگ نامہ لکھا ہے۔ اس میں زینتھس میدان جنگ کا نام ہے۔ ہکٹر اور اجکس فریقین کے سورما ہیں اور ہیلن وہ عورت ہے جس کی خاطر جنگ ہوئی تھی۔

پھر یا تو ہم امن کا گوشہ ڈھونڈیں گے یا میدان جنگ میں جھکیں گے۔
کبھی اندھی امیدوں سے ابھریں گے۔ کبھی اندھی مایوسیوں میں ڈوبیں گے۔

دل و جان سے سعی و عمل میں مصروف ہو جائیں گے مگر یہ پتہ نہ چلے گا کہ ہماری روح کا کیا حشر ہوتا ہے۔

بازاری پروپاگنڈا

۱۹۳۲ء کے ابتدائی مہینوں میں۔ اور بہت سی عجیب باتوں کے ساتھ ایک یہ بھی تھا کہ برطانوی حکومت دل کھول کر بازاری طرز کے پروپاگنڈے سے کام لے رہی تھی۔ چھوٹے بڑے تمام بڑی بلند آہنگی سے دعوے کرتے تھے کہ ہم بڑے نیک اور امن پسند ہیں اور کانگریس بڑی پاپی اور جھگڑالو ہے۔ ہم جمہوریت کے حامی ہے اور کانگریس ڈکٹیٹری کی موید ہے۔ اس تقدس کے جوش میں شاید انھیں اس قسم کی چھوٹی چھوٹی باتیں یاد نہیں رہیں، جیسے تعزیری قوانین کا نفاذ، ہر طرح کی آزادی کا سلب کر لینا، اخباروں اور مطبعوں کا گلا گھونٹنا، بلا مقدمہ چلائے لوگوں کو قید میں ڈال دینا۔ جائداد اور روپیے کی ضبطی یا اسی طرح کی اور بہت سی باتیں جو آئے دن دیکھنے میں آتی تھیں اور شاید وہ یہ بھی بھول گئے کہ ہندوستان میں برطانوی حکومت کن اصولوں پر قایم ہے۔ سرکاری وزرا جو ہمارے ہی ہم وطن تھے جوش خطابت میں یہ فرماتے تھے کہ کانگریس والے تو اپنے ذاتی اغراض حاصل کرتے ہیں (جیل میں!) اور ہم چند ہزار ماہ کی حقیر تنخواہ پر رات دن قوم کی خدمت کیا کرتے ہیں۔ ماتحت عدالتیں نہ صرف ہمیں بھاری بھاری سزائیں دیتی تھیں بلکہ اس موقع پر وعظ و نصیحت بھی فرماتی تھیں اور کبھی کبھی کانگریس اور اس کے کارکنوں کو جی بھر کے گالیاں بھی دیتی تھیں۔ سر سیموئل ہور نے بھی وزارت ہند کی کرسی پر بیٹھ کر یہ

گل افشانی فرمائی تھی کہ کتے بھونکا کرتے ہیں اور قافلہ بڑھتا چلا جاتا ہے۔
شاید وہ اس وقت یہ بھول گئے تھے کہ سب کتے تو جیل میں بند تھے اور وہاں آسانی سے بھونک نہیں سکتے تھے اور جو باہر تھے ان کے منھ پر کس کر چھینکا چڑھا دیا گیا تھا۔

سب سے عجیب بات یہ ہوئی کہ کانپور کے فساد کا الزام کانگریس کے سر تھوپا گیا۔ اس خوفناک فساد کی تباہ کاریوں کو بیان کرکے بار بار یہ کہا گیا کہ کانگریس اس کی ذمہ دار ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اس موقع پر صرف کانگریس ہی نے شرافت اور ہمدردی سے کام لیا۔ اس کے ایک لائق ترین فرزند نے امن قایم کرنے کی کوشش میں اپنی جان دے دی اور کانپور کی ہر جماعت اور ہر فرقہ نے اس کا ماتم کیا۔ کانگریس کے کراچی کے اجلاس میں جب یہ خبر پہنچی تو فوراً ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی گئی۔ اس کمیٹی نے بہت تفصیلی تحقیقات کی مہینوں کی محنت کے بعد ایک ضخیم رپورٹ شائع کی جسے حکومت نے فوراً ممنوع قرار دیا۔ اس کے تمام مطبوعہ نسخے ضبط کر لئے اور شاید انھیں ضائع کر دیا۔ ہماری تحقیقات کے نتائج کو اس طرح دبا دینے کے باوجود سرکاری معترضین اور انگریزوں کے اخبارات یہی رٹ لگائے گئے کہ یہ فساد کانگریس کی وجہ سے ہوا۔

ایک دن اس معاملہ اور دوسرے معاملات کی حقیقت آشکارا ہو کر رہے گی۔

لیکن بعض اوقات جھوٹ بہت دن تک سچ سے آگے آگے رہتا ہے۔

جھوٹ اپنا کام کرکے رٹ جائے گا۔

سچ بہت بڑا ہے اور اسی کا بول بالا رہے گا۔
مگر اس وقت جب اس سے کوئی فائدہ نہ ہو گا۔

اس وقت جنگ کی سی حالت تھی۔ اس لئے شاید جذبات کا یہ ہیجان ایک قدرتی چیز تھی اور یہ توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ حکومت سچائی یا ضبط سے کام لے گی۔ مگر پھر بھی ہیجان کی یہ شدت حیرت انگیز تھی۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ ہندوستان کی حکمراں جماعت کے اعصاب کی کیا حالت تھی اور اس نے کس طرح اپنے جذبات کو ایک مدت سے دبا رکھا تھا غالباً اس کے اس غیظ و غضب کا سبب ہمارا کوئی قول یا فعل نہیں تھا۔ بلکہ خود اس کا یہ خوف کہ سلطنت ہاتھ سے نکلی جا رہی ہے۔ جن حکمرانوں کو اپنی قوت پر اعتماد ہوتا ہے وہ اس طرح بد حواس نہیں ہو جایا کرتے۔ تصویر کا دوسرا رخ اس رخ سے بہت مختلف تھا۔ دوسری طرف خاموشی طاری تھی۔ یہ کوئی اختیاری اور پُر وقار خاموشی نہیں تھی۔ بلکہ قید خانے کے خوف کی اور عالمگیر احتساب کی خاموشی تھی۔ اگر اس طرح جبر و تشدد نہ کیا جاتا تو ممکن ہے دوسری طرف بھی یہی ہیجان نظر آتا اور اسی طرح مبالغے اور بد زبانی سے کام لیا جاتا۔ البتہ گھٹے جذبات کے اظہار کا ایک ذریعہ ضرور تھا یعنی وہ خلاف قانون خبر کے پرچے جو مختلف شہروں سے کبھی شائع ہوتے تھے۔

انگریزوں کے جو اخبار ہندوستان میں ہیں وہ بھی اس بازاری پروپاگنڈے میں بڑے شوق سے شریک ہو گئے اور ان خیالات کو علی الاعلان ظاہر کرنا شروع کر دیا جو شاید مدت سے اپنے سینوں میں دبائے بیٹھے تھے عموماً انہیں اپنی تحریر میں ذرا احتیاط سے کام لینا پڑتا ہے۔ کیونکہ انکے ناظرین میں ہندوستانیوں کی تعداد بہت کافی ہے لیکن اس طوفان میں یہ احتیاط بھی بہہ گئی۔ اور انہیں

انگریزوں اور ہندوستانیوں دونوں کے دلوں کی گہرائی کی ایک جھلک نظر آ گئی۔ ہندوستان میں ایک ایک کرکے بیشتر اینگلو انڈین اخبار ختم ہو چکے ہیں۔ صرف تھوڑے سے باقی رہ گئے ہیں۔ لیکن جو باقی ہیں وہ نہایت اعلیٰ معیار کے اخبار ہیں۔ ان کا خبروں کا انتظام بھی نہایت معقول ہے اور ترتیب اور طباعت بھی بہت اچھی ہوتی ہے۔ دنیا کی سیاست کے متعلق ان میں جو افتتاحیہ مقالے شائع ہوتے ہیں گو ان کا نقطۂ نظر رجعت پسندانہ ہوتا ہے لیکن بڑی قابلیت سے لکھے جاتے ہیں اور ان سے پتہ چلتا ہے کہ لکھنے والے کو اپنے موضوع پر پورا عبور حاصل ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اخباری حیثیت سے وہ ہندوستان میں سب سے ممتاز ہیں۔ لیکن ہندوستان کے سیاسی مسائل میں وہ اپنی سطح سے بہت نیچے گر جاتے ہیں اور ایسی یک طرفہ رائے ظاہر کرتے ہیں کہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے اور جب قومی تحریک کا زور ہوتا ہے تو یہ جانب داری وحشت اور سوقیانہ پن کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔ وہ حکومت ہند کی آواز کو دہرانے لگتے ہیں اور اس سلسلہ میں پروپاگنڈے میں ضبط اور احتیاط کے تمام پردے اٹھا دیتے ہیں۔

ان چند منتخب اینگلو انڈین اخباروں کے مقابلہ میں ہندوستانی اخبار عموماً ادنیٰ قسم کے ہیں۔ ان کی مالی حالت خراب ہے اور ان کے مالک اسے سنبھالنے کی کوششیں بھی نہیں کرتے۔ ان کا روز کا خرچ بھی مشکل سے پورا ہوتا ہے اور بے چارے ادارتی عملے کو بڑی مصیبتیں اٹھانی پڑتی ہیں۔ ان کی طباعت وغیرہ خراب ہوتی ہے اور اشتہارات بھی نامناسب قسم کے ہوتے ہیں۔ زندگی کے عام مسائل اور سیاسیات میں بھی یہ والہانہ رنگ رکھتے ہیں۔ اس کی وجہ کچھ تو یہ ہے کہ ہماری قوم جذبات پرست واقع ہوئی

ہے۔ کچھ یہ کہ (جہاں تک انگریزی اخباروں کا تعلق ہے) انگریزی ان کے لئے
بدیسی زبان ہے اور اس میں ایسا طرزِ بیان اختیار کرنا کہ سادگی کے ساتھ زور
بھی ہو۔ آسان نہیں ہے۔ لیکن اصل وجہ یہ ہے کہ ایک عرصہ تک محکوم رہتے رہتے
اور جبر و تشدد سہتے سہتے ہمارے جذبات گھٹ کر اور دب کر رہ گئے ہیں اور جب
ذرا سا موقع ملتا ہے ابل پڑتے ہیں۔

ہندوستانیوں کے انگریزی اخباروں میں طباعت ترتیب وغیرہ کے
لحاظ سے مدراس کا ہندو سب سے بہتر ہے۔ اس کی وہ شان ہے جو ایک
ثقہ اور تقدس مآب بوڑھی بن بیاہی عورت کی ہوتی ہے کہ جہاں کسی نے کوئی
ایسا ویسا لفظ زبان سے نکالا اور وہ حیا اور غصہ کے مارے آپے سے باہر
ہوگئی۔ ہندو خاص طور پر اوسط طبقہ کے شہریوں کا پرچہ ہے اور اس کا کاروبار خوب
جما ہوا ہے۔ زندگی کے تاریک پہلو، حیات کی کشمکش اور نشیب و فراز سے اسے
کوئی تعلق نہیں۔ بہت سے اعتدال پسند اخباروں کا معیار بھی یہی ثقاہت اور
تقدس مآبی ہے۔ یہ رنگ تو پیدا کر لیتے ہیں لیکن ہندو کی خصوصیت اور خصوصیات
نہیں پیدا کر سکتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ہر اعتبار سے روکھے پھیکے ہو کر رہ جاتے ہیں۔

یہ ظاہر ہے کہ حکومت نے اس حملہ کے لئے عرصہ سے تیاری کی تھی اور وہ
چاہتی تھی کہ پہلی ہی ضرب نہایت شدید اور مؤثر ہو۔ ۱۹۳۰ء میں اس کی ہمیشہ یہ
کوشش رہی کہ نئے نئے تعزیری ضابطوں سے تحریک کی بڑھتی ہوئی رفتار
کو روکے۔ گویا اس وقت پیش قدمی کانگریس کی طرف سے ہوئی تھی اور حکومت
مدافعت کرتی تھی ۱۹۳۲ء کا طریقہ اس کے بالکل برعکس تھا۔ یعنی اب حکومت نے
چاروں طرف سے حملہ شروع کر دیا۔ سارے ملک کے لئے اور اس کے علاوہ
علیحدہ علیحدہ تمام صوبوں کے لئے طرح طرح کے تعزیری ضابطے نافذ کئے۔

اور ان کی رو سے حکام کو دنیا بھر کے اختیارات دے دیئے۔ ادارے خلاف قانون قرار دیئے گئے۔ عمارتیں، جائداد، موٹریں اور بنک کی رقمیں ضبط کر لی گئیں۔ جلسہ اور جلوس کی ممانعت کر دی گئی اور اخبار اور مطبعے پوری طرح جکڑ دیئے گئے۔ دوسری طرف اس کے خلاف ۱۹۳۱ء کے گاندھی جی کی قطعی رائے تھی کہ سول نافرمانی فی الحال شروع نہ کی جائے۔ اور ورکنگ کمیٹی کے اراکین بھی زیادہ تر ان کے ہم خیال تھے۔ بعض لوگوں کا اور میرا بھی یہی خیال تھا کہ چاہے ہم جنگ کو کتنا ہی ناپسند کرتے ہوں مگر جنگ یقینی ہے۔ اس لئے ہمیں اس کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ صوبہ متحدہ اور صوبہ سرحد میں کشمکش برابر بڑھ رہی تھی اس لئے لوگوں کا ذہن آنے والی جنگ کی طرف خود بخود منتقل ہونے لگا تھا۔ لیکن بحیثیت مجموعی تعلیم یافتہ اور اوسط طبقہ اس وقت جنگ کے خیال میں نہ تھا۔ گو وہ اس کو بالکل ناممکن نہیں سمجھتا تھا نہ جانے کیوں لوگوں کو یہ امید بندھ گئی تھی کہ گاندھی جی کی واپسی پر جنگ ٹل جائے گی۔ ظاہر ہے کہ خود ان کی خواہش نے خیال کی صورت اختیار کر لی تھی۔

غرض ۱۹۳۲ء کے شروع میں حکومت نے سراسر پیش قدمی کی اور کانگریس اول سے آخر تک مدافعت کرتی رہی۔ تعزیری ضوابط کے یکایک نافذ ہو جانے اور سول نافرمانی کے شروع ہو جانے سے اکثر مقامی کارکن بیکار ہو گئے پھر بھی کانگریس کی دعوت پر چاروں طرف سے لبیک کی آواز بلند ہو گئی۔ اور ہر طرف سے سول نافرمانی کرنے والے امڈ آئے۔ میرا تو یہ خیال ہے کہ ۱۹۳۲ء میں حکومت برطانیہ کا ۱۹۳۰ء سے کہیں زیادہ مضبوطی سے مقابلہ کیا گیا۔ کیونکہ ۱۹۳۰ء میں عموماً سب کہیں اور خصوصاً بڑے بڑے شہروں میں نمود و نمایش زیادہ تھی۔ ہاں یہ سچ ہے کہ اگرچہ ۱۹۳۲ء میں لوگوں نے پہلے سے زیادہ استقلال

کا ثبوت دیا۔ اور غیر معمولی طور پر پر امن رہے لیکن ۱۹۳۰ء کے مقابلہ میں جوش بہت کم تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہم کو مجبوراً جنگ میں شریک ہونا پڑا۔ ۱۹۳۰ء کی جنگ میں ایک خاص شان تھی جو اب باقی نہیں رہی تھی۔ حکومت نے اپنی پوری طاقت سے کانگریس کا مقابلہ کیا۔ سارے ہندوستان میں گویا مارشل لا جاری تھا۔ اس کے بعد کانگریس کو آزادی عمل یا پیش قدمی کا کوئی موقع نہیں ملا۔ پہلے ہی وار نے مسے اور اس کے اوسط طبقہ کے حامیوں کو جو اس کے خاص ہم درد تھے بے کار کر دیا۔ اس کی چوٹ ان کی جیبوں پر پڑی اور انھیں یقین ہو گیا کہ جو کوئی سول نافرمانی کی تحریک میں شریک ہوگا یا کسی طرح اس کی مدد کرے گا اسے نہ صرف اپنی آزادی سے بلکہ شاید تمام املاک سے بھی ہاتھ دھونا پڑے گا۔ صوبۂ متحدہ میں ہم پر اس کا کچھ زیادہ اثر نہیں پڑا۔ کیونکہ یہاں تو کانگریس غریبوں کی جماعت ہے۔ البتہ بمبئی جیسے بڑے بڑے شہروں میں املاک کی ضبطی کے خوف نے بڑا اثر ڈالا۔ کیونکہ اس سے تاجروں کا طبقہ تو بالکل برباد ہو جاتا اور اونچے پیشوں کے لوگوں کو سخت نقصان اٹھانا پڑتا۔ محض اس دھمکی نے (جو کبھی کبھی عمل میں بھی لائی گئی) شہر کے تمام کھاتے پیتے لوگوں کو سُن کر دیا۔ چنانچہ بعد میں مجھے ایک سیدھے سادے لیکن خوش حال تاجر کا ایک عجیب واقعہ معلوم ہوا۔ اس بے چارے کو سیاست سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ بجز اس کے کہ شاید وہ کبھی کبھی چندہ دے دیتا تھا۔ مگر پولیس نے اسے دھمکی دی کہ تم پر پانچ لاکھ روپیہ جرمانہ کیا جائے گا اور لمبی سزا الگ ہوگی۔ اس قسم کی دھمکیاں بہت عام تھیں اور یہ خالی خولی دھمکیاں نہ تھیں۔ کیونکہ اس وقت پولیس کا راج تھا اور آئے دن دیکھنے میں آتا تھا کہ وہ گرجتی نہیں بلکہ برستی بھی ہے۔

میرے نزدیک حکومت کے اس رویہ پر کسی کانگریسی کو اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں ہے گو اس میں کوئی شک نہیں کہ حکومت نے اس انتہائی پر امن تحریک کے خلاف جو جبر و تشدد اختیار کیا وہ تہذیب کے ہر معیار سے گرا ہوا اور سخت قابل اعتراض تھا۔ اگر ہم عملی جد و جہد اور انقلابی طریقے اختیار کریں گے تو چاہے وہ کتنے ہی پر امن کیوں نہ ہوں ان کا مقابلہ ضرور ہوگا۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر انقلاب کا کھیل نہیں کھیلا جا سکتا۔ لیکن بعض حضرات انقلاب بھی چاہتے ہیں اور مقابلہ سے بھی بچتے ہیں ظاہر ہے کہ یہ ناممکن ہے۔ جو شخص انقلابی جد و جہد کی راہ میں قدم رکھنا چاہتا ہے اسے اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ کھاتے پیتے خوش حال لوگ بہت کم انقلاب پسند ہوتے ہیں۔ گو ان میں سے ایک آدھ ایسے بھی نکل آتے ہیں وہ حضرات جو دنیاوی عقل رکھتے ہیں انھیں بے وقوف سمجھتے ہیں اور ان پر اپنے طبقے سے غداری کا الزام لگاتے ہیں۔

عام لوگوں کو جن پر قومی تحریک اصل میں منحصر تھی دبانے کے لئے حکومت کو اور تدبیروں سے کام لینا پڑا۔ اس لئے کہ ان کے پاس نہ موٹریں تھیں، نہ بینکوں میں رقم تھی نہ کوئی اور ایسی املاک تھیں جن پر قبضہ کیا جا سکتا۔ تحریک کو دبانے کے لئے حکومت نے طرح طرح کی سختیاں شروع کیں اور ان کا ایک دلچسپ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ حضرات بھی جو بقول ایک مصنف کے جس کی کتاب حال ہی میں شائع ہوئی ہے، "سرکاری آدمی" کہلاتے ہیں، خوب جھنجھوڑے گئے۔ ان میں سے بعض نے یہ سمجھ کر نہ جانے اونٹ کس کروٹ بیٹھے کچھ دن سے کانگریس سے لگاوٹ کی باتیں شروع کر دی تھیں۔ بھلا حکومت اسے کب برداشت کرنے والی تھی۔ اس کے لئے مجہول وفاداری کافی نہیں تھی۔

بقول فریڈرک کوپر کے جو ۱۸۵۷ء کی شورش کے سلسلہ میں مشہور ہیں حکومت "کامل عملی اور ضبوطی وفاداری چاہتی تھی اسے یہ گوارا نہ تھا کہ رعایا کی رواداری کے برتے پر قایم رہے" ایک سال پہلے مسٹر لائیڈ جارج نے اپنے پرانے رفقاء کار یعنی برطانوی لبرل پارٹی کے لیڈروں کے متعلق جو "نیشنل گورنمنٹ" میں شامل ہوگئے تھے یہ فرمایا تھا کہ "وہ گرگٹ کی طرح جیسا موقع دیکھتے ہیں ویسا ہی رنگ بدلا لیتے ہیں" ہندوستان کے نئے حالات میں اب غیر جانب داری کا رنگ نہیں چل سکتا تھا۔ اس لئے ہمارے بعض ہم وطن وفاداری کے گہرے اور شوخ رنگوں میں جو حکومت کو مرغوب تھے ڈوب گئے اور بڑی دھوم دھام سے ہمارے حکمرانوں سے قربت محبت کرنے لگے۔ انھیں تعزیری ضوابط، فوجی قواعد، مغرب کے بعد گھر سے نہ نکلنے کے احکام اور دوسری بے شمار مخالفتوں اور مزاحمتوں کا تو کوئی خوف تھا نہیں۔ لیکن سرکاری طور پر اعلان ہوچکا تھا کہ یہ سب کچھ باغیوں اور مخالفوں کے لئے ہے۔ وفاداروں کو خوف کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ چنانچہ وہ مزے سے بیٹھے اس شورش اور ہنگامہ کا تماشا دیکھتے تھے جو چاروں طرف برپا تھا اور اس خوف و ہراس سے ذرا بھی متاثر نہ تھے جو ان کے بہت سے ہم وطنوں پر طاری تھا۔ گویا وہ "وفادار چرواہے" کی ہیروئن "گلو" کے ہم زبان ہو کر کہتے تھے:-

ایک چیز کا تو مجھے خوف ہی نہیں۔

یعنی مجھ پر دست درازی کرنا ناممکن ہے۔

کیونکہ میں تو پہلے سے راضی ہوں

نہ جانے کیوں حکومت کو یہ خیال ہوگیا تھا کہ کانگریس خاص کر کے عورتوں کو جیل بھیجنا چاہتی ہے۔ اس امید میں کہ ان کے ساتھ بہتر سلوک

کیا جائے گا اور انھیں معمولی سزائیں ملیں گی۔ یہ محض احمقانہ خیال تھا۔ دنیا میں کوئی بھی اپنی عورتوں کو جیل میں جھونکنا نہیں چاہتا تھا۔ عموماً عورتوں نے اپنے والد، خاوند، یا بھائیوں کی مرضی کے خلاف، یا کم سے کم بغیر ان کی خوشی کے اس تحریک میں حصہ لیا۔ بہر حال حکومت نے عورتوں کو لمبی لمبی سزائیں دے کر اور جیل خانے میں ان کے ساتھ سختی کا برتاؤ کر کے اس کی انتہائی کوشش کی کہ وہ ہمت ہار بیٹھیں۔ میری بہنوں کی گرفتاری اور سزایابی کے بعد ہی چند پندرہ سولہ برس کی لڑکیاں الہ آباد میں غور کرنے کے لئے جمع ہوئیں کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔ انھیں دنیا کا کوئی تجربہ نہ تھا لیکن وہ جوش سے سرشار تھیں اور انھیں مشورہ کی ضرورت تھی۔ وہ ایک نجی مکان میں جمع تھیں کہ انھیں گرفتار کر لیا گیا۔ اور ہر ایک کو دو سال قید سخت کی سزا دے دی گئی۔ یہ تو بہت ہی معمولی سا واقعہ تھا۔ اس قسم کے متعدد واقعات ہندوستان کے کونے کونے میں آئے دن ہو رہے تھے۔ جن عورتوں اور لڑکیوں کو تحریک کے سلسلہ میں سزا ہوئی انھیں جیل خانے میں مردوں سے زیادہ مصیبتیں جھیلنی پڑیں۔ میں نے بہت سے تکلیف دہ واقعات سنے ہیں لیکن سب سے عجیب سرگزشت میری نظر سے گذری میری بہن (امیڈ اینی سلبیڈ) کی ترتیب دی ہوئی تھی۔ اس میں انھوں نے اپنے اور سول نافرمانی کی دوسری قیدی عورتوں کے بمبئی جیل کے تجربے درج کیے تھے۔

صوبۂ متحدہ میں ہماری تحریک کا زیادہ زور دیہاتی علاقہ میں تھا کسانوں کی طرف سے کانگریس حکومت پر برابر دباؤ ڈالتی رہی تھی اس لیے حکومت نے خاص رقم کی چھوٹ کا وعدہ کر لیا تھا۔ اگرچہ ہمارے نزدیک وہ کافی نہ تھی۔ ہماری گرفتاری کے بعد ہی اس چھوٹ کا اعلان کیا گیا

کیسی عجیب بات ہے کہ یہی اعلان فوراً پہلے نہ کیا گیا۔ ورنہ حالات میں بہت بڑا فرق پڑ جاتا۔ ہم ہرگز بے سوچے سمجھے اس کو رد نہ کر سکتے۔ لیکن دراصل حکومت کو تو یہ فکر تھی کہ اس چھوٹ کا سہرا کانگریس کے سر نہ ہو۔ اس لئے کہ ایک طرف تو اس نے کانگریس کو کچلنے کی کوشش کی اور دوسری طرف کسانوں کو خاموش کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ چھوٹ دی۔ ہمارا یہ بھی اندازہ ہے کہ جہاں کہیں کانگریس کا سب سے زیادہ زور پڑا تھا۔ وہیں سب سے زیادہ چھوٹ ملی۔

اگرچہ بہت معقول چھوٹ دی گئی تھیں۔ لیکن اس سے کسانوں کی مشکلات کا حل نہیں ہوا۔ البتہ انہیں کچھ سہولت ضرور ہو گئی۔ گویا حکومت نے کسانوں کی مخالفت کی شدت میں کمی کر دی۔ جس سے ملک کی عام تحریک وقتی طور پر کچھ کمزور پڑ گئی۔ اس تحریک کی وجہ سے یوپی کے ہزاروں کسانوں پر طرح طرح کی آفتیں نازل ہوئی تھیں جن سے بہت سے غریب بالکل تباہ ہو گئے تھے۔ لیکن اس تحریک کی وجہ سے لاکھوں کسانوں کو اس وقت جو زیادہ سے زیادہ چھوٹ مل سکتی تھی مل گئی اور سول نافرمانی کے شدائد سے (قطع نظر) وہ زبردست پریشانیوں سے بچ گئے۔ ان چھوٹے چھوٹے وقتی فائدوں سے کسانوں کا کچھ زیادہ کام نہیں چلا۔ لیکن اس میں ذرا شک نہیں ہے کہ جو کچھ بھی ملا وہ ان کوششوں کا نتیجہ تھا جو کسانوں کی حمایت میں صوبۂ متحدہ کی کانگریس کمیٹی برابر کام کرتی رہتی تھی۔ عارضی طور پر کسانوں کو اس سے فائدہ پہنچا۔ لیکن ان میں جو سب سے زیادہ بہادر تھے وہ جنگ میں کام آ گئے۔

دسمبر ۱۹۳۱ء میں جب صوبہ متحدہ میں خاص تعزیری ضابطہ نافذ ہوا تو اس کے ساتھ ایک توجیہی بیان بھی شائع ہوا۔ اس بیان میں، اس کے علاوہ اور بیانوں میں بھی جو دوسرے تعزیری ضوابط کے ساتھ شائع ہوئے۔

بہت کچھ جھوٹ بھی درج تھا۔ جس سے پروپاگنڈے کا کام لینا مقصود تھا۔ یہ بھی اس ابتدائی بازاری پروپاگنڈے کا ایک جزو تھا۔ اور ہمیں اس کا موقع بھی حاصل نہ تھا کہ ہم اس کا جواب دیں یا اس سفید جھوٹ کی تردید کرسکیں۔ البتہ ایک مرتبہ شیروانی پر اس طرح کا جھوٹ تراشا گیا تھا تو انھوں نے اپنی گرفتاری سے پہلے اس کی تردید کردی تھی۔ حکومت کے ان مختلف بیانوں اور معذرتوں کا مطالعہ بھی بہت دلچسپ تھا اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ حکومت کتنی بوکھلائی ہوئی تھی اور اس کے حواس کس حد تک جواب دے چکے تھے۔ کل اتفاق سے میں شاہ اسپین یورپین چارلس سوم کا ایک فرمان پڑھ رہا تھا جس کی رو سے انھوں نے یسوعی فرقے کو اپنی سلطنت سے نکالنے کا حکم صادر فرمایا تھا اسے پڑھ کر مجھے خواہ مخواہ حکومت ہند کے تعزیری ضوابط اور ان وجوہ کا خیال آگیا جو ان کی تائید میں پیش کی گئی تھیں۔ شاہ چارلس نے فروری ۱۷۶۷ء میں یہ فرمان جاری کیا تھا اور اس میں اپنے فعل کو اس طرح حق بجانب ٹھہرایا تھا کہ "رعایا میں فرماں برداری، امن و امان اور عدل و انصاف برقرار رکھنے کے سلسلے میں اپنی جانب پر جو فرض عائد ہوتا ہے اس کی وجہ سے، نیز دوسری ناگزیر اور ضروری وجوہ کی بناء پر جو اس جانب کے سینے میں محفوظ ہیں اپنے یہ فرمان نافذ کرنے پر مجبور ہوئے ہیں"۔

اسی طرح تعزیری ضوابط کی اصل وجوہ وائسرائے کے سینے میں یا ان کے مشیروں کے سینوں میں محفوظ ہیں۔ اگرچہ ہر شخص انھیں جانتا تھا۔ سرکاری طور پر جو وجوہ بیان کی گئیں ان سے ہمیں پروپگنڈے کی اس نوعیت کا پتہ چلا۔ جو حکومت برطانیہ ہندوستان میں شروع کرنے والی تھی۔ چند ماہ بعد ہمیں معلوم ہوا کہ نیم سرکاری وسائل اشتہارات بہت بڑی تعداد میں کام میں لائی

علاقوں میں تقسیم کیے گئے۔ ان میں طرح طرح کی بے سروپا باتیں درج تھیں۔ خصوصاً کانگریس پر یہ اتہام لگایا گیا تھا کہ اس کی وجہ سے زرعی پیداوار کا بھاؤ گر گیا جس سے کسانوں کو بہت نقصان پہنچا۔ یہ تو کانگریس کی انتہائی تعریف تھی۔ کیونکہ اگر وہ ساری دنیا میں کساد بازاری پیدا کر سکتی ہے تو اس کی قوتوں کا کیا ٹھکانا ہے۔ لیکن اس جھوٹ کی بڑے اہتمام کے ساتھ متواتر اشاعت کی گئی تاکہ کانگریس کے وقار کو صدمہ پہنچے۔

ان سب باتوں کے باوجود، صوبۂ متحدہ کے خاص خاص اضلاع کے کسانوں نے سول نافرمانی کی دعوت کا جو بعض جگہ لازمی طور پر چھوٹ وغیرہ کے مقامی جھگڑوں کے ساتھ گڈمڈ ہو گئی تھی بڑا پرجوش خیر مقدم کیا۔ ۱۹۳۰ء کے مقابلہ میں اس مرتبہ کسان زیادہ منظم طریقہ سے اور زیادہ بڑی تعداد میں تحریک میں شریک ہوئے۔ شروع شروع میں تو اس میں خاصا خوش دلی کا رنگ تھا۔ میں نے اسی قسم کا ایک بہت دلچسپ قصہ سنا ہے۔ ضلع رائے بریلی کے موضع بکولیہ میں پولیس کے کچھ لوگ عدم ادائیگی لگان کی وجہ سے قرقی کے کر گئے۔ یہ گاؤں بہت خوش حال تھا اور اس کے باشندے فراخ دل والے تھے۔ وہ پولیس اور مال کے افسروں سے بڑے اخلاق سے پیش آئے اور اپنے گھروں کے دروازے کھلے چھوڑ کر خندہ پیشانی سے ان سے کہا کہ جہاں آپ کا جی چاہے تشریف لے جائیے۔ ان لوگوں نے چند مویشی وغیرہ قرق کر لئے۔ اس کے بعد گاؤں والوں نے ان افسروں کی پان تمباکو سے خاطر کی اور یہ بے چارے بہت خفیف اور شرمندہ ہو کر واپس گئے۔ لیکن یہ تو ایک غیر معمولی واقعہ تھا۔ رفتہ رفتہ رواداری، خوش دلی اور انسانی شرافت کا یہ جذبہ بہت کم ہو گیا۔ بے چارہ موضع بکولیہ اپنی

خوش دلی کی وجہ سے سزا سے بچ نہ سکا اور اسے اپنی دلیری کی سزا بھگتنی پڑی۔

ان اضلاع میں بہتیروں لوگوں نے لگان ادا نہیں کیا۔ اور غالباً گرمیوں کے شروع میں تھوڑا بہت لگان پہنچنا شروع ہوا۔ یہاں بڑی بڑی تعداد میں گرفتاریاں بھی ہوئیں۔ لیکن یہ حکومت کی عام پالیسی کے خلاف تھا کیونکہ اس وقت وہ عموماً خاص خاص کارکنوں اور دیہات کے لیڈروں کو گرفتار کرتی تھی۔ باقی لوگ صرف مارپیٹ کرکے چھوڑ دئے جاتے تھے۔ جیل بھیجنے اور گولی چلانے سے مارپیٹ زیادہ قرین مصلحت معلوم ہوتی تھی۔ کیونکہ اس کا حسب ضرورت بار بار اعادہ کیا جا سکتا تھا۔ یہ دور دست دیہاتی علاقوں میں ہوتی تھی۔ اس لئے باہر والوں کو اس کی خبر نہیں ہوتی تھی پھر بھی تھا کہ اس طرح جیل خانوں میں قیدیوں کی تعداد بھی زیادہ بڑھنے نہیں پاتی تھی۔ مارپیٹ کے علاوہ لاتعداد بے دخلیاں اور قرقیاں بھی ہوئیں اور املاک و مویشی بھی کثرت سے فروخت کئے گئے۔ کسان اپنے کلیجہ پر پتھر رکھ کر یہ دیکھتے تھے کہ ان کے پاس جو تھوڑا بہت اثاثہ ہے وہ بھی ان سے چھین رہا ہے اور ان کی آنکھ کے سامنے کوڑیوں کے مول بک رہا ہے۔

حکومت نے ہندوستان بھر کی بے شمار عمارتوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ اسی سلسلہ میں اس نے سوراج بھون بھی ضبط کر لیا۔ اس عمارت میں کانگریس کا اسپتال قائم تھا۔ چنانچہ اس کے تمام قیمتی ساز و سامان پر بھی حکومت کا قبضہ ہو گیا چند روز تک تو یہ اسپتال بالکل بند رہا۔ پھر قریب ہی کے ایک چمن میں کھلے میدان میں دوبارہ جاری کر دیا گیا۔ چند روز بعد وہ سوراج بھون کے متصل ایک چھوٹی سی عمارت میں منتقل ہو گیا اور یہاں کوئی دو ڈھائی سال

تک جاری رہا۔

یہ افواہ بھی تھی کہ ہمارا سکونتی مکان آنند بھون بھی ضبط ہو جائے گا۔ کیونکہ میں نے انکم ٹیکس کا یہ حصہ ادا کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ یہ رقم ۱۹۳۰ء میں والد کی آمدنی پر تشخیص ہوئی تھی۔ لیکن انھوں نے سول نافرمانی کی وجہ سے ادا نہیں کی تھی۔ ۱۹۳۱ء میں دہلی کے صلح نامے کے بعد انکم ٹیکس افسروں سے میری کچھ بحث ہوئی۔ آخر کار میں اسے ادا کرنے کو تیار ہو گیا۔ بلکہ ایک قسط ادا بھی کر دی تھی۔ اس کے بعد ہی تعزیری ضوابط نافذ ہوئے اور میں نے طے کیا کہ اب کوئی رقم ادا نہیں کروں گا مجھے یہ قطعاً نامناسب بلکہ ناجائز معلوم ہوتا تھا کہ کسانوں کو تو میں لگان ادا نہ کرنے کی تلقین کروں اور خود انکم ٹیکس ادا کر دوں۔ غرض مجھے یہ توقع تھی کہ حکومت ہمارا مکان بھی قرق کر لے گی۔ اس خیال ہی سے میرا دل دکھتا تھا۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ اس طرح میری والدہ کو گھر چھوڑنا پڑے گا۔ ہماری کتابیں، کاغذات اور وہ ساز و سامان جو ہمیں بعض ذاتی وجوہ کی بناء پر بہت عزیز تھا غیروں کے ہاتھ میں چلا جائے گا اور ممکن ہے سب برباد ہو جائے۔ نیز قومی جھنڈا اتار کر یونین جیک لہرا دیا جائے گا۔ بخلاف اس کے گھر ہاتھ سے نکل جانے میں مجھے ایک خوبی بھی معلوم ہوئی۔ میں نے سمجھا کہ اس طرح میں کسانوں سے جو بے چارے اپنے گھر بار سے محروم کیے جا رہے ہیں نزدیک تر ہو جاؤں گا اور ان کے دل بڑھ جائیں گے۔ تحریک پر یقیناً اس کا بہت اچھا اثر پڑتا لیکن حکومت نے یہ مناسب نہ سمجھا اور ہمارے گھر کو ہاتھ نہیں لگایا۔ شاید اس نے میری ماں کا کچھ خیال کیا ہو یا شاید یہ صحیح اندازہ کر لیا ہو کہ اس سے سول نافرمانی کو تقویت پہنچے گی۔ کئی مہینے بعد حکومت کو میرے ریلوے کے چند

حصّوں کا پتہ چلا اور وہ اس نے انکم ٹیکس کے حساب میں قرق کر لئے۔ میری اور میرے بہنوئی کی موٹریں تو پہلے ہی قرق کرکے فروخت ہو چکی تھیں۔

اس زمانہ میں ایک چیز سے مجھے بڑی کوفت ہوئی یعنی مختلف میونسپلٹیوں اور پبلک اداروں نے خصوصاً کلکتہ کارپوریشن نے جس میں کانگریسی اراکین کی اکثریت بیان کی جاتی تھی اپنی عمارتوں پر سے قومی جھنڈا اتار دیا۔ انھوں نے یہ حرکت حکومت اور پولیس کے دباؤ سے کی تھی کیونکہ انھیں یہ دھمکی دی گئی تھی کہ اگر تم نے حکم کی تعمیل نہ کی تو سخت تدارک کیا جائے گا۔ عدول حکمی کا زیادہ سے زیادہ یہ نتیجہ ہوتا کہ میونسپلٹی کو معطل کر دیا جاتا یا ممبروں کو سزا ہوتی۔ لیکن بڑے ادارے جو مستقل حقوق رکھتے ہیں عموماً بزدل ہوتے ہیں۔ اس لئے انھیں وہی کرنا چاہئے تھا جو انھوں نے کیا پھر بھی مجھے اس سے سخت تکلیف ہوئی۔ یہ جھنڈا ہمارے لئے ان چیزوں کا نشان بن گیا ہے جو ہمیں بہت عزیز ہیں۔ اور اس کے سایہ کے نیچے ہم نے بارہا ان کی عزت وقار کو برقرار رکھنے کی قسمیں کھائی ہیں۔ اس لئے اسے اپنے ہاتھ سے اتارنا یا اپنی رضامندی سے اتروانا نہ صرف عہد شکنی بلکہ ہتک حرمت ہے۔ یہ گویا روح کی ذلت اور حق کا انکار یا زبردست کے ڈر سے باطل کا اقرار ہے جن لوگوں نے اس طرح حکومت کے آگے سر جھکا دیا انھوں نے قوم کو ذلیل کیا اور اس کی خودداری کو صدمہ پہنچایا۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ انھیں سورما بن کر آگ میں کود پڑنا چاہئے تھا۔ دوسروں کو اس بنا پر الزام دینا بالکل غلط بلکہ حماقت ہے کہ وہ صفِ اول میں کیوں نہیں آئے۔ جیل کیوں نہیں گئے مصیبتیں اور نقصان کیوں نہیں اٹھائے۔

ہر شخص پر بہت سے فرائض اور ذمہ داریوں کا بار ہوتا ہے۔ اور ہر ایک اپنے حالات کو خود بہتر سمجھ سکتا ہے۔ اس لئے کسی دوسرے کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنے آپ حکم بن کر اس کا فیصلہ کرے۔ لیکن میدان میں نہ آنا اور چیز ہے۔ اور حق سے یا اس چیز سے جسے انسان حق سمجھتا ہو منھ موڑنا اور بات ہے۔ میونسپلٹی کے ممبروں کو اگر قومی عزت کے خلاف کوئی حکم دیا جاتا اور اس کی خلاف ورزی کی ان میں جرأت نہ ہوتی تو انھیں رکنیت سے استعفیٰ دے دینا چاہیے تھا۔ لیکن عام طور پر انھوں نے ایسا نہیں کیا اور اپنی نشستوں پر چپکے رہے۔

تھامس مور نے کہا ہے "جس طرح شہد کی مکھیاں پھولوں پر بیٹھ کر بھنبھنانا بند کر دیتی ہیں
اسی طرح دھکا جماعت والے جب وزارت کی کرسی پر بیٹھتے ہیں تو ان کی زبانیں بند ہو جاتی ہیں"

بہر حال ایسے ناگہانی نازک موقع پر جہاں انسان بدحواس ہو جاتا ہو کسی کے رویہ پر اعتراض کر لینا بے انصافی ہے۔ کبھی کبھی بڑے بہادروں کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ گذشتہ جنگ عظیم میں بارہا دیکھنے میں آیا ہے۔ اس سے پہلے ۱۹۱۲ء میں جب ٹیٹانک جہاز تباہ ہوا تو بڑے بڑے مشہور لوگوں نے جن کے متعلق خواب میں بھی بزدلی کا تصور نہیں کیا جا سکتا تھا جہاز رانوں کو رشوت دے دے کر بچنے کی کوشش کی۔ اور دوسروں کو ڈوبنے کے لئے چھوڑ دیا۔ حال ہی میں جب مورو کاسل جہاز میں آگ لگی اس وقت بھی بڑے شرمناک حالات دیکھنے میں آئے۔ کون جانتا ہے کہ ایسے ناگہانی موقع پر جب ضبط و عقل پر حیوانی جبلت غالب آجاتی ہے خود ہمارا کیا

عمل ہوا، اس لئے ہمیں دوسروں کو برا نہیں کہنا چاہئے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہم صحیح راستے سے بھٹکنے پر خاموش رہیں اور آئندہ اس کی احتیاط نہ کریں کہ قوم کی کشتی کو کھینے کا کام ایسے ہاتھوں میں نہ دیا جائے جو تھرتھراتے ہوں اور ضرورت کے وقت جواب دے دیں۔ اور اپنی ناکامی کی تاویلیں کرنا اور اسے صحیح قرار دینا اس سے بھی برا ہے۔ عذر گناہ بدتر از گناہ۔

دو قوتوں کی جنگ زیادہ تر اخلاقی نظم اور ہمت پر مبنی ہوتی ہے سخت سے سخت لڑائی کا دارومدار انہیں چیزوں پر ہے۔ مارشل فوش فرماتے ہیں "آخر کار جنگ میں اسی کو فتح ہوتی ہے جس کی ہمت بندھی رہے۔" پرامن جنگ میں تو اخلاقی نظم اور ہمت کی اور زیادہ ضرورت ہے۔ اس لئے جو شخص اپنے عمل سے اس اخلاقی نظم کو نقصان پہنچاتا ہے یا قوم کی ہمت کو پست کرتا ہے وہ اپنے ملک کے ساتھ غداری کرتا ہے۔

مہینے گذرتے گئے اور روز کی اچھی بری خبریں ہمارے پاس پہنچتی رہیں یہاں تک کہ ہم اپنی اپنی جیلوں میں وہاں کے کھانے اور روزمرہ زندگی کے عادی ہوگئے۔ اس کے بعد قومی ہفتہ کا زمانہ (۶ اپریل تا ۱۳ اپریل) آیا۔ ہم جانتے تھے کہ اس زمانہ میں بہت سے غیر معمولی واقعات ہوں گے اور یہی ہوا لیکن میرے لئے تو ایک حادثہ کے سامنے سب کچھ ماند پڑ گیا۔ الہ آباد میں میری والدہ ایک جلوس میں شامل تھیں۔ پولیس نے اس جلوس کو راستے میں روکا اور لاٹھی چارج کیا۔ جس وقت جلوس روکا گیا تو کسی نے میری والدہ کے لئے ایک کرسی لاکر ڈال دی۔ وہ سڑک پر جلوس کے آگے بیٹھی تھیں۔ چند لوگ خاص طور پر ان کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔ جن میں میرا سکریٹری بھی شامل تھا۔ ان سب کو پولیس گرفتار کرکے لے گئی اس کے بعد حملہ شروع

ہوا۔ میری والدہ کرسی پر سے گر پڑیں اور پے در پے ان کے سر پر کئی بید
پڑے۔ ان کا سر پھٹ گیا اور خون بہنے لگا۔ جس کی وجہ سے وہ بے ہوش
ہو گئیں۔ اسی حالت میں وہ سڑک پر پڑی ہوئی تھیں جو اب بالکل اور
جلوس والوں سے صاف ہو گئی تھی۔ کچھ عرصہ بعد ایک پولیس افسر نے انھیں
وہاں سے اٹھایا اور اپنی موٹر میں آنند بھون پہنچا دیا۔

اسی رات کو الہ آباد میں یہ افواہ پھیل گئی کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ چنانچہ
فوراً غصہ سے بھرے ہوئے لوگ جمع ہو گئے اور انھوں نے امن اور عدم تشدد
کو پس پشت ڈال کر پولیس پر حملہ کر دیا۔ پولیس نے گولی چلائی جس کا نتیجہ
یہ ہوا کہ بہت سے لوگ ہلاک ہو گئے۔

ہمیں صرف ایک ہفتہ وار اخبار پڑھنے کو ملتا تھا۔ جب اس حادثہ کے چند روز
بعد ہمیں یہ خبر ملی تو میرے دل پر یہ تصور کر کے ایک چوٹ سی لگی کہ میری
نحیف بوڑھی ماں سڑک کے گرد و غبار میں خون میں لت پت پڑی
تھیں۔ اگر میں وہاں موجود ہوتا تو نہ جانے خود میرا کیا رویہ ہوتا۔ معلوم
نہیں خود میں عدم تشدد پر کہاں تک قائم رہتا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ
پچھلے بارہ برس میں میں نے جو سبق سیکھنے کی کوشش کی تھی۔ یہ دردناک
منظر دیکھ کر میں وہ سب کچھ بھول جاتا۔ اور شاید مجھے ذاتی یا قومی
مصالح کا بھی کوئی خیال نہ رہتا۔

رفتہ رفتہ وہ اچھی ہو گئیں۔ لیکن اگلے مہینے میں جب وہ مجھ سے
بریلی جیل میں ملنے آئی تھیں اس وقت تک ان کے پٹی بندھی ہوئی تھی۔
بہر حال وہ بہت خوش تھیں اور اس پر فخر کرتی تھیں کہ اپنے لڑکوں اور
لڑکیوں کے ساتھ انھیں بھی بید اور لاٹھیاں کھانے کا موقع ملا۔ لیکن



سروپ رانی نہرو

ان کی یہ صحت یابی حقیقی نہیں بلکہ محض ظاہری تھی اور اس ضعیف العمری میں انھیں جو شدید صدمہ پہنچا اس نے ان کے سارے نظام کو ہلا ڈالا۔ اور ان پرانی شکایات کو ابھار دیا جنھوں نے ایک سال بعد بڑی خطرناک صورت اختیار کرلی۔

بریلی اور دہرہ دون کی جیلوں میں

چھ ہفتے نینی جیل میں رہنے کے بعد میں بریلی کی ڈسٹرکٹ جیل میں بھیج دیا گیا میری صحت پھر خراب ہو گئی تھی۔ اور روز حرارت ہو جاتی تھی جس کی وجہ سے طبیعت پریشان تھی۔ چار مہینہ کے بعد جب کہ شاید گرمی بڑھ رہی تھی میں بریلی جیل سے منتقل کر دیا گیا اور اب کی بار ایک ٹھنڈی جگہ بھیجا گیا یعنی دہرہ دون کی جیل میں۔ جو ہمالیہ پہاڑ کے دامن میں واقع ہے۔ یہاں میں مسلسل ساڑھے چودہ مہینے یعنی قریب قریب اپنی دو سال کی میعاد کے ختم تک رہا۔ ملاقاتوں، خطوں اور منتخب اخباروں کے ذریعے سے مجھے باہر کی تھوڑی بہت خبریں تو پہنچ جاتی تھیں مگر پھر بھی مجھے بہت سی باتوں کی مطلق خبر نہ تھی۔ صرف خاص خاص واقعات کا ایک دھندلا سا تصور ذہن میں تھا۔

جیل سے رہا ہونے کے بعد میں اپنے ذاتی معاملات اور اس وقت کے سیاسی حالات میں الجھا رہا۔ کوئی ساڑھے پانچ مہینہ کے بعد پھر قید خانے میں پہنچ گیا اور اب بھی یہیں ہوں۔ اسی طرح پچھلے ساڑھے تین برس میں میرا وقت زیادہ تر جیل میں گذرا اور میں واقعات سے بے خبر رہا۔ مجھ کو اس کا موقع ہی کب ملا کہ جو کچھ ملک میں ہو رہا ہے اس سے تفصیلی واقفیت حاصل کرتا۔ مجھے ابھی تک اچھی طرح نہیں معلوم ہے کہ دوسری گول میز کانفرنس میں جس میں گاندھی جی نے شرکت کی تھی پردے کے پیچھے کیا کیا ہوا۔ میں ان سے اس مسئلہ پر گفتگو کر سکا نہ اور

واقعات پر اس عرصہ میں پیش آئے۔

مجھے ۱۹۳۲ء اور ۱۹۳۳ء کے حالات کا اتنا علم نہیں ہے کہ اس زمانہ میں قومی تحریک کے نشوونما دکھا سکوں مگر چونکہ میں اس کی بنیاد سے واقف تھا اور کام کرنے والوں کو بھی جانتا تھا اس لئے بہت سے چھوٹے چھوٹے واقعات کی حقیقی اہمیت کو سمجھ سکتا تھا۔ اسی طرح مجھے تحریک کی عام رفتار کا خاصا اندازہ تھا پہلے چار پانچ مہینہ سول نافرمانی بڑے زور شور سے چلتی رہی۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ دھیمی پڑتی گئی۔ البتہ بیچ میں کبھی کبھی بھڑ بھڑک اٹھتی تھی۔ علی جدوجہد کی انقلابی شدت تھوڑے ہی دن رہ سکتی ہے۔ اس کا ایک حالت پر قائم رہنا ناممکن ہے۔ یا بڑھتی ہے یا گھٹتی ہے۔ چنانچہ سول نافرمانی بھی پہلے سال میں آہستہ آہستہ گھٹنے لگی مگر اس دھیمی رفتار سے وہ بہت مدت تک جاری رہ سکتی تھی۔ خلاف قانون قرار دئے جانے کے باوجود کانگریس کا نظام خاصی کامیابی سے چلتا رہا۔ وہ صوبوں کے کارکنوں کے کام سے باخبر رہتی تھی۔ انھیں ہدایتیں بھیجتی تھی۔ ان سے رپورٹیں منگاتی تھی اور کبھی کبھی انھیں مالی امداد بھی دیتی تھی۔

صوبوں کی کانگریس کمیٹیاں بھی کم وبیش کامیابی سے چلتی رہیں۔ اس سارے عرصے میں جب میں جیل میں تھا مجھے دوسرے صوبوں کے کچھ زیادہ حالات معلوم نہیں ہو سکے۔ مگر رہائی کے دنوں میں صوبۂ متحدہ کی جدوجہد کے متعلق کچھ معلومات حاصل ہوئی۔ اس صوبہ کی کانگریس ۱۹۳۲ء میں تمام سال اور ۱۹۳۳ء کے وسط تک باقاعدہ کام کرتی رہی۔ یہاں تک کہ کانگریس کے قائم مقام پریسیڈنٹ نے گاندھی جی کے مشورے سے سول نافرمانی ملتوی کر دی۔ اس عرصہ میں اکثر اضلاع کو ہدایتیں بھیجی جاتی تھیں چھپے ہوئے یا سائکلوسٹائل سے لکھے ہوئے خبرنامے باقاعدہ شائع کئے ہوئے تھے۔ اضلاع کے کام وقتاً فوقتاً

معائنہ کیا جاتا تھا۔ اور قومی کارکنوں کو اُن میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ یہ کام زیادہ تر خفیہ طور پر کرنا پڑتا تھا۔ مگر صوبہ کی کانگریس کمیٹی کا سکریٹری جو دفتر وغیرہ کا نگراں ہوتا تھا کھلم کھلا کام کرتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ گرفتار ہو جاتا تھا۔ اور اس کی جگہ دوسرا شخص آجاتا تھا۔

۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۲ء کے تجربہ سے ہمیں یہ معلوم ہوا کہ ہم تمام ہندوستان میں خفیہ خبر رسانی کا سلسلہ آسانی سے قایم کر سکتے ہیں۔ اگرچہ کچھ زیادہ کوشش نہیں کی گئی اور برابر مزاحمت ہوتی رہی پھر بھی ہمیں کافی کامیابی حاصل ہوئی مگر ہم میں سے بہت لوگوں کا یہ خیال تھا کہ خفیہ طور پر کام کرنا سول نافرمانی کے اصول کے ساتھ نہیں کھپتا اور اس سے عام لوگوں میں بیداری پیدا نہیں ہوتی بلکہ افسردگی سی چھا جاتی ہے۔ اگر عام تحریک بڑے پیمانہ پر جاری ہو تو اس کے ساتھ تھوڑی سی بہت خفیہ کارروائی بھی مفید ہو سکتی ہے۔ مگر اس میں ہمیشہ یہ خطر رہتا ہے خصوصاً اس وقت جب تحریک کا زور گھٹ رہا ہو، کہ کہیں یہ کم و بیش بے اثر خفیہ کارروائیاں عام تحریک کی جگہ نہ لے لیں۔ گاندھی جی نے جولائی ۱۹۳۳ء میں خفیہ کارروائیوں کو ناپسندیدہ قرار دیا۔

صوبہ متحدہ کے علاوہ گجرات اور کرناٹک میں بھی کچھ دن تک کسانوں کی محصول نہ دینے کی تحریک چلتی رہی۔ گجرات اور کرناٹک دونوں جگہ کاشتکار اپنی زمین کے مالک ہیں۔ انھوں نے حکومت کو مال گذاری ادا کرنے سے انکار کیا اور اس کی وجہ سے انھیں بہت سخت نقصان پہنچا۔ کانگریس کی طرف سے تھوڑی بہت کوشش کی گئی کہ مصیبت زدوں کی مدد کی جائے اور بیدخلیوں اور املاک کی ضبطیوں سے جو نقصان پہنچا تھا اس کی تلافی کی جائے۔ ظاہر ہے مگر کوشش بہت محدود تھی۔ صوبہ متحدہ میں کانگریس کمیٹی نے بے دخل کسانوں

کی مدد کی کوئی کوشش نہیں کی۔ یہاں مسئلہ بہت بڑا تھا اس صوبے میں اسامیوں کی تعداد زمیندار کاشتکاروں سے بہت زیادہ تھی اور رقبہ بھی بہت وسیع تھا اور کانگریس کمیٹی کے پاس روپیہ بہت کم تھا۔ یہاں ہزاروں آدمیوں کو اس تحریک کی وجہ سے نقصان پہنچا تھا۔ ان سب کی مدد کرنا ناممکن تھا اور ان میں اور دوسرے کاشتکاروں میں جو خود فاقے کر رہے تھے تفریق کرنا بھی مشکل تھا۔ اگر دو چار ہزار آدمیوں کی مدد بھی کی جاتی تو اس سے جھگڑے پڑ جاتے اور بد دلی پھیل جاتی۔ اس لیے ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ ہم کوئی مالی امداد نہیں دیں گے یہ بات کاشتکاروں کو پہلے ہی سے سمجھا دی گئی اور انھوں نے ہماری مشکلات کو تسلیم کر لیا تھا۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ انھوں نے کیسی کیسی تکلیفیں اٹھائیں اور اُف تک نہ کی۔ البتہ جہاں تک ممکن تھا ہم نے بعض افراد کی خصوصاً جیل جانے والے کارکنوں کے بال بچوں کی مدد کی۔ اس بدنصیب ملک کے افلاس کا یہ عالم ہے کہ ایک روپیہ مہینہ بھی ان کے لئے بڑی نعمت تھی۔

اس سارے عرصہ میں صوبۂ متحدہ کی کانگریس کمیٹی (جو خلاف قانون قرار دے دی گئی تھی) اپنے اجرت پر کام کرنے والے کارکنوں کو قلیل مقررہ الاؤنس دیتی رہی اور جب وہ باری باری سے جیل جاتے تھے تو ان کے خاندان کی خبر گیری کی جاتی تھی۔ یہ بجٹ کی سب سے بڑی مد تھی۔ اس کے بعد اشتہاروں وغیرہ کی چھپائی کا نمبر تھا۔ یہ بھی خاصی رقم ہو جاتی تھی۔ ایک اور بڑی مد سفر خرچ کی تھی اور اس کے علاوہ جن اضلاع کی کمیٹیوں کی مالی حالت اچھی نہیں تھی انہیں کچھ امداد دی جاتی تھی۔ ان سب مصارف کے باوجود صوبۂ متحدہ کی کانگریس کمیٹی نے بیس مہینہ میں جنوری سنہ ۱۹۳۲ء سے آخر اگست سنہ ۳۳ء تک جب وہ ایک طاقتور حکومت کے ساتھ زبردست لڑائی لڑ رہی تھی کل ترسٹھ ہزار روپیہ یعنی تقریباً تین ہزار

ایک سو چالیس روپے ماہوار خرچ کیا (اس رقم میں الہ آباد، کانپور، آگرہ، لکھنؤ وغیرہ کی خوش حال ضلع کمیٹیوں کے علیحدہ مصارف شامل نہیں ہیں) صوبہ متحدہ ۳۲ء اور ۳۳ء میں سارے وقت تحریک میں پیش پیش رہا اور میرے خیال میں جتنا کام اس نے کیا اس کے مقابلہ میں یہ خرچ بہت ہی کم ہے۔ اس چھوٹی سی رقم کا بھلا ان اخراجات سے کیا مقابلہ ہے جو صوبہ کی حکومت نے سول نافرمانی کو دبانے کے لئے برداشت کئے۔ میرا قیاس ہے (اگرچہ مجھے ٹھیک معلوم نہیں) کہ کانگریس کے بعض اور بڑے بڑے صوبوں نے اس سے بہت زیادہ خرچ کیا۔ بہار کانگریس کے نقطۂ نظر سے اپنے ہمسائے صوبۂ متحدہ سے بھی غریب ہے پھر بھی اس کا کام اس تحریک میں نہایت شاندار تھا۔

غرض سول نافرمانی رفتہ رفتہ دھیمی پڑتی گئی۔ مگر پھر بھی وہ کسی نہ کسی حد تک جاری رہی۔ البتہ اس میں عام تحریک کا رنگ کم ہوتا گیا۔ حکومت کی سختیوں سے قطع نظر کر کے اسے پہلا سخت دھچکا ستمبر ۱۹۳۲ء میں پہنچا جب کہ گاندھی جی نے ہریجنوں کے معاملے کی وجہ سے پہلی بار برت رکھا۔ اس برت سے عام لوگوں میں جوش اور بیداری پیدا ہوئی مگر اس نے دوسرا رخ اختیار کر لیا۔ مئی ۱۹۳۳ء میں سول نافرمانی کے التوا کا اعلان کر دیا گیا اور وہ عملی طور پر ختم ہو گئی۔ اس کے بعد بھی وہ اصولی طور پر باقی تھی۔ مگر اس پر عمل بہت کم ہوتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اگر التوا نہ کیا جاتا تب بھی وہ رفتہ رفتہ ٹھنڈی پڑ جاتی۔ حکومت کے جبر و تشدد نے سارے ہندوستان کو سن کر دیا تھا۔ مجموعی طور پر قوم کی اعصابی قوت ختم ہو چکی تھی اور کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو اسے ابھارے۔ انفرادی طور پر بہت سے لوگ تھے جو سول نافرمانی کر سکتے تھے مگر وہ ایک مصنوعی فضا میں کام کر رہے تھے۔

جیل میں اس عظیم الشان تحریک کے رفتہ رفتہ گھٹنے کی خبر سن کر ہم کو بڑی تکلیف

ہوئی۔ حالانکہ ہم میں سے بہت کم لوگ ایسے تھے جنھیں فوری کامیابی کی امید ہو۔ ایک خفیف سا احتمال ضرور تھا کہ اگر عام لوگ پورے جوش کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوں تو شاید کوئی فوری نتیجہ ظاہر ہو سکتا ہے۔ مگر اس پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تھا اس لئے ہم لوگوں کو یہی توقع تھی کہ لڑائی بہت طول کھینچے گی۔ بڑے بڑے نشیب و فراز دیکھنے پڑیں گے۔ صدہا مشکلات کا سامنا ہوگا۔ تب کہیں آہستہ آہستہ عام لوگوں میں انضباط، اتحاد عمل اور اتحاد خیال پیدا ہوگا۔ ۱۹۳۲ء کے شروع میں کبھی کبھی اس خیال سے ایک خوف سا ہوتا تھا کہ کہیں ہمیں بہت جلد ظاہری کامیابی نہ حاصل ہو جائے کیونکہ اس کا نتیجہ لازمی طور پر یہ ہوتا کہ کانگریس مصالحت کر لیتی اور اس سے گورنمنٹ کے آدمیوں اور مطلب پرستوں کی بن آتی۔ ۱۹۳۱ء کے تجربے نے ہماری آنکھیں کھول دی تھیں۔ کامیابی اسی حالت میں مفید ہو سکتی ہے جب عام لوگوں میں اتنی قوت اور ان کے خیال میں اتنی وضاحت ہو کر وہ اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ ورنہ یہی ہوگا کہ عام لوگ تو لڑیں گے اور قربانیاں کریں گے اور عین وقت پر دوسرے لوگ آکر مزے میں مال غنیمت پر قبضہ کر لیں گے۔ اس کا بہت سخت اندیشہ تھا۔ اس لئے کہ خود کانگریس کے اندر لوگوں کے خیالات بہت الجھے ہوئے تھے۔ اور ان کے سامنے کوئی واضح تصور نہ تھا کہ وہ کس قسم کی حکومت یا سماج چاہتے ہیں۔ بعض کانگریسی تو اس خیال کے تھے کہ موجودہ نظام حکومت میں کچھ زیادہ تبدیلی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس برطانوی حکام کو ہٹا کر ان کی جگہ سودیشی چھاپ کے لوگوں کو مقرر کر دینا کافی ہے۔

خاص قسم کے حکومت پرستوں سے کچھ زیادہ اندیشہ نہیں تھا کیونکہ ان کا ایمان تو یہ ہے کہ جو حکومت بھی ہو اس کی اطاعت کی جائے۔ ان کے

علاوہ لبرل پارٹی اور تعاونی پارٹی بھی تقریباً پورے طور پر برطانوی حکومت کی ہم خیال تھی۔ اور ان کی طرف سے جو نکتہ چینی ہوتی رہی تھی اس کا نہ کوئی اثر تھا نہ کوئی قدر و قیمت۔ سب جانتے تھے کہ یہ لوگ تو ہر حال میں قانون کے بندے ہیں۔ اور اس لئے ان سے یہ توقع ہو ہی نہیں سکتی تھی کہ سول نافرمانی کو پسند کریں گے۔ مگر انھوں نے صرف ناپسندیدگی کے اظہار پر اکتفا نہیں کی بلکہ کم و بیش حکومت کے دست و بازو بن گئے۔ ہر قسم کی قانونی آزادی چھینی جا رہی تھی اور وہ بیٹھے ہوئے چپ چاپ تماشا دیکھ رہے تھے۔ حکومت صرف سول نافرمانی کو توڑنا اور دبانا نہیں چاہتی تھی بلکہ ہر قسم کی سیاسی زندگی اور پبلک جد و جہد کو روکنا چاہتی تھی۔ مگر اس کی مخالفت میں ایک آواز بھی نہ اٹھی۔ جو لوگ قانونی آزادی کی حمایت کیا کرتے تھے وہ سب لڑائی میں شریک تھے۔ اور حکومت کے جبر و تشدد کے آگے سر نہ جھکانے کی سزا بھگت رہے تھے۔ دوسرے لوگوں نے ڈر کے مارے ذلت سے سر تسلیم خم کر دیا اور نکتہ چینی کی جرأت نہیں کی۔ اگر کبھی کچھ ہلکی سی نکتہ چینی ہوتی بھی تھی تو بہت نیاز مندانہ لہجہ میں اور اس کے ساتھ کانگریس کو اور تحریک میں شریک ہونے والوں کو دل کھول کر برا بھلا بھی کہا جاتا تھا۔

مغربی ملکوں میں رائے عامہ پوری قوت سے قانونی آزادی کی حمایت کرتی ہے۔ اور اگر اس میں مداخلت کی جائے تو بیزاری اور مخالفت کا طوفان برپا ہو جاتا ہے (شاید اب یہ بات ایک قصہ پارینہ ہو گئی ہے) بہت سے ایسے لوگ ہیں کہ خود عملی جد و جہد میں شریک ہونا نہیں چاہتے۔ مگر وہ تقریر و تحریر کی آزادی، جلسوں اور انجمنوں کی آزادی، اشخاص اور اخبارات کی آزادی کی اتنی قدر کرتے ہیں کہ ہمیشہ اس کے لئے احتجاج کرتے رہتے ہیں اور حکومت کے استبداد کو روکنے میں مدد دیتے ہیں۔ ہندوستان کی لبرل جماعت کا یہ دعویٰ ہے

دعویٰ ہے کہ وہ کس حد تک انگلستان کی لبرل پارٹی کی روایات کی حامل ہے۔ حالانکہ اصل میں ان دونوں میں نام کے سوا کوئی چیز مشترک نہیں۔ ان سے یہ توقع ہوسکتی تھی کہ وہ قانونی آزادی کی پامالی کی کم سے کم اصولی مخالفت کرے گی کیونکہ خود اسے بھی اس سے نقصان پہنچتا ہے۔ مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ والٹیر کی ہم زبان ہو کر کہتی "تم جو کچھ کہتے ہو اس کا میں قطعاً مخالف ہوں مگر میں مرتے دم تک تمہارے اس حق کی حمایت کروں گا جو کچھ کہنا چاہتے ہو وہ کہہ سکو"۔

شاید انہیں الزام دینا بے انصافی ہے۔ کیونکہ انھوں نے کبھی آزادی اور جمہوریت کا حامی ہونے کا دعویٰ نہیں کیا اور موقع ایسا تھا کہ اگر کوئی ایسی ویسی بات ان کی زبان سے نکل جاتی تو بے چارے مصیبت میں پڑ جاتے۔ البتہ یہ دیکھنا چاہیے کہ آزادی کے قدیم علم بردار برطانوی لبرل اور لیبر پارٹی کے نئے اشتراکی ہندوستان میں حکومت کے جبر و تشدد سے کس حد تک متاثر ہوئے۔ وہ اس دردناک منظر کو خاصے اطمینان اور سکون سے دیکھتے رہے اور کبھی کبھی اس پالیسی کے متعلق جسے مانچسٹر گارجین کا نامہ نگار "جبر و تشدد کا سائنٹفک استعمال" کہتا ہے۔ پسندیدگی کا اظہار بھی کرتے رہے۔ حال میں انگلستان کی نیشنل گورنمنٹ نے "قانون بغاوت" کا مسودہ پاس کرنے کی کوشش کی تھی اور اس پر لبرل پارٹی اور لیبر پارٹی کی طرف سے بڑی لے دے ہوئی تھی۔ اس پر جو اعتراضات کئے گئے ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ یہ تقریر کی آزادی میں مداخلت کرتا ہے اور مجسٹریٹوں کو تلاشی کا وارنٹ جاری کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ میں جب ان اعتراضات کو پڑھتا تھا تو دل سے ان کی تائید کرتا تھا۔ اور اسی کے ساتھ میری آنکھوں میں ہندوستان کی تصویر پھرنے لگتی تھی جہاں برطانیہ کے مجوزہ قانون بغاوت سے ہزار درجہ بدتر قانون نافذ ہیں۔ مجھے حیرت تھی کہ اہل برطانیہ انگلستان میں جس کو دیکھ کر ناک بھوں چڑھاتے ہیں

اور ہندوستان میں اونٹ کا اونٹ نگل جاتے ہیں اور ان کی تیوری پر بل تک نہیں آتا۔ میں تو ان کے اس کمال کا قائل ہوں کہ وہ اپنے اخلاقی اصول کو اپنے مادی اغراض کے سانچے میں ڈھال لیتے ہیں اور ہر چیز جو ان کے سیاسی منصوبوں میں مدد دے انہیں اچھی معلوم ہوتی ہے۔ وہ سچے دل سے اخلاقی جوش کے ساتھ ہٹلر اور مسولینی کو برا کہتے ہیں کہ وہ آزادی اور جمہوریت کے دشمن ہیں۔ اور اسی سچے دل سے ہندوستان میں آزادی اور جمہوریت کی پامالی کی حمایت کرتے ہیں اور اسے ضروری سمجھتے ہیں۔ اعلیٰ درجہ کے اخلاقی دلائل سے وہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کا یہ فعل خالص بے غرضی پر مبنی ہے۔

ادھر ہندوستان میں آگ لگی ہوئی تھی اور ہمارے مرد اور عورتوں کی جان پر بیت رہی تھی۔ ادھر لندن میں خادمانِ حکومت ہندوستان کے لیے دستورِ اساسی بنا رہے تھے ۱۹۳۲ء میں تیسری گول میز کانفرنس اور اس کی نہ جانے کتنی کمیٹیاں ہو رہی تھیں اور اسمبلی کے ممبران کیبنٹوں کی ممبری کی کوشش کر رہے تھے تاکہ قوم کی خدمت بھی کریں اور سیر و سفر کا لطف بھی اٹھائیں۔ اس کے بعد ۱۹۳۳ء میں پارلیمنٹ کے جوائنٹ کمیٹی کا اجلاس شروع ہوا اور اس میں ہندوستانی اسیسر بلائے گئے۔ پھر ہماری فیاض حکومت کی طرف سے ان لوگوں کو جو شہادت دینے جا رہے تھے جہاز کے ٹکٹ مفت دیئے گئے۔ بہت سے لوگ دوبارہ ہندوستان کی خدمت کے جوش میں پبلک کے خرچ پر سمندر پار گئے اور سنا ہے کہ بعض نے تو کرائے کی رقم پر بچت بھی کی۔

کچھ تعجب کی بات نہ تھی کہ ارباب غرض کمینہ ایسے ہندوستان کو قائم رکھنے سے خوف زدہ ہو کر برطانوی شہنشاہی کے زیر سایہ لندن میں جمع ہو گئے۔ ہمارے جذبۂ قومیت کو یہ دیکھ کر سخت صدمہ پہنچا کہ ہمارے ہندوستانی

بھائیوں نے یہ حرکت عین اس وقت کی جب ہندوستان موت اور زندگی کی کشمکش میں گرفتار تھی۔ مگر ہم میں سے بہت سے لوگ سمجھتے تھے کہ ایک لحاظ سے یہ اچھا ہوا۔ کیونکہ ہمارا یہ خیال تھا (جو آگے چل کر غلط ثابت ہوا) کہ اس سے عام صاف معلوم ہو جائے گا کہ ہندوستان میں کون لوگ رجعت پسند ہیں اور کون ترقی پسند۔ اس طریق سے عام لوگوں کو سیاسی تربیت میں مدد ملے گی۔ اور سب پر ظاہر ہو جائے گا کہ بغیر کامل آزادی کے ہمارے سماجی مسائل حل نہیں ہو سکتے اور عام لوگوں کی مصیبت دور نہیں ہو سکتی۔

یہ حضرات نہ صرف روزمرہ کی زندگی کے لحاظ سے بلکہ اخلاقی اور ذہنی اعتبار سے بھی عام ہندوستانیوں سے بالکل الگ ہو گئے ہیں۔ ان کے اور ان کے درمیان کوئی رشتہ باقی نہیں رہا۔ انھیں مطلق احساس نہیں کہ عام لوگوں کے کیا خیالات ہیں اور وہ کون سا جذبہ ہے جو انھیں قربانیاں کرنے اور تکلیفیں سہنے پر ابھار رہا ہے۔ ان ناسور مدبروں کو صرف ایک ہی حقیقت نظر آتی ہے یعنی برطانوی شہنشاہی ان کے نزدیک ان کا مقابلہ کرنا ناممکن ہے اس لئے چارناچار اس کی اطاعت کرنی چاہئے وہ اتنا بھی نہ سمجھے کہ عام لوگوں کی مرضی کے بغیر ہندوستان کا مسئلہ حل نہیں ہو سکتا اور کوئی حقیقی اور عملی دستور نہیں بنایا جا سکتا۔ مسٹر فریج اسپنڈر نے اپنی کتاب "ہمارے زمانہ کی مختصر تاریخ" میں آئرلینڈ کی مشترکہ کانفرنس کی ناکامی کا ذکر کیا ہے جو ۱۹۱۷ء میں دستور کی کشمکش کو ختم کرنے کے لئے کی گئی تھی۔ وہ لکھتے ہیں کہ جو سیاسی لیڈر اس نازک وقت میں دستور بنانے کی فکر میں تھے ان کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی مکان کا بیمہ اس وقت کرے جب کہ مکان میں آگ لگی ہو۔ آئرلینڈ میں ۱۹۱۶ء میں جو آگ لگی تھی اس سے بہت بڑی آگ ۱۹۴۲ء اور ۱۹۴۳ء میں ہندوستان میں لگی

ہو گئی تھی اور اگرچہ اس کے شعلے بجھ گئے ہیں مگر اس کے انگارے جن میں ہندوستان کے جوش آزادی کی حرارت ہے مدت تک دہکتے رہیں گے۔

ہندوستان کے سرکاری حلقوں میں تشدد کا جذبہ انتہا کو پہنچ گیا تھا۔ یہ روایات پہلے سے چلی آتی تھیں اور برطانی حکومت ابتدا سے ہندوستان میں زیادہ تر پولیس کا کام کرتی تھی۔ ملکی حکام کے طرز عمل پر بھی فوجی رنگ غالب تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دشمنوں کی فوج مفتوحہ علاقے میں پڑاؤ ڈالے پڑی ہے جب موجودہ نظام کی مخالفت شروع ہوئی تو یہ رنگ اور بھی گہرا ہو گیا۔ ان لغو حرکتوں سے جو بنگال وغیرہ میں کبھی کبھی ہوتی تھیں حکومت کے تشدد کو اور بھڑکا دیا۔ اور اسے سختی کرنے کے لئے ایک عذر بھی مل گیا۔ حکومت کی پالیسی اور اس کے تعزیری ضابطوں کی وجہ سے عاملہ اور پولس کو اتنے وسیع اختیارات حاصل ہو گئے کہ گویا ہندوستان میں پولیس کا راج قائم ہو گیا اور کوئی اس کی روک ٹوک کرنے والا نہ رہا۔

اس جبر و تشدد کی زد میں کم و بیش ہندوستان کے سب ہی صوبے آئے مگر صوبۂ سرحد اور بنگال کو سب سے زیادہ مصیبت اٹھانی پڑی۔ صوبۂ سرحد ہمیشہ سے بڑی حد تک ایک فوجی علاقہ تھا اور اس میں نیم فوجی انتظام رائج تھا۔ اس کا محل وقوع جنگی نقطۂ نظر سے بہت اہم تھا۔ اور وہاں سرخ پوشوں کی تحریک پھیلنے سے حکومت بالکل بدحواس ہو گئی تھی۔ سارے صوبے میں ہر طرف فوجی دستے نظر آتے تھے جو امن قائم کرنے میں اور سرکش دیہات کو قابو میں لانے میں مصروف تھے۔ سارے ہندوستان میں پورے پورے گاؤں پر اور کبھی کبھی (خصوصاً بنگال میں) شہروں پر بھی بھاری جرمانے کئے جاتے تھے۔ اکثر تعزیری پولیس بھی تعینات کی جاتی تھی۔ ظاہر ہے کہ جب پولیس کو

اتنے اختیارات دے دئے گئے تھے۔ اور کسی قسم کی روک نہیں تھی تو اس کا زیادتی کرنا ایک لازمی امر تھا۔ قانون اور انصاف کی بدنظمی اور بے انصافی کی عجیب غریب مثالیں دیکھنے میں آتی ہیں۔

بنگال کے بعض حصوں میں بہت افسوس ناک منظر نظر آتا تھا۔ حکومت وہاں کی ساری آبادی کو (یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ ساری ہندو آبادی کو) دشمن سمجھتی تھی۔ اور بارہ اور پچیس سال کے درمیان عمر رکھنے والے ہر ہندو عورت لڑکے لڑکی کو ایک کاغذ رکھنا پڑتا تھا جس میں اس کا نام نشان درج ہوتا تھا جیسے، بند کر دئے جاتے تھے۔ یا انھیں کسی علاقہ میں داخل ہونے کی ممانعت کر دی جاتی تھی۔ لباس پر بندشیں عاید کی گئی تھیں۔ مدرسوں کی نگرانی ہوتی تھی یا وہ بند کر دئے جاتے تھے۔ لوگوں کو بائیسکل رکھنے کی اجازت نہیں تھی انھیں اپنی نقل و حرکت کی اطلاع پولیس کو دینی پڑتی تھی غروب آفتاب کے بعد گھر سے نکلنے کی ممانعت، فوجوں کا گشت، تعزیری پولیس، مجموعی جرمانے، غرض نیا بھرکے قاعدوں اور ضابطوں کی زنجیروں سے لوگوں کو جکڑ رکھا تھا۔ علاقہ کے علاقے فوجی محاصرے کی حالت میں تھے۔ اور ان کے سارے باشندوں کی حیثیت ان قیدیوں کی سی تھی جو عارضی طور پر رہا کئے جاتے ہیں اور ہر وقت پولیس کی شدید نگرانی میں رہتے ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ برطانوی حکومت کے نقطۂ نظر سے یہ عجیب و غریب قاعدے یا ضابطے ضروری تھے یا نہیں تھے۔ اگر ان کی ضرورت نہیں تھی تو حکومت پر بہت سخت الزام آتا ہے کہ اس نے بڑے بڑے علاقوں کے باشندوں کو خواہ مخواہ ستایا۔ ذلیل کیا اور شدید نقصان پہنچایا۔ اور اگر ان کی ضرورت تھی تو اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان میں برطانوی حکومت کی جڑیں کھوکھلی ہو چکی تھیں۔

اس جبر و تشدد نے جیل میں بھی ہمارا پیچھا نہیں چھوڑا۔ قیدیوں کی تقسیم مختلف درجوں میں کرنا ایک لغو فعل تھا اور اس سے اکثر ان لوگوں کو جو اونچے درجوں میں رکھے جاتے تھے سخت تکلیف ہوتی تھی۔ بہت کم لوگوں کو اونچے درجے ملتے تھے۔ اور بہت سے نوجوان مردوں اور عورتوں کو ایسی شرائط کی پابندی کرنی پڑتی تھی جو ان کے لئے سوہان روح تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ حکومت جان بوجھ کر ایسی پالیسی اختیار کرتی ہے جس سے سیاسی قیدیوں کی حالت عام قیدیوں سے بدتر ہو جائے۔ جیل کے ایک انسپکٹر جنرل نے تو یہاں تک کیا کہ تمام جیل خانوں میں ایک خفیہ گشتی چٹھی بھیج دی جس میں ہدایت[1] کی کہ سول نافرمانی کے قیدیوں کے ساتھ انتہائی سختی کا برتاؤ کرنا چاہئے۔ کوڑے لگانے کی سزا جیل میں عام ہو گئی۔ ۲۷ اپریل ۱۹۳۳ء کو نائب وزیر ہند نے دارالعوام میں بیان کیا "ہز میجسٹی گورنمنٹ کو اطلاع ملی ہے کہ ۱۹۳۲ء میں ہندوستان میں پانچسو قیدیوں کو سول نافرمانی کی تحریک کے سلسلے میں کوڑے لگائے گئے۔" معلوم نہیں اس تعداد میں وہ لوگ بھی شامل ہیں یا نہیں جنھیں جیل کے قوانین کی خلاف ورزی کی سزا میں بھی کوڑے لگائے گئے۔ ۱۹۳۲ء میں جب ہمیں جیل میں یہ خبریں پہنچیں کہ بہت سے لوگوں کو کوڑے کی سزائیں دی گئی ہیں تو مجھے یاد آیا کہ دسمبر ۱۹۲۱ء میں ہم نے اس قسم کے دو ایک واقعات کے خلاف احتجاج کیا

[1] یہ گشتی ۳۰ جون ۱۹۳۲ء کو جاری کی گئی تھی اور اس کے الفاظ حسب ذیل تھے:۔

"انسپکٹر جنرل جیل کے متعلقہ ماتحت افسروں کو آگاہ کرتے ہیں کہ سول نافرمانی کے قیدیوں کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کرنی چاہئے۔ ان کا دماغ درست کر دینا چاہئے اور ان کے ساتھ انتہائی سختی کا برتاؤ ہونا چاہئے۔"

تھا اور تین روز کا فاقہ کیا تھا۔ اس وقت مجھے اس وحشیانہ سزا سے سخت صدمہ پہنچا تھا۔ اب بھی مجھے صدمہ ہوتا تھا اور دل دکھتا تھا۔ مگر اس کا کبھی خیال بھی نہ آیا کہ مجھے احتجاج اور فاقہ کرنا چاہیے۔ معلوم ہوتا تھا کہ اب میں بالکل بے بس ہوں۔ انسان کا احساس دہشت اور بہیمیت کا منظر دیکھتے دیکھتے کند ہو جاتا ہے۔ کتنی ہی بری چیز کیوں نہ ہو ایک مدت کے بعد دنیا کو اس کی عادت ہو جاتی ہے۔

ہمارے آدمیوں سے جیل میں سخت ترین مشقت کے کام لیے جاتے تھے۔ مثلاً چکی پیسنا، کولھو چلانا وغیرہ اور انہیں ہر قسم کی تکلیفیں دی جاتی تھیں تاکہ وہ عاجز آکر معافی مانگ لیں اور اقرارنامے پر دستخط کر کے رہا ہو جائیں۔ یہ جیل کے افسروں کی بڑی کامیابی سمجھی جاتی تھی۔

جیل کی اکثر سزائیں لڑکوں اور نوجوانوں کے حصہ میں آتی تھیں اس لیے کہ وہ بیجا سختیوں پر بے زاری کا اظہار کرتے تھے۔ یہ بڑے اچھے بہادر لڑکے تھے جن میں خودداری، تیزی طراری، من چلاپن کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ اگر یہ انگلستان کے پبلک اسکولوں اور یونیورسٹیوں میں ہوتے تو ان کی بڑی قدر اور ہمت افزائی کی جاتی۔ مگر ہندوستان میں ان کی نوجوانانہ تصور پرستی اور خودداری کا صلہ یہ ملتا تھا کہ ان کے پیروں میں بیڑیاں ڈالی جاتی تھیں۔ کال کوٹھری میں بند کیے جاتے تھے اور کوڑوں سے پٹتے تھے۔

ہماری عورتوں کی حالت جیل میں اور بھی زیادہ افسوس ناک تھی یہ عموماً اوسط طبقے کی عورتیں تھیں جو گھروں کی چار دیواری میں زندگی بسر کرنے کی عادی تھیں اور اس سماج نے جس میں مردوں کی خود غرضانہ حکومت

ہے۔ انھیں طرح طرح کی بندشوں اور رسموں میں جکڑ رکھا تھا۔ آزادی کی تحریک ان کے لیے دہری اہمیت رکھتی تھی جس جوش و خروش سے وہ اس تحریک میں شریک ہوئیں۔ اس کی تہہ میں یقیناً یہ خواہش تھی کہ انھیں گھر کی غلامی سے بھی نجات مل جائے۔ یہ خواہش مبہم اور غیر محسوس سہی مگر شدت سے ان کے دلوں میں موجود تھی۔ جیل میں سیاسی قیدی چند کے سوا ان خواتین کے ساتھ معمولی قیدیوں کا سا برتاؤ ہوتا تھا۔ وہ بدترین قسم کی عورتوں کے ساتھ رکھی جاتی تھیں اور اکثر انھیں سخت تکلیفیں برداشت کرنی پڑتی تھیں۔ ایک بار میں اس بارک میں رکھا گیا جو عورتوں کے احاطے سے متصل تھی۔ بس ایک دیوار بیچ میں تھی اس احاطہ میں اور عورتوں کے ساتھ چند سیاسی قیدی عورتیں بھی تھیں۔ جن میں سے ایک خاتون کے گھر میں ایک زمانہ میں مہمان رہ چکا تھا۔ ایک اونچی دیوار حائل ہونے کے باوجود نگراں قیدی عورتوں کی ڈانٹ ڈپٹ کی آواز صاف سنائی دیتی تھی۔ اور مجھے سخت صدمہ ہوتا تھا کہ میری دوستوں کو ایسی بیہودہ اور نامعقول باتیں سننی پڑتی ہیں۔

یہ بات صریحی طور پر نظر آتی تھی کہ ۱۹۳۲ء اور ۱۹۳۳ء میں دو برس پہلے یعنی ۱۹۳۰ء کے مقابلہ میں سیاسی قیدیوں کے ساتھ اور بھی بدتر برتاؤ ہوتا تھا۔ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ چند افسر اپنی مرضی سے ایسا کرتے ہوں سوا اس کے اور کوئی وجہ عقل میں نہیں آ سکتی تھی کہ حکومت نے قصداً یہ پالیسی مقرر کی ہے۔ کچھ سیاسی قیدیوں پر موقوف نہیں بلکہ یوں بھی صوبہ متحدہ کا جیل کا محکمہ اس زمانہ میں اس کے لیے بدنام تھا کہ وہ ہر قسم کی ہمدردی اور انسانیت سے محروم ہے۔ ہمیں نہایت معتبر ذریعے سے اس کی ایک دلچسپ مثال معلوم ہوئی۔ ایک بار جیل کے ایک معزز وزیٹر جو ہماری طرح باغی یا مفسد نہیں

بلکہ حکومت کے معتمدین میں سے تھے اور مہر کا خطاب رکھتے تھے ہم سے ملنے کے لئے آئے۔ انھوں نے بیان کیا کہ چند مہینے پہلے وہ ایک اور جیل کے معائنے کے لئے گئے تھے اور انھوں نے اپنی رپورٹ میں جیلر کے متعلق یہ الفاظ لکھے تھے کہ وہ "ہمدردی کے ساتھ ضابطے کی پابندی کرتے ہیں" جیلر نے ان سے درخواست کی کہ آپ میری ہمدردی کا ذکر نہ کیجیے اس لئے کہ سرکاری حلقوں میں یہ کوئی اچھی چیز نہیں سمجھی جاتی۔ مگر وزیٹر صاحب نہیں مانے اور انھیں یقین نہ آیا کہ اس رپورٹ سے جیلر کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی دن کے بعد جیلر وہاں سے دور کسی کور وہ مقام پر بدل دیا گیا جو اس کے لئے ایک قسم کی سزا تھی۔

بعض جیلروں کو جو خاص طور سے سخت اور بے باک سمجھے جاتے تھے۔ ترقیاں ملیں اور خطابات دئے گئے۔ رشوت کی جیل میں اس قدر گرم بازاری ہے کہ شاید ہی کوئی شخص اس سے بچتا ہو۔ مگر میرا اور میرے بہت سے دوستوں کا یہ تجربہ ہے کہ جیل کے افسروں میں وہی سب سے زیادہ رشوت لیتے ہیں جو بڑے سخت گیر بنتے ہیں۔

خوش قسمتی سے میرے ساتھ جیل میں اور جیل کے باہر بھی لوگوں کا برتاؤ بہت اچھا رہا اور ہر شخص جس سے مجھے سابقہ پڑا میرے ساتھ اخلاق اور مہربانی سے پیش آیا۔ ان موقعوں پر بھی جب میں اس سلوک کا مستحق نہیں تھا۔ البتہ جیل میں ایک واقعہ ایسا ہوا جس سے مجھے اور میرے عزیزوں کو بڑا دکھ پہنچا۔ ایک بار میری والدہ، کملا اور میری بیٹی اندرا الہ آباد کے ڈسٹرکٹ جیل میں میرے بہنوئی رنجیت پنڈت سے ملنے کے لئے گئیں۔ جیلر نے انھیں بے قصور برا بھلا کہا اور باہر نکال دیا۔ مجھے اس سے بہت

رنج ہوا۔ اور صوبے کی حکومت نے اس معاملہ میں جو طریقہ اختیار کیا اس سے اور بھی زیادہ صدمہ پہنچا۔ اس خیال سے کہ کہیں پھر جیل کے ملازموں کے ہاتھ میری والدہ کی توہین نہ ہو۔ میں نے سب سے ملاقات کرنا ترک کر دیا اور دہرہ دون کی جیل میں سات مہینے تک ایک شخص سے بھی ملاقات نہیں کی۔

ایک قیدی کی نفسی کیفیتیں

میں اور گووند ولبھ پنت بریلی ڈسٹرکٹ جیل سے دہرہ دون جیل منتقل کر دیئے گئے۔ اس خیال سے کہ کوئی مظاہرہ نہ ہونے پائے ہمیں بریلی اسٹیشن سے ریل پر سوار نہیں کیا بلکہ وہاں سے پچاس میل تک لے جا کر ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر گاڑی پر بٹھا دیا۔ اور وہ بھی خفیہ طور پر رات کے وقت۔ مہینوں تنہائی میں بند رہنے کے بعد رات کی خنکی میں موٹر کار کا یہ سفر بڑا خوشگوار معلوم ہوا۔

بریلی جیل سے روانگی سے پہلے ایک بات ایسی ہوئی جس نے میرے دل پر بڑا اثر کیا۔ اور جس کی یاد اب تک تازہ ہے۔ بریلی کا انگریز سپرنٹنڈنٹ پولیس بھی وہاں موجود تھا۔ جب میں موٹر میں بیٹھنے لگا تو اس نے کچھ شرماتے ہوئے ایک بنڈل میری طرف بڑھایا اور کہا کہ اس میں جرمنی کے چند پرانے باتصویر رسالے ہیں۔ میں نے سنا تھا کہ آپ نے جرمن زبان سیکھنا شروع کی ہے۔ اس لئے میں یہ رسالے آپ کے لئے لیتا آیا۔ میں نہ ان صاحب سے پہلے کبھی ملا تھا اور نہ اس کے بعد ملنے کا اتفاق ہوا۔ مجھے ان کا نام تک معلوم نہیں۔ ان کے اس بے ساختہ اخلاق اور اس جذبۂ ہمدردی نے جو اس کا محرک ہو مجھے بہت متاثر کیا اور میں ان کا یہ احسان کبھی نہ بھولوں گا۔

آدھی رات کے سناٹے میں موٹر کے اس طویل سفر میں میں انگریزوں اور ہندوستانی حاکموں اور محکوموں، سرکاری عہدہ داروں اور غیر سرکاری لوگوں کے تعلقات پر غور کرتا رہا۔ ان دونوں کے درمیان کتنی بڑی زبردست خلیج حائل ہے اور یہ

ایک دوسرے سے کس قدر بددل اور بدظن ہیں۔ لیکن اس بددلی اور بدگمانی کے علاوہ اجنبیت کی بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے سے بالکل ناواقف ہیں۔ اس لئے ہر فریق دوسرے سے کھنچا رہتا ہے اور کھچا کھچا رہتا ہے۔ ایک دوسرے کو ترش رو اور روکھا نظر آتا ہے اور دونوں میں سے کسی کو یہ احساس نہیں ہوتا کہ اس پردے کے پیچھے شرافت اور انسانیت بھی ہے۔ انگریز ملک کے حاکم ہیں اور جاہ و منصب عطا کرنا ان کے اختیار میں ہے اس لئے بہت سے خوشامدی، ابن الوقت اور بد دل کے خواہاں انہیں گھیرے رہتے ہیں اور انہیں ناپاک نمونوں سے انھوں نے ہندوستانیوں کی سیرت کا اندازہ لگایا ہے۔ دوسری طرف ہندوستانیوں نے انگریزوں کو صرف افسروں کی حیثیت سے دیکھا، جو انسانیت سے خالی مشینوں کی طرح کام کرتے ہیں اور ہر وقت اپنے مستقل حقوق کو محفوظ رکھنے کی دھن میں رہتے ہیں۔ کسی شخص کے انفرادی رویہ میں جب وہ اپنے انسانی جذبات کے ماتحت کام کرتا ہے اور اس کے منصبی طرزِ عمل میں جب وہ ایک فوج کا سپاہی ہوتا ہے زمین آسمان کا فرق ہے۔ سپاہی جب ڈیوٹی پر ہوتا ہے تو اس کی انسانیت رخصت ہو جاتی ہے۔ وہ ایک کل کے پتلے کی طرح حرکت کرتا ہے اور ان بے عذر انسانوں پر گولی چلاتا ہے جنھوں نے اس کا کچھ نہیں بگاڑا۔ یہی حال اس پولیس کے افسر کا ہے جسے آج کسی شخص سے ذرا سی بدسلوکی کرنا بھی گوارا نہیں تو کل بے گناہوں پر بے تکلف لاٹھی چارج کرتا ہے۔ اس وقت نہ وہ اپنے آپ کو انسان سمجھتا ہے نہ مجمع کے ان افراد کو جن پر وہ لاٹھیاں اور گولیاں برساتا ہے۔

جب کوئی شخص دوسرے فریق کو جماعت یا مجمع کی حیثیت سے دیکھتا ہے تو انسانی رشتہ غائب ہو جاتا ہے اور وہ یہ بھول جاتا ہے کہ جماعت بھی افراد سے

مردوں، عورتوں اور بچوں سے بنتی ہے۔ جن کے سینے میں دل ہے اور اس میں محبت نفرت اور تکلیف کا احساس موجود ہے۔ انگریز اگر صاف گوئی سے کام لیں تو یہ کہیں گے کہ انھوں نے ہندوستانیوں میں بعض معقول آدمی بھی دیکھے ہیں مگر وہ استثنا کا حکم رکھتے ہیں ورنہ عموماً ہندوستانی سخت قابل نفرت ہیں۔ اسی طرح ہندوستانی بھی یہی کہیں گے کہ وہ چند ایسے انگریزوں کو جانتے ہیں جو قابل تعریف ہیں لیکن انھیں چھوڑ کر باقی سب کے سب مغرور، ظالم اور بد ہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ ہر شخص دوسری قوم کا اندازہ ان افراد سے نہیں لگاتا جن سے اسے انسان کی حیثیت سے سابقہ پڑا ہے بلکہ دوسرے لوگوں سے جن سے وہ بالکل ناواقف ہوتا ہے یا بہت کم واقفیت رکھتا ہے۔

میں ذاتی طور پر اس معاملے میں بڑا خوش نصیب ہوں۔ کیونکہ میرے ہم وطن اور انگریز دونوں بلا استثنا ہمیشہ مجھ سے بڑے اخلاق سے پیش آئے یہاں تک کہ وہ پولیس والے جنھوں نے مجھے گرفتار کیا یا ایک جگہ سے دوسری جگہ لے گئے اور جیلر وغیرہ بھی مجھ سے بڑی مہربانی سے پیش آتے رہے اور ان کی اس انسانیت کی وجہ سے لڑائی کی تلخیوں اور جیل کی زندگی کی سختیوں میں بہت کچھ کمی ہوگئی میرے ہم وطنوں کا مجھ سے اچھا سلوک کرنا کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ کیونکہ ان میں تو مجھے کچھ نہ کچھ مقبولیت اور شہرت حاصل تھی لیکن انگریز بھی مجھے محض ایک جماعت کے رکن نہیں بلکہ ایک فرد کی حیثیت دیتے رہے۔ میں نے انگلستان میں تعلیم پائی ہے اور وہاں کے ایک پبلک اسکول میں رہا ہوں شاید اس وجہ سے وہ مجھے اپنے سے قریب تر سمجھتے ہیں۔ اور چاہے میری قومی سرگرمیاں انھیں کتنی ہی نامعقول معلوم ہوں لیکن اپنے معیار کے مطابق مجھے کم و بیش مہذب ضرور جانتے ہیں۔ میرے ساتھ جو خاص مراعات کی جاتی تھیں جب میں ان کا مقابلہ اپنے ساتھیوں

کی حالت سے کرتا تھا تو اکثر مجھے اس سے تکلیف ہوتی تھی اور شرم آتی تھی۔

لیکن ان تمام رعایتوں کے باوجود جیل پھر جیل ہے۔ اور وہاں تکلیف وہ ماحول کبھی کبھی ناقابل برداشت ہو جاتا ہے۔ وہاں کی ساری فضا تشدد، کمینہ پن، رشوت اور جھوٹ سے ناپاک تھی۔ جیل کے ملازم یا تو انتہائی خوشامد کرتے تھے یا گالی سے بات کرتے تھے۔ جو شخص حساس طبیعت رکھتا ہو وہ ہمیشہ بے چین رہتا تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر طبیعت جھنجلاتی تھی۔ کسی خط یا اخبار میں کوئی بری خبر دیکھ کر کچھ دیر کے لئے پریشانی یا غصہ سے دل بے قابو ہو جاتا تھا۔ باہر تو کام میں لگے رہنے سے تسکین رہتی تھی اور مختلف دل چسپیاں اور سرگرمیاں دماغ اور جسم کا توازن قایم رکھتی تھیں لیکن جیل میں گھٹے ہوئے جذبات کے نکاس کا کوئی ذریعہ ہی نہیں تھا اور آدمی اندر ہی اندر کھولتا رہتا ہے۔ اسی وجہ سے اس کی رائے ہر معاملہ کے متعلق یک طرفہ اور غلط ہوتی تھی اور بیماری تو جیل میں بڑی سخت مصیبت تھی۔

پھر بھی میں نے جیل کے معمولات کا اپنے آپ کو عادی بنا لیا اور کافی جسمانی ورزش اور دماغی محنت کے ذریعے سے اپنی صحت کو قایم رکھا۔ ورزش اور محنت کی باہر کوئی اہمیت ہو یا نہ ہو لیکن جیل میں یہ نہایت ضروری چیز ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر صحت بالکل برباد ہو جاتی ہے۔ میں اوقات کی نہایت سختی سے پابندی کرتا تھا۔ اور جہاں تک ممکن تھا اپنے پرانے معمولات کو قایم رکھتا تھا تاکہ طبیعت شکستہ نہ ہونے پائے (مثلاً میں پابندی سے داڑھی مونڈتا تھا۔ جیل میں مجھے سیفٹی ریزر رکھنے کی اجازت تھی) میں نے ان چھوٹی چھوٹی باتوں کا ذکر اس لئے کر دیا کہ لوگ عموماً ان کی پروا نہیں کرتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اور کاموں میں بھی شکستہ پڑ جاتے ہیں۔ دن بھر سخت محنت کرنے کے بعد شام کی تکان بہت اچھی معلوم ہوتی تھی اور رات کو بڑے مزے کی نیند آتی تھی۔

اس طرح دن، ہفتے اور مہینے گذرتے گئے۔ لیکن کبھی کبھی کوئی مہینہ ایسا بھاری ہو جاتا تھا کہ کاٹے نہ کٹتا تھا۔ اور بعض اوقات میں دنیا کی ہر چیز اور ہر شخص سے بیزار ہو جاتا تھا۔ اپنے جیل کے ساتھیوں سے، جیل کے عملہ سے، باہر والوں سے کہ انھوں نے ایسا کیوں کیا اور ایسا کیوں نہ کیا سلطنت برطانیہ سے (اگر اس سے تو میں ہمیشہ سے بیزار تھا) اور سب سے زیادہ اپنے آپ سے میں سخت اعصابی بے چینی میں مبتلا رہتا تھا اور نفسی کیفیتیں جو ایک قیدی پر گزرتی ہیں مجھ پر بڑی شدت سے طاری ہوتی تھیں لیکن خوش قسمتی سے مجھے اس قسم کے دوروں سے بہت جلد افاقہ ہو جاتا تھا۔

جیل میں ملاقات کا دن ہمارے لئے عید کا دن ہوتا تھا ہر شخص اس کے انتظار میں دن گنا کرتا تھا۔ لیکن ملاقات کا جوش ختم ہونے کے بعد فطرتاً اس کا ردعمل شروع ہوتا تھا۔ یعنی ہمیں بڑی تنہائی اور اداسی محسوس ہوتی تھی کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ ملاقاتیں خوش گوار ثابت نہیں ہوتی تھیں یعنی کوئی پریشان کن خبر سننے میں آتی تھی۔ یا کوئی اور بات ایسی ہوتی تھی جس کی وجہ سے میں رنجیدہ ہو جاتا تھا۔ ملاقاتوں کے موقعوں پر جیل کے افسر تو موجود رہتے ہی تھے لیکن بریلی میں دو تین مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ خفیہ پولیس والے بھی کاغذ پنسل لئے بیٹھے تھے اور جو لفظ ہماری زبان سے نکلتا تھا اسے بڑے شوق سے لکھتے جاتے مجھے اس پر بڑا غصہ آتا تھا اور ان ملاقاتوں کا سارا لطف جاتا رہتا تھا۔

اس کے بعد جب الہ آباد جیل میں ایک ملاقات کے موقع پر میری ماں اور بیوی کے ساتھ بہت برا برتاؤ کیا گیا اور حکومت نے بھی اس کا کوئی تدارک نہیں کیا تو میں نے احتجاج کے طور پر ان ملاقاتوں کو جو میرے لئے اس قدر قیمتی تھیں ترک کر دیا تقریباً سات مہینے تک میں کسی شخص سے نہیں ملا۔

میرے لئے یہ بڑے سخت دن تھے۔ اس کے بعد جب میں نے دوبارہ ملاقات کا سلسلہ شروع کیا اور میرے عزیز پہلے پہل مجھ سے ملنے آئے تو کچھ نہ پوچھیے کہ کس قدر خوشی ہوئی۔ میری بہن کے چھوٹے چھوٹے بچے بھی ان کے ساتھ آئے تھے۔ ان میں سے ایک ننھا سا بچہ حسب عادت میرے کاندھے پر چڑھ گیا تو مجھے اپنے جذبات کا ضبط کرنا مشکل ہوگیا۔ اتنے دن تک انسانوں کی صحبت کے لئے ترسنے کے بعد گھر کی زندگی کے لطف نے مجھے بے چین کر دیا۔

جس زمانہ میں ملاقات کا سلسلہ بند تھا مجھے گھر کے یا دوسری جیلوں کے خطوں کا (کیونکہ میری دونوں بہنیں جیل میں تھیں) اور زیادہ بے چینی سے انتظار رہنے لگا۔ اور یہ چیز میرے لئے اور بھی قیمتی ہوگئی۔ اگر مقررہ وقت پر خط نہ پہنچتا تو مجھے سخت پریشانی ہوتی۔ لیکن جب آجاتا تو مجھے اس کے کھولنے میں ایک قسم کی ہچکچاہٹ سی ہوتی تھی اس سے اس طرح کھیلتا رہتا جیسے کوئی اپنی محبوب چیز سے کھیلتا ہے جو اپنے قابو میں آ ہو۔ اور میرے دل کی تہ میں یہ خیال بھی کھٹکتا رہتا کہ کہیں اس میں کوئی ایسی خبر یا بات نہ ہو جس سے مجھے تکلیف پہنچے خط بھیجنے اور خط پانے دونوں سے پرسکون زندگی میں بڑا خلل واقع ہوتا ہے۔ ان سے جذبات میں ایک ہیجان پیدا ہو جاتا ہے جس سے تکلیف ہوتی ہے ایک دو روز تک خیالات پریشان رہتے ہیں اور روزمرہ کے کام پر پوری توجہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

نینی اور بریلی کی جیلوں میں ہمارے ساتھ بہت سے لوگ تھے لیکن دہرہ دون میں شروع شروع میں صرف ہم تین آدمی تھے یعنی گووند بلبھ پنتھ۔ کاشی پور کے کنور آنند سنگھ اور میں۔ دو ایک مہینے بعد پنتھ جی اپنی چھ مہینے کی میعاد کاٹ کر چلے گئے لیکن دوسرے صاحب اور تشریف لے آئے جنوری ۱۹۳۲ء تک سب ساتھی مجھے چھوڑ کر

سے چلے گئے۔ اور میں اکیلا رہ گیا۔ آخر اگست میں مجھے رہائی ملی۔ اس عرصہ میں یعنی پورے آٹھ مہینے ڈیرہ دون جیل میں میں نے بالکل تنہائی کی زندگی گزاری۔ یہاں تک کہ کوئی بات کرنے کو بھی نہ تھا۔ البتہ کبھی کبھی جیل کا کوئی اہلکار چند منٹ کے لئے آنکلتا تھا۔ اگرچہ اصطلاحی طور پر مجھے قید تنہائی کی سزا نہیں دی گئی تھی لیکن یہ صورت قریب قریب وہی تھی۔ میرے لئے یہ بڑا صبر آزما زمانہ تھا۔ اچھا ہوا کہ میں نے ملاقات کا سلسلہ پھر شروع کر دیا تھا۔ کیونکہ اس سے مجھے کچھ نہ کچھ سکون حاصل ہو جاتا تھا۔ میرے ساتھ ایک خاص رعایت یہ تھی کہ مجھے باہر سے تازہ پھول منگانے اور چند فوٹو رکھنے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ ان سے میرا جی بہت کچھ بہل جاتا تھا۔ عموماً جیل میں پھولوں اور تصویروں کے رکھنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ اکثر لوگوں نے میرے لئے پھول بھیجے لیکن مجھے ان کے لینے کی اجازت نہیں ملی۔ بات یہ ہے کہ جیل کی کوٹھری کا خوشنما پیدا کرنا پسند نہیں کیا جاتا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ جیل کے ایک سپرنٹنڈنٹ نے میرے ایک ساتھی کو جو میرے برابر کی کوٹھری میں رہتے تھے اس بات پر تنبیہ کی کہ انھوں نے اپنے منہ ہاتھ دھونے کا سامان سلیقہ سے سجا کر رکھا تھا۔ انھوں نے فرمایا کہ آپ کوٹھری کو اس طرح سے سجا کر اس سے آرائش اور نفاست پسندی ظاہر ہوتی ہے۔ اور بعد کو اس سامان آرائش کی فہرست بھی ملاحظہ کیجئے۔ ایک دانت صاف کرنے کا برش، منجن کی شیشی، فاؤنٹین پن کی روشنائی، سر میں ڈالنے کے تیل کی ایک بوتل، ایک برش، ایک کنگھا اور شاید دو ایک اور چھوٹی چھوٹی چیزیں۔

جیل میں انسان کو روزمرہ کی معمولی معمولی چیزوں کی بڑی قدر ہو جاتی ہے۔ وہاں اپنا ذاتی سامان بہت کم ہوتا ہے اور اس میں آسانی سے اضافہ نہیں ہو سکتا۔ اگر کوئی چیز کھو جائے تو دوبارہ منگانا بہت مشکل ہے اس لئے ہمیں انھیں بہت

عزیز رکھتا ہے وہ ایسی چھوٹی چھوٹی چیزیں جمع کرتا ہے جو باہر عموماً ردی کی ٹوکری میں پھینک دی جاتی ہیں۔ ملکیت کا جذبہ وہاں بھی انسان کا پیچھا نہیں چھوڑتا جہاں کوئی چیز جوڑ رکھنے کے قابل ہو میسر نہیں آتی۔

کبھی کبھی زندگی کی خوشگوار چیزوں کے لئے دل چاہتا ہے مثلاً جسمانی آرام و آسائش، خوش گوار ماحول، دوستوں کی صحبت، دلچسپ گفتگو، بچوں کے ساتھ کھیلنا...... کبھی اخبار میں کوئی تصویر یا فوٹو دیکھ کر پرانے زمانے کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ اور جوانی کی بے فکریوں کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے گھری یاد کانٹے کی طرح کھٹکنے لگتی ہے اور سارا دن بے چینی سے کٹتا ہے۔

میں روز تھوڑی دیر چرخہ کاتتا تھا۔ کیونکہ ذہنی کام کرنے کے بعد جسمانی محنت سے سکون حاصل ہوتا تھا۔ لیکن میرا خاص شغل لکھنا پڑھنا تھا۔ جو کتابیں میں چاہتا تھا وہ سب مجھے نہیں مل سکتی تھیں۔ کیونکہ اس معاملہ میں بڑی پابندیاں تھیں اور سختی سے احتساب ہوتا تھا۔ احتساب کرنے والے بعض اوقات نا اہل ہوتے تھے مثلاً ایک مرتبہ اسپنگلر کی کتاب "زوال مغرب" اس لئے روک دی گئی کہ کتاب کا نام خطرناک اور باغیانہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن مجھے شکایت کا موقع نہیں ہے۔ اس لئے کہ پھر بھی مجھے بہت سی مختلف کتابیں پڑھنے کو مل جاتی تھیں۔ اس معاملہ میں بھی میرے ساتھ خاص رعایت تھی۔ کیونکہ میرے بہت سے ساتھیوں کو (جو درجہ اول کے قیدی تھے) مسائل حاضرہ کے متعلق کتابیں ملنے میں بڑی دقت ہوتی تھی مجھے معلوم ہوا کہ بنارس جیل میں وہائٹ پیپر (جس میں حکومت برطانیہ کی دستوری تجاویز درج تھیں منگانے کی اجازت نہیں دی گئی۔ کیونکہ اس میں سیاسی معاملات کی بحث تھی۔ برطانوی افسر صرف دو قسم کی کتابیں پڑھنے کا مشورہ دیتے تھے مذہبی کتابیں اور ناول۔ یہ عجیب بات ہے کہ حکومت برطانیہ مذہب کی بڑی قدر دان ہے اور

بڑی بے تعصبی سے ہر قسم کے مذہب کی ہمت افزائی کرتی ہے۔

جب ہندوستان میں معمولی سے معمولی ملکی حقوق بھی حاصل نہیں ہیں تو قیدیوں کے حقوق کا تذکرہ کرنا فضول ہے۔ پھر بھی یہ مسئلہ قابل غور ہے۔ اگر ایک عدالت کسی شخص کو قید کی سزا دیتی ہے تو اس کا یہ منشا ہرگز نہیں ہو سکتا کہ جسم کے ساتھ دماغ کو بھی سزا دی جائے قیدی کا جسم پابند ہی لیکن دماغ کیوں نہ آزاد ہو؟ ہندوستان کے جیلوں کے ارباب حل و عقد یقیناً اس سوال پر برافروختہ ہوں گے کیونکہ ان میں جدید خیالات کو سمجھنے کی صلاحیت اور غور و فکر کی عادت عموماً بہت کم ہوتی ہے۔ احتساب یوں بھی بے انصافی اور حماقت کا فعل ہے۔ ہندوستان میں ہم اس کی بدولت بہت سی جدید مطبوعات اور ترقی پذیر رسائل اور اخبارات سے محروم رہتے ہیں۔ ممنوعہ کتابوں کی فہرست کافی طویل ہے اور اس میں برابر اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اس پر طرہ یہ ہے کہ قیدیوں کو وہ کتابیں نہیں ملتیں جن کا جیل کے باہر خریدنا اور پڑھنا بھی قانوناً جائز ہے۔

کچھ عرصہ ہوا کہ ریاستہائے متحدہ امریکہ میں یہ سوال اٹھا تھا کہ وہاں نیویارک کے مشہور و معروف سنگ سنگ جیل میں چند اشتمالی رسائل کی ممانعت تھی۔ امریکہ کے حکمران طبقے کو اشتمالیوں سے خاص کد ہے لیکن اس کے باوجود جیل کے حکام نے یہ تسلیم کیا کہ قیدیوں کو ہر طرح کی مطبوعات حتیٰ کہ اشتمالی رسائل اور اخبارات بھی منگانے کا حق ہے۔ جیل کے وارڈن نے اس میں صرف اتنا استثنا کیا تھا یعنی ان کارٹونوں کی اجازت نہیں دی تھی جنھیں وہ اشتعال انگیز سمجھتا تھا۔

ہندوستان کی جیلوں کے متعلق ذہنی آزادی کے مسئلہ پر بحث کرنا بالکل فضول ہے۔ کیونکہ عام قیدیوں کو نہ تو کوئی اخبار ملتا ہے اور نہ لکھنے کا سامان۔ احتساب کا کیا ذکر ہے یہاں تو ان سب چیزوں کی ایک سرے سے ممانعت ہے۔

صرف درجہ اول کے قیدیوں کو لکھنے کا سامان ملتا ہے۔ لیکن روزانہ اخبار ان میں سے بھی سب کو نہیں دیئے جاتے اور جنھیں ملتے بھی ہیں تو وہی اخبار جنھیں حکومت پسند کرتی ہے۔ درجہ دوم سے اور تیسرے درجے کے سیاسی اور غیر سیاسی قیدیوں ان کے لئے اصولاً لکھنے کا سامان ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ بعض سیاسی قیدیوں کے ساتھ یہ رعایت کی جاتی ہے کہ انھیں لکھنے کا سامان دے دیا جاتا ہے لیکن اکثر یہ رعایت منسوخ ہوتی رہتی ہے۔ درجہ اول کے قیدی ہزار میں ایک سے زیادہ نہ ہوتے ہوں گے۔ اس لئے ہندوستانی قیدیوں کی عام حالت پر غور کرتے وقت ہم انھیں نظر انداز کر سکتے ہیں۔ مگر یہ یاد رہے جہاں تک کتابوں اور اخباروں کا تعلق ہے، درجہ اول کے ان خوش نصیب قیدیوں کو بھی وہ مراعات حاصل نہیں ہیں جو اکثر مہذب ممالک کے عام قیدیوں کو حاصل ہیں۔

بقیہ قیدیوں یعنی ہزار میں نوسو ننانوے کو ایک وقت میں دو تین کتابیں منگانے کی اجازت ہے۔ لیکن پابندیاں اتنی سخت ہیں کہ عام طور پر وہ اس رعایت سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ لکھنا یا کتابوں سے نوٹ لینا بہت خطرناک سمجھا جاتا ہے اور اس کی سخت ممانعت ہے۔ ذہنی تربیت کو جان بوجھ کر اس طرح روکنا نہایت عجیب اور مضحکہ خیز ہے۔ قیدیوں کی اصلاح کے نقطۂ نظر سے یہ نہایت ضروری ہے کہ ان کے دماغ کی تربیت کی جائے۔ اور اس کا رخ بدلا جائے۔ انھیں لکھنا پڑھنا اور کوئی کارآمد ہنر سکھایا جائے۔ لیکن ہندوستان میں جیل کے حکام کو شاید یہ بات نہیں سوجھی۔ کم سے کم صوبہ متحدہ میں تو اس کا نام و نشان بھی نظر نہیں آتا۔ ابھی کچھ عرصہ سے لڑکوں اور نوجوان قیدیوں کو لکھنا پڑھنا سکھانے کی کوشش شروع ہوئی ہے لیکن یہ بالکل ناکافی ہے اور جن لوگوں کے سپرد یہ خدمت کی گئی ہے وہ قطعاً نااہل ہیں۔ کبھی کبھی یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قیدی پڑھنے لکھنے کو پسند نہیں کرتے

لیکن میرا تجربہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ میرے پاس بہت سے قیدی اسی غرض سے آتے تھے اور میں دیکھا کہ انھیں لکھنے پڑھنے کا دل سے شوق تھا۔ جن قیدیوں سے ملنے کا ہمیں موقع ملا تھا ہم انھیں پڑھاتے تھے اور وہ بڑی محنت سے کام کرتے تھے۔ اکثر جب آدھی رات کو میری آنکھ کھلی تو میں یہ دیکھ کر حیرت میں رہ گیا کہ دو ایک قیدی بارک کے اندر دھندلی سی لالٹین کے پاس بیٹھے اپنا سبق یاد کر رہے تھے۔

غرض میں کتب بینی میں مصروف رہتا تھا۔ میں اپنے مطالعہ کا موضوع بدلتا رہتا تھا۔ مگر عموماً ٹھوس کتابیں پڑھتا تھا۔ ناولوں سے ذہن سست ہو جاتا ہے اس لیے میں نے زیادہ ناولیں نہیں پڑھیں۔ جب پڑھتے پڑھتے تھک جاتا تو لکھنے لگتا تھا۔ تاریخ عالم کے موضوع پر میں نے اپنی لڑکی کے نام خطوط کا جو سلسلہ لکھا ہے اس کام میں اپنی سزا کے پورے دو سال مصروف رہا اور اس سے میرے ذہن کی یکسوئی اور تندرستی قائم رہی۔ ایک حد تک مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ میں اسی دور ماضی میں رہتا ہوں جس کی تاریخ میں لکھ رہا ہوں۔ اس لئے میں اپنے جیل کے ماحول کو قریب قریب بھول گیا تھا۔

سفرنامے پڑھنے کا مجھے بڑا شوق تھا مثلاً ہیوئن سانگ، مارکو پولو، ابن بطوطہ وغیرہ پرانے سیاحوں کے تذکرے اور زمانہ حال کے لوگوں مثلاً سیون ہیڈن (جس نے وسطی ایشیا کے ریگستانوں میں سفر کیا ہے) اور فریچ (جس نے تبت کے بڑے عجیب واقعات لکھے ہیں) وغیرہ کی کتابیں، تصویروں کی کتابیں خصوصاً پہاڑوں برف کے تودوں اور ریگستانوں کی تصویریں دیکھنے میں بڑا لطف آتا تھا۔ کیونکہ جیل میں ہر شخص وسیع فضاؤں، سمندروں اور پہاڑوں کے لئے ترستا ہے۔ میرے پاس مونٹ بلانک، کوہ آلپس اور ہمالیہ کی تصویروں کے چند خوبصورت

کتابیں بیٹھیں ہیں اکثر انھیں دیکھا کرتا تھا۔ اور جب میری کو ٹھڑی یا بارک کا درجۂ حرارت ۵۰ڈگری یا اس سے زیادہ ہوتا تھا۔ تو میں برف کے ان تو دوں کو حسرت سے تکا کرتا تھا۔ اٹلس کو دیکھ کر طبیعت میں بڑا ہیجان پیدا ہوتا تھا۔ ان سے ان جگہوں کی یاد تازہ ہو جاتی تھی جنھیں ہم دیکھ چکے تھے اور ان مقامات کا تصور نبا رہ جاتا تھا جنھیں دیکھنے کا ارمان تھا بے اختیار جی چاہتا تھا کہ ان پرانے منظروں کا لطف اٹھائیں۔ ان نقطوں اور نشانوں کی سیر کریں جو بڑے بڑے شہروں کو ظاہر کرتے ہیں۔ ان گہری موٹی لکیروں پر سے گذریں جو پہاڑوں کی علامت ہیں۔ اور ان نیلے دھبوں کو عبور کریں جو سمندر کی نشانی ہے۔ غرض دنیا کے تمام دل کش منظر دیکھیں اور بدلتی ہوئی انسانی زندگی کی کش مکش کا مطالعہ کریں۔ یہ آرزوئیں ہمیں بے چین کر دیتی تھیں اور جلدی سے ہم حسرت و افسوس کے ساتھ اٹلس کو اٹھا کر رکھ دیتے تھے اور پھر اسی چار دیواری میں لوٹ آتے تھے جو ہمیں گھیرے ہوئے تھی۔ اور انہی بے کیف معمولات میں مصروف ہو جاتے تھے جو ہماری قسمت میں لکھے تھے۔

قید خانے کے جانور

ایک سال اور ڈھائی مہینے میں میں نے دہرہ دون جیل میں اپنی چھوٹی سی کوٹھری یا کمرے میں گذارے اور مجھے ایسا محسوس ہونے لگا گویا میں اس کا ایک جزو بن گیا ہوں۔ میں اس کے ہر حصے سے آشنا تھا سفیدی سے پتی ہوئی دیواروں، ناہموار فرش اور کرم خوردہ چھت کی کڑیوں کے ایک ایک نشان اور ایک ایک داغ سے واقف تھا۔ باہر مختصر سے صحن میں گھاس کے چھوٹے چھوٹے پتے میرے پرانے دوست بن گئے تھے۔ میں اپنی کوٹھری میں تنہا نہیں تھا اس لئے کہ یہاں ہر قسم کے زہریلے کیڑے مکوڑوں اور بھڑوں نے اپنی نوآبادیاں قایم کر رکھی تھیں۔ کڑیوں کے پیچھے چھپکلیوں کا ڈیرہ تھا جو سر شام کو اپنے شکار کی تلاش میں باہر نکل آتی تھیں۔ اگر یہ صحیح ہے کہ انسان کے خیالات و جذبات کا کوئی نقش اس کے گرد وپیش میں باقی رہ جاتا ہے تو یقین ہے کہ اس کوٹھری کی تنگ فضا بھی طرح طرح کے خیالات سے معمور ہوگی اور وہ ہر چیز میں بسے ہوئے ہوں گے۔

دوسرے قید خانوں میں، میں اچھی اچھی کوٹھریوں میں رہا ہوں لیکن دہرہ دون جیل میں مجھے ایک ایسی رعایت حاصل تھی جس کی میں دل سے قدر کرتا تھا۔ یہاں کا اصل جیل خانہ نہایت مختصر ہے اور ہم جیل کے احاطہ ہی میں مگر اس کی دیواروں سے باہر ایک پرانی حوالات میں رہتے تھے۔ یہ جگہ بہت چھوٹی

تھی ۔ اس قدر چھوٹی تھی کہ اس میں ٹہلنے کی مطلق گنجائش نہ تھی ۔ لہذا ہمیں اجازت تھی کہ اپنی کوٹھری سے باہر جیل کے پھاٹک کے سامنے جو تقریباً سو گز کے فاصلہ پر تھا۔ صبح شام ٹہل سکیں ۔ گویا احاطہ جیل میں رہنے کے باوجود ہم اسکی دیواروں سے باہر نکل کر پہاڑ اور کھیتوں کا منظر دیکھ سکتے تھے ۔ پاس ہی آمد و رفت کے لئے ایک سڑک بھی تھی ۔ لیکن اس رعایت سے جس کا میں نے ذکر کیا ہے صرف میں ہی نہیں بلکہ بلاک الف اور ب کے تمام قیدی فائدہ اٹھا سکتے ہیں ۔ جیل کی دیواروں سے باہر مگر اس کے احاطہ کے اندر ہی ایک اور چھوٹی سی حوالات بھی تھی جو پورہ پہن حوالات کہلاتی تھی ۔ اس کے ارد گرد کوئی دیوار نہ تھی ۔ لہذا اس میں بیٹھے ہی بیٹھے کوہستان کے دلفریب منظر اور بیرونی زندگی کا نظارہ ممکن تھا ۔ پورہ پہن مجرم اور دوسرے قیدی جو یہاں رکھے گئے تھے انھیں بھی صبح و شام جیل خانے کے پھاٹک کے سامنے چہل قدمی کی اجازت تھی ۔

صرف وہی قیدی جو ایک مدت تک جیل کی اونچی اونچی دیواروں کے اندر رہے ہیں اس امر کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس کی حدود سے باہر ٹہل لینا یا بیرونی دنیا کے وسیع اور کشادہ منظر سے لطف اندوز ہونا نفسیاتی اعتبار سے کیسی عجیب و غریب نعمت ہے ۔ مجھے جیل سے باہر نکلنے کا اس قدر شوق تھا کہ برسات کے موسم میں بھی جب موسلا دھار بارش کا سلسلہ کئی روز تک جاری رہتا اور مجھے ٹخنوں ٹخنوں پانی میں چلنا پڑتا میں نے نکل کر ٹہلنا ترک نہیں کیا ۔ اس قسم کی چہل قدمی یوں تو ہر جگہ اچھی معلوم ہوتی مگر قریب ہی سر بہ فلک ہمالیہ کا منظر میرے لئے مزید خوشی کا باعث ہوتا تھا ۔ جس سے دم بھر کے لئے قید خانے کی پریشانی اور کلفت بڑی حد تک رفع ہو جاتی ۔ یہ میری

خوش قسمتی تھی کہ اس طویل عرصہ میں جب ملاقاتوں کا سلسلہ بالکل مسدود ہو جاتا اور مجھے کئی مہینے لگاتار تنہا رہنا پڑتا یہ خوب پہاڑ میری آنکھوں کے سامنے تھے۔ کوٹھری کے اندر سے اگرچہ میرے لیے ان کا لطف اٹھانا ناممکن تھا مگر ان کا تصور میرے دل میں اس طرح سما گیا تھا کہ مجھے ان کے قرب کا ہر وقت احساس رہتا۔ معلوم ہوتا تھا میرے ان کے درمیان ایک پر اسرار ربط قائم ہو گیا۔

پرندوں کے جھنڈ اڑتے اڑتے نظر سے غائب ہو گئے
اور وہ بادل کا اکیلا ٹکڑا بھی تیرتا ہوا دور چلا گیا۔
میں تنہا بیٹھا ہوں اور میرے آگے بہت دور جنگ ٹنگ
کی بلند چوٹی کھڑی ہے۔
ہم ایک دوسرے سے کبھی نہیں اکتاتے۔ پہاڑ اور میں

میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ شاعر لی تے پو کی طرح مجھے پہاڑوں سے کبھی وحشت نہیں ہوئی لیکن یہ بہت کم ہوتا تھا۔ عموماً مجھے ان کے قرب سے ایک طرح کی تسکین محسوس ہوتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان پہاڑوں کا وقار اور ثبات، لاکھوں کروڑوں برس کی حکمت و دانائی سے مالا مال مجھے چشم نمائی کرتا ہے۔ میرے تلون پر ہنستا ہے اور میرے بے چین دل کو سکون اور تقویت بخشتا ہے۔

ہندوستان کے نشیبی میدانوں کی نسبت دہرہ دون میں بہار کا موسم طویل بھی ہوتا ہے اور خوشگوار بھی۔ جاڑے میں درختوں کے پتے گر گئے تھے اور وہ ننگے ہو کر رہ گئے تھے۔ تعجب تو ہوتا ہے کہ جیل کے دو چار بڑے بڑے درخت بھی جو جیل کے سامنے کے دروازے کے قریب تھے بالکل ہی ننگے ہو گئے تھے۔ یوں بھی جیل میں بہت تر تیب والی

ہو گئے تھے۔ اور ان پر ایک افسردگی سی چھا گئی تھی۔ مگر بہار کی ہواؤں نے انھیں پھر گرما دیا اور ان کے رگ و ریشہ میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ دفعتاً ان بیلوں کے پیڑوں اور تمام درختوں میں ایک حرکت پیدا ہوئی۔ اور ایک طلسمات کا عالم نظر آنے لگا۔ جیسے پردے کے پیچھے پر اسرار قوتیں کام کر رہی ہوں میں ان کی شاخوں میں ہری ہری کونپلیں پھوٹتے دیکھ کر چونک پڑتا تھا۔ یہ منظر نہایت ہی خوش گوار اور مسرت خیز تھا۔ دفعتہً لاکھوں کروڑوں پتے بڑی سرعت کے ساتھ شاخوں پر نمودار ہو کر آفتاب کی روشنی میں چمک اٹھے۔ اور پھر ہوا کی تال پر رقص کرنے لگے۔ کونپلوں کا دیکھتے ہی دیکھتے پتے بن جانا کس قدر عجیب و غریب منظر ہے۔

اس سے پہلے میں نے یہ کبھی نہیں دیکھا تھا کہ آم کے نئے پتوں کا رنگ سرخی مائل بھورا ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے موسم خزاں میں کشمیر کے پہاڑوں پر ہلکا گلابی رنگ چھا جاتا ہے۔ لیکن یہ آم کے پتے بہت جلد اپنا رنگ بدل کر پھر سبز ہو جاتے ہیں۔

برسات کی بارشیں ہمیشہ خوش گوار ہوتی ہیں اس لئے کہ وہ گرمی کی تپش بجھا دیتی ہیں۔ مگر کبھی نعمت کی فراوانی زحمت بھی بن جاتی ہے اور دہرہ دون تو بارش کے دیوتا کا استھان ہے۔ برسات کی ابتدا میں شروع ہی کے پانچ چھ ہفتوں میں یہاں تقریباً پچاس ساٹھ انچ بارش ہو جاتی ہے اس وقت جیل کے ایک تنگ گوشے میں دبک کر بیٹھ جانا اور یہ کوشش کرنا کہ آدمی ٹپکتی ہوئی چھت کے پانی یا کھڑکیوں میں سے آنے والی بوچھار سے بچا رہے کچھ اچھا نہیں لگتا۔

برسات کے بعد خزاں کا موسم نہایت خوش گوار ہوتا تھا اور جاڑا بھی

بشرطیکہ بارش نہ ہو، پانی کی بوچھار، بجلی کی کڑک، تیز و تند ہواؤں کے چلنے سے دم الجھتا تھا اور بے اختیار جی چاہتا تھا کہ ایک اچھا مکان، کسی قدر گرمی، آسائش اور گرمی میسر ہو۔ بعض اوقات اولے گرتے تھے اور ایک ایک اولا کھیلنے کی گولی سے بڑا ہوتا تھا۔ جب یہ اولے نالی دار آہنی چھت پر گرتے تو ان سے کچھ اس قسم کا زبردست شور پیدا ہوتا تھا جیسے توپیں چل رہی ہوں۔

ایک دن مجھے خاص طور سے یاد ہے۔ دسمبر ۱۹۳۲ء کی چوبیسویں تاریخ تھی۔ دن بھر رعد و باراں کا زور رہا۔ سردی نہایت سخت تھی جسمانی تکلیف کے لحاظ سے یہ سب سے برا دن تھا۔ جو میں نے جیل میں گذارا لیکن شام کو دفعۃً مطلع صاف ہو گیا۔ ارد گرد کے تمام پہاڑ اور پہاڑیاں برف سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ یہ دیکھ کر میری تمام افسردگی اور کلفت دور ہو گئی۔ اگلے روز بڑا دن تھا۔ صاف اور خوش گوار، اور برف آلود پہاڑوں کا منظر نہایت دل فریب معلوم ہوتا تھا۔

روزمرہ کے مشاغل سے محروم ہونے کی وجہ سے میں فطرت کے مشاہدے کا شوق ہو گیا۔ مختلف قسم کے جانوروں اور کیڑوں کو جو وہاں موجود تھے ہم بہت غور سے دیکھنے لگے۔ جب میری مشاہدے کی قوت بڑھ گئی تو میں نے دیکھا کہ میری کوٹھری اور باہر صحن میں ہر قسم کے کیڑے مکوڑے موجود ہیں۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ میں "تنہائی" کی شکایت کرتا تھا اور یہ خبر نہ تھی کہ وہ احاطہ جو بظاہر خالی اور ویران معلوم ہوتا تھا زندگی سے معمور ہے ان رینگنے اور اڑنے والے کیڑوں نے مجھے کبھی نہیں ستایا۔ اس لئے میں نے بھی انہیں نہیں چھیڑا۔ البتہ کھٹملوں اور مچھروں اور ایک حد تک مکھیوں سے میری لڑائی مسلسل جاری رہی۔ بھڑوں اور زہریلے کیڑوں سے جو سینکڑوں کی تعداد میں میری

کوٹھری میں موجود تھے میں نے کبھی تعرض نہیں کیا۔ مجھ میں اور ان میں صرف ایک دفعہ ذرا سا جھگڑا ہوا تھا۔ شاید ایک بھڑ نے نادانستہ طور پر مجھے کاٹا اور مجھے اس قدر طیش آیا کہ میں نے اس کو نیست و نابود کرنے کی ٹھان لی لیکن انھوں نے اپنے چھتوں کو بچانے کے لیۓ جن میں غالباً ان کے انڈے تھے بڑی بہادری سے میرا مقابلہ کیا۔ مجبوراً مجھے اپنا ہاتھ روکنا پڑا۔ اور میں نے یہ فیصلہ کیا کہ اگر آیندہ انھوں نے مجھے کسی قسم کی تکلیف نہیں دی تو میں بھی ان کو اپنے حال پر چھوڑ دوں گا۔ اس واقعہ کے بعد میں ایک سال سے کچھ اوپر ہی اس کوٹھری میں رہا ہوں۔ لیکن ان بھڑوں یا زہریلے کیڑوں نے کبھی مجھے تنگ نہیں کیا اور ہم ایک دوسرے کا احترام کرتے رہے۔

چمگادڑوں سے مجھے نفرت تھی۔ لیکن مجبوراً انھیں بھی برداشت کرنا پڑتا تھا۔ شام کے دھندلکے میں وہ نہایت خاموشی کے ساتھ پرواز کرتے اور ایک لحظہ کے لیۓ آسمان کی تاریک فضا کے مقابل نظر آجاتے۔ ان بھیانک جانوروں سے مجھے ڈر لگتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ میرے چہرے کے برابر سے گذر جاتے ہیں اور یہ خوف تھا کہ کہیں ہم ایک دوسرے سے ٹکرا نہ جائیں۔ بڑے بڑے چمگادڑ فضا میں بہت اوپر پرواز کرتے تھے۔

میں گھنٹوں چیونٹی، دیمک اور دوسرے کیڑے مکوڑوں کا مشاہدہ کیا کرتا تھا۔ اور چھپکلیوں کا جب وہ شام کو رینگتی ہوئی چپکے چپکے اپنے شکار کو تاکتی رہتیں یا کبھی نہایت ہی مضحک انداز سے دم ہلا ہلا کر ایک دوسرے کا پیچھا کرتیں عام طور پر یہ بھڑوں کی طرف سے بچتی تھیں۔ لیکن دو مرتبہ میں نے دیکھا کہ انھوں نے نہایت احتیاط سے بھڑوں کا پیچھا کیا اور پھر دفعتہً سے انھیں دبوچ لیا۔ میں نہیں جانتا کہ انھوں نے جان بوجھ کر اپنے آپ کو ڈنک سے

بچایا یا محض اتفاقی بات تھی۔

ان کے علاوہ گلہریاں قریب کے درختوں پر بے شمار تھیں کبھی کبھی انھیں یہاں تک جرأت ہوئی کہ ہمارے پاس چلی آتیں۔ لکھنؤ جیل میں میں کئی کئی گھنٹے قریب قریب بے حس و حرکت بیٹھا مطالعہ کیا کرتا تھا۔ اس اثنا میں اکثر ایسا ہوتا تھا کہ ایک گلہری میری ٹانگ سے ہوتی ہوئی گھٹنے پر آ بیٹھتی اور ادھر ادھر دیکھنے لگتی۔ دفعتہً میری آنکھیں اس سے چار ہوتیں اور وہ محسوس کرتی کہ میں کوئی درخت وغیرہ نہیں ہوں جو اس نے مجھے سمجھ رکھا تھا۔ ایک لمحے کے لئے وہ خوف سے ٹھٹکتی اور پھر نہایت تیزی کے ساتھ بھاگ جاتی۔ بعض اوقات گلہریوں کے چھوٹے چھوٹے بچے درختوں پر سے گر پڑتے۔ ان کی ماں گلہری بھی ان کے پیچھے ہی آ جاتی اور ایک چھوٹی سی گیند کی طرح ان کا گچھا سا بنا کر انھیں کسی محفوظ گوشے میں لے جاتی۔ کبھی یہ بچے گم بھی ہو جاتے تھے۔ ایک بار ایک رفیق کو اس قسم کی تین گلہریاں مل گئیں جن کی ہم بہت دیر تک دیکھ بھال کرتے رہے۔ یہ گلہریاں اتنی چھوٹی تھیں کہ ان کو کھلانا پلانا ناممکن سا معلوم ہوتا تھا۔ آخر یہ مسئلہ ایک نئی ترکیب سے حل کیا گیا۔ یعنی ہم نے فاؤنٹین پن میں روشنائی ڈالنے کی نلکی کی نوک پر ذرا سی روئی لگا دی اور اس سے دودھ پلانے کی بوتل کا کام لیا۔

کبوتروں سے میں نے کوئی جیل خالی نہیں پایا سوائے الموڑہ کے کوہستانی قید خانے کے۔ دہرہ دون جیل میں سینکڑوں ہزاروں کبوتر تھے شام کو ان کے جھنڈ کے جھنڈ سطح آسمان پر چھا جاتے۔ بعض اوقات جیل کے عہدہ دار ان کا شکار کرتے اور کھا جاتے۔ یہاں مینائیں بھی تھیں جو ہر جگہ ہوتی ہیں۔ ان کے ایک جوڑے نے میری کوٹھری کے دروازہ کے اوپر

اوپر اپنا گھونسلا بنا رکھا تھا۔ اور ان کی خوراک کا انتظام میرے ذمہ تھا۔ رفتہ رفتہ وہ مجھ سے اس قدر مانوس ہو گئیں کہ اگر صبح یا شام ان کے کھانے میں ذرا سی بھی دیر ہو جاتی تو وہ میرے پاس چلی آتیں اور شور مچا مچا کر اپنی غذا طلب کرتیں۔ ان کی حرکات و سکنات کو دیکھ دیکھ کر اور بے صبری کی چیخوں کو سن کر مجھے بے حد لطف آتا تھا۔

نینی میں بہت سے طوطوں نے میری بارک کی دیواروں میں دمدوں کے اندر اپنے گھونسلے بنا رکھے تھے۔ ان کا ایک دوسرے سے اختلاط اور اظہارِ محبت کرنا نہایت دلکش معلوم ہوتا تھا۔ کبھی کبھی دو نر طوطوں میں کسی مادہ کی بدولت جنگ بھی ہو جاتی تھی۔ اس موقع پر مادہ نہایت اطمینان سے بیٹھی تماشا دیکھتی رہتی اور جس کی فتح ہوتی اسے اپنا موردِ عنایت بناتی۔

دہرہ دون میں طرح طرح کے پرند موجود تھے۔ ان کے چہچہوں سے ایک شور برپا ہو جاتا تھا۔ مگر کوئل کی دردناک کوک ان سب پر غالب آ جاتی تھی۔ برسات اور برسات سے کچھ پہلے "دماغی بخار" کا پرند آ جاتا اور مجھے بہت جلد معلوم ہو گیا کہ اس کا یہ نام کیوں رکھا گیا۔ مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوتا تھا کہ دن ہو یا رات، دھوپ ہو یا بارش یہ پرند لگاتار ایک ہی نغمہ الاپتا رہتا ہے۔ یہاں اکثر یہ پرندے نظر نہیں آتے تھے۔ ہم صرف ان کی آواز سنتے تھے۔ ہمارے مختصر سے صحن میں کوئی درخت نہیں تھا البتہ میں عقابوں اور چیلوں کو دیکھا کرتا تھا جو بہت اوپر ہوا میں نہایت خوب صورتی سے منڈلایا کرتی تھیں۔ کبھی کبھی وہ تیر کی طرح نیچے گرتیں اور پھر ہوا کے جھونکے میں اوپر اٹھ جاتیں۔ مرغابیوں کا جھنڈ البتہ ہمارے سر پر سے گذر جاتا تھا۔

بریلی جیل میں بندروں نے ایک بہت بڑی نو آبادی قائم کر رکھی تھی۔

ان کی حرکتیں دیکھنے سے تعلق رکھتی تھیں۔ ایک واقعہ مجھے اب تک یاد ہے ایک بندر کا بچہ کسی طرح ہماری بارک کے احاطہ میں آگیا اور باوجود کوشش کے دیوار کو نہیں پھاند سکا۔ یہ دیکھ کر جیل کے محافظوں، قیدیوں اور قیدی نگرانوں نے پکڑ کر اس کی گردن میں رسی ڈال دی۔ اس کے ماں باپ ایک اونچی سی دیوار پر بیٹھے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے اور ان کا غصہ لحظہ بہ لحظہ بڑھ رہا تھا۔ دفعتاً ان میں سے ایک جنادری بندر نیچے کود پڑا اور اس ہجوم پر جس نے بندر کے بچے کو گھیر رکھا تھا حملہ کر دیا۔ یہ فعل غیر معمولی جرأت اور دلیری کا کام تھا۔ اس لئے کہ محافظ اور قیدی نگراں ہاتھوں میں لاٹھیاں اور ڈنڈے لئے اس کو دھمکا رہے تھے۔ اور ان کی تعداد بھی بڑی تھی آخر بے دریغ جرأت کی فتح ہوئی اور انسانوں کا ہجوم لاٹھیاں اور ڈنڈے سب کچھ چھوڑ کر ڈر کے مارے بھاگ گیا۔ یوں بندروں نے اپنے بچے کو انسانوں کے ہاتھ سے بچا لیا۔

بعض اوقات جیل میں ایسے جانور بھی چلے آتے تھے جن کا آنا کچھ بہت زیادہ خوش گوار نہ تھا۔ بچھوؤں کو میں اکثر اپنی کوٹھری میں دیکھتا تھا خصوصاً رعد و باراں کے طوفان کے بعد عجیب بات یہ ہے کہ مجھے کبھی کسی بچھو نے نہیں کاٹا۔ حالانکہ مجھے ان سے ایسی ایسی جگہوں پر سابقہ پڑا جہاں ان کی موجودگی کا وہم بھی نہ ہوتا تھا۔ مثلاً بستر پر۔ اکثر ایسا بھی ہوا کہ میں نے کوئی کتاب پڑھنے کے لئے اٹھائی اور اس میں بچھو موجود تھا۔ میں نے ایک نہایت سیاہ بچھو کو جو شکل سے زیادہ زہریلا معلوم ہوتا تھا بوتل میں بند کر رکھا تھا اور اسے مکھیاں وغیرہ کھلایا کرتا۔ ایک دن میں نے اس کو ڈوری میں باندھ کر دیوار پر چھوڑا تو بہت ہی تندہی سے نکل بھاگا۔ اس کی آزادی

کو میں خطرناک سمجھتا تھا۔ اس لئے میں نے اپنی کوٹھری کا کونا کونا چھان مارا لیکن کچھ پتا نہ چلا۔

جیل میں میری کوٹھری میں یا اس کے قریب ہی تین چار سانپ بھی پائے گئے۔ ان میں سے ایک کی خبر کسی نہ کسی طرح باہر جا پہنچی اور اخباروں نے اسے موٹی موٹی سرخیوں کے ساتھ شائع کیا۔ سچ پوچھئے تو مجھے اس سے تکلیف نہیں ہوئی بلکہ لطف آیا۔ قید خانے کی زندگی بڑی بے کیف ہوتی ہے اور اس کی یکسانی کو جو چیز بھی توڑ دے وہ اچھی معلوم ہوتی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مجھے سانپ اچھے معلوم ہوتے ہیں مگر مجھے ان سے وحشت نہیں ہوتی جتنی بعض اور لوگوں کو۔ ان کے ڈسنے سے بے شک ڈر معلوم ہوتا ہے اور جب کبھی اس کا سامنا ہو جائے یقیناً اس سے اپنی حفاظت کی فکر کرتا ہوں۔ میرے دل میں کراہیت یا غیر معمولی خوف کا کوئی جذبہ نہیں ہوتا۔ البتہ کنکھجوروں سے ڈر لگتا ہے بلکہ ڈر سے زیادہ گھن آتی ہے۔ ایک مرتبہ علی پور جیل کلکتہ میں آدھی رات کو میری آنکھ کھلی تو میں نے محسوس کیا کہ کوئی چیز میرے پاؤں پر رینگ رہی ہے۔ میں نے جو مشعل کو جلایا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک کنکھجورا بستر پر موجود ہے۔ میں گھبرا کر بستر سے کودا اور کوٹھری کی دیوار سے ٹکراتے ٹکراتے رہ گیا۔ یہ موقع تھا جب میں نے صحیح طور پر محسوس کیا کہ یادلاف کی اضطراری حرکات کیا ہوں گی۔

دہرہ دون میں میں نے ایک نیا جانور دیکھا یا یوں کہنا چاہئے کہ وہ جانور میرے لئے نیا تھا۔ میں جیل کے پھاٹک میں کھڑا جیلر سے باتیں کر رہا تھا کہ ہمیں ایک شخص نظر آیا جو ایک عجیب و غریب جانور کو اٹھائے لئے جا رہا تھا۔ جیلر نے اسے بلوا بھیجا تو میں نے دیکھا کہ یہ جانور چھپکلی اور مگرمچھ کے بیچ کی چیز ہے۔ یہ تقریباً دو فٹ لمبا تھا۔ اس کے پنجے اور کھال سخت اور مضبوط۔

رس بھنگم جانور کو جو ابھی تک زندہ تھا ایک عجیب و غریب طریقہ سے مروڑ کر جیسے گرہ لگائی جاتی ہے شکاری اسے بانس میں لٹکائے خوش خوش گھر لیے جا رہا تھا۔ ہم نے دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ اس جانور کو 'بو' کہتے ہیں۔ جیلر کے اس سوال پر کہ وہ اسے کیا کرے گا۔ اس شخص کی باچھیں کھل گئیں اور وہ کہنے لگا کہ میں اس کی بھجیا بنا ڈالوں گا۔ یہ شخص جنگل کا رہنے والا تھا۔ اس واقعہ کے کچھ دنوں کے بعد جب میں ایف، ڈبلیو، چیپلین کی کتاب "جنگل اندھیرے اور روشنی میں" کا مطالعہ کر رہا تھا تو مجھے معلوم ہوا کہ اس جانور کو پنگولین کہتے ہیں۔

قیدیوں اور بالخصوص ان مجرموں کے لئے جن کی سزا بہت طویل ہو سب سے زیادہ تکلیف دہ امر یہ ہے کہ ان کے جذبات افسردہ ہو جاتے ہیں۔ بعض اوقات وہ جانوروں کو پال کر اس کی تلافی کرنا چاہتے ہیں۔ عام قیدیوں کو اس کی اجازت نہیں ہوتی مگر قیدی نمبرداران جن کو تھوڑی بہت آزادی حاصل ہوتی ہے ایسا کریں تو حکام جیل کو کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔ عام طور پر گلہریاں اور عجیب بات یہ ہے کہ نیولے پالے جاتے ہیں۔ کتوں کو تو جیل میں آنے کی اجازت ہی نہیں ہوتی۔ البتہ بلیوں پر کوئی قید نہیں۔ ایک مرتبہ بلی کا ایک چھوٹا سا بچہ مجھ سے مانوس ہو گیا جس کو دراصل جیل کے ایک افسر نے پالا تھا۔ جب اس کی تبدیلی ہو گئی تو مجھے اس بچے کی جدائی کا واقعی افسوس ہوا کتے اگرچہ جیل میں نہیں آ سکتے لیکن دہرہ دون میں مجھے بالکل اتفاقی طور پر ان سے سابقہ پڑ گیا۔ ہمارے جیل کے افسروں میں سے ایک صاحب اپنے ساتھ ایک کتیا لے آئے۔ جب ان کی تبدیلی ہو گئی تو انھوں نے اسے وہیں چھوڑ دیا۔ اس پر یہ کتیا ادھر ادھر ماری ماری پھرنے لگی۔ کبھی موریوں میں سا پڑی رہتی اور کبھی محافظین جیل کے یہاں سے اسے چند ٹکڑے مل جاتے۔ لیکن زیادہ تر

اسے بھوکا ہی رہنا پڑتا۔ چونکہ میں قید خانے کے باہر حوالات میں رہتا تھا اس لئے کبھی کبھی یہ کنبا خوراک کی تلاش میں میرے پاس بھی آنکلتی۔ میں نے اسے باقاعدہ کھلانا پلانا شروع کیا۔ کچھ دن گذر گئے تو اس نے ایک نالی میں بہت سے بچے دئے۔ جن میں سے اکثر لوگ اٹھالے گئے۔ مگر تین بچ گئے۔ ان کی خوراک کا اہتمام میرے ذمہ تھا۔ مگر ایک مرتبہ جب ان میں سے ایک پلا بہت زیادہ بیمار ہو گیا تو مجھے اس کی وجہ سے بہت زیادہ تکلیف اٹھانا پڑی بعض اوقات مجھے رات کو بار بار اٹھنا پڑتا تاکہ اس کی نگہداشت کرسکوں جب یہ پلا بچ گیا تو میں بہت خوش ہوا کہ میری تیمارداری رائیگاں نہیں گئی۔

جیل سے باہر مجھے کبھی جانوروں سے اتنا سابقہ نہیں پڑا جتنا جیل کے اندر۔ یہ صحیح ہے کہ کتوں کا مجھے ہمیشہ شوق رہا ہے اور میں نے کئی بار ان کو پالا بھی۔ لیکن اپنے دوسرے مشاغل کی وجہ سے کبھی پوری طرح ان کی دیکھ بھال نہیں کرسکا۔ قید خانے میں میں کتوں کی رفاقت سے خوش تھا۔ عام طور سے ہم ہندوستانی جانوروں کو پیار سے نہیں پالتے اور عجیب بات یہ ہے کہ باوجود اہنسا کے تمام فلسفہ کے ان سے اکثر لاپرواہی بلکہ سختی کا سلوک کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر گائے ہی کو لے لیجئے۔ ہندوؤں کو یہ جانور کس قدر محبوب ہے۔ وہ اس کی دیکھ بھال کیا پرستش تک کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض اوقات اس کے لئے بلوے بھی ہو جاتے ہیں۔ باایں ہمہ گائے سے کچھ بہت اچھا سلوک نہیں کیا جاتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ عبادت کے ساتھ شفقت کا ہونا ضروری نہیں۔

مختلف ممالک نے مختلف قسم کے جانوروں کو اپنے مقاصد یا سیرت کے اظہار کے لئے علامت کے طور پر اختیار کررکھا ہے۔ مثلاً ریاستہائے متحدہ

اور جرمنی نے عقاب، انگلستان نے شیر اور بل ڈاگ اور فرانس نے لڑتا ہوا مرغا، قدیم روس کا نشان ریچھ تھا۔ کیا جانوروں کو قومی نشان بنانے سے قوموں کی سیرت پر کچھ اثر پڑتا ہے؟ ان میں سے اکثر...... لڑنے والے جانور بلکہ درندے ہیں۔ لہٰذا یہ کوئی عجیب بات نہیں کہ جن قوموں نے اس قسم کی مثالوں کو سامنے رکھ کر نشو ونما پائی ہے۔ انھوں نے خود بھی قصداً اس قسم کی عادات و خصائل اختیار کر لئے ہیں۔ وہ دوسروں پر جھپٹتے، غراتے ہیں اور موقع پا کر دبوچ لیتے ہیں۔ اسی طرح اگر ہندوؤں کے دل میں علم اور عدم تشدد کا غلبہ ہے تو اس پر بھی کوئی تعجب نہیں ہونا چاہئے کیونکہ ان کا قومی نشان گائے ہے۔

جدّوجہد

جیل سے باہر جنگ کا سلسلہ جاری تھا اور ہمارے بہادر مرد اور عورتیں پرامن طریقہ سے ایک مضبوط اور مستحکم حکومت کا مقابلہ کر رہی تھیں۔ گو انھیں اس بات کا یقین تھا کہ اس وقت یا مستقبل قریب میں انکی کامیابی ناممکن ہے۔ دوسری جانب حکومت کے مسلسل اور ہر لحظہ بڑھتے ہوئے تشدد سے یہ حقیقت آشکارا ہو رہی تھی کہ ہندوستان میں ان کی بنا کس چیز پر قائم ہے۔ ہمیں کم سے کم اس خیال سے تسکین ہوتی تھی کہ اس کا پردۂ ریا چاک ہو گیا۔ بالآخر سنگینوں کو فتح ہوئی لیکن ایک بہت بڑے جنگجو کا قول ہے کہ "سنگینوں سے اور کام لے سکتے ہیں مگر ان پر بیٹھ نہیں سکتے"۔ ہم سمجھتے تھے کہ ہمارا اس طرح محکوم رہنا زیادہ اچھا ہے۔ بجائے اس کے کہ ہم اپنے ضمیر کو بیچ ڈالیں اور روحانی اعتبار سے فنا ہو جائیں۔ قید خانوں میں اگرچہ ہمارے جسم بالکل بے بس تھے مگر ہم محسوس کرتے تھے کہ ہم یہاں بھی اپنا کام کر رہے ہیں بلکہ شاید ان لوگوں سے بہتر کر رہے ہیں جو جیل سے باہر ہیں (مانا کہ ہم کمزور ہیں) مگر یہ بات کہاں تک ٹھیک ہے کہ ہم اپنے آپ کو بچانے کے لئے ہندوستان کا مستقبل قربان کر دیں۔ اس میں شک نہیں کہ انسان کی قوتیں اور اس کی طاقت محدود ہے اور ہمارے بہت سے ساتھی معذور ہو گئے یا مر گئے۔ بعض نے علیحدگی اختیار کر لی اور بعض نے ہمارے ساتھ غداری کی۔ پھر بھی ہماری جدوجہد کا سلسلہ جاری رہا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر انسان اپنے مقصد کو فراموش نہ کرے اور اپنی ہمت کو مضبوطی کے ساتھ قایم رکھے تو اس کے لئے ناکامی کا کوئی امکان نہیں حقیقی ناکامی یہ ہے کہ ہم اپنے اصولوں کو ترک کر دیں یعنی اپنے حقوق سے دست بردار ہو جائیں اور ظلم کے آگے ذلت سے سر جھکا دیں۔ یاد رکھنا چاہئے کہ اپنوں کے لگائے ہوئے زخم دشمن کے لگائے ہوئے زخموں سے دیر میں بھرتے ہیں۔

اسی کمزوری اور حالات کی نامساعدت کو دیکھ کر اکثر طبیعت افسردہ ہو جاتی تھی مگر اس کے باوجود ہمیں اپنی کامیابی پر فخر تھا۔ کیونکہ ہماری قوم نے واقعی بڑی بہادری سے کام لیا تھا اور ہمیں یہ محسوس کر کے خوشی ہوتی تھی کہ ہم ایک شجاع اور باہمت جماعت کے فرد ہیں۔

سول نافرمانی کی تحریک کے دوران میں دو مرتبہ یہ کوشش کی گئی کہ کانگریس کا عام اجلاس منعقد کیا جائے۔ ایک مرتبہ دہلی میں اور دوسری مرتبہ کلکتہ میں۔ ظاہر تھا کہ ایک خلاف قانون جماعت امن و امان سے اپنا اجلاس کس طرح منعقد کر سکتی ہے۔ جب کبھی ایسا ہوتا پولیس سے اس کا تصادم ضروری تھا۔ اور واقعہ بھی یہ ہے کہ ان جلسوں کو پولیس ہمیشہ لاٹھیوں کے زور سے منتشر کرتی رہی۔ اس نے بہت سے لوگوں کو گرفتار بھی کیا۔ لیکن یہاں قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ان غیر قانونی اجتماعات میں سینکڑوں نمائندے ہندوستان کے ہر حصے سے آئے اور مجھے یہ سن کر حیرت ہوتی تھی کہ صوبجات متحدہ کا حصہ ان میں بہت نمایاں تھا مارچ ۱۹۳۳ء کے آخر میں جب اجلاس کلکتہ کی نوبت آئی تو میری ماتاجی نے بھی اس میں شرکت پر اصرار کیا۔ مگر پنڈت مالویہ اور ان کے رفقاء کی طرح وہ بھی گرفتار ہو گئیں۔ اور انھیں بھی کلکتہ جاتے ہوئے چند دن آسنسول کی جیل میں گذارنا پڑے۔ اس موقع پر انھوں نے جس ہمت اور قوت کا اظہار

کیا اس پر مجھے بے حد تعجب ہوا۔ وہ کمزور تھیں اور بیمار بھی لیکن وہ قید خانے
سے نہیں ڈرتی تھیں۔ اس لئے کہ وہ اس سے زیادہ سخت مصیبتیں برداشت
کر چکی تھیں۔ جس ماں کا بیٹا، دونوں بیٹیاں اور بہت سے عزیز جن کو وہ دل
سے چاہتی تھیں زیادہ تر جیل میں رہتے اسے خالی گھر سے وحشت نہ ہوتی
تو اور کیا ہوتا۔

جب ہماری جدوجہد دھیمی پڑ گئی اور اس نے ایک خاص رفتار
اختیار کر لی تو اس میں وہ جوش و خروش بھی نہیں رہا۔ البتہ بیچ میں کبھی کبھی لوگ
بھڑک اٹھتے تھے۔ اس زمانہ میں میرے خیالات زیادہ تر دوسرے ملکوں کی سیر
کیا کرتے تھے۔ جہاں تک ممکن تھا میں نے جیل کے اندر اپنا وقت اس کی دنیا اور کی
کے مطالعہ میں گذارا جو دنیا پر چھائی ہوئی تھی۔ اس بحث کے متعلق مجھے جو کتابیں
بھی ملیں میں نے اسے پڑھ ڈالا۔ اور جوں جوں مجھے زیادہ کتابیں دستیاب ہوتی
گئیں میری دلچسپی بھی بڑھتی گئی۔ معلوم ہوتا تھا کہ ہندوستان اور اس کے تمام
مسائل اور جدوجہد اس زبردست ناٹک کا ایک سین ہے جو سیاسی اور
معاشی قوتوں کی کشمکش کی شکل میں دنیا بھر میں قومی اور بین الاقوامی اسٹیج
پر کھیلا جا رہا ہے۔ اس جدوجہد میں ہماری ہمدردی کا رخ روز بروز اشتمالیت
کی طرف ہوتا گیا۔

اشتراکیت اور اشتمالیت بہت دنوں سے مجھے اپنی طرف کھینچ رہی تھیں
اور روس کا میرے دل پر خاص اثر تھا۔ یہ صحیح ہے کہ میں اس ملک کی اکثر باتوں
کو ناپسند کرتا تھا۔ مثلاً مخالفت رائے کا بے رحمی سے دبا دینا۔ مزدوروں کی
جبری تنظیم اور مختلف کارروائیوں میں تشدد سے کام لینا۔ جو میرے نزدیک
غیر ضروری تھا۔ لیکن سرمایہ داروں کی دنیا میں بھی تو جبر و تشدد کی کمی نہیں۔

غرض مجھے روز بروز یقین ہوتا گیا کہ ہماری حسب بعض سماج اور ہماری حکومت کی بنیاد ہی تشدد پر قائم ہے۔ اور بغیر تشدد کے اس کا زیادہ دن چلنا محال ہے۔ اگر عام لوگوں کی یہی حالت رہی کہ بھوک اور فاقے کا ڈر انھیں چند آدمیوں کا حکم ماننے پر مجبور کرے اور ان کی فلاح و عظمت کا باعث ہو تو تھوڑی سی سیاسی آزادی لے کر کیا کرنا ہے۔

تشدد سے دراصل کوئی بھی خالی نہیں لیکن سرمایہ داری نظام کا تو خمیر ہی تشدد سے بنا ہے۔ بر خلاف اس کے روس کا تشدد بجائے خود کچھ بہت اچھی چیز نہیں۔ پھر بھی اس کا مقصد ایک جدید نظام قائم کرنا ہے جو صلح جمہوریت اور جمہور کی حقیقی آزادی پر مبنی ہے۔ باوجود اپنی غلطیوں کے سوویٹ روس نے غیر معمولی مشکلات پر غلبہ حاصل کیا ہے۔ اور ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس جدید نظام کی تاسیس میں اس کو بڑی حد تک کامیابی ہوئی۔ جب تمام عالم میں کساد بازاری کا زور تھا۔ اور کسی نہ کسی طرح ہر شخص کا قدم پیچھے کی طرف ہٹ رہا تھا سوویٹ روس میں ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے ایک نئی دنیا تعمیر ہو رہی تھی۔ اس کی نظر لینن اعظم جیسے بلند انسان کی قیادت میں مستقبل پر تھی اور وہ صرف یہی دیکھتا تھا کہ آیندہ کیا ہونے والا ہے برعکس اس کے دوسرے ممالک ماضی کے از کار رفتہ ہاتھوں میں دب کر اپنی قوتیں زائل کر چکے تھے۔ اور ان کی ساری کوشش یہ تھی کہ گزرے ہوئے عہد کے نکمے آثار کو محفوظ رکھیں۔ وسط ایشیا کے پسماندہ ممالک نے سوویٹ حکومت کے ماتحت جو زبردست ترقی کی ہے اس کی روداد نے مجھے خاص طور پر متاثر کیا۔ لہٰذا ان دونوں نظام کا مقابلہ کرتے ہوئے بالآخر مجھے روس کے ساتھ اتفاق کرنا پڑا جو اس تاریک اور پریشان عالم میں میرے سامنے ایک روشن اور حوصلہ افزا نمونہ پیش کر رہا تھا۔

لیکن اگرچہ سوویٹ روس کی کامیابی یا ناکامی ایک اشتمالی ریاست قائم کرنے کے عملی تجربے کی حیثیت سے بے حد اہم ہے۔ مگر نظریہ اشتمالیت کی صحت پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ممکن ہے بالشویک اپنی غلطیوں یا بعض قومی یا بین الاقوامی وجوہ کی بناء پر ناکام رہیں اور پھر بھی اشتمالیت کا نظریہ بالکل صحیح ہو۔ خود اس نظریہ کی رو سے دوسروں کے لئے ہر بات میں اندھا دھند روس کی تقلید کرنا حماقت ہے۔ اس لئے کہ روس نے اشتمالیت کو جس طریق پر استعمال کیا ہے اس کا انحصار اس ملک کے مخصوص حالات اور تاریخی نشوونما پر ہے۔ اور پھر ہندوستان اور دوسرے ممالک کو یہ موقع حاصل ہے کہ بالشویک روس کی غلطیوں سے بھی اتنا ہی فائدہ اٹھائیں جتنا اس کی کامیابیوں سے۔ غالباً بالشویکوں کی کوشش یہ رہی ہے کہ وہ اپنا قدم نہایت تیزی کے ساتھ آگے بڑھائیں ان کے اردگرد دشمنوں کا نرغہ تھا اور وہ بیرونی حملہ آوروں سے ڈرتے تھے۔ اگر ان کی رفتار اس قدر تیز نہ ہوتی تو شاید وہ اس مصیبت سے جو دیہاتی علاقوں کو اٹھانی پڑی، بچ سکتے تھے۔ لیکن اب سوال یہ ہے کہ تبدیلی کی رفتار کم رکھنے سے انقلاب ممکن بھی تھا یا نہیں۔ ایسی نازک صورت حال میں جب ایک نظام میں بنیادی تبدیلی کرنی تھی جزوی اصلاحات سے کام نہیں چل سکتا تھا۔ چاہے آگے چل کر ترقی کی رفتار کتنی ہی سست کیوں نہ ہو پہلا قدم یہی ہونا چاہئے تھا کہ موجودہ نظام کا خاتمہ کر دیا جائے۔ جو اپنا کام پورا کر چکا تھا۔ اور آئندہ ترقی کی راہ میں حائل تھا۔

ہندوستان میں زمین اور صنعت کے مسائل ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ بلکہ تمام کا حل صرف اسی طرح ممکن ہے کہ ایک انقلابی لائحہ عمل اختیار کیا جائے۔ مسٹر لائیڈ جارج اپنی تصنیف "جنگ کی یادداشت" میں لکھتے

ہیں" اس سے بڑی غلطی اور کیا ہو گی کہ ہم ایک کہائی کو دو جستوں میں عبور کرنے کی کوشش کریں"

مجھے اس سے بحث نہیں مگر مارکسیت کے نظریے اور اس کے فلسفے نے میرے ذہن کے بہت سے تاریک گوشوں کو منور کر دیا۔ اب میرے نزدیک تاریخ کے معنی ہی بدل گئے۔ مارکسی تفسیر نے اسے کہیں زیادہ روشن اور واضح کر دیا۔ اور مجھے محسوس ہونے لگا کہ یہ ایک ڈرامہ ہے جو گویا بتدریج کھیلا جا رہا ہے۔ اور اس کی تہ میں ایک مقصد اور نظام موجود ہے۔ خواہ وہ غیر شعوری کیوں نہ ہو۔ ماضی اور حال کی دل ہلا دینے والی تباہی اور بربادی کے باوجود مستقبل میں ہزارہا خطروں کے ساتھ امید کی روشنی جلوہ گر ہے۔ مارکسیت کا جو پہلو مجھے خاص طور سے پسند آیا وہ اس کا علمی طرز خیال اور اذعانی عقیدے سے قطعاً آزاد ہونا ہے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ روس اور بعض دوسرے مقامات میں سرکاری اشتمالیت میں اذعانیت کا زور ہے اور جو لوگ اشتمالیت کے منکر ہیں ان پر تشدد کیا جاتا ہے۔ یہ امر بلاشبہ افسوسناک ہے مگر سوویٹ ممالک میں جہاں زبردست تغیرات نہایت تیزی کے ساتھ رونما ہو رہے تھے اور اندرونی مخالفت کے قوی ہو جانے سے ہولناک ناکامی کا اندیشہ تھا اس تشدد کی وجہ سمجھ میں آ سکتی ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ دنیا کی عظیم الشان کساد بازاری اور نازک حالات سے اس نظریے کی تائید ہوتی ہے جو مارکسیت نے تاریخ کا تجزیہ کرتے ہوئے پیش کیا ہے۔ جب اور تمام نظام اور نظریے اندھیرے میں بھٹک رہے تھے یہی ایک اصول تھا جس نے کم و بیش صحت کے ساتھ ان مشکلات کی توضیح کی اور ان کا حقیقی حل پیش کیا۔

جوں جوں مجھے اس بات کا یقین ہوتا گیا میں نے اپنے دل میں ایک نیا جوش محسوس کرنا شروع کیا۔ قانون شکنی کی تحریک کے ناکام رہنے سے جو افسردگی پیدا ہو رہی تھی لحظہ بلحظہ کم ہوتی گئی۔ مجھے یہ نظر آنے لگا کہ دنیا نہایت تیزی کے ساتھ منزل مقصود کی طرف بڑھ رہی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارا راستہ جنگ کے زبردست خطرات اور مصائب و آفات سے پُر ہے۔ لیکن بہرحال ہم اس راستے کو طے کر رہے ہیں۔ ہم میں جمود ہرگز نہیں ہے۔ قومی تحریک نے میری نظر میں اس دور دراز سفر کے ایک مرحلے کی صورت اختیار کر لی۔ میں نے اسے بہت غنیمت سمجھا کہ جبر وقت نے ہماری قوم کو آنے والی کشاکش کے لئے تیار کر دیا۔ اور اس پر مجبور کر دیا کہ جو نئے خیالات اس وقت دنیا کو ہلا رہے ہیں ان پر غور کرے۔ جوں جوں ہمارے کمزور عناصر ہم سے دور ہوں گے ہم زیادہ مضبوط، زیادہ منضبط اور زیادہ پختہ ہوتے جائیں گے وقت ہماری مدد کر رہا ہے۔

یہی وجہ تھی کہ میں نے روس، جرمنی، انگلستان، جاپان، امریکہ، فرانس، چین، اسپین، اٹلی اور وسط یورپ کے واقعات کا زیادہ احتیاط سے مطالعہ کرنا شروع کر دیا اور کوشش کرتا کہ موجودہ حالات کی الجھی ہوئی گتھیوں کو سلجھا سکوں۔ مجھے ان کوششوں سے بے حد دلچسپی تھی جو آنے والے طوفان کو روکنے کے لئے ہر ملک فرداً فرداً یا دوسروں کے ساتھ مل کر کر رہا تھا۔ بین الاقوامی کانفرنسوں کی ان مسلسل ناکامیوں سے جو سیاسی اور معاشی خرابیوں کی اصلاح کے لئے اور مختلف اسلحہ جات کے مسئلے کو حل کرنے کے لئے منعقد کی جا رہی تھیں مجھے وہ تکلیف دہ مسئلہ یاد آ جاتا تھا جو ہمیں اپنے ملک میں درپیش تھا یعنی فرقہ وارانہ مسئلہ۔ باوجود انتہائی خلوص اور نیک نیتی کے ہم اس مسئلہ کو ابھی تک

حل نہیں کر سکے ۔ اسی طرح جیسے اس عالمگیر یقین کے باوجود کہ ان کی ناکامی تمام دنیا کے لئے ایک خوفناک حادثہ کا باعث ہو گی ۔ یورپ اور امریکہ کے مدبرین ایک دوسرے سے اتفاق رائے نہیں کر سکے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں صورتوں میں جس طریقے سے معاملہ کو طے کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے وہ غلط ہے اور صحیح طریقہ اختیار کرنے کی کسی کو جرأت نہیں ہوتی ۔

دنیا کے مصائب اور نزاعات پر اس طرح غور کرتے کرتے میں اپنی ذاتی اور قومی مصیبتوں کو بھول گیا ۔ بعض اوقات مجھے بڑی مسرت ہوتی تھی کہ تاریخ عالم کے اس نہایت ہی اہم انقلابی دور کا میں اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر رہا ہوں ۔ ممکن ہے کہ دنیا کے اس گوشے میں آنے والے زبردست تغیرات میں میرا بھی کچھ حصہ ہو ۔ کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ جنگ اور تشدد کی فضا کو دیکھ کر میرا دل بیٹھ جاتا ۔ اس سے بھی زیادہ افسوسناک اور یاس انگیز منظر یہ تھا کہ بعض اچھے خاصے ذہین اور سمجھ دار آدمی حکومیت و غلامی اور پستی اخلاق کے اس درجہ خوگر ہو چکے ہیں کہ ان کے دل میں انسان کے افلاس ، اس کا دکھ درد اور مظلومیت سے بیزاری کا جذبہ سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتا ۔ اس دم گھٹنے والی فضا میں ہر طرف سوقیانہ شور و شر اور منظم فریب کار دوڑتے ۔ اور نیک لوگ خاموش ہیں ۔ ہٹلر اور ہیلر کی بعض جھوٹی خطاؤں کی کامیابیوں سے مجھے بے حد قلق ہوا ۔ لیکن اس خیال سے اپنے دل کو تسکین دی کہ یہ زیادہ دن چلنے والی چیز نہیں ۔ بعض دفعہ یہ بھی احساس ہوتا تھا کہ انسان کی سعی اور کوشش بالکل بے سود ہے ۔ کیونکہ قدرت کی مشین اندھا دھند اپنا کام کر رہی ہے اور اس میں ایک چھوٹے سے پرزے کی حیثیت ہی کیا ہے ۔

باایں ہمہ زندگی کا اشتمالی فلسفہ بڑے بڑے تسکین نما اور اطمینان کا

باعث تھا۔ میں سوچا کرتا تھا کہ ہندوستان میں اس پر کیوں کر عمل کیا جائے
ابھی تو ہم نے سیاسی آزادی کا مسئلہ ہی حل نہیں کیا۔ ہمارے دلوں پر قوم
پرستانہ نصب العین کا تسلط ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہم معاشی آزادی کی کوشش
بھی اسی وقت شروع کر دیں یا سیاسی آزادی کے بعد اس کی طرف
توجہ کریں لیکن ہندوستان اور ہندوستان کے باہر جو واقعات رونما
ہوئے ہیں ان سے قدرتاً سماجی مسئلہ روز بروز ہمارے سامنے آتا گیا اور یہ
ظاہر ہو گیا کہ ہم اپنی سیاسی آزادی کے مسئلہ کو اس سے الگ نہیں رکھ سکتے

برطانوی حکومت نے جو پالیسی ہندوستان میں اختیار کی
اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ رجعت پسند طبقے سیاسی آزادی کی تحریک کے
خلاف پرا باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ یہ ایک ناگزیر امر تھا۔ مجھے اس
سے خوشی ہوئی کہ ہندوستان کے مختلف طبقوں اور جماعتوں کے دائرے
وضاحت کے ساتھ متعین ہو گئے۔ لیکن کیا دوسرے لوگوں کو بھی اس کا
احساس ہوا؟ بظاہر بہت کم لوگوں کو۔ یہ صحیح ہے کہ چند بڑے بڑے شہروں
میں مٹھی بھر کمیونسٹ تھے جو قومی تحریک کے مخالف تھے اور
اس پر شدت سے تنقید کرتے تھے۔ خصوصاً بمبئی اور ایک حد تک
کلکتے کے مزدوروں کی منظم تحریک ایک معنی میں اشتراکی تحریک
تھی۔ لیکن وہ کئی ٹکڑوں میں بٹ گئی تھی اور اسے کساد بازاری
سے بہت نقصان پہنچا تھا۔ ذہنی طبقے میں یہاں تک کہ حکومت کے ذہین
افسروں میں بھی کچھ دھندلے سے اشتراکی اور اشتمالی خیالات پھیلنے لگے
تھے۔ نوجوان کانگریسی جو جمہوریت پر برائش، مارلے، کیتھ اور مازینی کی تصانیف پڑھنے
کے عادی تھے اگر اشتراکیت اجتماعیت اور روس پر کتابیں مل جائیں تو انھیں بھی پڑھ لیتے تھے اور متاثر ہوتے تھے

نے لوگوں کے ذہن کو بڑی حد تک ان نئے خیالات کی طرف متوجہ کر دیا۔ اور دنیا کی نازک صورت حال نے انھیں مجبور کر دیا کہ وہ اس مبحث پر غور کریں۔ اس طرح تحقیق اور تنقید اور موجودہ نظام کی مخالفت کی فضا پیدا ہو گئی۔ اس سے پتہ چلتا تھا کہ اب ہوا کا رخ کس طرف ہے۔ تاہم یہ تحریک نہایت کمزور اور ڈانواں ڈول تھی بعض لوگ فاشستی خیالات کی حمایت کر رہے تھے۔ غرض اشتراکیت کا کوئی صاف اور واضح تصور لوگوں کے ذہن میں نہیں تھا اور وہ ابھی تک قومیت کے رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے۔

میں اس بات کو خوب سمجھتا تھا کہ جب تک ہمیں تھوڑی بہت سیاسی آزادی حاصل نہ ہو گی ہمارے لئے قومیت کا تخیل ہی سب سے بڑا محرک عمل رہے گا۔ اگر کانگریس اب تک ہندوستان کی سب سے زیادہ مضبوط اور ترقی پسند جماعت ہے (بعض مزدور جماعتوں کو مستثنیٰ کرتے ہوئے) تو اس کی وجہ بھی یہی ہے۔ پچھلے تیرہ برس سے اس نے گاندھی جی کی زیر قیادت اسی اوسط طبقے کے شہریوں کی ذہنیت کے باوجود ایک غیر معمولی بیداری پیدا کر دی ہے جس نے انقلابی مقاصد کو بڑی مدد ملی۔ اس کا وجود ابھی تک کار آمد ہے اور آئندہ بھی رہے گا۔ یہاں تک کہ لوگوں کے دل میں قومیت کے جذبہ کی جگہ سماجی انقلاب کا جذبہ پیدا ہو جائے۔ اس لئے ہماری آئندہ ترقی اصول اور عمل دونوں کے لحاظ سے کانگریس سے وابستہ ہے۔ اگرچہ ہم دوسرے ذرائع سے بھی کام لے سکتے ہیں۔

چنانچہ میرے نزدیک کانگریس سے قطع تعلق کرنا گویا قومی زندگی کی رو سے الگ ہونا اور اپنے سب سے قوی حربے کو کھو دینا ہے۔ غالباً اس کا نتیجہ یہ بھی ہو گا کہ ہم اپنی قوتوں کو بے کار تجربات میں ضائع کر دیں لیکن سوال

یہ ہے کہ کیا کانگریس اپنی موجودہ شکل میں کبھی ایسا کر سکے گی کہ ہمارے سماجی نظام کو بنیادی طور پر بدل ڈالے۔ اگر اس قسم کا کوئی مسئلہ اس کے سامنے پیش کیا جاتا تو یقین ہے کہ اس کے دو یا دو سے زیادہ ٹکڑے ہو جاتے اور اگر یہ نہ ہوتا تو اس کے بہت سے اجزاء اس سے الگ ہو جاتے۔ اگر اس سے ہر جماعت کے مقاصد بالکل صاف ہو جاتے اور ایک اچھی منظم پارٹی خواہ اسے کانگریس میں اکثریت حاصل ہوتی یا اقلیت انقلابی سماجی پروگرام کی حمایت کرتی تو یہ صورت کچھ ایسی بری نہ تھی۔

لیکن اس وقت کانگریس اور گاندھی جی ایک چیز تھے۔ سوال یہ تھا کہ گاندھی جی کیا کریں گے۔ اصول اور نظریات کے لحاظ سے وہ بعض اوقات اس قدر پیچھے رہ جاتے ہیں کہ انسان کو تعجب ہوتا ہے لیکن جہاں تک عمل کا تعلق ہے وہ بحالت موجودہ ہندوستان کے سب سے بڑے انقلاب پسند ہیں۔ انھوں نے ایک عجیب و غریب شخصیت پائی ہے۔ اس لئے انھیں عام پیمانوں سے ناپنا یا معمولی منطقی اصول سے جانچنا ناممکن ہے۔ مگر چونکہ وہ فطرتاً انقلاب پسند ہیں اور ہندوستان کی سیاسی آزادی کے حصول کا بیڑا اٹھا چکے ہیں اس لئے جب تک یہ آزادی حاصل نہ ہو جائے وہ یقیناً انتہا پسندانہ طرز عمل اختیار کریں گے۔ اس دوران میں وہ عام لوگوں میں زبردست قوتوں کو بیدار کر دیں گے اور مجھے تو تھوڑی سی امید ہے کہ وہ خود بھی رفتہ رفتہ اشتراکیت کی منزل کی طرف بڑھیں گے۔

ہندوستان اور ہندوستان کے باہر اکثر اشتمالی سالہا سال سے گاندھی جی اور کانگریس پر نہایت سختی سے نکتہ چینی کر رہے ہیں اور کانگریس کے لیڈروں پر بدترین الزامات لگاتے ہیں۔ نظری اعتبار سے دیکھئے تو

کانگریس کی ذہنیت کے متعلق ان کی بہت سی تنقیدیں نہایت صحیح اور برمحل تھیں جن کی آیندہ واقعات نے ایک حد تک تائید بھی کی۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے اہم سیاسی حالات کا تجربہ جو بعض اشتمالی اس سے پہلے کر چکے تھے غیر معمولی طور پر صحیح ثابت ہوا۔ لیکن اصول اور کلیات کی بحث سے قطع نظر کر کے جب تفصیلات کا اور کانگریس کی سرگرمیوں کا سوال آتا ہے تو اس پر انھیں بڑا دھوکا ہوتا ہے۔ ہندوستان میں اشتمالیوں کی قلیل تعداد اور بے اثری کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اشتمالیت کی اشاعت و تبلیغ اور لوگوں کو اپنی طرف کھینچنے کے بجائے ان کا مشغلہ زیادہ تر دوسروں کی مذمت کرنا ہے۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ اس کا ردعمل ان کے لیے کس قدر مضرت رساں ثابت ہو رہا ہے۔ انھوں نے زیادہ تر مزدور حلقوں کو اپنی جولانیوں کا مرکز بنا رکھا ہے۔ جہاں وہ چار چلتے ہوئے فقرے مزدوروں کو ان کی طرف کھینچ لاتے ہیں۔ لیکن پڑھے لکھے لوگوں کے لیے محض چلتے ہوئے فقرے کافی نہیں۔ اشتمالی اس بات سے بے خبر ہیں کہ اس وقت ہندوستان میں اوسط طبقہ سب سے بڑی انقلابی قوت کا مالک ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اکثر اشتمالیوں کے اس طرز عمل کے باوجود بہت سے تعلیم یافتہ لوگ اشتمالیت کی طرف کھنچ آئے ہیں۔ مگر ان دونوں کے درمیان ابھی تک ایک خلیج حائل ہے۔

اشتمالیوں کی رائے میں کانگریس کے لیڈروں کا مقصد یہ رہا ہے کہ حکومت پر عام لوگوں کا دباؤ ڈال کر ہندوستانی سرمایہ داروں اور زمینداروں کے لئے صنعتی اور تجارتی فوائد حاصل کریں۔ کانگریس کا کام یہ ہے کہ کسانوں، نیچے اوسط طبقہ کے لوگوں اور صنعتی مزدوروں کی سیاسی اور معاشی بے چینی کی قوت سے بمبئی، احمد آباد اور کلکتہ کے مالکان کارخانہ اور ساہوکاروں کی

گاڑی چلائے" گویا ہندوستانی سرمایہ دار پس پردہ بیٹھے کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے نام حکم جاری کر دیتے ہیں کہ اول جمہور میں ایک تحریک اٹھائے اور جب وہ بہت بڑھ جائے یا بہت خطرناک ہو جائے تو اسے دفعتہً ملتوی کر دے یا اصل راستے سے ہٹا کر کسی اور طرف موڑ دے۔ کانگریسی رہنما یہ نہیں چاہتے کہ انگریز سچ مچ ہندوستان سے چلے جائیں۔ کیونکہ انھیں کی مدد سے یہاں کی فاقہ مست آبادی قابو میں رکھی جا سکتی ہے۔ اور اس سے ناجائز فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ اور ہندوستان کا اوسط طبقہ اسے اپنے بس کی بات نہیں سمجھتا۔

یہ بات کس قدر حیرت انگیز ہے کہ کانگریس کی سرگرمیوں کا جو عجیب و غریب تجزیہ ہم نے اوپر پیش کیا ہے اس کا بعض سمجھ دار اشتمالیوں کو دل سے یقین ہے۔ ظاہر ہے کہ جب اُن کے خیالات اس قسم کے ہوں تو انھیں ہندوستان میں کیوں کر کامیابی ہو سکتی ہے۔ ان کی سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ وہ ہندوستان کی قومی تحریک کا اندازہ یورپ کی لیبر تحریک کے معیار سے کرتے ہیں۔ چوں کہ مغرب میں مزدوروں کے لیڈر اکثر اُن سے غداری کرتے ہیں لہٰذا ان کا یہ خیال ہے کہ ہندوستان میں بھی یہی حال ہوگا۔ انھوں نے اس بات کو فراموش کر رکھا ہے کہ ہندوستان کی قومی تحریک غریبوں اور مزدوروں کی تحریک نہیں یہ اوسط طبقہ یعنی بورژوا کی تحریک ہے۔ جیسا کہ خود اس کے نام سے ظاہر ہوتا ہے۔ اور اس کا مقصد محض سیاسی آزادی ہے نہ کہ سماجی نظام کی تبدیلی۔ یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ یہ مقصد بہت محدود ہے اور قومی تحریک ایک فرسودہ چیز ہے۔ اس تحریک کی بنیاد کو سمجھ لینے کے بعد یہ کہنا بالکل مہمل ہے کہ اس کے رہنما عوام سے غداری کرتے ہیں کیونکہ نہ طریق زمینداری یا نظام

سرمایہ داری کو بدلنے کی کوشش نہیں کرتے۔ انھوں نے تو کبھی یہ دعویٰ ہی نہیں کیا۔ البتہ کانگریس میں بعض لوگ اس قسم کے ضرور موجود ہیں اور ان کی تعداد میں روز بروز اضافہ بھی ہو رہا ہے۔ جو سرمایہ اور زمین کے موجودہ نظام کو بالکل بدل دینا چاہتے ہیں۔ مگر وہ ابھی تک اپنے آپ کو کانگریس کا ترجمان نہیں کہہ سکتے"۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستان کی سرمایہ دار جماعتوں کو (جن میں زمیندار اور تعلقہ دار شامل نہیں ہیں) برطانوی اور بدیسی مال کے بائیکاٹ اور سودیشی کی ترویج سے بہت بڑا فائدہ پہنچا ہے۔ اور ایسا ہونا ضروری بھی تھا کیونکہ ہر قومی تحریک ملکی صنعتوں کی حمایت اور بدیسی چیزوں کے بائیکاٹ کا سبق دیتی ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ سول نافرمانی اور برطانوی مال کے بائیکاٹ کے دوران میں بمبئی کے مالکان کارخانہ نے بطور ایک جماعت کے یہ جسارت کی کہ لنکا شائر کے ساتھ ایک معاہدہ کر لیا۔ کانگریس کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو یہ ہمارے قومی مقاصد کے ساتھ بہت بڑی غداری تھی۔ اور اسے بجا طور پر غداری ہی سے تعبیر کیا گیا۔ بمبئی کے مالکان کارخانہ کے نمایندوں نے بھی جب ہم میں سے اکثر جیل میں تھے اسمبلی میں ہمیشہ کانگریسیوں اور "انتہا پسندوں" کا مضحکہ اُڑایا۔

پچھلے چند سال سے سرمایہ دار طبقوں نے جو طرز عمل اختیار کیا ہے وہ کانگریس اور قومیت کے نقطۂ نظر سے بھی شرمناک ہے۔ اٹاوا کے معاہدے سے ممکن ہے کسی چھوٹی سی جماعت کو عارضی فائدہ پہنچا ہو۔ مگر بحیثیت مجموعی اس نے ہندوستان کی صنعت کو نقصان پہنچایا اور اسے برطانوی سرمایہ اور صنعت کا اور بھی محتاج کر دیا۔ یہ معاہدہ جو عام لوگوں کے لئے بے حد

مضر تھا اس وقت کیا گیا۔ جب ہماری جد وجہد جاری تھی اور ہزاروں ہندستانی جیلوں میں بند تھے۔ نوآبادیوں نے جہاں تک ہو سکا انگلستان سے بہتر سے بہتر شرائط حاصل کیں۔ لیکن ہندوستان کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس نے سب کچھ انگلستان کو بخش دیا۔ بعض من چلے ساہوکاروں نے بھی ہمارے ملک کی سونے کے کاروبار میں ہندوستان کے مفاد کو قربان کر کے خوب نفع کمایا۔

گول میز کانفرنس میں بڑے بڑے زمیندار اور تعلقہ دار آپس میں مل کر کانگریس کی مخالفت کرتے تھے۔ سول نافرمانی کے زمانے میں انھوں نے کھلم کھلا جارحانہ حیثیت سے حکومت کا ساتھ دیا۔ انھی کی امداد سے حکومت نے تکوہری ضابطوں کی شکل میں جابرانہ قوانین منظور کیے۔ اور یو پی کونسل کے زمیندار اراکین کی بہت بڑی اکثریت نے ان لوگوں کی رہائی کی مخالفت کی جو سول نافرمانی کی تحریک میں قید ہوئے تھے۔

یہ خیال کہ گاندھی جی نے سنہ ۱۹۲۱ء اور سنہ ۱۹۳۰ء میں محض جمہور کے دباؤ سے وہ تحریکیں جو بظاہر جارحانہ معلوم ہوتی تھیں شروع کیں سراسر غلط ہے۔ یہ صحیح ہے کہ جمہور میں اکثر حرکت پیدا ہوتی رہی۔ لیکن دونوں موقعوں پر خود گاندھی جی نے اسے ایک بڑی تحریک کی شکل دی۔ سنہ ۱۹۲۱ء میں تو انھوں نے تن تنہا کانگریس سے ترک موالات کی تحریک منظور کرائی۔ اور سنہ ۱۹۳۰ء میں اگر وہ ذرا سی بھی مخالفت کرتے تو ہم ہرگز حکومت کے خلاف کوئی مؤثر اور جارحانہ طرز عمل اختیار نہ کر سکتے۔

یہ امر نہایت افسوس ناک ہے کہ بعض اوقات محض حماقت یا نا واقفیت کی وجہ سے ذاتیات پر حملہ کیا جاتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اصل مسئلہ کی طرف سے توجہ ہٹ جاتی ہے۔ گاندھی جی کے خلوص نیت پر حملہ کرنا خود اپنی

ذات اور مقصد کو نقصان پہنچاتا ہے۔ ہندوستان کے کروڑہا باشندوں کے نزدیک وہ حق و صداقت کا مجسمہ ہیں۔ اور جو شخص اُن سے ذرا بھی واقف ہے وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ وہ کس قدر جوش اور خلوص سے ہر موقع پر صحیح طرز عمل اختیار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ہندوستان میں اشتمالیوں نے اپنے آپ کو بڑے بڑے شہروں کے مزدوروں سے وابستہ کر رکھا ہے۔ دیہاتی علاقوں سے نہ انھیں واقفیت ہے اور نہ ان سے کوئی تعلق ہے۔ مگر ہندوستان کا مسئلہ اس وقت کسانوں کا مسئلہ ہے۔ اس لئے صنعتی مزدوروں کو اگرچہ وہ بجائے خود بڑی اہمیت رکھتے ہیں اور مستقبل میں ان کی اہمیت برابر بڑھتی جائے گی وہ درجہ حاصل نہیں ہو سکتا جو کسانوں کو حاصل ہے۔ کانگریس کارکن اس وقت ہر جگہ دیہات میں پھیلے ہوئے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ رفتہ رفتہ کانگریس کسانوں ہی کی ایک جماعت بن جائے گی۔ لیکن کسان جب اپنا فوری مقصد حاصل کر لیتا ہے تو بہت کم انقلاب کی طرف مائل ہوتا ہے۔ لہذا ممکن ہے کہ ہندوستان میں بھی کچھ دنوں کے بعد شہر اور دیہات اور مزدور اور کسان کے مقابلہ کا مسئلہ چھڑ جائے۔

مجھے اس بات کا فخر حاصل ہے کہ کانگریس کے لیڈروں اور کارکنوں کی ایک بہت بڑی تعداد سے میرے تعلقات بہت گہرے رہے ہیں اور میں تسلیم کرتا ہوں کہ مجھے ان سے بہتر انسان نہیں مل سکتے۔ پھر بھی میں نے ہر اہم معاملہ میں ان سے اختلاف کیا ہے اور بعض دفعہ مجھے اس بات پر کوفت بھی ہوئی ہے کہ بعض ایسی باتیں جو میری نظر میں بالکل عیاں اور واضح ہیں ان کی سمجھ میں کیوں نہیں آتیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ اتنی عقل نہیں رکھتے۔ بلکہ یہ ہے کہ ہم نے فکر و نظر کی دنیا میں الگ الگ راہیں اختیار کر لی ہیں۔ میں

اچھی طرح جانتا ہوں کہ ان سے نکلنا کس قدر مشکل اور دیر طلب ہے۔ یہ مختلف فلسفۂ زندگی کے دائرے ہیں جن میں انسان بتدریج غیر شعوری طور پر نشوونما پاتا ہے۔ اس لئے ان لوگوں کو جو ہم سے اختلاف خیال رکھتے ہیں۔ الزام دینا بے کار ہے۔ اشتراکیت نام ہے زندگی اور اس کے مسائل کے ایک خاص نفسیاتی نظریے کا جس کا انحصار محض منطق پر نہیں ہے۔ اسی طرح دوسرے نظریے بھی وراثت، تربیت، ماضی کی روایات اور موجودہ ماحول کے اثرات پر مبنی ہیں۔ یہ قوت صرف زندگی اور اس کے تلخ تجربات میں ہے کہ وہ ہمیں نئی راہوں پر چلائیں اور رفتہ رفتہ ہمارے خیالات کو بدل دیں۔ جو اس سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔ شاید ہم اپنی ذاتی کوشش سے اس انقلاب میں تھوڑی بہت مدد دے سکیں اور شاید "انسان جو راہیں اپنے مقدر سے بچنے کے لئے اختیار کرے وہی اسے مقدر کی منزل تک پہنچا دیں"

(۴۷)

مذہب کیا ہے؟

ستمبر ۱۹۳۲ء کے وسط میں ہمارا جیل کا پرسکون اور یکساں روزمرہ معمول یکایک درہم برہم ہوگیا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی گولا آکر پھٹا ہو۔ خبر آئی کہ گاندھی جی نے ان جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب پر اظہار ناپسندیدگی کرنے کے لئے جو مسٹر ریمزے میکڈانلڈ نے اپنے فرقہ وارانہ فیصلہ میں پنچ ذاتوں کے لئے تجویز کئے تھے اس بات کا فیصلہ کیا ہے کہ روزہ رکھ کر جان دے دیں گے۔ اس شخص میں بھی لوگوں کو جھنجھوڑنے کی کیسی کچھ صلاحیت ہے! میرے دماغ میں طرح طرح کے خیالات پیدا ہونے لگے۔ ہر قسم کے اتفاقات و احتمالات سامنے آئے۔ اور میرا توازن ذہنی بالکل بگڑ گیا۔ دو دن تک بالکل تاریکی میں رہا۔ کوئی روشنی نہ تھی جو راہ دکھاتی۔ گاندھی جی کے فعل کے بعض نتائج کا خیال آتا تو دل بیٹھا جاتا تھا۔ معاملہ کا ذاتی پہلو بھی خاصا قوی تھا اور دل میں کس کس دکھ کے ساتھ یہ خیال آتا تھا کہ شاید اب انھیں نہ دیکھ سکوں گا۔ کوئی سال بھر ہوا تھا کہ انگلستان جاتے وقت انھیں جہاز پر دیکھا تھا۔ کیا یہی آخری دیدار ثابت ہونے کو تھا۔

پھر سخت الجھن ہوتی تھی کہ انھوں نے اپنی آخری قربانی کے لئے ایک ضمنی مسئلہ کو کیوں چنا۔ محض حلقہ ہائے انتخاب کے معاملہ کو اس کا اثر ہماری تحریک آزادی پر کیا ہوگا؟ کیا یہ نہ ہوگا کہ کم سے کم تھوڑے دن کے

بڑے اہم ترین مسائل پس پشت جا پڑے ہیں گے۔ اور اگر ان کا یہ مقصد حاصل ہو بھی
گیا اور پیچ ذاتوں کے حلقہ ہائے انتخاب اور ہندوؤں کے ساتھ مخلوط ہو بھی
گئے، تو کیا اس کا ردعمل یہ نہ ہوگا کہ لوگ سمجھنے لگیں گے کہ اچھا کچھ تو مل ہی
گیا اور اب تھوڑے دنوں کچھ کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ پھر یہ سوال پیدا
ہوتا تھا کہ کیا ان کا یہ فعل فرقہ وارانہ فیصلہ کو اور اس کل تجویز کو جسے حکومت
نے آگے بڑھایا ہے ماننے اور جزوی طور پر قبول کرنے کی مراد ف نہیں؟ اور کیا
یہ بات ترک موالات اور سول نافرمانی کے اصولوں کے مطابق ہے؟ اتنی
قربانی، اتنی شجاعانہ سعی کے بعد کیا ہماری تحریک ایک حقیر سی چیز ہو کر رہ
جانے والی ہے؟۔

مجھے ان پر غصہ بھی آتا تھا کہ ایک سیاسی مسئلہ کو یوں مذہبی اور
جذباتی طریق پر حل کرنا چاہتے ہیں اور اس سلسلہ میں بار بار خدا کا ذکر کرتے
ہیں معلوم تو ایسا ہوتا تھا کہ ان کے خیال میں خدا نے روزے کی تاریخ تک
ان کے لئے مقرر کی ہے۔ لوگوں کے لئے یہ کیسی بری مثال قایم کرنا ہے۔
اور اگر باپو کہیں مر گئے؟ تو پھر ہندوستان کا کیا حال ہوگا؟ اس کی
سیاست کس راہ پر چلے گی؟ سامنے تیرہ و تار مستقبل دکھائی دیتا تھا اور جب
اس کا خیال آتا تو دل پر یاس و حرماں کا تسلط ہو جاتا۔

غرض یوں ہی سوچتا تھا اور سوچے جاتا تھا۔ دماغ میں انتشار تھا اور
غصہ و یاس اور اس شخص کی محبت جو اس ساری پریشانی کا باعث تھی مجھے
بس کچھ نہ آتا تھا کہ کیا کروں طبیعت چڑچڑی ہو گئی تھی اور ہر ایک سے جھگڑتا
تھا اور سب سے زیادہ خود اپنے سے۔

پھر ایک عجیب کیفیت گذری۔ یوں سمجھئے کہ ایک جذباتی بحران سا ہوا

اور جب وہ ختم ہوا تو طبیعت میں کچھ سکون محسوس ہوا۔ اور مستقبل پھر اتنا تاریک نہ رہا۔ باپو میں ہمیشہ سے ایک عجیب صفت ہے کہ ٹھیک نفسیاتی موقع پر صحیح بات کر گزرتے ہیں۔ اس لئے خیال ہوا کہ شاید ان کا یہ فعل بھی جسے بہت سے اعتبارات سے حق بجانب ثابت کرنا ممکن نہ تھا، بڑے نتائج کا باعث بن جائے اور صرف اس تنگ میدان ہی میں نہیں جس سے کہ اس کو واسطہ ہے۔ بلکہ قومی جدوجہد کے وسیع تر میدان میں بھی۔ پھر یہ خیال بھی آیا کہ اگر باپو مر بھی گئے تو ہماری آزادی کی سعی تو بہرحال جاری رہے گی۔ اس لئے ہر چہ بادا باد ہمیں تیار رہنا چاہئے اور اپنے کو اس کام کا اہل بنانا چاہئے۔ اپنے ذہن کو جب یوں بے جھجک گاندھی جی کی موت تک کے مقابلہ کے لئے تیار کر لیا تب کہیں سکون اور جمعیت خاطر نصیب ہوئی اور میں پھر دنیا اور اس کے ممکنات سے نبٹنے کے لئے تیار ہو گیا۔

اس کے بعد اس حیرت انگیز بیداری کی خبریں آئیں جو سارے ملک میں پیدا ہوئی۔ اس جادو اثر جوش کی لہر کی جو ساری ہندو سماج میں دوڑ گئی اور ایسا معلوم ہوا کہ چھوت چھات بس اب ختم ہوئی۔ دل نے کہا کیسا جادوگر ہے یہ چھوٹا سا آدمی جو یروڈا کے قید خانے میں بیٹھا ہے۔ یہ ان تاروں کو کتنی اچھی طرح پہچانتا ہے جن سے دلوں کو جنبش دی جاتی ہے۔

ان کا ایک تار مجھے ملا۔ سزایابی کے بعد یہ ان کا پہلا پیام تھا۔ اتنے عرصے کے بعد پیام پانے پر دل بہت خوش ہوا۔ اس تار میں انھوں نے لکھا تھا "کرب کے ان تمام دنوں میں تم میرے ذہن کی آنکھ کے سامنے رہے ہو۔ تمہاری رائے جاننے کا بڑا فکر ہے۔ تم جانتے ہو کہ میں تمہاری رائے کی کتنی قدر کرتا ہوں۔ اندو سے اور سروپ کے بچوں سے ملا تھا۔ اندو خوش وخرم

تھی۔ ذرا گوشت بھی آ گیا ہے۔ میری حالت بہت اچھی ہے۔ تار سے جواب دو۔ پیار۔"

بڑی نرالی بات تھی۔ پر مٹھیٹھ گاندھی جی کی سی بات تھی کہ برت کی کلفت میں اور اپنی بے شمار مشغولیتوں میں بھی انھیں کا خیال رہا کہ میری بچی اور میری بہن کے بچوں کے آنے کا ذکر کر دیا اور اندرا کے موٹے ہو جانے تک کا۔ (میری بہن بھی اس زمانے میں قید میں تھیں) اور یہ سب بچے پونا کے ایک مدرسے میں پڑھتے تھے۔ زندگی میں جو چیزیں یوں ذرا ذرا سی معلوم ہوتی ہیں پر در اصل بہت کچھ ہوتی ہیں۔ یہ انھیں کبھی نہیں بھولتے۔

اسی زمانے میں خبر ملی کہ حلقہائے انتخاب کے متعلق کچھ تصفیہ ہو گیا۔ جیل کے سپرنٹنڈنٹ نے مہربانی سے مجھے گاندھی جی کے تار کا جواب دینے کی اجازت دے دی اور میں نے یہ تار بھیجا "آپ کے تار اور اس مختصر سی اطلاع نے کہ تصفیہ ہو گیا دل کو خوشی اور اطمینان سے بھر دیا۔ برت کی خبر سے پہلے تو سخت ذہنی کوفت اور انتشار پیدا ہوا۔ لیکن آخر میں آس مشرلی نے فتح پائی اور مجھے اپنا گم شدہ اطمینان پھر سے مل گیا۔ دبے ہوئے مظلوم طبقوں کی خاطر جو قربانی بھی کی جائے کم ہے۔ آزادی کا معیار سب سے ادنیٰ گروہ کی آزادی ہے۔ لیکن ڈرتا یہ ہوں کہ کہیں ان باتوں میں ہمارا مقصد وحید پس پشت نہ پڑ جائے۔ مذہبی نقطۂ نظر سے تو کوئی حکم میں لگا نہیں سکتا۔ ڈر ہے کہ کہیں آپ کے طریقوں کو دوسرے بے جا طور پر استعمال نہ کریں۔ لیکن آپ جیسے جادوگر کو میں کیا مشورہ دے سکتا ہوں۔ پریم۔"

پونا میں جو ہر قسم کے لوگ جمع ہو گئے تھے انھوں نے ایک معاہدہ پر دستخط کئے اور برطانوی وزیر اعظم نے غیر معمولی عجلت کے ساتھ اسے

قبول کر لیا اور اپنے سابقہ فیصلہ میں اس کے مطابق تبدیلی کر دی اور برت ٹوٹ گیا مجھے ایسے میثاق و معاہدے بہت ناپسند ہیں مگر پونا کے معاہدے کا اس کے مقاصد سے قطع نظر، میں نے دل سے خیر مقدم کیا۔

آخر یہ ہماہمی ختم ہوئی اور پھر وہی جیل کا روزمرہ معمول شروع ہوا۔ ہریجن تحریک کی اور گاندھی جی جیل خانے سے جو کام کر رہے تھے اس کی اطلاعیں پہنچتی تھیں۔ اور میرا دل ان سے کچھ بہت خوش نہ ہوتا تھا۔ اس میں ذرا شک نہیں کہ چھوت چھات کو ختم کرنے اور نیچ ذاتوں کو ابھارنے کی تحریک کو بڑی مدد پہنچی۔ لیکن اس عہد نامے سے اس قدر نہیں جتنی کہ اس مجاہدانہ جوش سے جو تمام ملک کے اندر پیدا ہو گیا۔ اور یہ ایسی چیز تھی جس کا خیر مقدم کرنا چاہیے۔

مگر اس میں شک نہیں کہ سول نافرمانی کو نقصان پہنچا۔ ملک کا دھیان دوسرے معاملوں کی طرف مڑ گیا۔ اور کانگریس کے بہت سے کام کرنے والے ہریجن تحریک کی طرف چلے گئے۔ غالباً ان میں سے بہتیرے اس بات کا بہانہ ہی ڈھونڈھ رہے تھے کہ کوئی ذرا زیادہ محفوظ کام مل جائے جس میں جیل جانے کا ڈر نہ ہو اور اس سے زیادہ لاٹھی کی مار اور املاک کی ضبطی کا خطرہ نہ ہو۔ یہ بات ہے بھی فطری اور اپنے ہزارہا کارکنوں سے یہ توقع رکھنا بھی بے جا ہے کہ وہ ہر وقت انتہائی تکلیف اٹھانے اور اپنے گھر بار کو تباہ و برباد کر دینے کے لئے آمادہ رہیں گے پھر بھی اس عظیم الشان تحریک کے اس تدریجی انحطاط کو دیکھ دیکھ کر جی بہت کڑھتا تھا۔ مگر باوجود اس کے سول نافرمانی ابھی تک جاری تھی اور کبھی کبھی تو بڑے پیمانے پر مظاہرے بھی ہوتے رہتے تھے۔ جیسے مارچ اپریل سنہ ۱۹۳۳ء میں کلکتہ کانگریس کا مظاہرہ

گاندھی جی برداداجیل میں تھے مگر ان کے ساتھ خاص رعایت یہ کر دی گئی تھی کہ یہ لوگوں سے مل جل سکتے تھے اور ہریجن تحریک کے لیئے ہدایات دے سکتے تھے۔ کچھ ہو اس سے اس ناگواری میں کمی ہو گئی جو ان کے قید میں ہونے کی وجہ سے قوم میں تھی۔ اس لیئے ان سب باتوں سے طبیعت پست ہو تی تھی۔

کئی مہینہ بعد ۱۹۳۳ء کے شروع میں گاندھی جی نے اپنا ۲۱ دن والا برت شروع کیا۔ اس کی اطلاع آئی تو بھی پہلے پہل تو صدمہ سا ہوا۔ مگر میں نے اسے ایک ناگزیر حادثہ جان کر قبول کر لیا اور رفتہ رفتہ اپنے کو اس کا عادی بنا لیا۔ بلکہ مجھے اس سے بڑی الجھن ہوتی تھی کہ جب وہ برت رکھنا طے ہی کر چکے اور اس کا اعلان بھی کر چکے تو لوگ کیوں خواہ مخواہ اس کے ترک کرانے پر اصرار کرتے ہیں۔ یہ برت میری سمجھ میں تو آتا نہ تھا۔ اور اگر فیصلہ سے پہلے مجھ سے رائے لی جاتی تو میں سختی سے اس کی مخالفت کرتا۔ مگر میں گاندھی جی کے قول کی بڑی قدر کرتا ہوں اور مجھے یہ بات غلط معلوم ہوتی تھی کہ ایک خالص شخصی معاملہ پر جو ان کی نظر میں بڑی اہمیت رکھتا تھا کوئی بھی اُن سے اس قول کے تڑوانے کی کوشش کرے۔ اس لیئے اس برت پر ہر چند کہ بہت ناشاد تھا راضی تھا۔

برت شروع کرنے سے چند روز پہلے انھوں نے مجھے اپنے مخصوص انداز میں ایک خط لکھا جس سے مجھ پر بڑا اثر ہوا۔ انھوں نے جواب چاہا تھا اس لیئے میں نے یہ تار بھیجا "آپ کا خط ملا جن باتوں کو میں سمجھتا ہی نہیں ان کی بابت کہہ کیا سکتا ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پردیس میں بھٹک گیا ہوں نشان راہ اگر کوئی ہے تو بس آپ کی ذات۔ اندھیرے میں راہ ٹٹولتا ہوں اور ٹھوکریں کھاتا ہوں۔ جو بھی ہو۔ میرا دھیان اور میری محبت آپ کے

ساتھ ہے۔"

ایک طرف میں ان کے فعل کو ناپسند کرتا تھا۔ دوسری طرف یہ فکر تھی کہ انھیں دکھ نہ دوں اور ان دونوں میں کشمکش تھی۔ میں نے سوچا کہ میں نے انھیں دلاسہ دینے کا کوئی پیام نہیں بھیجا اور اب کے وہ اس تکلیف کی آزمائش میں اپنے کو ڈالنے پر تلے ہی ہوئے ہیں۔ جس میں ممکن ہے کہ زندگی ہی سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔ میرا فرض ہے کہ جہاں تک ہو سکے ان کا دل بڑھاؤں۔ ذہن کی زندگی میں ذرا ذرا سی باتوں سے بڑا فرق پڑ جاتا ہے اور اس مصیبت سے جانبر ہونے کے لئے انھیں اپنے اعصابی قوت کا شمہ شمہ درکار ہوگا۔ یہ بھی مجھے محسوس ہوا کہ اب جو کچھ بھی ہو چکا ہے بدقسمتی سے ان کی موت ہی کیوں نہ واقع ہو سب کو مضبوطی سے جھیلنا چاہئے۔ چنانچہ میں نے انھیں یہ تار بھیجا: "اب کے آپ نے ایک عظیم الشان مہم شروع ہی فرما دی ہے۔ میں اپنی محبت اور تبریک کا ہدیہ پھر پیش کرتا ہوں اور یقین دلاتا ہوں کہ اب مجھے بہت صاف محسوس ہو رہا ہے کہ جو کچھ ہوگا وہ اچھا ہوگا اور جو بھی ہو جیت آپ کی ہے۔"

وہ اس برت سے جانبر ہو گئے۔ برت کے پہلے ہی دن انھیں جیل سے چھوڑ دیا گیا۔ اور ان کے مشورے سے چھ ہفتے کے لئے سول نافرمانی ملتوی کر دی گئی۔

اس برت کے زمانے میں پھر میں نے اس جذباتی جوش کا نظارہ کیا اور بار بار سوچا کہ آیا سیاست میں یہ بھی کوئی صحیح طریقہ ہے۔ یہ تو مری ہوئی چیزوں کو زندہ کرنا ہے اور اس کے مقابلے میں وضاحت سے سوچنے سمجھنے کے لئے ذرا بھی تو موقع نہیں۔ سارا ہندوستان یا اس کا بہت بڑا

حسبِ ادب اور احترام سے دہاتما کا منہ تکتا ہے اور توقع کرتا ہے کہ وہ معجزہ کے بعد معجزہ دکھائیں چھوت چھات کو ختم کرا دیں۔ سوراج حاصل کرا دیں وغیرہ وغیرہ اور خود کوئی کچھ نہیں کرتا۔ اور گاندھی جی ہیں کہ دوسروں کو سوچنے سمجھنے کی ہمت نہیں دلاتے۔ ان کا اصرار ہے بس خلوص اور قربانی پر۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اپنی جذباتی وابستگی کے باوجود میں برابر ذہنی طور پر ان سے دور ہوتا جاتا ہوں۔ یہ ضرور ہے کہ اکثر سیاسی کاموں میں ان کی جبلت سلیم اُن کی صحیح رہنمائی کرتی ہے۔ عمل کا ولولہ بھی ہے لیکن کیا عقیدت مندی کا راستہ ایک قوم کو تربیت دینے کا صحیح راستہ ہے؟ ممکن ہے کچھ دن تو اس سے کام چلے، مگر پھر آگے؟

پھر ایک بات میری سمجھ میں نہ آتی تھی کہ وہ موجودہ نظام معاشرت کو جو کہ تشدد اور کشاکش پر مبنی ہے کس طرح قبول کرتے ہیں۔ اور معلوم بھی ہوتا تھا کہ قبول کرتے ہیں۔ میرے سینے میں بھی کشاکش تھی اور میری وفاداریاں مجھے مختلف سمتوں میں کھینچتی تھیں۔ جانتا تھا کہ تبدیلی کی غیر اختیاری آڑھٹی اور بہت سے دقتوں کا سامنا ہے۔ معلوم ایسا ہوتا تھا کہ بالکل یکہ و تنہا ہوں اور بلکہ غریب الوطن۔ ہندوستان جسے اپنا دل دیا اور جس کے لئے جان لڑائی ایک عجیب سا وحشت کدہ معلوم ہوتا تھا۔ سوچتا تھا کہ کہیں میرا ہی قصور تو نہیں کہ میں اپنے ہم وطنوں کی ذہنیت اور طریق فکر کو نہیں اپنا سکتا؟ نہایت قریب کے ساتھیوں کے متعلق بھی معلوم ہوتا کہ ان کے میرے درمیان ایک غیر مرئی روک ہے جب اسے دور کرنے میں ناکام رہتا تو ناشاد ہوتا اور پھر اپنے ہی خول میں سمٹ رہتا۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ انھیں چاروں طرف سے پرانی دنیا گھیرے ہوئے ہے۔ یعنی ماضی کے افکار اور امیدوں اور آرزوؤں

کی دنیا اور نئی دنیا ابھی بہت دور ہے۔ بقول شاعر "دو دنیاؤں کے درمیان سرگرداں، ایک مردہ، دوسری پیدا ہونے کی منتظر قدرت نہیں۔ غرض کہیں بھی سر دھرنے کا ٹھکانا نہ تھا۔"

کہتے ہیں کہ اور سب باتوں سے زیادہ ہندوستان ایک مذہبی ملک ہے ہندو، مسلمان، سکھ سب اپنے اپنے مذہب پر فخر کرتے ہیں اور ایک دوسرے کا سر پھوڑ کر اس فخر کا ثبوت دیتے ہیں۔ جس چیز کو ہم مذہب یا منظم مذہب کہتے ہیں اسے ہندوستان میں اور دوسری جگہ دیکھ دیکھ کر میرا دل ہیبت زدہ ہو گیا ہے۔ میں نے اکثر مذہب کی مذمت کی ہے اور یکسر مٹا دینے کی آرزو تک ظاہر کی ہے۔ تقریباً ہمیشہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اندھے یقین اور ترقی دشمنی کا، بے دلیل عقیدت اور تعصب کا، توہم پرستی اور لوگوں سے بے جا فائدہ اٹھانے کا، قایم شدہ حقوق اور مستقل اغراض رکھنے والوں کے لئے کا حامی ہے۔ لیکن باوجود اس کے میں جانتا ہوں کہ اس میں اور کچھ بھی ہے کوئی ایسی بات، جس سے انسانوں کی ایک گہری احتیاج بھی پوری ہوتی ہے ورنہ یہ ایسی زبردست قوت کیسے ہوتا جیسی کہ رہ چکا ہے، اور بے شمار، بے تاب روحوں کی تسکین کا سامان کیسے کرتا؟ اس کا بخشا ہوا امن کیا محض اندھے یقین اور بے سوالی کی پناہ ہے؟ کیا وہ سکون ہے جو چین سے بندرگاہ میں پہنچ جانے اور کھلے سمندر کے طوفان کے بچ جانے پر حاصل ہوتا ہے؟ اس سے زیادہ کچھ اور؟ بعض صورتوں میں تو یقیناً یہ کچھ اور بھی ہوتا ہے۔

لیکن منظم مذہب کا ماضی کچھ بھی رہا ہو آج تو وہ زیادہ تر ایک خالی شگاف ہے جس میں حقیقت نام کو نہیں۔ مسٹر جی کے چسٹرٹن نے اس کی مثال (اپنے

خاص مذہب کی نہیں بلکہ اوروں کے مذہب کی ! ایک متحجر جسم سے دی ہے جس کی شکل تو کسی جانور یا دوسری زندہ چیز کی ہے جس کا نامی مغز سب غائب ہوگیا ہے۔ بس خول اس لئے باقی ہے کہ اس میں کوئی بالکل ہی دوسری چیز بھر گئی ہے۔ اگر مذہب میں کوئی قابل قدر چیز باقی بھی ہے تو وہ بھی کچھ دوسری چیز بنا کر سامنے آتی ہوئی ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ حال مغربی مذہبوں کی طرح ہمارے مشرقی مذاہب پر بھی گذرا ہے۔ انگریزی کلیسا شاید اس مذہب کی سب سے واضح مثال ہے جو کسی حقیقی معنوں میں مذہب نہیں۔ ایک حد تک تو یہ حال تمام منظم پروٹسٹنٹ مذاہب کا ہے لیکن کلیسا انگلستان اس میں بہت آگے اس سے نکل گیا ہے کہ یہ مدت سے ریاست کا ایک سیاسی شعبہ ہے۔[۵]

---

[۵] ہندوستان میں تو انگریزی کلیسا اور انگریزی حکومت میں تمیز کرنا بھی دشوار ہے۔ ہندوستان کی سرکاری آمدنی ..... باضابطہ تنخواہ پانے والے پجاری اور پادری اسی طرح سامراجی قوت کے علمبردار ہیں جیسے کہ دوسری اعلیٰ خدمات والے ہندوستانی ریاست میں۔ بحیثیت مجموعی یہ کلیسا جمود اور ترقی دشمنی کی ایک قوت رہا ہے اور عام طور سے اس نے برتری اور اصلاح کی مخالفت کی ہے۔ مشن کے معمولی کام کرنے والے عام طور پر ہندوستان کے ماضی اور اس کے تمدن سے یکسر ناواقف ہوتے ہیں۔ اور اس بات کے معلوم کرنے کی ذرا زحمت گوارا نہیں کرتے کہ یہ تمدن کیا تھا اور کیا ہے۔ ان سے تو فکر بس زیادہ اس کا ہوتا ہے کہ کفار کے عیبوں اور گناہوں کو ظاہر کرے۔ اس کلیہ کے بہت سے مستثنیات بھی ضرور ہیں مثلاً چارلی اینڈریوز سے زیادہ سچا دوست ہندوستان کا اور کون ہے۔ ان کی ہمہ گیر محبت ان کا جذبہ خدمت ان کی بے حساب دوست داری، سے جی خوش ہو جاتا ہے۔ بو ناگے کر سٹا سبو اسنگ (بقیہ صفحہ ۱۶۳)

اس میں شک نہیں کہ اس کے معتقدوں میں بہت سے لوگ نہایت اعلیٰ سیرت کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ لیکن دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اس کلیسا نے کس کس طرح برطانوی سامراج کی خدمت انجام دی ہے اور سرمایہ داری اور سامراج دونوں کو ایک اخلاقی اور مذہبی لباس پہنایا ہے۔ اس نے اعلیٰ ترین اخلاقی معیاروں سے ایشیا اور افریقہ میں برطانیہ کی غاصبانہ سیاست کو حق بجانب ثابت کیا ہے اور انگریزوں کے اندر ایک غیر معمولی اور قابلِ رشک احساس کے

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۶۲) میں بھی چند اچھے انگریز ہیں جن کے مذہب نے انھیں اس بات پر آمادہ کیا ہے کہ دوسروں کو سمجھیں اور ان کی سیوا کریں۔ یہ خواہ کتنے تھوڑے ہوں اور جنھوں نے اپنی تمام اعلیٰ صلاحیتوں کو ہندوستان کی بے غرض خدمت کے لیے وقف کر دیا ہے۔ اور بھی بہت سے انگریز اہلِ کلیسا ہیں جن کی یاد ہندوستان میں زندہ رہے گی۔

کنٹربری کے لاٹ پادری صاحب نے ۱۲ دسمبر ۱۹۳۳ء کو دارالامراء میں تقریر کرتے ہوئے ۱۹۱۷ء کے مانٹیگو چیمسفورڈ والی اصلاحات کے تمہیدی کلمات کا ذکر کیا تھا اور فرمایا تھا کہ مجھے کبھی کبھی خیال ہوتا ہے کہ یہ بڑا اعلان ذرا عجلت میں کر دیا گیا اور گمان ہوتا ہے کہ یہ بھی منجملہ ان دریادلی کی عاجلانہ حرکتوں کے ہے جو جنگ کے بعد کی گئیں۔ لیکن اب جو منزل مقرر ہو گئی اسے واپس لینا تو ممکن نہیں۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ انگریزی کلیسا کا سردار ہندوستانی سیاست کے متعلق ایسا انتہائی قدامت پسندوں والا رویہ اختیار کرتا ہے۔ وہ قدم جسے ہندوستانی رائے عامہ نے بالکل ناکافی جانا تھا اور جس نے اسی وجہ سے عدم تعاون اور اس کے جملہ عواقب کے لیے راہ کھولی تھی۔ اسے یہ لاٹ پادری صاحب عجلت اور دریادلی پر مبنی خیال فرماتے ہیں۔ انگریزی حکمراں طبقہ کے نقطۂ نظر سے بے شک یہ تسکین دہ خیال ہے اور اپنی ایسی دریادلی کے یقین سے جو عاجلانہ بے احتیاطی کی حد تک پہنچتی ہو (بقیہ صفحہ ۱۶۴ پر)

پیدا ہونے کا سامان کیا ہے کہ وہ ہمیشہ حق بجانب ہی ہوتے ہیں۔ میں ٹھیک نہیں
جانتا کہ برابر حق بجانب ہونے کا یہ آرام دہ خیال کلیسا نے پیدا کرایا ہے یا خود
کلیسا اس کی پیداوار ہے۔ یہ اعظم یورپ اور امریکہ کی دوسری قومیں جو ذرا کم
خوش حال ہیں، انگریزوں پر ریاکاری کا الزام لگاتے ہیں اور "البیون دانگریزیا" کی
دغابازی" کا طعن بہت پرانا ہے۔ مگر یہ الزام غالباً برطانوی کامیابی پر حسد کی وجہ
سے پیدا ہوا ہے۔ اس لیے کہ بھلا کوئی اور سامراجی طاقت پر برطانیہ کیا سبقت لے
گی؟ خود اس کا اپنا نامۂ اعمال بھی تو اتنا ہی سیاہ ہوگا۔ جو قوم جان بوجھ کر
ریاکاری کر رہی ہو وہ قوت کے ایسے محفوظ ذخیرے بروئے کار نہیں لاسکتی
جیسے کہ انگریز بارہا لائے ہیں۔ اور معلوم یہی ہوتا ہے کہ مذہب کا جو خاکہ انھوں نے
اختیار کیا ہے اس نے ان کی بڑی مدد کی ہے۔ یوں کہ جہاں خود ان کی اغراض کا
معاملہ ہے وہاں اس نے ان کے اخلاقی حس کو کند کر دیا ہے۔ دوسرے لوگوں
اور قوموں نے بارہا انگریزوں سے زیادہ بری طرح کام کیے ہیں لیکن اس
میں انھیں کبھی اس قدر کامیابی نہیں ہوئی کہ اپنے فائدے کی بات کو تو خیر
اور نیکی بھی مان لیں۔ یوں تو ہم سب کو اس میں بڑی آسانی ہے کہ دوسرے
کی آنکھ کا تنکا دیکھیں اور اپنی آنکھ کا شہتیر نظر انداز کر دیں لیکن شاید انگریز

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۶۳) ضرور ان لوگوں میں اطمینانِ قلب کی ایک روحانی رَو
دوڑ جاتی ہوگی۔

اور سب سے بازی لے گیا[1]

پروٹسٹنٹ مذہب نے نئے حالات سے مطابقت کی کوشش کی اور اس کی تدبیر کی کہ دونوں دنیاؤں سے پورا پورا فائدہ اٹھائے۔ جہاں تک اس دنیا کا تعلق ہے اسے بڑی کامیابی ہوئی۔ لیکن دینی نقطۂ نظر سے بہ حیثیت ایک منظم مذہب کے وہ نہ ادھر کا رہا نہ اُدھر کا۔ چنانچہ رفتہ رفتہ مذہب کی جگہ محض جذبات اور کاروبار نے لے لی۔ کلیسا روما کے مذہب کا یہ حشر نہیں ہوا اس لئے کہ وہ یکسوئی سے اپنی پرانی جگہ پر جما رہا اور جب تک وہ جگہ مستحکم ہے یہ بھی پھلتا پھولتا رہے گا۔ اگر لفظ مذہب کے محدود معنی لئے جائیں تو آج مغربی دنیا میں بس کلیسا روما کا مذہب ہی ایک زندہ مذہب ہے۔ قید خانے میں ایک رومن کیتھولک دوست نے مجھے اپنے مذہب کی بہت سی کتابیں اور پاپائے روم کے گشتی اعلانات صحیح دئے تھے۔ اور میں نے انھیں بڑے شوق سے پڑھا اور ان کے مطالعہ سے مجھے معلوم ہوا کہ انسانوں کی اتنی کثیر تعداد پر اس مذہب کا کتنا تسلط ہے۔ اسلام اور عام ہندو مت کی طرح یہ بھی شک و شبہ اور

---

[1] ہندوستانی سیاست پر کلیسا، انگلستان کے بالواسطہ اثر کی ایک مثال حال میں میرے علم میں آئی۔ صوبہ متحدہ کے عیسائیوں کی ایک کانفرنس نومبر سنہ ۱۹۳۴ء کو کانپور میں ہوئی تھی۔ اس کی مجلس استقبالیہ کے صدر مسٹر ای۔ ڈی ڈیوڈ نے فرمایا "عیسائی ہونے کی حیثیت سے ہم مذہباً ملک معظم کی وفاداری پر مامور ہیں کہ وہ ہمارے دین کے محافظ ہیں" اس کا لازمی تقاضہ یہ ہے کہ ہندوستان میں برطانوی سامراج کو مدد دی جائے آگے چل کر مسٹر ڈیوڈ نے سول سروس پولیس اور کل مجوزہ دستور سیاسی کے متعلق انگلستان کے شدید قدامت پسند گروہ کے خیالات سے ہمدردی کا اظہار فرمایا کہ ان لوگوں کو خدشہ ہے کہ اس جدید دستور کے استعمال سے کہیں ہندوستان میں مشن کا سارا کاروبار خطرہ میں پڑ جائے۔

ذہنی انتشار کے طوفانی سمندر میں ایک محفوظ لنگر کا کام دیتا ہے اور آنے والی زندگی کا یقین دلاتا ہے جس میں اس زندگی کی ناکامیوں کی تلافی ہو جائے۔

مگر کیا کروں میرے لئے اس طرح پناہ ڈھونڈنا ناممکن ہے۔ میں کھلے سمندر کو ترجیح دیتا ہوں اور اس کے طوفان و طغیانی کو۔ مجھے بعد والی زندگی میں، اور موت کے بعد جو ہوگا اس میں بہت کچھ دلچسپی ہے۔ میرے ذہن کو مشغول رکھنے کے لئے تو اسی زندگی کے مسائل کافی ہیں۔ چینیوں کا روایتی نقطۂ نظر جو اصولاً اخلاقی ہے مگر غیر مذہبی یا یوں کہئے کہ مذہبی تشکیک سے متاثر، وہ مجھے بہت بھاتا ہے اگرچہ چینیوں نے جس طرح اسے زندگی پر نافذ کیا ہے اس سے میں متفق نہیں۔ مجھے دلچسپی ہے ان کے نظریئے، ان کے طریق حیات سے۔ اس راستے سے جس پر کہ ان کے نزدیک چلنا چاہیے۔ زندگی کو سمجھنا چاہیے۔ اسے رد نہ کرنا چاہیے بلکہ قبول، اس سے مطابقت کرنا چاہیے اور اس کو بہتر بنانا چاہیے۔ لیکن عموماً مذہبی رجحان کو اس ذہنیت سے سروکار ہی نہیں ہوتا۔ میرے نزدیک یہ وضاحت فکر کا دشمن ہوتا ہے۔ اس لئے ہی نہیں کہ بعض مقررہ اور ناقابل تغیر نظریوں اور عقیدوں بے چون و چرا تسلیم کرنے پر اس کی بنیاد ہوتی ہے بلکہ اس لئے بھی کہ یہ جذبات غمی اور جلی پر منحصر ہوتا ہے۔ یہ اس چیز سے بہت دور ہوتا ہے جسے میں روحانیت اور روح کی باتیں جانتا ہوں اور یہ تو جان بوجھ کر یا نادانستہ حقیقت سے آنکھیں بند کر لیتا ہے اس لئے کہ کہیں حقیقت اس کے تعصبات سے مطابقت کرنے سے معذور نہ ہو۔ یہ تنگ نظر ہوتا ہے اور دوسرے خیالات و آرا کے ساتھ رواداری کا نہیں برتتا۔ یہ خود غرض اور برخود غلط ہوتا ہے۔ اور اکثر مطلبی لوگوں موقع شناسوں کو اپنے سے بے جا فائدہ اٹھانے دیتا ہے۔

اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اہل دین کبھی بھی اعلیٰ ترین اخلاقی اور روحانی

زندگی کا نمونہ نہ تھے۔ یا اب بھی نہیں ہیں۔ لیکن اس کے معنی یہ ہرگز نہیں ہیں کہ مذہبی نقطۂ نظر کسی قوم کی اخلاقی اور روحانی ترقی میں مدد نہیں دیتا بلکہ اس میں حائل ہی ہوتا ہے۔ اگر اخلاق اور روحانیت کو اس دنیا کے معیاروں سے جانچا جائے نہ کہ آخرت سے۔ عموماً تو مذہب خدا یا ذات مطلق کی غیر معاشرتی جستجو بن کر رہ جاتا ہے اور مذہبی آدمی کو سماج کی بھلائی سے کہیں زیادہ اپنی شخصی نجات کی فکر رہتی ہے۔ صوفی اپنے کو نفس سے رہا کرنا چاہتا ہے اور اس کوشش میں اکثر نفس اس پر چھا جاتا ہے۔ اخلاقی معیاروں کو جماعتی ضروریات سے کوئی علاقہ نہیں ہوتا بلکہ ان کی بنیاد معصیت کے مافوق الطبیعت مسالک پر ہوتی ہے اور منظم مذہب تو بلا استثنا مستقل اغراض سے وابستہ ہو جاتا ہے اور یوں لازمی طور پر ایک ترقی دشمن قوت بن کر تبدیلی اور ترقی کی مخالفت کرتا ہے۔

یہ تو سب جانتے ہیں کہ مسیحی کلیسا نے شروع میں غلاموں کو اپنی معاشرتی حالت بہتر کرنے میں مدد نہیں دی۔ غلام لوگوں کو جو قرون وسطیٰ کے منصب داری نظام میں زرعی چاکر کی حیثیت ملی تو وہ معاشی اسباب سے۔ کلیسا کا نقطۂ نظر تو ابھی دو سو سال پہلے تک (۱۷۲۷ء تک) جو تھا اس کا پتا ایک خط سے چلتا ہے جو لندن کے بڑے پادری نے امریکہ کی جنوبی آبادیوں کے غلاموں کے مالکوں کو لکھا تھا۔

پادری صاحب نے تحریر فرمایا تھا کہ "مسیحت سے یا کتاب مقدس کے قبول کرنے سے شہری حقوق ملکیت ہیں یا شہری تعلقات سے متعلق جو فرائض ہیں ان میں مطلق کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ان سب حیثیات سے تو آدمی اسی حال میں رہتے ہیں جس میں وہ پہلے تھے۔ مسیحت جو آزادی بخشتی ہے، وہ گناہ سے شیطان سے، اور انسان کے شہوات و جذبات اور بے جا خواہشات سے آزادی ہے۔

لیکن جہاں تک ان کی حالت کا تعلق ہے۔ وہ پہلے جو کچھ تھے۔ چاہے وہ آزاد تھے یا غلام، تو اس میں عیسائی ہو جانے یا بپتسمہ لینے سے یعنی کسی قسم کی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔

آج تو کوئی منظم مذہب اس صفائی سے اپنا یہ خیال ظاہر نہ کرے گا۔ لیکن سچ پوچھیے تو ہ میں حق ملکیت اور موجودہ نظام معاشرت کے متعلق اس کا رویہ یہی ہے۔

سب جانتے ہیں کہ الفاظ بجائے خود خیالات کے منتقل کرنے کا بہت ناقص ذریعہ ہیں اور مختلف لوگ ان کے مختلف معنی سمجھ سکتے ہیں اور شاید کسی زبان کے کسی اور لفظ کی مختلف لوگ اتنی مختلف تعبیریں نہ کرتے ہوں جتنی کہ لفظ مذہب (یا دوسری زبانوں میں اس کے مترادف لفظ) کی۔ اس لفظ کو پڑھ کر یا سن کر شاید دو آدمیوں کے ذہن میں بھی خیالات و تصورات کا ایک سا مجموعہ سامنے نہ آتا ہوگا۔ جو خیالات و تصورات اس لفظ سے ابھرتے ہیں وہ کہیں رسم و رواج کے ہیں۔ کہیں مختلف کتابوں کے، کہیں آدمیوں کی ایک جمعیت کے۔ تو کہیں چند قطعی عقائد کے، کہیں اخلاق، احترام، محبت کے، کہیں خوف و نفرت کے، خیرات، قربانی، رہبانیت کے، روزہ رکھنے کے، اور خوب کھانے پینے کے جشنوں کے، دعا اور عبادت کے، قدیم تاریخ کے، شادی کے، موت کے، آنے والی دنیا کے، بلوؤں کے، سر پھوٹنے کے، غرض طرح طرح کے۔ تعبیروں اور تصوروں کی اس بے حساب رنگا رنگی سے جو سخت انتشار پیدا ہوتا ہے اس کے علاوہ اس کے ساتھ ساتھ تقریباً ہمیشہ ایک تیز جذباتی تحریک بھی شامل ہوتی رہتی ہے۔ جس میں ٹھنڈے دل سے سوچنے سمجھنے کا امکان نہیں رہتا۔ لفظ مذہب کے کوئی واضح معنی اب باقی نہیں رہتے ہیں، اگر کبھی تھے۔ چنانچہ اس سے سخت

انتشار پیدا ہوتا ہے اور دلیل و بحث کا ایسا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جو کہیں ختم ہونے پر نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ مختلف لوگ اس کے بالکل ہی جدا جدا معنی لیتے ہیں۔ بہت بہتر ہوتا اگر اس لفظ کا استعمال ہی ترک کر دیا جاتا اور اس کی جگہ دوسرے لفظ استعمال کئے جاتے جن کے معنی زیادہ محدود و متعین ہوتے مثلاً دینیات، فلسفۂ اخلاق، اخلاقیات، روحانیت، مابعد الطبیعات، فرض، رسم وغیرہ خود یہ الفاظ بھی خاصے مبہم ہیں۔ لیکن ان کا مفہوم مذہب سے کہیں محدود ہے۔ اور ایک بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ ان لفظوں کے ساتھ وہ جذبات اس طرح وابستہ نہیں ہیں جس میں کہ لفظ مذہب چاروں طرف سے لپٹا ہوا ہے۔

پھر آخر مذہب ہے کیا؟ اگر باوجود اس کے عیوب کے اسی لفظ کو استعمال کیا ہی جائے، غالباً اس سے مراد فرد کی اندرونی نشو و نما ہے یعنی اس کے شعور کا ارتقا کسی ایسی سمت میں جسے اچھا سمجھا جاتا ہے پھر خود یہ بات موضوع بحث بن جاتی ہے کہ وہ سمت کیا ہے۔ لیکن جہاں تک میں سمجھتا ہوں مذہب اسی اندرونی تبدیلی پر زور دیتا ہے اور خارجی تبدیلی کو اسی داخلی نشو و نما کا پرتو بتاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ اندرونی تبدیلی خارجی ماحول پر زبردست اثر ڈالتی ہے لیکن یہ بات بھی اتنی ہی صاف ہے کہ خارجی ماحول بھی اسی اندرونی تبدیلی اثر انداز ہوتا ہے یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے پر اثر ڈالتی ہیں اور ایک دوسرے سے متاثر ہوتی ہیں۔ یہ سب کو معلوم ہے کہ مغرب کی جدید تہذیب میں خارجی ترقی اندرونی نشو و نما کی نسبت بہت آگے بڑھ گئی ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ ہرگز نہیں نکلتا جیسا کہ مشرق کے بہت سے لوگ خیال کرتے ہیں کہ چونکہ ہم صنعت میں پیچھے ہیں اور ہماری ترقی سست ہے اس لئے ہمارا اندرونی ارتقاء کچھ زیادہ ہو گیا ہے۔ یہ بھی ان دھوکوں میں سے ایک دھوکہ ہے جس سے

ہم اپنے کو تسلی دے لیا کرتے ہیں اور اپنے ہیٹے پن کے احساس پر غالب آنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ ضرور ہو سکتا ہے کہ افراد حالات اور ماحول سے بالاتر ہو کر اندرونی بلندیاں حاصل کر لیں لیکن انسان کے بڑے گروہوں اور قوموں کے لیے تو اندرونی ارتقا شروع ہونے سے پہلے لازم ہے کہ خارجی نشوونما ایک خاص درجہ تک پہنچ چکا ہو۔ جو شخص معاشی حالات کا شکار ہوا اور زندہ رہنے کی کشاکش اسے ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہو وہ مشکل ہی سے شعور داخلی کے کسی بلند مرتبہ تک پہنچ سکتا ہے۔ جو طبقہ دوسروں کے قدموں تلے پس رہا ہو اور دوسرے جس سے بے جا فائدہ اٹھا رہے ہوں وہ کبھی اندرونی ترقی نہیں کر سکتا۔ جو قوم سیاسی اور معاشی اعتبار سے کسی دوسری قوم کی محکوم ہو اور ہر طرف سے گھری ہو۔ جس پر طرح طرح کی حد بندیاں ہوں جس سے دوسرے فائدہ اٹھا رہے ہوں، اسے کبھی اندرونی ترقی نصیب نہیں ہو سکتی۔ غرض خود اندرونی نشوونما کے لیے باہر کی آزادی اور مناسب ماحول لازم ہو جاتا اس خارجی آزادی کے حاصل کرنے اور ماحول کو اس طرح بدلنے میں کہ اندرونی نشوونما کی راہ میں جو رکاوٹیں ہوں وہ ہٹ جائیں۔ پسندیدہ بات یہ ہے کہ جو وسائل اختیار کیے جائیں وہ ایسے ہوں کہ یہ مقصد فوت نہ ہو جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جب گاندھی جی فرماتے ہیں کہ وسائل مقصد سے زیادہ اہم ہیں تو ان کے خیال میں اس قسم کی کوئی بات ہوتی ہے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ وسائل ایسے ہوں جو اس مقصد تک لے جا سکیں ورنہ ساری کوشش ضائع ہو گی اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اندرونی اور بیرونی دونوں اعتبار سے حالت پہلے سے پست تر ہو جائے۔

گاندھی جی نے کسی جگہ لکھا ہے کہ "کوئی مذہب کے بغیر نہیں رہ سکتا۔

بعض لوگ ہیں جو اپنی عقل کے غرور میں یہ اعلان کرتے ہیں کہ انھیں مذہب سے کچھ سروکار نہیں۔ مگر اس کی مثال اس آدمی کی سی ہے جو کہے کہ میں سانس لیتا ہوں مگر میرے ناک نہیں" پھر کہیں وہ کہتے ہیں "حق وصداقت کے ساتھ میری شیفتگی مجھے سیاست میں گھسیٹ لائی ہے اور میں ذرا سے تامل کے بغیر اگرچہ بڑے عجز کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ جو لوگ کہتے ہیں کہ مذہب کو سیاست سے کچھ واسطہ نہیں وہ جانتے ہی نہیں کہ مذہب ہے کیا" زیادہ صحیح ہوتا اگر وہ یہ فرماتے کہ جو لوگ زندگی اور سیاست سے مذہب کو خارج کرنا چاہتے ہیں وہ لفظ مذہب کے معنی اس سے بالکل مختلف سمجھتے ہیں جو میں سمجھتا ہوں۔ یہ بات تو صاف ہے کہ گاندھی جی اس لفظ کو ایک ایسے معنی میں استعمال کرتے ہیں (غالباً اور کسی معنی سے زیادہ "اخلاقی" معنی میں) جو مذہب کے نکتہ چینوں کے معنی سے مختلف ہے۔ ایک لفظ کو یوں مختلف معنوں میں استعمال کرنے سے ایک دوسرے کا مطلب سمجھنا اور بھی دشوار ہو جاتا ہے۔

مذہب کی ایک بالکل نئی تعریف، جس سے اہل مذہب اتفاق نہ کریں گے، پروفیسر جان ڈیوی کی تعریف ہے۔ ان کے خیال میں "مذہب سب کچھ ہے جس سے وجود کے منفرد اور متغیر حوادث و واقعات میں حقیقی توجہ منظر پیدا ہو" یا پھر ایک جگہ کہتے ہیں کہ "ہر وہ عمل جو کسی غیبی مقصد کے لئے موانع کے مقابلے میں اور شخصی نقصان کے ڈر کے باوجود کیا جائے اس لئے کہ اس کی عام اور مستقل قدر کا یقین ہے اپنی کیفیت میں مذہبی ہوتا ہے۔" اگر مذہب یہ ہے تو پھر یقیناً کسی کو اس پر ذرا سا بھی اعتراض نہیں ہو سکتا۔

رومین رولاں نے بھی مذہب کے تصور کو پھیلا کر اسے وہ معنی دیئے ہیں جس سے شاید منظم مذہب کے راسخ العقیدہ لوگ کانوں پر ہاتھ دھریں۔

سوانح رام کرشن میں کہتے ہیں "وہ بہت سی روحیں ہیں جو مذہبی عقیدہ سے آزاد ہیں یا سمجھتی ہیں کہ آزاد ہیں۔ لیکن ہر لمحہ ایک فوق العقل شعور میں ڈوبی رہتی ہیں جس کا نام وہ اشتراکیت رکھ لیتی ہیں یا اشتمالیت، انسان دوستی یا قوم پرستی یا عقلیت" تک خیال کی کیفیت سے اس کا منبع معین ہوتا ہے نہ کہ اس کے موضوع سے اور ایسی کیفیت کی بنا پر ہم فیصلہ کر سکتے ہیں کہ وہ مذہب سے نکلا ہے یا نہیں۔ اگر وہ تلاش حق کی طرف بے خوف و خطر بڑھتا رہے پھر چاہے جو بھی ہو اور یکسوئی اور خلوص کے ساتھ ہر قربانی کے لیے تیار ہو تو میں اسے ضرور مذہبی کہوں گا۔ اس لیے کہ وہ ضرور انسانی سعی کے لیے ایک ایسے مقصد پر یقین رکھتا ہے جو موجودہ معاشرہ کی زندگی سے بالا ہے بلکہ کل انسانیت کی زندگی سے بھی ارفع، خود تشکیک تک روح مذہبی کے لشکر بزرگ کے ساتھ ساتھ چلتی ہے، بشرطیکہ یہ تشکیک قوی اور کھری فطرتوں سے پیدا ہوا اور کمزوری کا مظہر نہ ہو بلکہ قوت کا۔

نہ جانے میں ان شرائط کو پورا بھی کرتا ہوں یا نہیں جو رومان رولاں نے لگائی ہیں۔ مگر ان حالات میں تو میں اس لشکر بزرگ کا ایک ناچیز پیادہ سپاہی بننے کے لئے ضرور تیار ہوں گا۔

(۴۸)

برطانوی حکومت کی دورخی پالیسی

ہریجن تحریک جاری تھی۔ گاندھی جی پہلے یرودا جیل سے اس کی رہنمائی کرتے رہے اور اب باہر سے کر رہے تھے۔ اس کے لئے سخت جدوجہد ہو رہی تھی کہ مندروں کے داخلے میں جو رکاوٹیں ہیں وہ دور کر دی جائیں اور اس کا ایک مسودہ قانون اسمبلی میں پیش کیا گیا۔ اس وقت یہ حیرت انگیز منظر دیکھنے میں آیا کہ کانگریس کے ایک ممتاز لیڈر دہلی میں گھر گھر پھر رہے تھے اور اسمبلی کے ممبروں کو اس مسودہ قانون کی تائید پر آمادہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ خود گاندھی جی نے ان کے ذریعہ سے اسمبلی کے ممبروں سے اپیل کیا تھا۔ مگر لطف یہ ہے کہ سول نافرمانی اب بھی جاری تھی اور لوگ جیل میں جا رہے تھے اور کانگریس نے اسمبلی کا بائیکاٹ کیا تھا۔ اور سارے سب ممبر استعفیٰ دے کر چلے آئے تھے۔ بچے کھچے ممبروں نے اور ان لوگوں نے جو کانگریسی ممبروں کی جگہ منتخب ہوئے تھے اس نازک زمانے میں ہمیشہ کانگریس کی مخالفت اور حکومت کی موافقت کی تھی۔ ان کی اکثریت نے حکومت کو اس جابرانہ قانون کے پاس کرنے میں مدد دی تھی جس کے ذریعہ سے تعزیری ضابطوں کو ایک مستقل شکل دے دی تھی۔ انھوں نے اوٹاوے کے سمجھوتے کو چپ چاپ قبول کر لیا تھا۔ شملہ اور لندن میں گنے چنے آدمیوں کے ساتھ دعوتیں اڑا رہے تھے۔ ہندوستان کی برطانوی حکومت کی شکرگذاری کے گیت گا رہے تھے اور اس کی دورخی پالیسی کے لئے دست بدعا تھے۔

مجھے ان حالات میں گاندھی جی کے اپیل پر حیرت ہوئی اور اس سے زیادہ دکھ

کہ راجگوپال اچاریہ جو چند ہفتے پہلے کانگریس کے قائم مقام پریسیڈنٹ تھے ان حضرات کی تائید حاصل کرنے کی انتہائی کوشش کر رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس سے سول نافرمانی کی جدوجہد کو نقصان پہنچا۔ میرے لئے اس کا اخلاقی پہلو اور زیادہ تکلیف دہ تھا میرے خیال میں گاندھی جی یا کسی کانگریسی لیڈر کا یہ طرز عمل اخلاقاً ناجائز تھا اور ایک قسم کی بدعہدی تھی ان ہزارہا آدمیوں سے جو جیل میں تھے یا اس تحریک کو چلا رہے تھے۔ مگر میں جانتا تھا کہ گاندھی جی کا نقطہ نظر دوسرا ہے۔

حکومت نے اس وقت اور اس کے بعد سے مسودہ قانون کے متعلق جو رویہ اختیار کیا اس سے ہماری آنکھیں کھل گئیں۔ اس نے اس کے حامیوں کی راہ میں ہر طرح کے روڑے اٹکائے۔ اس کو بار بار ملتوی کرتی رہی اور اس کے مخالفوں کو شہ دیتی رہی یہاں تک کہ آخر میں اس کی کھلم کھلا مخالفت کر کے اس کا خاتمہ کر دیا۔ کم و بیش یہی رویہ وہ ہندوستان کی سماجی اصلاح کے معاملہ میں رکھتی ہے اور مذہب میں مداخلت نہ کرنے کے بہانہ سے وہ معاشرتی ترقی میں رکاوٹ ڈالتی ہے اور لطف یہ ہے کہ وہ ہماری سماجی خرابیوں پر نکتہ چینی کرتی ہے اور دوسروں کو بھی اس پر آمادہ کرتی ہے۔ اتفاق سے شاردا بل جو بچپن کی شادی کو روکنے کے لئے پیش کیا گیا تھا منظور ہو گیا مگر اس بدنصیب ایکٹ کا جو حشر ہوا اس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ حکومت کو اس قسم کی تجویزوں پر عمل کرنا کس قدر ناگوار ہوتا ہے وہی حکومت جو راتوں رات تعزیری ضابطے بنا ڈالتی ہے جن میں نئے نئے جرم تراشے جاتے ہیں اور ایک شخص کے جرم کی سزا دوسروں کو دی جاتی ہے۔ جو بیسیوں ہزار آدمیوں کو ان ضابطوں کی خلاف ورزی کرنے پر جیل بھیج دیتی ہے اور شاردا ایکٹ جیسے باقاعدہ قانون کو نافذ کرنے سے ڈرتی ہے۔ سب سے پہلے تو اس ایکٹ کا اثر یہ الٹا ہوا اس لئے کہ اس میں ازراہ حماقت لوگوں کو چھ مہینے کی مہلت دی گئی تھی جس سے بےشمار آدمیوں نے فائدہ اٹھایا۔ ان کے

بعد یہ معلوم ہوا کہ یہ ایکٹ محض ایک مذاق ہے اور اگر اس کی خلاف ورزی کی جائے تو حکومت کی طرف سے کوئی کارروائی نہیں ہوتی۔ سرکاری طور پر اس کی اشاعت کی مطلق کوشش نہیں کی گئی اور بہت سے گاؤں والوں کو آج تک یہ معلوم نہیں ہوا کہ اس ایکٹ کا کیا منشا ہے۔ ان کے سامنے ہندو مسلمان مذہبی واعظ اس کو توڑ مروڑ کر پیش کرتے تھے جنھیں خود بھی صحیح واقعات کا علم نہ تھا۔

ظاہر ہے کہ حکومت ہندوستان کی معاشرتی خرابیوں کے معاملے میں جو رواداری کا برتاؤ کرتی ہے اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ ان کی مؤید ہے بلکہ اس میں شک نہیں کہ اسے ان خرابیوں کے دور کرنے کی فکر نہیں کیونکہ ان سے اس کے کام میں یعنی ہندوستان پر حکومت کرنے میں اور اس کی دولت سے ناجائز فائدہ اٹھانے میں خلل پڑتا ہے۔ پھر یہ خطرہ بھی ہے کہ سماجی اصلاح کی کوشش سے بعض لوگ ناراض ہو جائیں گے اور چونکہ حکومت کو ملک کی سیاسی مخالفت سے نمٹنا دشوار ہے اس لئے وہ نہیں چاہتی کہ اپنے لئے اور مشکلات پیدا کرے۔ مگر کچھ دنوں سے سماجی مصلحوں کے کام میں اور بھی زیادہ دشواری پیدا ہو گئی ہے اس لئے کہ حکومت روز بروز معاشرتی خرابیوں کی پشت پناہ بنتی جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا میل جول ہندوستان کی سب سے بڑی رجعت پسند جماعتوں سے رہتا ہے جوں جوں اس کی سیاسی مخالفت بڑھتی جاتی ہے اسے عجیب عجیب قسم کے حمایتی ڈھونڈھنے پڑتے ہیں اور آج کل برطانوی حکومت کے سب سے بڑے حامی انتہائی فرقہ پرست، مذہبی رجعت پسند اور اصلاح و ترقی کے دشمن ہیں۔ مسلمانوں کی فرقہ پرست جماعتیں سیاسی، معاشی اور سماجی اعتبار سے انتہائی رجعت پسند ہیں۔ ہندو مہاسبھا بھی ان سے کچھ کم نہیں مگر سناتن دھرمی رجعت پسندی میں اس سے کہیں بڑھے ہوئے ہیں جو مذہب کے معاملے میں ہر قسم کی اصلاح و ترقی کے دشمن ہیں اور اسی کے ساتھ برطانوی حکومت کے پکے وفادار ہیں یا کم سے کم زور و شور سے وفاداری کا دعویٰ کرتے ہیں۔

اگر حکومت خاموش رہی اور اس نے شاردا ایکٹ کو ہر دلعزیز بنانے اور نافذ کرنے کی کوشش نہیں کی تو کانگریس یا دوسری غیر سرکاری جماعتوں نے اس کے لیے پروپگنڈا کیوں نہیں کیا؟ یہ سوال برطانیہ کے اور دوسرے ملکوں کے نکتہ چینوں کی طرف سے اکثر کیا جاتا ہے۔ جہاں تک کانگریس کا تعلق ہے پچھلے پندرہ سال سے خصوصاً ۱۹۲۱ء سے برطانوی حکومت سے قومی آزادی کی شدید جنگ میں مصروف رہی ہے جس پر اس کی موت اور زندگی کا دارومدار ہے۔ رہیں دوسری انجمنیں تو ان میں نہ حقیقی قوت ہے اور نہ انہیں عام لوگوں سے تعلق ہے۔ وہ عورتیں اور مرد جو اعلیٰ مقاصد اور اخلاقی قوت رکھتے ہیں اور عوام میں ہر دلعزیز ہیں سب کے سب کھنچ کر کانگریس میں چلے آئے ہیں اور زیادہ تر اپنا وقت قید فرنگ میں گذارتے ہیں۔

دوسری انجمنیں اس سے آگے نہیں بڑھتیں کہ چند منتخب لوگوں کو جمع کر کے ریزولیوشن پاس کر دیں۔ عام لوگوں سے تعلق پیدا کرنے کی ان میں جرأت نہیں۔ مردوں کی انجمنیں جنٹلمینوں کی طرح اور انجمن خواتین ہند لیڈیوں کی شان سے کام کرتی ہیں۔ اور جارحانہ پروپگنڈا کرنا ان کے بس کی بات نہیں۔ اس کے علاوہ تعزیری ضابطوں اور ان قانونوں نے جو ہر قسم کی پبلک جد وجہد کو دبانے کے لیے بنائے گئے تھے ان انجمنوں کو بھی معطل کر دیا تھا۔ ممکن ہے کہ مارشل لا انقلابی جد وجہد کو کچل دے مگر اسی کے ساتھ وہ تمدنی اور تمدنی جد وجہد کو بھی معطل کر دیتا ہے۔

مگر کانگریس اور دوسری غیر سرکاری انجمنوں کا سماجی اصلاح میں زیادہ حصہ نہ لینے کا اصلی سبب اس سے زیادہ گہرا ہے۔ ہم لوگ قوم پرستی کے مرض میں مبتلا ہیں ہمارے دل و دماغ پر سیاسی کا خیال چھایا ہوا ہے اور اس وقت تک چھایا رہے گا جب تک ہمیں سیاسی آزادی حاصل نہ ہو جائے۔ برنارڈ شا کا یہ قول ہمارے حسب حال ہے محکوم قوم کی مثال اس شخص کی سی ہے جو سرطان کے مرض میں مبتلا ہو۔ وہ دن رات

اسی فکر میں رہتا ہے...... سچ پوچھئے تو کسی قوم کے لئے قومی تحریک سب سے بڑی مصیبت ہے یہ ایک طبعی عمل کو روک دئے جانے کی تکلیف دہ علامت ہے۔ محکوم قومیں دنیا کی رفتار ترقی میں پیچھے رہ جاتی ہیں۔ اس لئے کہ ان کی ساری توجہ اس کوشش صرف ہوتی ہے کہ کسی طرح قومی آزادی حاصل ہو اور قومی تحریک سے پیچھا چھوٹے"۔

پچھلے تجربے سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ ہم موجودہ حالات میں سماجی ترقی نہیں کر سکتے۔ اگرچہ بظاہر حکومت کے بعض صیغے منتخب شدہ وزیروں کی طرف منتقل کر دیئے گئے ہیں۔ حکومت کے انتہائی جمود سے ہمیشہ قدامت پسندوں کو مدد ملتی ہے اور برٹش گورنمنٹ مدتوں سے ہماری روح عمل کو کچلتی رہی ہے اور ہم پر استبدادی یا بقول خود بزرگانہ حکومت کرتی رہی ہے۔ وہ اس بات کو پسند نہیں کرتی کہ غیر سرکاری لوگ کوئی غیر منظم تحریک شروع کریں اور اسے یہ شبہ ہوتا ہے کہ ان کی نیت کچھ اور ہے ہریجن تحریک اپنے چلانے والوں کی انتہائی احتیاط کے باوجود کبھی کبھی سرکاری ملازموں سے ٹکرا جاتی ہے مجھے یقین ہے کہ اگر کانگریس ہمارے ملک میں یہ پروپیگنڈا کرے کہ صابون زیادہ مقدار میں استعمال کیا جائے تو بہت سے مقامات پر اس سے اور حکومت سے ٹکر ہو جائے گی۔

میرے خیال میں اگر ریاست سماجی اصلاح کو اپنے ہاتھ میں لے لے تو عام لوگوں کو اس پر آمادہ کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوگی مگر غیر ملکی حکمرانوں کی طرف سے لوگوں کو ہمیشہ شبہ رہتا ہے اور ان کو خیالات کے بدلنے میں زیادہ کامیابی نہیں ہو سکتی اگر غیر ملکی حکومت ہٹ جائے اور معاشی تبدیلیاں مقدم رکھی جائیں تو قابل اور مستعد حکام آسانی سے بڑی بڑی سماجی اصلاحیں کر سکتے ہیں۔

مگر جیل میں ہمیں سماجی اصلاح اور شاردا ایکٹ اور ہریجن تحریک کی کچھ زیادہ فکر نہیں تھی۔ مگر مجھے تو یہ بات ناگوار تھی کہ ہریجن تحریک نے سول نافرمانی میں رکاوٹ

ڈال دی۔ شروع مئی ۱۹۳۳ء میں یہ تحریک چھ ہفتے کے لیے ملتوی کر دی گئی۔ اب ہم کو یہ فکر تھی کہ دیکھیں اب کیا ہوتا ہے۔ التوا کی وجہ سے تحریک کا رہا سہا زور ختم ہو گیا کیونکہ قومی لڑائی کوئی کھیل نہیں کہ جب چاہا شروع کر دیا اور جب چاہا بند کر دیا۔ التوا سے پہلے بھی تحریک کے لیڈر بڑی کمزوری اور بودے پن کا ثبوت دے رہے تھے۔ جا بجا چھوٹی چھوٹی کانفرنسیں ہو رہی تھیں اور طرح طرح کی افواہیں مشہور کی جاتی تھیں جن سے عملی کام میں خلل پڑتا تھا۔ کانگریس کے بعض قائمقام پریسیڈنٹ بہت قابل قدر لوگ تھے مگر انہیں جنگ کا سپہ سالار بنانا ان پر بڑا ظلم تھا۔ وہ کچھ تھکے ہوئے سے معلوم ہوتے تھے اور چاہتے تھے کہ اس مشکل سے کسی طرح پیچھا چھڑائیں۔ بڑے لیڈروں کی اس ہچکچاہٹ اور لیت و لعل سے کچھ لوگ بیزار تھے۔ مگر وہ اپنی بیزاری کا اظہار منظم طریقے سے نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے کہ تمام کانگریس کمیٹیاں خلاف قانون قرار دے دی گئی تھیں۔

اسی حالت میں گاندھی جی کا اکیس دن کا برت شروع ہوا۔ وہ جیل سے رہا کر دیے گئے اور سول نافرمانی چھ ہفتے کے لیے ملتوی کی گئی۔ برت ختم ہو گیا اور گاندھی جی کو رفتہ رفتہ افاقہ ہونے لگا۔ وسط جون میں سول نافرمانی کی التوا کی میعاد چھ ہفتے اور بڑھا دی گئی۔ اس اثنا میں حکومت کے جبر و تشدد میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ جزیرۂ انڈمن میں سیاسی قیدی (بنگال کے انقلابی تشدد کے مجرم وہاں بھیجے گئے تھے) بدسلوکی کی وجہ سے بھوک ہڑتال کر رہے تھے۔ ان میں سے دو ایک فاقہ کرتے کرتے مر گئے اور بہت سے قریب مرگ تھے۔ جن لوگوں نے ہندوستان میں انڈمن کے واقعات کے خلاف احتجاج کے جلسے کیے انہیں بھی گرفتار کر کے سزا دے دی گئی۔ حکومت کی مرضی یہ تھی کہ ہم تکلیف اٹھائیں اور اف تک نہ کریں۔ چاہے سیاسی قیدی جن کے پاس بھوک ہڑتال کے سوا احتجاج کا کوئی ذریعہ نہ تھا ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جائیں۔ چند مہینے بعد ستمبر ۱۹۳۳ء میں (جب میں جیل سے رہا ہو چکا تھا) ایک اپیل شائع کیا گیا جس پر رابندر ناتھ ٹیگور، سی۔ ایف۔ اینڈریوز اور بہت سے اور مشہور لوگوں کے

دستخط تھے جن میں سے اکثر کانگریس سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے۔ اس میں یہ درخواست کی گئی تھی کہ انڈمن کے قیدیوں سے زیادہ انسانیت کا سلوک کیا جائے۔ بلکہ بہتر یہ ہے کہ وہ ہندوستان کی جیلوں میں منتقل کر دیے جائیں۔ حکومت ہند کے ہوم ممبر اس اپیل پر بہت خفا ہوئے اور جن لوگوں نے اس پر دستخط کیے تھے ان کو برا بھلا کہا کہ وہ قیدیوں سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ آگے چل کر جہاں تک مجھے یاد ہے ان قیدیوں سے ہمدردی کرنا قابل سزا جرم قرار دے دیا گیا۔

سول نافرمانی کے التوا کی میعاد ختم ہونے سے پہلے ہی دہرہ دون میں یہ خبر ملی کہ گاندھی جی پونا میں ایک بے ضابطہ کانفرنس منعقد کرنے والے ہیں دو تین سو آدمی وہاں جمع ہوئے اور گاندھی جی کے مشورے سے عام سول نافرمانی ملتوی کر دی گئی مگر انفرادی نافرمانی کی اجازت رہی اور ہر قسم کے خفیہ طریقوں کی ممانعت کر دی گئی۔ یہ فیصلے حوصلہ افزا نہیں تھے مگر مجھے ان پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ سول نافرمانی کو روکنے کے معنی صرف یہ تھے کہ موجودہ حالت کا اعتراف کیا جائے اور اس کو قائم رکھا جائے کیونکہ سچ پوچھیے تو تمام تحریک پہلے ہی ختم ہو چکی تھی خفیہ کام کرنا محض ایک بہانہ تھا کہ تحریک اب بھی جاری ہے اور ہماری تحریک کی نوعیت دیکھتے ہوئے اس سے اخلاقی خرابیاں پیدا ہونے کا احتمال تھا۔ اس کی ضرورت صرف اس حد تک تھی کہ لوگوں کو ہدایتیں بھیجی جا سکیں اور ان سے تعلق قائم رکھا جا سکے مگر خود سول نافرمانی کو پوشیدہ رکھنا ناممکن تھا۔

مجھے جس بات سے تعجب اور افسوس ہوا وہ یہ تھی کہ پونا میں ہماری موجودہ حالت اور مقاصد کے متعلق صحیح معنوں میں کوئی بحث نہیں ہوئی۔ کانگریس والے تقریباً دو سال کی شدید جنگ کے بعد جمع ہوئے تھے اور اس عرصے میں ساری دنیا میں اور ہندوستان میں بڑے بڑے اہم واقعات رونما ہو چکے تھے جن میں سے ایک یہ بھی تھا کہ برطانوی حکومت نے وہائٹ پیپر میں دستور اساسی کی اصلاح کی تجاویز شائع کی گئی تھیں۔ ہم اس عرصے میں

مجبوراً خاموش رہے تھے۔ اور دوسری طرف سے مسلسل جھوٹا پروپگنڈا کیا گیا تھا تاکہ اصل مسئلہ لوگوں کی نظر سے چھپ جائے۔ نہ صرف حکومت کے حامیوں بلکہ لبرل پارٹی اور دوسرے لوگوں کی طرف سے بھی بار بار یہ کہا جاچکا تھا کہ کانگریس نے اپنا کامل آزادی کا مقصد ترک کر دیا ہے۔ میرے خیال میں اس موقع پر اور کچھ نہیں تو کم از کم یہ ضرور کرنا چاہیے تھا کہ ہمارا سیاسی مقصد دوبارہ واضح کر دیا جائے اور ممکن ہو تو اس کے ساتھ سماجی اور معاشی مقاصد کا بھی اضافہ کر دیا جائے۔ اس کے بجائے ساری بحث اس بات تک محدود رہی کہ عام سول نافرمانی بہتر ہے یا انفرادی نافرمانی اور خفیہ طریقوں سے کام لینا مناسب ہے یا نہیں۔ اس کے علاوہ ایک عجیب بات یہ تھی کہ حکومت سے "صلح" کرنے کا چرچا ہو رہا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے گاندھی جی نے وائسرائے کو ایک تار بھیجا اور ملاقات کی درخواست کی مگر وائسرائے نے انکار کر دیا۔ اس کے بعد گاندھی جی نے ایک اور تار بھیجا جس میں "باعزت صلح" کا ذکر تھا بھلا اس وقت اس پراسرار صلح کی تلاش کا کیا موقع تھا جبکہ حکومت بڑے زور شور سے قوم کو ہر طرح کچلنے کی کوشش کر رہی تھی اور انڈمن میں لوگ فاقہ کر کے جان دے رہے تھے۔ مگر میں جانتا تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو گا گاندھی جی کا اصول یہی ہے کہ وہ صلح کی درخواست منظور کرتے ہیں۔

حکومت کا جبر و تشدد زور شور سے جاری تھا اور پبلک جد و جہد کو روکنے کے لئے تمام خاص قوانین نافذ تھے۔ فروری ۱۹۳۴ء میں میرے والد کے یوم وفات کا جلسہ ہونے والا تھا مگر پولیس نے اس کو بھی روک دیا۔ حالانکہ اسے کانگریس سے کوئی تعلق نہ تھا اور اس کے صدر سر تیج بہادر سپرو جیسے اعتدال پسند تجویز کئے گئے تھے۔ آیندہ جو عنایات ہمارے حال پر ہونے والی تھیں ان کی جھلک ہمیں وہائٹ پیپر میں دکھائی گئی تھی۔

یہ ایک عجیب و غریب تحریر تھی جسے پڑھ کر انسان دم بخود رہ جاتا تھا۔ اس میں یہ تجویز تھی کہ ہندوستان موجودہ ہندوستانی ریاستوں کا ایک شاندار نمونہ بنا دیا جائے اور اس کی وفاقی حکومت میں ان ریاستوں کے قدامت پسند نمائندوں کا اثر غالب ہو۔

مگر خود ان ریاستوں میں باہر والوں کا کوئی اثر نہ ہو اور وہاں بدستور خالص استبداد کا دور دورہ رہے۔ شہنشاہی کی اصل کڑیوں یعنی قرض کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہم ہمیشہ لندن کے صرافوں کے غلام رہیں اور ہمارے سکے اور زر کی پالیسی ریزرو بینک کے توسط سے بینک آف انگلینڈ کے ہاتھ میں رہے۔ تمام مستقل حقوق رکھنے والے طبقوں کی حفاظت اس طرح کی جائے کہ اس میں کوئی دست اندازی نہ ہو سکے بلکہ نئے مستقل حقوق رکھنے والے طبقے پیدا کیے جائیں عظیم الشان امپیریل سروسیز جن سے ہمیں دلی محبت ہے بدستور آزاد اور خود مختار رہیں تاکہ وہ ہمیں رفتہ رفتہ حکومت خود اختیاری کی تربیت دیں۔ صوبوں میں اختیاری حکومت ہو مگر گورنر ایک شخصی مختار کل کی حیثیت سے ہماری تادیب کرتا ہے۔ اور سب کے اوپر حاکموں کا حاکم، مختاروں کا مختار وائسرائے ہو جسے سفید دنیا کا اختیار حاصل ہو سچ پوچھیے تو برطانیہ کے حکمران طبقے کو نوآبادیوں پر حکومت کرنے کا جو ملکہ حاصل ہے اس کا کمال اس وہائٹ پیپر میں نظر آتا ہے۔ اور اگر مسٹر ہٹلر اور مسولینی جیسے لوگ ہندوستان کے وائسرائے پر رشک کریں تو کچھ بے جا نہیں۔

ہندوستان کو اس دستور کی زنجیروں میں جکڑنے کے بعد اوپر سے تمام "ذمہ داریوں" اور تحفظات کی بیڑیاں اس کے پیروں میں ڈال دی گئیں تاکہ یہ بدنصیب قیدی ہل جل بھی نہ سکے۔ بقول مسٹر نویل چیمبرلین کے حکومت برطانیہ نے انتہائی کوشش سے ان تجویزوں کے ساتھ ان تمام تحفظات کو شامل کر دیا ہے جو انسان کی عقل سوچ سکتی تھی۔

پھر ہمیں یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ ان عنایات کے بدلے میں ہمیں ایک بھاری رقم ادا کرنی پڑے گی یعنی چند کروڑ یکمشت اور کچھ سالانہ قسطیں۔ ظاہر ہے کہ سوراج کی برکتیں بغیر معقول قیمت دیئے ہوئے کیونکر حاصل ہو سکتی ہیں۔ ہم اس دھوکے میں تھے کہ ہندوستان ایک غریب ملک ہے اور بھاری بوجھ میں دبا ہوا ہے اور ہمیں امید تھی کہ جب آزادی ملے گی تو یہ بوجھ ہلکا ہو جائے گا مگر اب معلوم ہوا کہ نہیں یہ تو اور بڑھ جائے گا۔

ہندوستان کے مسئلہ کا یہ مضحکہ خیز حل اس متانت کے ساتھ پیش کیا گیا جو برطانوی قوم کے حصے میں آئی ہے اور ہم سے کہا گیا کہ دیکھو تمہارے حکمراں کس قدر فیاض ہیں۔ آج تک کسی شہنشاہی حکومت نے کسی محکوم قوم کو اتنے اختیارات اور حقوق اپنی خوشی سے نہ دیے ہوں گے۔ انگلستان میں ان سنجیدہ داناؤں میں اور ان لوگوں میں جو اس سخاوت کو دیکھ کر دہشت زدہ ہو گئے تھے اور اس کی مخالفت کر رہے تھے بڑی بڑی بحثیں ہوئیں۔ اس آمد و رفت کا جو ہندوستان اور انگلستان کے درمیان تین سال سے ہو رہی تھی۔ تین گول میز کانفرنسوں اور بے شمار کمیٹیوں کا یہ نتیجہ تھا۔

مگر انگلستان جانے کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ برطانوی پارلیمنٹ کی جوائنٹ سلیکٹ کمیٹی وھائٹ پیپر کا فیصلہ کرنے کے لئے بیٹھی تھی اور ہندوستانی اسیسران اور گواہوں کی حیثیت سے بلائے جا رہے تھے۔ اس کے علاوہ کئی اور کمیٹیوں کا اجلاس لندن میں ہو رہا تھا۔ اور ہمارے ملک میں پس پردہ لوگ ان کمیٹیوں کی ممبری کے لئے لڑ رہے تھے تاکہ لندن کا ٹکٹ مفت میں مل جائے اور مرکز سلطنت کی زیارت کا موقع نصیب ہو۔ وھائٹ پیپر کی دل شکن تجویزیں ان سورماؤں کی ہمت کو پست نہیں کر سکیں اور وہ سمندر اور ہوا کے سفر کی جوکھم اٹھانے اور لندن کے قیام کے شدید خطروں کا مقابلہ کرنے کو تیار ہو گئے تاکہ اپنی خطابت اور جادو بیانی کے زور سے ان تجویزوں کو بدلوانے کی کوشش کریں۔ وہ یہ جانتے تھے اور کہتے بھی تھے کہ کام بڑا دشوار اور مایوس کن ہے مگر وہ میدان سے ہٹنے والے نہ تھے اور اس پر تلے ہوئے تھے کہ کوئی مانے یا نہ مانے ہم اپنی کہے جائیں گے ان میں سے ایک صاحب جو لبرل پارٹی کے لیڈر تھے اور سب لوگوں کے واپس آنے کے بعد بھی جمے رہے اور لندن کے ارباب اقتدار سے ملاقات پر ملاقات کرتے رہے اور ان کے ساتھ ڈنر پر ڈنر کھاتے رہے تاکہ خوب اچھی طرح ان کے ذہن نشین کر دیں کہ وہ کیا سیاسی تبدیلیاں چاہتے ہیں جب وہ خدا خدا کر کے وطن لوٹے تو انھوں نے پبلک سے جو ان کے

انتظار میں بے چین تھی، یہ فرمایا کہ وہ مرہٹوں کی شہرہ آفاق پارٹی کے ساتھ لندن میں ڈٹے رہے اور آخر وقت تک اپنے مطالبات کو دہراتے رہے۔

مجھے یاد ہے کہ میرے والد اکثر کہا کرتے تھے کہ ان کے تعاونی دوست ظرافت کی حس مطلق نہیں رکھتے۔ بارہا ایسا ہوا کہ انھوں نے مذاق میں کوئی بات کہی جس سے یہ حضرات محظوظ ہونے کے بجائے بگڑ بیٹھے اور والد کو اپنا مطلب سمجھانا پڑا اور ان کی تالیف قلوب کرنی پڑی۔ ظاہر ہے کہ اس سے انھیں بڑی کوفت ہوتی تھی۔ مجھے یہ شکایت سن کر مرہٹوں کے قابل قدر سپاہیانہ جوش کا دھیان آتا تھا جس کا اظہار نہ صرف پچھلے زمانہ میں ہوا بلکہ آج بھی ہماری قومی جنگ میں ہو رہا ہے اور تلک کی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی تھی جو دنیا کی کسی قوت سے نہیں ڈرتا تھا۔ جس کا سر کٹ جائے مگر جھکنا نہ تھا۔

لبرل وھائٹ پیپر کے دل سے مخالف تھے۔ اور انھیں وہ جبر و تشدد بھی پسند نہ تھا جو آئے دن ہندوستان میں ہوتا رہتا تھا بلکہ ایک آدھ بار انھوں نے اس کے خلاف احتجاج بھی کیا اور اس کے ساتھ یہ بھی جتا دیا کہ وہ کانگریس اور اس کی جدوجہد کو برا سمجھتے ہیں کبھی کبھی وہ حکومت کو کسی بڑے کانگریسی لیڈر کی رہائی کا مشورہ دیتے تھے اور ان کی مساعی صرف چند افراد تک محدود تھی جن کی ان سے ملاقات تھی۔ لبرل اور تعاونی دونوں جو دلیل پیش کرتے تھے وہ یہ تھی کہ فلاں شخص رہا کر دیا جائے کیونکہ اب امن عامہ کے لئے کوئی خطرہ نہیں ہے اور پھر حکومت کو ہر وقت اختیار ہے کہ اگر وہ اور کوئی شرارت کریں تو انھیں دوبارہ گرفتار کر لے۔ اس وقت حکومت کا یہ فعل زیادہ قرین انصاف ہوگا۔ انگلستان کے بعض حضرات بھی از راہ عنایت ورکنگ کمیٹی کے بعض ممبروں اور چند خاص افراد کی رہائی کی تحریک کرتے تھے اور یہی دلیلیں پیش کرتے تھے۔ یہ کیونکر ممکن تھا کہ ہم ان حضرات کے شکرگزار نہ ہوں جو اسیری میں ہمارے پرسان حال تھے مگر بعض وقت یہ خیال آتا تھا کہ ہمارے یہ مہربان اگر ہم پر احسان جتایا نہ کرتے تو یہ احسان ہوتا۔ ہمیں ان کے خلوص نیت میں

مطلق شبہ نہ تھا مگر صاف ظاہر تھا کہ یہ سراسر برطانوی حکومت کے خیالات سے متاثر ہیں اور ہمارے اور ان کے درمیان میں بہت بڑا خلیج حائل ہے۔

لبرل حکومت کی بہت سی کارروائیوں کو ناپسند کرتے تھے اور انہیں بہت رنج ہوتا تھا مگر وہ بے چارے کر ہی کیا سکتے تھے۔ حکومت کے خلاف کوئی مؤثر جدوجہد کرنا تو ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتا تھا۔ اپنی جداگانہ حیثیت کو قائم رکھنے کے لئے انہیں عام لوگوں سے اور عملی جدوجہد کرنے والوں سے دور ہٹنا پڑا اور اپنی پالیسی زیادہ معتدل کرنی پڑی۔ یہاں تک کہ ان کے اور حکومت کے خیالات میں کوئی فرق نہیں رہا۔ ان کی تعداد بہت کم تھی اور عام لوگوں پر ان کا کوئی اثر نہیں تھا۔ اس لئے ان کے الگ رہنے سے قومی تحریک کو کوئی ظاہری نقصان نہیں پہنچا۔ مگر ان میں بعض مشہور اور ممتاز اشخاص تھے جن کی ذاتی حیثیت سے بڑی قدر و منزلت تھی۔ ان بزرگوں نے اور بہ حیثیت مجموعی لبرل اور اعتدالی پارٹی نے اس نازک وقت میں سرکاری پالیسی کی اخلاقی مدد کر کے برطانوی حکومت کی زبردست خدمت کی۔ حکومت کے جبر و تشدد اور بے آئینی کو بھی اس سے بڑی شہ ملی کہ ان لوگوں نے اس کی کوئی مؤثر مخالفت نہیں کی بلکہ لبرل پارٹی نے تو کبھی کبھی پسندیدگی کا اظہار بھی کیا۔ غرض لبرل اور اعتدالی جماعت نے اس بے تحاشہ جبر و استبداد کی جو ملک میں ہو رہا تھا اخلاقی تائید کی جب کہ خود حکومت کے لئے اس کو جائز ثابت کرنا مشکل ہو گیا تھا۔

لبرل لیڈر یہ فرماتے تھے کہ وہائٹ پیپر برا ہے، بہت برا ہے مگر دیکھنا یہ تھا کہ وہ کرتے کیا ہیں۔ لبرل فیڈریشن کا جو جلسہ اپریل ۱۹۳۳ء میں کلکتہ میں ہوا اس میں سب سے ممتاز لبرل لیڈر سری نواس شاستری صاحب نے اس بات پر زور دیا کہ دستور اساسی کی تبدیلیاں خواہ کتنی ہی ناقابل اطمینان کیوں نہ ہوں ہمارے لئے یہی مناسب ہے کہ ہم ان کو عمل میں لائیں۔ انہوں نے کہا کہ "یہ اس کا وقت نہیں ہے کہ ہم چپ چاپ کھڑے رہیں اور کچھ نہ کریں۔" ان کے ذہن میں عمل کا صرف ایک ہی تصور تھا اور وہ یہ تھا کہ جو ملے اسے قبول کر لیں اور اس پر

عمل درآمد کریں۔ ان کے خیال میں دوسری صورت بھی ہو سکتی تھی کہ کچھ نہ کیا جائے۔ آگے چل کر انھوں نے فرمایا کہ اگر ہم عقل، تجربہ، اعتدال رکھتے ہیں۔ اگر ہم میں خاموشی سے دوسروں پر اثر ڈالنے کی صلاحیت، ان کی رائے بدلنے کی قوت اور حقیقی قابلیت ہے تو یہی موقع ہے جب ہمیں اپنی خدمات کا پورا پورا ثبوت دینا چاہیے۔" بقول کسی کے اخبار نویسوں کے یہ پرزور دلکش الفاظ کا ایک طلسم تھا۔"

خطابت مسٹر شاستری کا حصہ ہے۔ سب خطیبوں کی طرح انہیں بھی عمدہ عمدہ الفاظ کو خوش الحانی سے ادا کرنے کا شوق ہے۔ مگر وہ اکثر اپنے جوش کی رو میں بہہ جاتے ہیں۔ اور جو الفاظ کا طلسم وہ باندھتے ہیں اس میں وہ بھی اس طرح گم ہو جاتے ہیں کہ انہیں پتہ چلتا ہے نہ دوسروں کو۔ اگر ہم ان کے اس اپیل پر جو انھوں نے اپریل ۳۲ء میں سول نافرمانی کے دوران میں کلکتہ میں کیا تھا تنقیدی نظر ڈالیں تو فائدے سے خالی نہ ہوگا۔ بنیادی اصول و مقاصد سے قطع نظر کر کے جو دو باتیں قابل غور معلوم ہوتی ہیں اول یہ کہ ان کے خیال میں خواہ برطانوی حکومت ہمیں کتنا ہی ذلیل کرے۔ لیکن وہ ہمیں اس کی اطاعت سے انحراف نہیں کرنا چاہیے۔ کوئی ایسی حد نہیں مقرر کی جا سکتی جس کے آگے ہمیں نہ بڑھنا چاہیے۔ کمزور سے کمزور مظلوم بھی ایک وقت تنگ آکر ظالم سے لڑنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ مگر مسٹر شاستری کے مشورے کے مطابق ہندوستانیوں کو کبھی اس کا خیال بھی نہیں کرنا چاہیے۔ گویا ان کے نزدیک برطانوی حکومت کی اطاعت اور اس کے احکام کی تعمیل ایک مذہبی فریضہ ہے (یہ لفظ یہاں موزوں نہیں مگر مجبوراً استعمال کرنا پڑا) یہ نوشتہ تقدیر ہے جو ہمیں چار و ناچار پورا کرنا ہے۔

یہ یاد رہے کہ وہ یہ مشورے کسی خاص صورت حالات کے متعلق نہیں دے رہے تھے "دستور اساسی کی تبدیلیاں" ابھی تک زیر غور تھیں۔ اگرچہ لوگوں کو یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ بہت ناقص ہوں گی۔ وہ یہ کہتے تو ایک بات بھی تھی کہ گو وہ حالات پیہم

کی تجاویز ناقص ہوں لیکن میں تمام حالات کے لحاظ سے یہی مناسب سمجھتا ہوں کہ اگر وہ قانون کی شکل اختیار کرلیں تو ہمیں چاروناچار ان پر عمل کرنا چاہیے۔ اس صورت میں خواہ ان کا مشورہ اچھا سمجھا جاتا یا بُرا مگر وہ واقعات کے مطابق ہوتا مگر شاستری صاحب تو اس سے کہیں آگے بڑھ گئے۔ ان کا ارشاد تھا کہ خواہ یہ تبدیلیاں کتنی ہی بری کیوں نہ ہوں ہمیں بہرحال قبول کرلینی چاہئیں۔ وہ اس سلسلے میں جو قومی نقطۂ نظر سے انتہائی اہمیت رکھتا تھا اور برطانوی حکومت کو سیاہ و سفید کا اختیار دینے کو تیار تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کس طرح کوئی شخص یا جماعت نامعلوم مستقبل کے متعلق دوسروں کے فیصلہ کو پہلے سے قبول کرسکتی ہے۔ یہ تو تب ہی ہوسکتا ہے جب وہ مطلق کوئی اصول یا اخلاقی اور سیاسی معیار نہ رکھتی ہو اور اس کا دین و ایمان یہی ہو کہ حاکم کے حکم پر آنکھ بند کرکے عمل کرنا چاہئے۔

دوسری قابل غور بات یہ ہے کہ اس وقت مصلحت کا مقتضا کیا تھا۔ وھائٹ پیپر صرف پہلا مرحلہ تھا۔ اور ابھی ان تجویزوں کے قانون بننے میں بہت سے مرحلے باقی تھے اس میں شک نہیں کہ حکومت کے نقطۂ نظر سے وھائٹ پیپر کی منزل بہت اہم تھی مگر بہرحال ابھی اسے بہت سی منزلوں سے گزرنا تھا۔ اور یہ ممکن تھا کہ اس دوران میں اس میں اچھی یا بری تبدیلیاں ہوسکیں۔ ظاہر ہے کہ یہ تبدیلیاں اس بات پر منحصر تھیں کہ برطانوی حکومت اور پارلیمنٹ پر مختلف فریقوں کی طرف سے کس حد تک دباؤ پڑتا ہے یہ بات بعید از قیاس نہ تھی کہ حکومت اس کشمکش میں ہندوستانی لبرل پارٹی کو اپنی طرف کھینچنے کے لئے ان تجاویز کو کچھ بہتر بنا دے یا کم سے کم بدتر بنانے سے باز رہے مگر ابھی اصلاحات کے قبول کرنے یا رد کرنے کا سوال اٹھنے بھی نہ پایا تھا کہ مسٹر شاستری نے زور شور سے یہ اعلان کردیا اور حکومت پر ظاہر ہوگیا کہ ہندوستانی لبرل پارٹی کا لحاظ کرنے کی ضرورت نہیں۔ انھیں اپنی طرف کھینچنے کا

تو کوئی سوال ہی نہ تھا۔ وہ خود بخود کھنچے چلے آتے تھے۔ اور اگر حکومت انھیں دھکا دے کر نکالنا چاہتی تب بھی نہ نکلتے۔ جہاں تک میں اس معاملہ پر خود لبرل پارٹی کے نقطۂ نظر سے غور کر سکتا ہوں مجھے یہی نظر آتا ہے کہ مسٹر شاستری کی کلکتہ کی تقریر بالکل خلاف مصلحت اور لبرل جماعت کے مقاصد کے لئے مضر تھی۔

میں نے مسٹر شاستری کی پرانی تقریر پر تفصیلی بحث اس وجہ سے نہیں کی کہ بجائے خود یہ تقریر یا لبرل فیڈریشن کا جلسہ کوئی اہمیت رکھتا تھا بلکہ اس وجہ سے کہ میں لبرل لیڈروں کی ذہنیت کو سمجھتا ہوں۔ یہ لائق اور قابل قدر لوگ ہیں۔ مگر انتہائی کوشش کے باوجود میری سمجھ میں نہیں آتا کہ انھوں نے یہ طرز عمل کیوں اختیار کیا ہے۔ مسٹر شاستری کی ایک اور تقریر کا بھی جو میں نے جیل میں پڑھی تھی مجھ پر بہت اثر ہوا۔ جون ۱۹۳۴ء میں وہ پونا میں سرونٹ آف انڈیا سوسائٹی کے جلسے میں صدر کی حیثیت سے تقریر کر رہے تھے۔ اس میں انھوں نے یہ دکھایا کہ اگر برطانوی عملداری ہندوستان سے یکایک اٹھ جائے تو کس قدر خطرے پیدا ہو جائیں گے اور سیاسی تحریکیں باہمی نفرت اور ایک دوسرے پر جبر و تشدد کر کے کیا آفت برپا کر دیں گی۔ بقول ان کے برطانیہ کی سیاسی زندگی ہمیشہ رواداری پر مبنی رہی ہے۔ اس لئے اگر ہندوستان کی آیندہ نشو و نما برطانیہ کے اتحاد عمل سے ہو تو یہاں رواداری پیدا ہونے کی زیادہ امید ہو سکتی ہے۔ جیل میں ہونے کی وجہ سے میرے پاس اس تقریر کا ماخذ صرف اس کا وہ خلاصہ تھا جو کلکتہ کے سٹیٹسمین میں شائع ہوا۔ اس پر اسٹیٹسمین نے یہ لکھا کہ "یہ بڑا دل خوش کن نظریہ ہے اور ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ڈاکٹر موینجے نے بھی حال میں اسی قسم کی تقریریں کی ہیں" اپنی تقریر کے آخر میں مسٹر شاستری نے اس کا ذکر کیا کہ روس، اٹلی، اور جرمنی میں رعایا کی آزادی سلب کر لی گئی ہے اور ان پر وحشیانہ مظالم ہو رہے ہیں۔

اس کو پڑھ کر مجھے یہ خیال آیا کہ برطانیہ اور ہندوستان کے تعلقات کے بارے میں مسٹر شاستری کا خیال برطانیہ کے انتہائی قدامت پرست جماعت سے کس قدر حیرت انگیز مشابہت رکھتا ہے۔ دونوں میں کچھ جزوی اختلافات ضرور ہیں مگر بنیادی خیال ایک ہی ہے۔ اگر مسٹر ونسٹن چرچل بھی بالکل انہیں الفاظ میں تقریر کرتے تو کوئی بات ان کے اصول کے خلاف نہ ہوتی۔ مسٹر شاستری ہماری لبرل پارٹی کے ترقی پسند فریق سے تعلق رکھتے ہیں اور اس کے سب سے قابل لیڈر ہیں۔

افسوس ہے کہ میں شاستری کے تاریخی نظریئے اور ان خیالات سے جو وہ تمالک عالم خصوصاً برطانیہ اور ہندوستان کے متعلق رکھتے ہیں مطلق اتفاق نہیں کر سکتا غالباً انگریزوں کے سوا کوئی شخص بھی ان کی تائید نہ کرے گا بلکہ بعض روشن خیال انگریز بھی ان سے متفق نہیں ہوں گے۔ شاستری صاحب میں یہ کمال ہے کہ وہ دنیا کو اور خود اپنے ملک کو برطانوی حکمرانوں کی متعصبانہ نظر سے دیکھتے ہیں۔ پھر بھی یہ تعجب کی بات ہے کہ انھوں نے اپنی تقریر میں ان غیر معمولی واقعات کا کوئی ذکر نہیں کیا جو پچھلے اٹھارہ مہینہ میں ہندوستان میں پیش آچکے تھے اور عین اس تقریر کے وقت پیش آرہے تھے انھوں نے روس، اٹلی اور جرمنی کے مظالم بیان کر ڈالے مگر خود اپنے ملک کے خوفناک جبر و تشدد اور ہر قسم کی قانونی آزادی کی پامالی کا نام تک نہ لیا۔ ممکن ہے کہ انھیں صوبہ سرحد کے ہولناک واقعات اور بنگال کے حالات جنھیں بابو راجندر پرشاد نے حال میں کانگریس کے خطبہ صدارت میں "قیامت بنگال" سے تعبیر کیا تھا، نہ معلوم ہوں۔ اس لئے کہ ان پر احتساب کا بھاری پردہ پڑا ہوا تھا۔ مگر کیا انھیں یہ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا کہ ہندوستان سخت مصیبت میں ہے اور ان کے ہم قوم ایک زبردست دشمن سے شدید جنگ میں مصروف ہیں جن پر ان کی موت اور زندگی کا انحصار ہے؟ کیا وہ یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ ملک کے بڑے بڑے طاقتوں میں

پولیس کا راج ہے۔ مارشل لا کی سی حالت ہے۔ تعزیری ضابطوں کی گرم بازاری ہے۔ لوگ جیل میں بھوک ہڑتال کر رہے ہیں اور طرح طرح کی تکلیفیں اٹھا رہے ہیں؟ کیا انھیں یہ محسوس نہیں ہوا کہ جس آزادی اور رواداری کے لئے وہ برطانیہ کی قصیدہ خوانی کر رہے تھے اسے خود برطانیہ ہندوستان میں کچل رہا ہے۔

اس سے کوئی بحث نہیں کہ وہ کانگریس سے متفق تھے یا نہیں تھے۔ انھیں اس کا پورا حق تھا کہ وہ کانگریس کی پالیسی پر تنقید کریں۔ اور اسے برا بھلا کہیں مگر سوال یہ ہے کہ کیا ایک ہندوستانی، ایک محب آزادی، ایک ذی حس انسان کی حیثیت سے ان پر اپنے ملک کے مردوں اور عورتوں کی حیرت انگیز بہادری اور قربانی کا کچھ اثر نہیں ہوا؟ کیا انھیں یہ دیکھ کر مطلق تکلیف نہیں ہوتی کہ ہمارے حکمران ہندوستان کے دل پر آرے چلا رہے ہیں؟ کیا انھیں اس پر کوئی جوش نہیں آیا کہ بیسیوں ہزار آدمی ایک زبردست سلطنت کی قوت کے آگے جھکنے اور اپنی روح کو ہلاک کرنے سے یہ بہتر سمجھتے ہیں کہ ان کے جسم روند ڈالے جائیں۔ ان کے گھر برباد ہو جائیں اور ان کے پیارے دنیا بھر کی تکلیفیں سہیں؟ ہم لوگ جیل میں اور جیل سے باہر صبر کا اظہار کرتے تھے ہنستے تھے اور مسکراتے تھے۔ مگر اکثر تبسم کے ساتھ ہماری آنکھوں میں آنسو جھلک آتے تھے اور کبھی کبھی ہمارا ہنسنا رونے سے مشابہ ہوتا تھا۔

ایک بہادر اور فراخ دل انگریز مسٹر بریلسفورڈ نے ان تاثرات کا ذکر کیا ہے جو اس منظر سے اس کے دل میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ ۱۹۳۱ء کے متعلق لکھتے ہیں "ایک قوم کی قوم کو اپنی ذہنی غلامی کی زنجیریں توڑتے ہوئے اور عزم و استقلال کی بلندی پر چڑھتے ہوئے دیکھنا ایک عجیب و غریب تجربہ تھا" اور ایک موقع پر "ستیاگرہ کی تحریک میں کانگریس کے اکثر والنٹیروں کا وہ حیرت انگیز انضباط جس کا ایک صوبے کے گورنر نے فراخ دلی سے اعتراف کیا ہے ......

مسٹر سری نواس شاستری ایک قابل قدر اور ذوحس آدمی ہیں اور ان کے ہم وطن ان کی بڑی عزت کرتے ہیں۔ کسی طرح یقین نہیں آتا کہ ان کے دل پر اثر نہیں ہوا اور انھیں اس تحریک میں اپنے ہم وطنوں سے ہمدردی نہ تھی۔ ان سے یہ توقع تھی کہ ان کی آواز اس جبر و تشدد کے خلاف اٹھے گی۔ جس کے ذریعے حکومت تمام قانونی حقوق کو پامال کر رہی تھی اور ہر قسم کی پبلک جد و جہد کو روک رہی تھی۔ یہ امید تھی کہ وہ اور ان کے رفیق خود مصیبت زدہ علاقوں، یعنی صوبہ سرحد اور بنگال میں جائیں گے اس لیے نہیں کہ کانگریس یا سول نافرمانی کو مدد دیں گے بلکہ اس لئے کہ حکام اور پولس کی زیادتیوں کا پردہ فاش کر کے انھیں روکیں۔ دوسرے ملکوں میں سیاسی اور مدنی آزادی کے حامی عموماً یہی کرتے ہیں۔ مگر بجائے اس کے کہ وہ عاملہ کے استبداد کو روکتے جو ہندوستان کے مردوں اور عورتوں کو کچل رہا تھا۔ اور جس نے انھیں معمولی حقوق سے بھی محروم کر دیا تھا۔ یا کم سے کم حقیقت حال سے واقفیت حاصل کرتے، انھوں نے برطانوی حکومت کو حمایت، آزادی اور رواداری کی سند دے دی۔ عین اسی وقت جب یہ خوبیاں ہندوستان کی برطانوی حکومت میں نام کو بھی نہ تھیں اپنی اخلاقی تائید سے انھوں نے حکومت کی ہمت افزائی کی اور اس کے استبداد کو تقویت پہنچائی۔

مجھے یقین ہے کہ ان کی نیت یہ نہ ہوگی اور انھیں اپنے طرز عمل کے نتائج کا اندازہ نہیں ہوا ہوگا مگر اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ ان کی تقریر کا یہی اثر ہوا۔ سوال یہ ہے کہ آخر کہ ان کے یہ خیالات اور یہ عمل کیوں ہے؟۔

مجھے اس سوال کا کوئی جواب نہیں ملا۔ سوا اس کے کہ لبرل پارٹی نے اپنے ہم وطنوں سے اور جدید خیالات سے بالکل قطع تعلق کر لیا ہے۔ جو فرسودہ کتابیں انھوں نے پڑھی ہیں ان کی بدولت ہندوستانیوں کے حالات اور خیالات ان کی

نظر سے چھپ گئے ہیں اور وہ خود پرستی میں مبتلا ہو کر رہ گئے ہیں۔ ہم جیل میں گئے اور ہمارے جسم کال کوٹھری میں بند رہے مگر ہمارے ذہن قید سے آزاد، ہماری روحیں ہیبت اور دہشت سے بری رہیں۔ مگر انھوں نے اپنے ہاتھوں اپنے لئے ایک ذہنی قید خانہ بنا لیا جس میں وہ بھٹکتے پھرتے ہیں۔ مگر نجات کی کوئی صورت نہیں پاتے۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ ہر چیز جیسی اب ہے ویسی ہی رہنی چاہیے۔ مگر جب حالات بدلے، جیسا کہ اس بدلنے والی دنیا کا دستور ہے تو ان کی بے پتوار کی کشتی ڈگمگانے لگی۔ وہ جسمانی اور ذہنی حیثیت سے بے بس ہو کر رہ گئے۔ نہ ان کا کوئی نصب العین رہا اور نہ اخلاقی معیار۔ ہم میں سے ہر شخص کو دو چیزوں میں سے ایک چیز اختیار کرنی ہے۔ یا خود قدم بڑھائے یا دھکے دے کر آگے بڑھایا جائے اس حرکت پذیر دنیا میں کوئی ساکن نہیں رہ سکتا۔ ہمارے لبرل حرکت اور تغیر سے ڈرتے تھے۔ اس لئے وہ اس طوفان کو دیکھ کر جو چاروں طرف سے اٹھ رہا تھا بدحواس ہو گئے۔ ان میں اتنی طاقت نہ تھی کہ موجوں کو چیر کر آگے بڑھیں اس لئے ڈبکیاں کھانے لگے اور جو تنکا سامنے آ گیا اس کا سہارا ڈھونڈھنے لگے۔ ہندستان کی سیاست میں ان کی حیثیت شکسپیر کے ہاملٹ کی سی ہو گئی "جس کے چہرے پر فکر کی زردی چھائی رہتی تھی" اور وہ شک، ہچکچاہٹ اور تذبذب کا شکار ہو کر رہ گئے۔

"زمانے کا شیرازہ بکھر گیا، بُرا ہو تقدیر کی ستم ظریفی کا
جس نے مجھے اس سمیٹنے کے لئے پیدا کیا"

سرونٹ آف انڈیا نے جو لبرل جماعت کا ہفتہ وار اخبار ہے سول نافرمانی کے آخری دنوں میں کانگریس والوں پر یہ الزام لگایا کہ وہ خود ہی جیل جاتے ہیں اور پھر چاہتے ہیں کہ رہا کر دئے جائیں۔ وہ اس پر خفا تھا کہ کانگریس کی لے دے کے یہی ایک پالیسی رہ گئی ہے۔ اور لبرل جماعت کی پالیسی کیا تھی؟ برطانی وزیروں کی

خدمت میں ڈیپوٹیشن بھیجنا اور دعائیں مانگتے رہنا کہ انگلستان میں حکومت بدل جائے۔

یہ ایک حد تک صحیح ہے کہ کانگریس کی پالیسی ان دنوں زیادہ تر یہی تھی کہ لوگ تعزیری ضابطوں کی خلاف ورزی کرکے جیل جائیں اور یہ بھی صحیح ہے کہ قوم ایک مدت تک لڑتے لڑتے پست ہو گئی تھی اور حکومت پر کچھ زیادہ دباؤ نہیں ڈال سکتی تھی مگر یہ پالیسی اخلاقی اور عملی مصلحتوں پر مبنی تھی۔

کھلا ہوا استبداد جو ان دنوں ہندوستان میں ہو رہا تھا حکومت کو بہت مہنگا پڑتا تھا۔ خود اس کے لئے بھی یہ بڑی تکلیف دہ اور پریشان آزمائش تھی اور وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ یہ پالیسی آخر میں اس کی حکومت کی بنیادوں کو کمزور کر دے گی۔ اس سے نہ صرف ہندوستانی قوم بلکہ ساری دنیا کے سامنے اس کے طرز حکومت کا پردہ فاش ہو رہا تھا۔ وہ اسے بدرجہا بہتر سمجھتی تھی کہ اس کا آہنی پنجہ مخمل کے دستانے میں چھپا رہے۔ حکومت کے لئے اس سے زیادہ ناگوار اور اگر غور سے دیکھا جائے تو اس سے زیادہ مضر کوئی چیز نہیں کہ اسے ایسے لوگوں سے سابقہ پڑے جو کسی حال میں بھی اس کی مرضی کے آگے سر نہ جھکائیں اس لئے استبدادی قوانین کی خلاف ورزی کی متفرق اور منتشر کوششیں بھی فائدے سے خالی نہ تھیں ان سے قوم کو تقویت پہنچتی تھی اور حکومت کی ہمت پست ہوتی تھی۔

اخلاقی مصلحت اس سے بھی زیادہ اہم تھی۔ تھورو کا مشہور مقولہ ہے کہ "جب مرد اور عورتیں بے انصافی سے قید کی جا رہی ہوں تو ہر انصاف پسند مرد اور عورت کو قید خانے جانا چاہیے"۔ ممکن ہے کہ یہ مشورہ لبرل حضرات اور دوسرے بزرگوں کو پسند نہ آئے لیکن ہم میں سے اکثر لوگوں کا یہی خیال ہے کہ موجودہ حالات میں اخلاقی زندگی "ناقابل برداشت" ہے۔ جبکہ سول نافرمانی کے علاوہ یوں بھی ہمارے اکثر رفیق قید فرنگ میں گرفتار رہتے ہیں اور حکومت کے استبداد کا نظام ہمیں ہر وقت دباتا

ہماری قوم کو رہتا ہے۔ ہم اپنے ملک میں مشتبہ لوگوں کی سی زندگی بسر کرتے ہیں ہر وقت ہماری نقل وحرکت کی نگرانی ہوتی رہتی ہے، ہر لفظ جو ہماری زبان سے نکلتا ہے قلمبند کر لیا جاتا ہے کہ کہیں اس میں ہم کسی قانون بغاوت کی خلاف ورزی نہ ہو، ہمارے خطوط کھول لیئے جاتے ہیں اور ہمیں ہر وقت یہ کھٹکا لگا رہتا ہے کہ عاملانہ حکم امتناعی یا گرفتاری کا پروانہ آرہا ہو۔ ہمارے سامنے دو ہی صورتیں ہیں۔ یا تو حکومت کی قوت کے آگے سر جھکا دیں، روحانی ذلت اختیار کر لیں۔ اپنے ضمیر کا گلا گھونٹ دیں۔ اپنی اخلاقی دولت کو ادنیٰ اغراض کے بدلے بیچ ڈالیں یا مخالفت کریں اور اس کی سزا بھگتیں۔ کوئی شخص خوشی سے جیل جانا یا تکلیف اٹھانا نہیں چاہتا مگر اکثر جیل جانا ذلت کی زندگی بسر کرنے سے بہتر ہوتا ہے بہ قول برنارڈ شا کے "زندگی کی حقیقی مصیبت یہ ہے کہ انسان پرستوں کے ہاتھوں میں ان اغراض کا آلہ کار بن کر ہے جن کو وہ ادنیٰ اور ذلیل جانتا ہے اور جتنی مصیبتیں ہیں وہ زیادہ سے زیادہ بدقسمتی اور تقدیری حادثات کا حکم رکھتی ہیں یہی ایک چیز ہے جو شامت غلامی اور دنیا کا دوزخ ہے!"

X

(۴۹)

طویل سزا کا خاتمہ

میری رہائی کا وقت قریب آرہا تھا۔ "نیک چلنی" کی بنا پر مجھے حسب معمول چھوٹ ملی تھی۔ اس لئے میری دو سال کی سزا میں ۳ ½ مہینے کی تخفیف ہو گئی تھی۔ رہائی کی توقع نے میرے سکونِ قلب میں خلل ڈال دیا تھا۔ یا یوں کہیے کہ وہ عام بے حسی جو جیل میں پیدا ہو جاتی ہے دُور ہو گئی تھی۔ باہر نکل کر مجھے کیا کرنا چاہیئے؟ یہ بڑا مشکل سوال تھا اور چونکہ اس کا کوئی جواب میری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ اس لئے رہائی کا سارا مزا کرکرا ہو گیا تھا۔ مگر یہ عارضی کیفیت تھی۔ جو بہت جلد گزر گئی۔ میرا امنگوں کا دبا ہوا جوشِ عمل اُبھر آیا۔ اور میں بے چینی سے رہائی کا انتظار کرنے لگا۔

جولائی ۱۹۳۳ء کے آخر میں یہ دردناک خبر آئی کہ ج م سین گپتا کا یکایک انتقال ہو گیا۔ ہم دونوں نہ صرف کانگرس کی ورکنگ کمیٹی میں برسوں سے ساتھ ساتھ کام کرتے رہے تھے۔ بلکہ میرے اور ان کے اس زمانے کے تعلقات تھے۔ جب میں کیمبرج میں پڑھتا تھا۔ وہیں پہلے پہل میری اُن کی ملاقات ہوتی تھی جب میں وہاں داخل ہوا تو وہ سند حاصل کر کے فارغ ہو چکے تھے۔

سین گپتا کا انتقال نظربندی کے دوران میں ہوا۔ ۱۹۳۲ء کے آغاز میں جب وہ یورپ سے واپس آئے۔ تو ابھی اُنھوں نے ساحل بمبئی پر قدم بھی نہ رکھا تھا کہ شاہی قیدی کی حیثیت سے گرفتار کر لئے گئے۔ اس وقت

سے وہ برابر قید یا نظر بند رہے اور اُن کی صحت خراب ہوتی گئی۔ حکومت نے انہیں بہت کچھ سہولتیں بہم پہنچائیں لیکن مرض برابر بڑھتا گیا۔ اُن کی آرتھی کے موقع پر کلکتہ میں ایک عظیم الشان مظاہرہ ہوا۔ اور بے شمار آدمیوں نے نذرِ عقیدت پیش کی۔ گویا مظلومِ بنگال کے گھٹے ہوئے جذبات کو کم سے کم عارضی طور پر نکاسس کا ایک راستہ مل گیا۔

غرض سین گپتا ہم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے۔ سوبھاش بوس بھی شاہی قیدی تھے۔ اور ان کی صحت بھی مدّتوں قید اور نظر بند رہنے سے خراب ہو گئی تھی، خدا خدا کر کے حکومت نے انھیں علاج کی غرض سے یورپ جانے کی اجازت دی۔ ہمارے پرانے اور آزمودہ کار لیڈر وٹھل بھائی پٹیل بھی یورپ میں بیمار پڑے ہوئے تھے۔ ان کے علاوہ اور نہ جانے کتنے جیل کی مصیبتوں اور باہر کی پیہم مصروفیتوں کی تاب نہ لا کر اس دنیا سے سدھار گئے، یا اپنی صحت کھو بیٹھے۔ پھر کتنے ایسے تھے جنہیں اگرچہ بظاہر کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ لیکن اس غیر طبعی زندگی کی وجہ سے ان کے دماغ میں خلل پیدا ہو گیا۔ اور ان کے نفس میں طرح طرح کی گرہیں پڑ گئیں۔

سین گپتا کی موت نے میری آنکھیں کھول دیں اور میں نے دیکھا کہ سارا ملک خاموشی سے انتہائی مصیبتیں اٹھا رہا ہے۔ مجھ پر افسردگی اور اداسی چھا گئی۔ اور میں اپنے دل میں سوچنے لگا کہ آخر یہ سب کس لئے؟

صحت کے معاملے میں، میں بڑا خوش قسمت ہوں۔ اگرچہ کانگریس کے کام میں مجھے سخت محنت کرنا پڑی اور میں نے نہایت بے ترتیب زندگی گذاری لیکن میری صحت ہمیشہ اچھی رہی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ میرے قویٰ خلقی طور پر بہت اچھے تھے۔ دوسرے یہ کہ میں اپنے جسم کی بڑی نگہداشت کرتا تھا۔

جس طرح میں بیماری اور کمزوری کو برا سمجھتا تھا اسی طرح موٹاپے کو بھی سخت ناپسند کرتا تھا۔ اس لیئے کافی ورزش، تازہ ہوا اور سادہ غذا کے ذریعے سے میں اُن دونوں سے محفوظ رہا۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ ہندوستان کے اوسط طبقے کی بہت سی بیماریوں کی وجہ غلط قسم کی غذا ہے۔ اس میں چکنائی اور ثقیل اجزا بہت ہوتے ہیں۔ اور مقدار میں بھی زیادہ ہوتی ہے۔ (یہ صرف ان لوگوں کا ذکر ہے جو اس اسراف کی مقدرت رکھتے ہیں) لاڈ کرنے والی ماں اپنے بچوں کو مٹھائیاں اور طرح طرح کی "چیزیں" ٹھونس ٹھونس کر کھلاتی ہے۔ اور ابتدا سے سوءِ ہضمی کا بیج بو دیتی ہے، جو پھر تمام عمر پیچھا نہیں چھوڑتی۔ اس کے علاوہ بچوں پر بہت سے کپڑے بھی لاد دیئے جاتے ہیں۔ ہندوستان آکر انگریزوں کی خوراک بھی بہت بڑھ جاتی ہے۔ اگرچہ ان کی غذا میں چکنائی اور ثقیل چیزوں کی اتنی بھرمار نہیں ہوتی، غالباً اب وہ اپنے اجداد کے مقابلہ میں کچھ سنبھل گئے ہیں، جو بہت بڑی مقدار میں گرم اور ثقیل غذا کھایا کرتے تھے۔

میں کبھی غذا کی اصلاح کے وہم میں نہیں پڑا صرف ثقیل غذاؤں سے، اور زیادہ کھانے سے پرہیز کرتا رہا، تقریب قریب تمام کشمیری برہمنوں کی طرح ہمارا خاندان بھی گوشت کھایا کرتا تھا۔ اس لیئے بچپن سے میں بھی گوشت کھاتا رہا۔ اگرچہ مجھے اس کا شوق نہ تھا۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں جب عدم تعاون کی تحریک شروع ہوئی۔ تو میں نے گوشت کھانا ترک کر دیا۔ اور نباتی غذا کا پابند ہو گیا۔ چھ برس تک میں نے گوشت نہیں کھایا۔ لیکن یورپ جا کر کھانے لگا۔ ہندوستان آکر پھر چھوڑ دیا۔ اور اُس وقت سے اب تک میں کم و بیش نباتی غذا کا پابند رہا ہوں۔ گوشت مجھے موافق آتا ہے۔ لیکن اب مجھے اس سے رغبت نہیں رہی ہے۔ بلکہ کراہت معلوم ہوتی ہے۔

۱۹۳۲ء میں جیل خانے میں کئی مہینہ تک مجھے روزانہ حرارت رہا کی، اس قسم کی خفیف علالتیں مجھے بہت ناگوار ہوتی تھیں، کیونکہ مجھے اپنی صحت پر جو گھمنڈ تھا اسے صدمہ پہنچتا تھا، قوتِ حیات اور جوشِ عمل کا جو تصور میرے پیش نظر رہا کرتا تھا۔ وہ اب قائم نہیں رہا۔ اور ضعیف اور انحطاط کا خیال مجھے ستانے لگا۔ میں سمجھتا ہوں کہ مجھے موت کا کچھ زیادہ خوف نہیں ہے۔ لیکن دماغ اور جسم کا آہستہ آہستہ گھلنا بالکل دوسری چیز تھی۔ لیکن میرا وہم غلط ثابت ہوا۔ میری طبیعت سنبھل گئی۔ اور میں نے اپنی صحت پر قابو پا لیا۔ جاڑوں میں دیر تک "دھوپ کا غسل" کرنے سے مجھے بہت فائدہ ہوا۔ اور مجھے پھر تندرستی کا احساس ہونے لگا۔ جس زمانے میں میرے جیل کے ساتھی کوٹ پہنے اور شال اوڑھے سردی سے کانپتے رہتے تھے۔ میں ننگا دھوپ میں بیٹھا رہتا تھا اور سورج کی خوشگوار گرمی کا لطف اُٹھاتا تھا۔ یہ چیز صرف جاڑے کے موسم اور وہ بھی شمالی ہند میں ممکن ہے۔ کیونکہ اور جگہ تو بہت سخت دھوپ پڑتی ہے۔

ورزشوں میں شرسن آسن میں مجھے خاص لطف آتا تھا۔ اس کی ترکیب یہ ہے کہ سر کے بل کھڑے ہو کر دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو آپس میں گونتھ کر اُن سے گردن کو سہارا دیا جائے۔ اور کہنیاں زمین پر ٹکی رہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ ورزش جسمانی صحت کے لئے بہت مفید ہے۔ لیکن میں اس لئے اسے زیادہ پسند کرتا تھا کہ مجھ پر اس کا نفسیاتی اثر بہت اچھا پڑتا تھا۔ اس کرتب سے جو کسی قدر مضحک تھا تفریح ہوتی تھی۔ اور زندگی کی خفیف الحرکاتی سے طبیعت زیادہ مانوس ہو جاتی تھی۔

افسردگی اور اُداسی کے دوروں میں جو جیل میں لازمی طور پر ہوتے

ہیں، صحت اور تندرستی کا یہ احساس بہت کم آتا تھا۔ اور اسی کی بدولت میں جیل کے اندر اور جیل کے باہر انت نئے حالات کے ساتھ نبھاتا رہا۔ مجھے بہت سے دھچکے پہنچے، جو اس وقت ناقابلِ برداشت معلوم ہوتے تھے۔ لیکن مجھے خود حیرت ہے کہ میں خلاف توقع ان سے بہت جلد سنبھل گیا۔ میرے دل و دماغ کی صحت اور اعتدال کا ایک ثبوت یہ ہے کہ نہ تو آج تک میرے سر میں درد ہوا، اور نہ کبھی بے خوابی کی شکایت ہوئی۔ تہذیب جدید کی ان عام بیماریوں سے اور ضعف بصارت سے بھی میں محفوظ رہا۔ اگرچہ میں کثرت سے پڑھتا لکھتا رہا ہوں اور وہ بھی بعض اوقات جیل کی دھندلی سی روشنی میں، مگر میری نظر اب تک کمزور نہیں ہوئی۔ پچھلے سال ایک امراض چشم کے ماہر کو اس پر سخت تعجب ہوا آٹھ سال پہلے انھوں نے یہ پیشینگوئی کی تھی کہ دو ایک سال کے اندر ہی تمہیں عینک کی ضرورت پڑ جائے گی۔ لیکن ان کی رائے غلط نکلی اور آج بھی میں بغیر عینک کے اچھی طرح سب کام کر سکتا ہوں۔ ممکن ہے ان باتوں سے لوگ مجھے نہایت معتدل اور محتاط سمجھنے لگیں۔ اس لئے میں کہہ دینا چاہتا ہوں کہ مجھے ان لوگوں سے سخت وحشت ہوتی ہے۔ جو کسی وقت اعتدال اور احتیاط کے دائرے سے باہر قدم نہیں رکھتے۔

اِدھر میں جیل میں اپنی رہائی کا منتظر تھا۔ اور ادھر ملک میں سول نافرمانی کی نئی صورت یعنی انفرادی نافرمانی شروع ہو رہی تھی۔ گاندھی جی نے خود اس کی ابتدا کی۔ اور حکام کو پہلے سے اطلاع دینے کے بعد یکم اگست کو گجرات کے کسانوں کو سول نافرمانی کی تلقین کرنے کے ارادہ سے روانہ ہوگئے۔ انہیں فوراً گرفتار کر کے ایک سال کی سزا کردی گئی۔ اور پھر یرودا جیل بھیج دیئے گئے۔ مجھے ان کے

دوبارہ جیل جانے سے خوشی ہوئی۔ لیکن اس کے بعد ہی ایک نئی پیچیدگی پیدا ہوگئی۔ گاندھی جی نے اصرار کیا کہ مجھے جیل میں بھی ہریجن اُدّھار کا کام کرنے کی وہی سہولتیں ملنا چاہئیں، جو باہر حاصل تھیں۔ لیکن حکومت نے صاف انکار کر دیا۔ یکایک ہمیں اطلاع ملی کہ گاندھی جی نے پھر اس سلسلے میں برت شروع کر دیا ہے۔ ہمیں تو یہ بات عجیب و غریب معلوم ہوئی کہ اتنی چھوٹی سی بات کے لئے اتنا بڑا قدم اٹھایا جائے۔ چاہے حکومت کے مقابلے میں ان کی دلیلیں کتنی ہی صحیح کیوں نہ ہوں۔ پھر بھی ان کا یہ فیصلہ میری سمجھ سے باہر تھا۔ لیکن ہم بالکل بے بس تھے۔ اور حیرت کے عالم میں حالات کی رفتار کو دیکھ رہے تھے۔

ایک ہفتے کے بعد ان کی حالت بڑی تیزی سے خراب ہونا شروع ہوئی اس لئے وہ جیل سے اسپتال پہنچا دیئے گئے۔ لیکن یہاں بھی وہ قیدی کی حیثیت سے تھے۔ اور حکومت انہیں ہریجن اُدّھار کے کام میں کوئی سہولتیں بہم پہنچانے کو تیار نہ تھی۔ پچھلے برتوں میں انھوں نے عزم حیات کو نہیں چھوڑا تھا۔ مگر اب کی بار انھوں نے بالکل کندھا ڈال دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ بس چند دن کے مہمان ہیں۔ انھوں نے سب کو الوداع کہا۔ اور ان چند چیزوں کے متعلق جو اسپتال میں ان کے پاس تھیں وصیت بھی کر دی۔ ان میں سے بعض چیزیں نرسوں کو دیں۔ لیکن حکومت کب چاہتی تھی کہ ان کی موت کا الزام اس کے سر آئے۔ اس لئے اسی روز شام کو یکایک وہ رہا کر دیئے گئے۔ یہ رہائی عین وقت پر ہوئی۔ اگر ایک دن بھی دیر ہو جاتی تو بس کام تمام تھا۔ اُن کی جان بچانے کا سہرا اصل میں سی۔ ف۔ انڈریوز کے سر ہے۔ جو گاندھی جی کے حکم کے خلاف ہندوستان بھاگے ہوئے آئے۔

اسی عرصہ میں میں ۲۳ اگست کو دہرہ دون جیل سے ملینی جیل میں تبدیل کیا گیا۔ کوئی ڈیڑھ برس دوسرے جیلوں میں رہنے کے بعد میں یہاں واپس آیا تھا۔ اسی وقت مجھے اطلاع ملی کہ میری ماں سخت بیمار ہیں۔ اور ہسپتال پہنچا دی گئی ہیں۔ چونکہ ان کی حالت نازک تھی۔ اس لیئے میں ۳۰ اگست کو رہا کر دیا گیا ویسے میری میعاد ۱۲ ستمبر کو ختم ہونی تھی۔ غیر معمولی حالات کی وجہ سے صوبے کی حکومت نے میرے ساتھ ۱۳ دن کی اور رعایت کر دی۔

(۵۰)

گاندھی جی سے ملاقات

رہائی کے بعد میں سیدھا اپنی بیمار ماں کے پاس لکھنؤ گیا، اور چند روز اُن کے پاس رہا۔ بہت عرصے کے بعد جیل سے باہر نکلا تھا۔ اس لئے اپنے ماحول سے بیگانگی سی محسوس کرتا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر کچھ صدمہ سا ہوا کہ دنیا رنگ بدلتی ہوئی بہت آگے بڑھ گئی تھی اور میں جیل میں پڑا سڑتا رہا۔ جیل سے باہر نکل کر سب پر یہی کیفیت گذرتی ہے۔ ہم باہر آ کر دیکھتے ہیں کہ وہ ننھے بچے، لڑکے اور لڑکیاں جنہیں ہم بہت چھوٹا چھوڑ گئے تھے۔ اب ماشاء اللہ بڑے ہو گئے ہیں۔ بہت سی شادیاں ولادتیں اور موتیں ہو چکی ہیں۔ دنیا محنت اور نفرت، کام اور کھیل، الم و راحت کے بہت سے منظر دیکھ چکی ہے۔ زندگی کی نئی نئی دلچسپیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ بحث کے نئے نئے موضوع اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ غرض میں جو کچھ سنتا یا دیکھتا تھا، اس میں میرے لئے حیرت کا کچھ نہ کچھ سامان ضرور ہوتا تھا۔ جیسے زندگی مجھے جہالت کے گڑھے میں چھوڑ کر آگے بڑھ گئی ہے۔ یہ کوئی خوش گوار خیال نہ تھا۔ یہ ممکن تھا کہ میں بہت جلد اپنے ماحول سے ہم آہنگی اور مطابقت پیدا کر لیتا۔ لیکن میں نے اس کی کوئی ضرورت نہیں سمجھی۔ میں نے خیال کیا کہ مجھے صرف چند روز جیل کے باہر رہنا ہے اس کے بعد پھر وہیں جانا پڑے گا۔ اس لئے میں ان چیزوں سے مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کیوں کروں، جو مجھ سے بہت جلد چھوٹ جائیں گی۔

سیاسی اعتبار سے ہندوستان میں کم و بیش خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

پبلک جدّوجہد کو حکومت دبا رہی تھی۔ اور کبھی کبھی گرفتاریاں بھی ہو جاتی تھیں۔ لیکن اس وقت ہندوستان کی یہ خاموشی بڑی معنی خیز تھی یہ وہ منحوس خاموشی تھی جو خوفناک تشدّد کے بعد چھا جاتی ہے۔ وہ خاموشی جو زبان حال سے بہت کچھ کہتی، لیکن تشدّد کرنے والی حکومتیں اُسے سُن نہیں سکتیں۔ اس وقت ہندوستان اس ریاست کا مکمّل نمونہ تھا جو محض پولیس کا کام کرتی ہے۔ پولیس کی ذہنیت حکومت کے تمام شعبوں پر چھائی ہوئی تھی۔ ہر طرح کی مخالف آواز دبا دی جاتی تھی۔ خفیہ پولیس والوں جاسوسوں اور مخبروں کا سارے ملک میں ایک جال پھیلا ہوا تھا۔ عام طور پر لوگوں پر خوف وہراس طاری تھا۔ اور ساری فضا میں اخلاقی پستی کے آثار نمایاں تھے۔ حکومت ہر طرح کی سیاسی جدّوجہد کو فوراً دبا دیتی تھی۔ خصوصاً دیہاتی علاقوں میں مختلف صوبوں کی حکومتیں اس کی کوشش کر رہی تھیں کہ میونسپلٹی اور لوکل بورڈ کی ملازمت سے کانگریس والوں کو نکال باہر کیا جائے۔ ان کی نظر میں وہ شخص جو سول نافرمانی کے سلسلے میں جیل ہو آیا تھا، میونسپل مدارس میں تعلیم دینے یا میونسپلٹی میں اور کوئی کام کرنے کی قطعاً اہلیت نہیں رکھتا تھا۔ چنانچہ میونسپلٹیوں پر بہت دباؤ ڈالا گیا اور انھیں دھمکی دی گئی کہ اگر کانگریس والوں کو برخاست نہیں کیا تو سرکاری امداد بند کر دی جائے گی۔ اس جبر اور زیادتی کی سب سے نمایاں مثال کلکتہ کارپوریشن میں دیکھنے میں آئی میرا خیال ہے کہ آخر میں حکومت بنگال نے ایسا قانون بنا دیا کہ جو شخص کسی سیاسی جرم میں سزایاب ہو چکا ہو وہ کارپوریشن میں ملازم نہیں رکھا جا سکتا۔

جرمنی میں نازی جو زیادتیاں کر رہے تھے، ہندوستان کے برطانوی افسروں اور ان کے اخباروں پر اس کا عجیب وغریب اثر پڑ رہا تھا۔ اسے وہ اپنے طرزِ عمل کے جواز میں پیش کرتے تھے۔ اور اپنی نیکی پر ناز کرتے ہوئے کہتے تھے کہ اگر نازی تمھارے حاکم ہوتے تو تمہاری کیا گت بنتی؟ نازیوں نے تشدّد کے عجیب عجیب طریقے

ایجاد کئے تھے۔ اور جبر کی حد کر دی تھی۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کا مقابلہ کرنا مشکل تھا۔ ممکن ہے ان کی حکومت میں ہماری حالت اس سے بدتر ہوتی لیکن میں اس کا صحیح فیصلہ نہیں کر سکتا۔ کیونکہ گزشتہ پانچ سال میں خود ہندوستان میں جو کچھ ہوتا رہا ہے اس سے میں پوری طرح واقف نہیں ہوں۔ حکومت ہند اس نیک اصول کی قائل ہے کہ سیدھا ہاتھ جو کچھ کرے اُلٹے ہاتھ کو اس کی خبر نہ ہونا چاہیئے۔ چنانچہ وہ غیر جانب دارانہ تحقیقات کی تجویزوں کو رد کر دیتی ہے۔ حالانکہ اس قسم کی تحقیقات میں ہمیشہ اسی کا پلّہ بھاری رہتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ عام انگریز وحشیانہ مظالم سے نفرت کرتے ہیں اور اس کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ نازیوں کی طرح کھلّم کھلّا "بہیمیت" پر فخر کریں اور اس کا وظیفہ پڑھیں۔ اگر وہ کبھی بہیمیت سے کام بھی لیتے ہیں تو انھیں خود اس پر شرم آتی ہے۔ لیکن چاہے جرمن ہوں یا انگریز یا ہندوستانی سبھی پر تہذیب کا ملمع اتنا ہلکا ہے کہ جذبات کی رگڑ سے فوراً اتر جاتا ہے اور پھر اندر سے وہ چیز نکل آتی ہے۔ جسے دیکھ کر کراہت آتی ہے۔ جنگِ عظیم نے انسانوں میں خوفناک بہیمیت پیدا کر دی۔ اس کے اثرات ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں۔ یعنی صلح کے بعد بھی جرمنی کا بحری محاصرہ جاری رہا۔ اور اشیائے خوردنی کے دستیاب نہ ہونے سے لوگوں کو فاقے کرنے پڑے۔ اس کے متعلق ایک انگریز مصنف لکھتا ہے کہ "دنیا کی کسی قوم نے ایسا احمقانہ، خوفناک اور وحشیانہ ظلم نہ کیا ہوگا!" ہندوستان میں بھی ۵۷ء اور ۱۹۱۹ء کی یاد دلوں سے محو نہیں ہوئی ہے۔ جب کبھی کسی کے مفاد اور حقوق خطرے میں ہوتے ہیں تو پھر شرافت اور تہذیب کو بالائے طاق رکھ دیا جاتا ہے جھوٹ کا نام پروپگنڈا پڑ جاتا ہے بہیمیت کو "سائنٹفک تشدد"، اور امن و انصاف کا تحفظ"، کہنے لگتے ہیں۔ اس میں افراد یا کسی خاص قوم کا کوئی قصور نہیں ہے۔ ان حالات میں ہر شخص کا کم و بیش یہی طرزِ عمل ہوتا ہے۔ ہر محکوم ملک کی طرح ہندوستان

میں بھی ہمیشہ حکمراں قوت کی مخالفت کا ایک دبا ہوا جذبہ موجود رہتا ہے کبھی کبھی یہ بھڑک اٹھتا ہے۔ اور خطرناک صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اس مخالفت سے حکمران قوم میں اچھی بری ہر طرح کی فوجی صفات پیدا ہو جاتی ہیں۔ گذشتہ چند سال میں ہمیں ہندوستان میں ان فوجی صفات کا بہت اچھی طرح تجربہ ہوا کیونکہ ہم حکومت کی جو مخالفت کر رہے تھے وہ بہت قوی اور موثر ہو گئی تھی۔ لیکن ہندوستان کو تو ہمیشہ سے اس فوجی ذہنیت سے (جو حقیقی سپاہیانہ روح سے خالی ہے) سابقہ رہا ہے یہ شہنشاہی کا لازمی نتیجہ ہے اور اس میں حاکم اور محکوم دونوں کی ذلت ہے۔ ہندوستانیوں کی ذلت تو کھلی ہوئی ہے لیکن انگریزوں کی ذلت اس قدر آسانی سے محسوس نہیں ہوتی۔ البتہ جب نازک وقت آتا ہے تو یہ صاف ظاہر ہو جاتی ہے۔ ان کے علاوہ ایک تیسرا فریق بھی ہے جس کے حصہ میں بدقسمتی سے دونوں قسم کی ذلتیں آتی ہیں۔

جیل میں مجھے اتنی کافی فرصت تھی کہ میں نے اعلیٰ افسروں کی تقریریں ان کے اسمبلی اور کونسلوں کے سوالات کے جواب اور حکومت کے اعلانات سب تفصیل سے پڑھے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ گذشتہ تین برس میں ان میں بہت کچھ تبدیلی ہو گئی ہے اور یہ تبدیلی رفتہ رفتہ زیادہ نمایاں ہوتی جاتی ہے۔ ان کا لہجہ زیادہ درشت اور تحکمانہ ہو گیا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ایک سرجنٹ میجر اپنے سپاہیوں کو حکم دے رہا ہو۔ اس کی ایک دلچسپ مثال وہ تقریر ہے جو مدنا پور (بنگال) کے کمشنر نے نومبر یا دسمبر ۱۹۳۳ء میں کی تھی۔ یہ چنگیز خانی شان تمام سرکاری حلقوں میں یکساں پائی جاتی ہے۔ غیر سرکاری یورپی خصوصاً بنگال میں سرکاری افسروں سے بھی بڑھ گئے ہیں۔ ان کی تقریر اور عمل دونوں میں بالکل فاسسٹی ذہنیت کی جھلک پائی جاتی ہے۔

بہیمیت کی ایک دوسری بیّن مثال سندھ میں دیکھنے میں آئی۔ حال ہی میں

وہاں چند مجرموں کو منظرِ عام پر پھانسی دی گئی، چونکہ سندھ میں جرائم بڑھ رہے تھے اس لئے افسروں نے طے کیا کہ ان مجرموں کو سب کے سامنے پھانسی دی جائے تاکہ دوسروں کو عبرت ہو۔ یہ وحشیانہ منظر دیکھنے کے لئے عام لوگوں کو ہر طرح کی سہولتیں بہم پہنچائی گئیں۔ سنا ہے کہ اس وقت ہزاروں آدمی جمع ہو گئے تھے۔

غرض رہائی کے بعد میں نے ہندوستان کے سیاسی اور معاشی حالات کا جائزہ لیا۔ ان کو میں نے کچھ خوشگوار نہیں پایا۔ میرے بہت سے ساتھی جیل میں تھے۔ اور گرفتاریاں ابھی جاری تھیں۔ تمام تعزیری ضابطے ابھی تک نافذ تھے۔ احتساب اخباروں کا گلا گھونٹ رہا تھا، اور اس نے ہماری خط وکتابت میں ابتری ڈال رکھی تھی۔ میرے ایک رفیقِ کار، رفیع احمد قدوائی، سنسر کی زیادتیوں سے نالاں تھے۔ اُن کے خط روک لئے جاتے تھے، دیر سے ملتے تھے یا غائب ہو جاتے تھے جس سے اُن کے کاموں میں بڑی گڑبڑ ہوتی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ سنسر سے درخواست کریں کہ اپنا فرض ذرا معقولیت سے انجام دے، لیکن مشکل یہ تھی کہ لکھیں کیسے کسی کو یہ خبر نہیں تھی کہ سنسر کون ہے۔ غالباً وہ کوئی خفیہ پولیس کا افسر ہوتا ہے۔ جو پوشیدہ طور پر اپنی خدمات انجام دیتا ہے۔ اور اس کا وجود اور کام تسلیم ہی نہیں کیا جاتا۔ لیکن رفیع احمد نے اس مشکل کو اس طرح حل کیا کہ سنسر کے نام خط لکھا۔ اور لفافے پر اپنا پتہ لکھ دیا۔ چنانچہ واقعی یہ خط منزلِ مقصود پر پہنچ گیا۔ اور اس کے بعد سے رفیع احمد کے خطوں کے معاملے میں زیادہ احتیاط برتی جانے لگی۔

مجھے پھر جیل جانے کی آرزو نہ تھی کیونکہ اتنے دن قید میں رہتے رہتے میرا جی بھر گیا تھا۔ لیکن میں جانتا تھا کہ موجودہ حالات میں اس سے بچ نہیں سکتا۔ بجز اس کے سیاست سے کنارہ کش ہو جاؤں۔ اس کے لئے میں ہرگز تیار نہیں تھا اور حکومت سے ٹکر ہونا ناگزیر تھا۔ وہ جب چاہتی حکم نامہ بھیج دیتی کہ فلاں کام کرو۔ یا

فلاں کام نہ کرو اور میری طبیعت اس قسم کی ہے کہ زبردستی کو برداشت ہی نہیں کر سکتی سارے ملک میں ہندوستانیوں کو ڈرانے اور دبانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ میں اس معاملے میں بے بس تھا۔ اور وسیع پیمانے پر کوئی جدوجہد کرنا میرے امکان سے باہر تھا بس اتنا ہی کر سکتا تھا کہ خود نہ ڈروں اور دب کر اطاعت نہ کروں۔

جیل جانے سے پہلے مجھے کئی کام نبٹانے تھے۔ میری ماں بیمار تھیں اور سب سے پہلے مجھے ان کی خدمت کرنی تھی۔ انھیں رفتہ رفتہ صحت ہو رہی تھی۔ مگر اس میں اتنی دیر لگ گئی کہ تقریباً ایک سال تک وہ صاحب فراش رہیں۔ پھر میں گاندھی جی سے ملنا چاہتا تھا۔ جو پونا میں اپنے نئے برت کے ختم ہونے کے بعد آہستہ آہستہ طاقت حاصل کر رہے تھے۔ مجھے اُن سے ملے دو برس سے زیادہ ہو گئے تھے۔ اس کے علاوہ میں چاہتا تھا کہ اپنے صوبے کے زیادہ سے زیادہ رفیقوں سے ملوں اور نہ صرف ہندوستان کی سیاسی حالت بلکہ دنیا کی عام حالت اور ان خیالات کے متعلق گفتگو کروں۔ جو میرے دل و دماغ پر چھائے ہوئے تھے۔ اس وقت میرا خیال تھا کہ دنیا سیاسی اور معاشی اعتبار سے بڑی تیزی کے ساتھ ہلاکت کی طرف بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ اور اپنا قومی پروگرام بناتے وقت اس بات کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔

میرے خانگی معاملات بھی میری توجہ کے محتاج تھے۔ اب تک میں ان سے انتہائی بے پروائی برتتا رہا تھا۔ یہاں تک کہ والد کے انتقال کے بعد میں نے ان کے کاغذات کبھی نہیں دیکھے تھے۔ ہم نے اپنے اخراجات بہت گھٹا دئے تھے مگر اب بھی وہ ہماری موجودہ حیثیت سے زیادہ تھے۔ تاہم جب تک ہم اپنے پرانے گھر میں رہتے ان کا اور گھٹانا مشکل تھا۔ موٹر اب ہمارے پاس نہیں تھی کیونکہ ہم اس کا خرچ برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اور پھر یہ اندیشہ بھی تھا کہ حکومت جب چاہے گی اس پر قبضہ

کرلے گی۔ ایک طرف تو یہ مالی مشکلات درپیش تھیں، اور دوسری طرف سینکڑوں خط آتے تھے جن میں لوگ مجھ سے مالی امداد طلب کرتے تھے (سنسر ان خطوں کو نہیں روکتا تھا) سارے ملک میں اور خصوصاً جنوبی ہند میں یہ غلط خیال پھیلا ہوا ہے کہ میں بڑا مالدار آدمی ہوں۔

میری رہائی کے بعد ہی میری چھوٹی بہن کرشنا کی منگنی ہوگئی اور میں چاہتا تھا کہ جیل بھیجے جانے سے پہلے اس کی شادی کردوں۔ کرشنا خود بھی ایک سال کی سزا بھگتنے کے بعد ابھی چند مہینے ہوئے جیل سے آئی تھی۔

جوں ہی میری ماں کی طبیعت سنبھلی میں فوراً گاندھی جی سے ملنے کے لئے پونا روانہ ہوگیا۔ مجھے ان سے مل کر اور یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ گو وہ ابھی تک کمزور تھے مگر ان کی حالت روز بروز بہتر ہوتی جاتی تھی۔ ہم دونوں میں گھنٹوں باتیں ہوتی تھیں۔ یہ ظاہر ہے کہ سیاست، معاشیات اور زندگی کے مختلف مسائل کے متعلق ہمارے خیالات میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ لیکن میں ان کی اس شفقت کا ممنون ہوں کہ حتی الامکان انھوں نے میرے خیالات کی رعائیت مدنظر رکھی میری ان کی خط وکتابت میں (جو بعد میں شائع ہوگئی) بہت سے وسیع مسائل پر جن پر میں ان دنوں غور کررہا تھا، بحث کی گئی تھی۔ اور اگرچہ ان کا ذکر مبہم الفاظ میں تھا۔ لیکن منشار بالکل واضح تھا میں گاندھی جی کا یہ اعلان سن کر بہت خوش ہوا کہ مستقل حقوق کو منسوخ کردینا چاہیئے۔ اگرچہ وہ اس پر زور دیتے تھے کہ ہمیں جبر سے نہیں بلکہ سمجھا بجھا کر اپنا مقصد حاصل کرنا چاہیئے۔ چونکہ میرے نزدیک ان کے بعض طریقے مہذب اور معقول قسم کے جبر کے مترادف ہیں اس لئے میں دونوں صورتوں میں کچھ زیادہ فرق نہیں سمجھتا! مجھے پہلے کی طرح اب بھی ان سے یہ توقع تھی کہ اگرچہ وہ مبہم نظریوں پر غور کرنے کے مخالف ہیں لیکن واقعات کی منطق انہیں رفتہ رفتہ یہ تسلیم کرنے پر مجبور کردے گی کہ بنیادی سماجی تبدیلی ناگزیر ہے۔ وہ بھی عجیب وغریب شخص ہیں۔ ایک طرف وہ (بہ قول مسٹر ویرپرالیون

کے) قرونِ وسطیٰ کے کیتھولک اولیار کی طرح ہیں اور دوسری طرف وہ عملی رہنما ہیں۔ اور ان کا ہاتھ ہمیشہ ہندوستانی کسانوں کی نبض پر رہتا ہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وقت آنے پر وہ کدھر جھکیں گے۔ لیکن یہ یقینی بات ہے کہ جدھر بھی وہ جھکیں گے۔ وہی پلّہ بھاری ہوجائے گا۔ ممکن ہے وہ ہمارے نزدیک غلط راستہ اختیار کریں لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک کھلا ہوا راستہ ہوگا۔ ان کے ساتھ مل کر کام کرنا سب سے بہتر ہے۔ لیکن اگر ضرورت مجبور کرے تو پھر دوسری راہ اختیار کرنی پڑے گی۔

میرے خیال میں اس وقت تو یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوتا تھا ہم اپنی قومی جدوجہد میں مصروف تھے اور اصولاً کانگریس کا پروگرام اب تک سول نافرمانی تھا۔ اگرچہ وہ افراد تک محدود کردی گئی تھی۔ میں نے ہی فیصلہ کیا کہ اس وقت ہمیں موجودہ صورت پر قناعت کرنی چاہیے اور اشتراکی خیالات عام لوگوں میں خصوصاً کانگریس کے ان کارکنوں میں جو سیاسیات میں کچھ دخل رکھتے ہیں پھیلانے چاہئیں تاکہ آئندہ جب کبھی ہماری پالیسی کے تعین کا موقع آئے۔ تو ہم کافی پیش قدمی کر سکنے تیار ہیں اس وقت تو کانگریس خلاف قانون جماعت تھی اور حکومت برطانیہ اسے کچل ڈالنا چاہتی تھی اس لئے ہمیں اس کے حملے کی مدافعت کرنی تھی۔

گاندھی جی کے سامنے سب سے اہم مسئلہ یہ تھا کہ خود انھیں کیا کرنا چاہیے؟ وہ عجیب شش و پنج میں تھے۔ اگر وہ جیل جاتے تو پھر ہریجن اُدّھار کی سہولتوں کا سوال درپیش ہوتا۔ اور غالباً حکومت اپنی پہلی رائے سے نہ ہٹتی اس لئے انھیں پھر برت رکھنا پڑتا۔ کیا یہ چکر اسی طرح چلتا رہے؟ وہ اس بلّی چوہے کے کھیل کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اور ان کا خیال تھا۔ کہ اگر اب ان سہولتوں کے لئے میں نے برت رکھا تو چاہے میں رہا بھی کردیا جاؤں برت جاری رہے گا۔ اس کے معنی یہ تھے کہ وہ برت رکھ کر جان دے دیں گے۔

دوسری صورت یہ تھی کہ وہ اپنی سزا کی باقی میعاد میں (جس میں ابھی ۱۰½ مہینے باقی تھے) جیل جانے کی کوشش نہ کریں۔ صرف ہریجن ادھار کا کام کرتے رہیں البتہ کانگریس کے کارکنوں سے ملتے رہیں اور جب ضرورت ہو انھیں مشورہ دیتے رہیں۔

تیسری صورت یہ ہو سکتی تھی کہ وہ عارضی طور پر کانگریس سے کنارہ کش ہو جائیں اور سارا کام (بقول خود) "نئی پود" کے ہاتھ میں دے دیں۔

پہلی صورت کی ہم میں سے کوئی بھی تائید نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ اس میں بظاہر ان کی موت یقینی تھی۔ تیسری صورت اس وقت جبکہ کانگریس ہنوز خلاف قانون جماعت تھی بہت نامناسب بات تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ یا تو سول نافرمانی اور ہر قسم کی عملی جد و جہد فوراً ملتوی ہو جاتی اور آئینی کارروائی شروع ہو جاتی یا کانگریس بے یار و مددگار رہ جاتی اور حکومت اسے اور زیادہ کچل ڈالتی۔ اس کے علاوہ اس خلاف قانون ادارے پر جس کا نہ جلسہ ہو سکتا تھا اور نہ اس کی پالیسی پر بحث، کوئی جماعت قبضہ کیوں کرتی۔ غرض پہلی اور تیسری شکل رد کر کے ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ دوسری شکل مناسب ہے۔ ہم میں سے اکثر کو یہ صورت بھی پسند نہیں تھی اور ہم جانتے تھے کہ سول نافرمانی کا رہا سہا جوش بھی ٹھنڈا پڑ جائے گا۔ اگر لیڈر خود جنگ سے کنارہ کش ہو جائے تو پھر کیا توقع ہو سکتی تھی کہ کانگریسی کارکنوں میں سے ایسے باہمت لوگ زیادہ تعداد میں نکل آئیں گے، جو اس آگ میں کود نا گوارا کریں گے۔ لیکن اس کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔ چنانچہ گاندھی جی نے اس مضمون کا بیان شائع کر دیا۔

گاندھی جی اور میں اس معاملے میں متفق تھے۔ (اگرچہ ہمارے وجوہ مختلف تھے) کہ سول نافرمانی کو ملتوی کرنے کا ابھی وقت نہیں آیا ہے اور چاہے کمزور حالت میں ہی لیکن اسے جاری رکھنا چاہیے۔ اپنے لئے میں نے یہ فیصلہ کیا کہ لوگوں کو اشتراکی اصولوں اور واقعات عالم کی طرف توجہ دلاؤں۔

ڈالہوزی میں چند روز بھی ٹھہرا۔ میری خوش قسمتی کہ اس زمانے میں اودے شنکر
ڈالہوزی میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ اس سبب مجھے ان کا ناچ دیکھنے کا موقع مل گیا۔ میرے لئے ایک
نعمت غیر مترقبہ تھی جس سے میں بہت ہی محظوظ ہوا۔ برسوں میں تھیٹر، ہوٹل
سینما، ناطق فلم، ریڈیو اور براڈکاسٹنگ وغیرہ سے محروم تھا کیونکہ میں عموماً جیل
میں رہتا تھا اور جب تھوڑے عرصے کے لئے باہر آتا بھی تھا تو دوسرے مشاغل میں
منہمک رہتا تھا۔ شاید ایک مرتبہ میں نے ناطق فلم دیکھا ہے اور سینما کے بڑے بڑے
ایکٹروں کے صرف نام ہی سنے ہیں۔ تھیٹر دیکھنے کو خاص طور پر میرا بہت دل چاہتا
ہے اور میں بڑی حسرت کے ساتھ ان بڑے بڑے ناٹکوں کی خبریں پڑھا کرتا ہوں جو
دوسرے ملکوں میں کھیلے جاتے ہیں۔ شمالی ہند میں تو اعلیٰ معیار کے ناٹک ہوتے
ہی نہیں اس لئے جب میں جیل سے باہر بھی ہوتا تب بھی اچھے ناٹک دیکھنے کا موقع نہ
تھا۔ میرا خیال ہے کہ بنگالی، مرہٹی اور گجراتی ناٹک نے خاصی ترقی کر لی ہے۔ لیکن
ہندوستانی زبان کا تھیٹر ابھی بہت پیچھے ہے۔ مجھے تازہ ترین حالات تو معلوم
نہیں لیکن پہلے تو ہندوستان کے ناٹک بڑے کھدرے اور بھونڈے ہوا کرتے تھے
سنا ہے کہ ناطق اور خاموش دونوں قسم کے ہندوستانی فلم بھی لطافتوں سے کورے
ہوتے ہیں۔ عموماً ہلکی قسم کے غنائی یا جذبات پرستانہ فلم دکھائے جاتے ہیں اور ان کا
موضوع عموماً ہندوستان کی قدیم تاریخ یا دیومالا سے ماخوذ ہوتا ہے۔
میرا خیال ہے کہ ان میں وہ چیزیں نہیں پائی جاتیں جو شہر والے پسند کرتے
ہیں ان تھیٹروں اور تکلیف دہ تماشوں سے گاؤں والوں کے گیت اور ناچ اور پرانے
سوانگ بھی جو کہیں کہیں اب تک دیہات میں باقی رہ گئے ہیں بدرجہا بہتر ہوتے ہیں۔ بنگال، گجرات اور
جنوبی ہند میں کبھی کبھی اچانک یہ دیکھ کر بڑی حیرت اور مسرت ہوتی ہے کہ گاؤں
والے غیر شعوری طور پر کتنا صحیح مذاق رکھتے ہیں۔ اوسط طبقے کے لوگوں میں یہ

بات بغیر ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی تہذیب کی جڑوں سے الگ ہو گئے ہیں
اور قدیم روایات سے بالکل کٹ گئے ہیں۔ وہ اس قسم کی معمولی تصویروں
سے لطف اٹھاتے ہیں جو بے معنی اور بے سر پیر ہیں۔ غیر ضروری چیزیں ان کو زیادہ
سے زیادہ پرواز دیتی ہیں۔ وہ ان تصویروں کو پسند کرتے ہیں۔ [illegible] ان کا [illegible]
میں اسی امید پر بسر کرتا ہوں کہ ہندوستان کی [illegible] کا پہلا کام یہی کرنے کی
[illegible] اس نامعقول [illegible] کی مخالفت کرے۔ لیکن شاید اس تکلیف دہ [illegible]
[illegible] اور بد مذاقی کی انتہا گھنونا یا دوسرا [illegible] تحفہ [illegible]
یہاں نظر آتا ہے۔ ان کے پاس خرچ کرنے کو روپیہ ہے اور اپنی نمود و نمائش
کا شوق ہے۔ وہ دل کھول کر اپنا شوق پورا کرتے ہیں۔ اور جب کبھی ان کے
یہاں جلسے ہوتے ہیں تو کیسے کیسے منظر دیکھنے پڑتے ہیں۔

[illegible] سے [illegible] نامور خاندان کی سرکردگی میں [illegible] کے
صحیح مذاق کو بیدار کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ اس کا اثر سارے ملک میں
صاف نظر آ رہا ہے لیکن جس ملک کے لوگ ہر قدم پر [illegible] اور [illegible]
اور وحشت کی فضا میں زندگی بسر کرتے ہوں، وہاں کوئی آرٹ نہیں پنپ سکتا ہے۔

بمبئی میں، میں بہت سے [illegible] اور [illegible] سے ملا جن میں کچھ ابھی
ابھی قید سے چھوٹ کر آئے تھے۔ وہاں اشتراکیت کا عنصر قوی تھا [illegible]
کانگریس کے اندر حلقے میں جو تازہ ترین واقعات ہو رہے تھے ان پر [illegible]
کچھ ناراضگی کا اظہار کیا جا رہا تھا۔ گاندھی جی پر سخت نکتہ چینی ہو رہی تھی کہ وہ
سیاست کو الہیات کے نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں۔ مجھے بہت سے اعتراضات سے
اتفاق تھا۔ لیکن یہ بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ موجودہ حالات میں اس کے سوا کوئی
چارہ نہیں ہے کہ ہم اسی طرح کام چلنے دیں۔ [illegible] ملتوی کرنے سے کوئی [illegible]

فائدہ نہیں تھا، کیونکہ حکومت کا تشدد برابر جاری رہتا اور اگر کوئی موثر جدوجہد کی جاتی تو پھر وہی جیل کی منزل سامنے تھی۔ ہماری قومی تحریک اس درجے پر پہنچ گئی تھی کہ یا تو حکومت اسے دباتی ورنہ حکومت کو اس کی مرضی کے آگے سر جھکانا پڑتا۔ یعنی وہ اتنی قوی ہوگئی تھی کہ حال میں اس کا خلاف قانون قرار دیا جانا لازمی تھا اور اگر سول نافرمانی ملتوی بھی کر دی جاتی تب بھی تحریک کا پیچھے قدم ہٹانا ناممکن تھا غرض سول نافرمانی کے جاری رہنے یا نہ رہنے سے عملاً کوئی فرق نہیں پڑتا تھا مگر اصولاً یہ حکومت کے مقابلے کے لئے ایک اخلاقی حربے کی حیثیت رکھتی تھی اور اس لحاظ سے قابل قدر تھی۔ جنگ کے زمانے میں نئے خیالات کی اشاعت کرنا آسان تھا بمقابلہ اس زمانے کے جبکہ جنگ عارضی طور پر رک گئی ہو اور سستی کا دور شروع ہو گیا ہو۔ جنگ کے علاوہ دوسری صورت یہی تھی کہ حکومت سے مصالحت کا رویہ اختیار کیا جائے اور کونسلوں میں آئینی جدوجہد شروع کی جائے۔

معاملہ پیچیدہ تھا، اور دونوں صورتوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ میں اپنے ساتھیوں کی ذہنی کش مکش کو خوب سمجھتا تھا۔ کیونکہ مجھے خود اس سے سابقہ پڑ چکا تھا۔ لیکن بمبئی میں اور ہندوستان کے دوسرے مقامات میں بھی میں نے یہ دیکھا ہے کہ بعض لوگ جو کچھ کرنا نہیں چاہتے۔ اشتراکی اصولوں کی آڑ لیتے ہیں۔ یہ دیکھ کر غصہ آتا تھا کہ یہ لوگ خود تو کچھ کرتے نہیں اور دوسروں کو جنھوں نے جنگ کی مصیبتیں جھیلیں۔ رجعت پسند کہتے ہیں۔ یہ شیر قالین اشتراکی سب سے زیادہ گاندھی جی کے مخالف ہیں اور انھیں رجعت پسندوں کا قبلہ گاہ کہتے ہیں۔ ان کی دلیلیں منطق کے لحاظ سے تو بالکل درست ہیں لیکن وہ ایک چھوٹی سی بات کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ یہ "رجعت پسند" ہندوستان کو جانتا ہے، سمجھتا ہے، بلکہ بذات خود ہندوستان کے کسانوں کا مجسمہ ہے اور اس نے سارے ملک کو ہلا کر رکھ دیا

جو آج تک کسی نام و نہاد انقلابی سے نہ ہو سکا۔ اس کی نئی ہریجن ادھار کی سرگرمیوں نے بھی بڑی نرمی سے، مگر اس زبردست قوت کے ساتھ جس کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ کٹر ہندو دھرم کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیا۔ کٹر پنتھیوں کی ساری جماعت اس کی مخالف ہو گئی ہے اور اسے اپنا سب سے خطرناک دشمن سمجھتی ہے۔ حالانکہ وہ ہمیشہ ان سے بڑی نرمی اور شرافت سے پیش آتا ہے۔ وہ اپنے خاص انداز میں بے اندازہ قوتوں کا خزانہ کھول دیتا ہے۔ جو سطح سمندر کی ہلکی ہلکی موجوں کی طرح پھیلتی چلی جاتی ہیں اور کروڑوں آدمیوں کو اپنے ساتھ بہا لے جاتی ہیں۔ وہ رجعت پسند ہو یا انقلابی مگر اسی کی ذات تھی جس نے ہندوستان کا نقشہ بدل دیا ایک پست اور دبو قوم کو عزم و وقار بخشا۔ عام لوگوں میں بیداری اور قوت پیدا کر دی اور ہندوستان کے مسئلے کو دنیا کا مسئلہ بنا دیا۔ پرامن عدم تعاون یا سول نافرمانی کے مقصد اور فلسفیانہ نتائج سے قطع نظر اس کا طریق کار ایک عجیب و غریب، قوی اور موثر حربہ ہے جو اس شخص نے ہندوستان کے اور ساری دنیا کے ہاتھوں میں دے دیا ہے اور ذرا بھی شبہ نہیں کہ ہندوستان کے حالات کے لئے خاص طور پر موزوں ہے۔

میں تسلیم کرتا ہوں کہ ایمانداری کے ساتھ جو نکتہ چینی کی جاتی ہے اس کی قدر اور حوصلہ افزائی کرنی چاہیے، اور جہاں تک ہو سکے لوگوں کو موقع دینا چاہیے کہ وہ ہمارے معاملات پر دل کھول کر بحث کریں۔ یہ بات ضرور قابل افسوس ہے کہ گاندھی جی کے اقتدار نے ایک حد تک بحث مباحثے میں رکاوٹ پیدا کر دی ہے۔ لوگ ہر معاملے میں ان کا سہارا ڈھونڈتے ہیں اور ہر بات کا فیصلہ ان پر چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ طریقہ صریحی طور پر غلط ہے۔ قوم اسی وقت ترقی کر سکتی ہے جب وہ مقصد اور طریق کار کو سمجھ بوجھ کر قبول کرے اور اس کا عمل اور انضباط

کرانہ اطاعت پر نہیں بلکہ فرض شناسی پر مبنی ہو۔ کوئی شخصیت بھی خواہ وہ کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو۔ تنقید سے بالاتر نہ ہونی چاہئیے۔ لیکن اگر تنقید اپنی غلطی کو چھپانے کے لئے کی جائے تو وہ یقیناً ناجائز ہے۔ اشتراکی اگر اس قسم کی حرکتیں کریں گے تو بدنام ہو جائیں گے۔ کیونکہ لوگ تو ہر شخص کو عمل کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں۔ لینن نے لکھا ہے "جو شخص مستقبل کے سہل کاموں کے خواب دیکھتا رہ کر اور حال کے مشکل کاموں کو قابل توجہ نہیں سمجھتا وہ ابن الوقت ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے عمل کی بنا ان واقعات پر نہیں رکھتا جو اس وقت حقیقی زندگی میں پیش آ رہے ہیں بلکہ اس سے بچنے کے لئے خواب و خیال کی دنیا میں پناہ لیتا ہے۔"

ہندوستان کے اشتراکیوں اور اشتمالیوں کا ذہنی سرمایہ یہ لے دے کر وہ کتابیں ہیں جو صنعتی مزدوروں کے متعلق لکھی گئی ہیں۔ بعض مخصوص علاقوں مثلاً بمبئی یا کلکتے کے قرب و جوار میں کارخانے کے مزدوروں کی کثرت ہو۔ مگر اصل میں ہندوستان ایک زرعی ملک ہے۔ اس لئے ہمارے مسائل صنعتی مزدوروں کے نقطۂ نظر سے نہ پوری طرح سمجھے جا سکتے ہیں اور نہ حل کئے جا سکتے ہیں۔ ہمارے یہاں قومیت اور دیہی معیشت دو زبردست عنصر ہیں اور یورپی اشتراکیت اس سے بہت کم بحث کرتی ہے۔ روس کی جنگ سے پہلے کے حالات ہندوستان سے بہت کچھ ملتے جلتے تھے لیکن وہاں غیر معمولی حادثات پیش آئے اور یہ توقع رکھنا کہ دوسری جگہ بھی ایسا ہی ہوگا حماقت ہے۔ میں یہ مانتا ہوں کہ اشتمالیت کا فلسفہ ہمیں ہر ایک ملک کے موجودہ حالات کو سمجھنے اور ان کا تجزیہ کرنے میں مدد دیتا ہے اور آئندہ کے لئے ترقی کی راہ دکھاتا ہے۔ لیکن یہ اس فلسفے کے ساتھ بڑی زبردستی اور بے انصافی ہوگی کہ حالات اور واقعات کا لحاظ کئے بغیر آنکھ بند کر کے اس سے کام لیا جائے۔

بہرحال زندگی یونہی گزرتی رہی۔ جمہوریت اور اس کے اختلافات اور تضادات کو دیکھ کر بعض اوقات انسان ہمت ہار جاتا ہے۔ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ لوگوں میں اختلاف رائے ہو بلکہ ایک ہی جماعت کے لوگ جو اکثر مسائل کو ایک ہی نظر سے دیکھتے ہیں، مختلف خیالات رکھتے ہیں لیکن وہ لوگ جو اپنی کمزوری کو رعب دار فقروں اور شاندار اصولوں کے پیچھے چھپانے کی کوشش کرتے ہیں شبہ سے کیسے بچ سکتا ہے جو لوگ اقرار نامے لکھ کر یا حکومت سے وعدے کر کے یا دوسرے مشتبہ طریقوں سے جیل سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں اور پھر دوسروں پر نکتہ چینی کرنے کی جرأت کرتے ہیں۔ اس ملک کو نقصان پہنچاتے ہیں کیونکہ وہ علمبردار بنتے ہیں۔

بمبئی ایک بہت بڑا آفاقی شہر ہے اور اس میں ہر طرح کے لوگ موجود ہیں لیکن وہاں کے ایک ممتاز بزرگ اپنے سیاسی، معاشی، سماجی اور مذہبی خیالات کے اعتبار سے عجیب معجون مرکب واقع ہوئے ہیں۔ مزدور طبقے کے لیڈر کی حیثیت سے تو وہ اشتراکی ہیں۔ سیاسی اعتبار سے اپنے آپ کو جمہوریت پسند کہتے ہیں اسی کے ساتھ ہندو مہاسبھا کے ٹھیکیدار بھی ہیں۔ اور اس لئے انہوں نے وعدہ بھی کیا تھا کہ قدیم مذہبی اور سماجی رسم و رواج کی حفاظت کریں گے اور مجلس قانون ساز کے قوانین کو ان میں مداخلت کرنے سے باز رکھیں گے۔ انتخاب کے موقع پر وہ سناتن دھرم کے نمائندے بن گئے جو قدیم رسوم کے مندر کا پجاری ہے۔ جب یہ رنگ اور یہ عجیب زندگی بھی کافی نہ ہوئی تو انہوں نے اپنی فالتو قوت کو کانگریس پر نکتہ چینی کرنے اور گاندھی جی کو رجعت پسند کہہ کر بدنام کرنے میں صرف کرنا شروع کیا۔ اس کے بعد چند اور شخصوں کے ساتھ مل کر انہوں نے ایک ڈیموکریٹک کانگریس پارٹی قائم کی جسے حقیقت میں جمہوریت سے دور کا رشتہ بھی نہ تھا، اور کانگریس سے صرف اتنا تعلق تھا کہ یہ اس سے پیدا ہوئی

حملے کیا کرتی تھی۔ اب انھیں اپنی تگ و تاز کے لئے نئے میدانوں کی تلاش پیدا ہوئی۔ چنانچہ وہ مزدوروں کے نمایندے کی حیثیت سے جنیوا کی لیبر کانفرنس میں جا پہنچے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس قسم کی حکومت کے وزیر اعظم بننے کی تربیت حاصل کر رہے تھے۔ جو انگلستان میں "قومی حکومت" کہلاتی ہے۔

اس قسم کے رنگے برنگے خیالات اور سرگرمیاں بہت کم آدمیوں کو نصیب ہوتی ہیں پھر بھی کانگریس کے معترضین میں ایسے بہت سے لوگ تھے جو مختلف میدانوں میں گھوڑے دوڑا چکے تھے اور اب بھی ہر طرح کی تحریکوں میں شریک تھے۔ ان میں سے بعض لوگ اپنے آپ کو اشتراکی بھی کہتے ہیں۔ انھیں کی وجہ سے اشتراکیت بدنام ہوتی ہے۔

(۱۱۵)

لبرل ذہنیت

جب میں گاندھی جی سے ملنے پونا گیا تو ایک روز ان کے ساتھ سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی کے مرکز میں بھی گیا۔ کوئی ایک گھنٹے تک سوسائٹی کے بعض اراکین ان سے سیاسی مسائل پر سوالات پوچھتے رہے اور وہ جواب دیتے رہے۔ اتفاق سے اس وقت وہاں نہ سری نواس شاستری صاحب تھے جو اس سوسائٹی کے صدر ہیں اور نہ پنڈت ہردے ناتھ کنزرو جو صدر کے بعد اس انجمن کے سب سے لائق رکن ہیں مگر بعض پرانے اراکین موجود تھے۔ ہمارے خیال کے تھوڑے سے آدمی جو اس گفتگو کو سن رہے تھے ان کی حیرت ہر بات کے ساتھ بڑھتی جاتی تھی۔ اس لیے کہ سوالات اس وقت کے نہایت ادنیٰ واقعات کے متعلق تھے اور ان کا موضوع بیشتر وہ درخواست تھی جو گاندھی جی نے بہت دنوں پہلے وائسرائے سے ملاقات کے لئے کی تھی اور جسے وائسرائے نے منظور نہیں کیا تھا۔ کیا بس یہی ایک اہم سوال رہ گیا تھا جو ان لوگوں کے ذہن میں آ سکتا تھا جب کہ دنیا میں جدھر دیکھئے اہم سے اہم مسائل درپیش تھے جب ان کا اپنا ملک آزادی کے لیے ایک ہمت آزما جنگ میں جٹا ہوا تھا اور سینکڑوں ادارے خلاف قانون قرار دئے جا چکے تھے؟ اس وقت کاشتکاروں کے مسئلے کی حالت نازک ہو گئی تھی۔ صنعتی کساد بازاری کے سبب سے ہر طرف بے روزگاری پھیل رہی تھی۔ بنگال اور سرحد پر جو کچھ ہو رہا تھا اس کا خیال کرکے کلیجہ دھڑکنے لگتا تھا۔ خیالات کی، تقریر کی، تحریر کی،

او اجتماع کی آزادی کا سر کچلا جا رہا تھا۔ اس کے علاوہ بھی کیا جانے کتنی قومی اور بین الاقوامی مسائل تھے۔ مگر لبرل حضرات نہایت چھوٹی چھوٹی باتوں کے متعلق سوالات کر رہے تھے اور جاننا چاہتے تھے کہ اگر گاندھی جی نے پہل کی تو اس کا وائسرائے اور حکومت ہند پر کیا اثر ہوگا؟

مجھے ایسا لگتا تھا کہ میں ایک خانقاہ میں پہنچ گیا ہوں جس کے رہنے والوں کا مدتیں گزر گئیں کہ بیرونی دنیا سے کوئی ربط ضبط ہی نہیں رہا ہے اور یہ خیال میرے دل میں جاگزیں ہو گیا۔ لطف یہ کہ ہمارے یہ دوست عملی سیاسیات میں حصہ لے رہے تھے، ہوشیار لوگ تھے اور ان کی قومی خدمت اور ایثار کی کارگزاریاں بھی کچھ کم نہ تھیں۔ یہ اور ان کے چند ساتھی لبرل پارٹی کی روح رواں تھے۔ باقی پارٹی ایک مبہم اور بے شکل سی جماعت تھی۔ جس کے رکن کبھی کبھی بس اس احساس کا لطف اٹھانا چاہتے تھے کہ ہم بھی سیاسی جدوجہد میں شریک ہیں۔ ان میں سے بعض خصوصاً بمبئی اور مدراس والے تو ایسے تھے کہ ان میں اور سرکاری ملازموں میں بس نام کا فرق تھا۔

کسی ملک کے لوگ جس طرح کے سوالات کرتے ہیں وہ ان کی سیاسی نشوونما کا پیمانہ ہوتے ہیں۔ اکثر ان کی ناکامی کا سبب یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ سے ایسے سوالات نہیں پوچھتے جو اصل اہمیت رکھتے ہیں۔ ہماری سیاسی پستی کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ہم نشستوں کی فرقہ وارانہ تقسیم پر اپنا وقت اور پوری قوت ضائع کرتے ہیں اور جی بُرا کیا کرتے ہیں یا فرقہ وارانہ فیصلے کی مخالفت یا موافقت میں پارٹیاں بناتے ہیں اور ان مسائل کو نظر انداز کر کے جن پر ہماری زندگی اور موت کا دار و مدار ہے اس کے متعلق لاحاصل بحثیں کرتے رہتے ہیں۔ اسی طرح وہ سوالات جو اس روز سرونٹ آف انڈیا سوسائٹی کے

مرکز میں پوچھے گئے۔ اس سوسائٹی اور لبرل پارٹی کی عجیب و ذہنی حالت کا آئینہ تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ ان لوگوں کے کوئی سیاسی اور معاشی عقائد ہی نہیں ہیں۔ ان کی نظر میں وسعت نہیں ان کی سیاست بس اسی قسم کی ہے جس کا ڈرائنگ روم یا دربار میں چرچا رہتا ہے مثلاً یہ کہ فلاں بڑے عہدہ دار کیا کریں گے اور کیا نہ کریں گے۔

لبرل پارٹی کا نام غلط فہمی پیدا کر سکتا ہے۔ اور جگہ خصوصاً انگلستان میں اس جماعت کی ایک خاص سیاست تھی یعنی آزاد تجارت اور کاروبار کو اس کے حال پر چھوڑ دینے کا اصول اور شخصی آزادی اور شہری حقوق کا ایک خاص فلسفہ۔ انگلستان کی لبرل پارٹی کی تعلیم اور عقائد کی بنیاد معاشیات پر تھی اور تجارتی آزادی حاصل کرنے اور شاہی اجاروں اور بے ضابطہ محصولوں سے چھٹکارا پانے کی خواہش نے سیاسی آزادی کا حوصلہ پیدا کیا تھا۔ ہندوستان کی لبرل پارٹی کے عقائد ایسا کوئی پس منظر نہیں رکھتے۔ ہندوستانی لبرل آزاد تجارت کے قائل نہیں۔ حال کے واقعات نے انھیں اچھی طرح روشن کر دیا ہے کہ وہ سیاسی آزادی اور شہری حقوق کو بھی خاص اہمیت نہیں دیتے۔ دیسی ریاستوں میں قریب قریب منصب وارانہ نظام رائج ہے۔ ان کی حکومتیں مطلق العنانی پر مبنی ہے اور وہاں جمہوریت اور شخصی آزادی کا ابھی تک ذکر بھی نہیں ہے۔ اس کے باوجود یہ لبرل ان سے گہرے تعلقات رکھتے ہیں اور عموماً ان کی حمایت کرتے ہیں۔ یہ بھی ایک صفت ہے جو انھیں یورپ کے لبرلوں سے ایک جدا قسم بنا دیتی ہے۔ لبرل کے معنی ہیں حریت پسند۔ بہر حال اس لفظ کے جو معنی بھی لیجئے ہندوستانی لبرل حریت پسند نہیں ٹھہرائے جا سکتے۔ زیادہ سے زیادہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ حریت پسندی ان کے کہیں کہیں چھو گئی ہے۔

یہ ٹھیک ٹھیک بتانا کہ وہ ہیں کیا، بہت مشکل ہے۔ اس لئے کہ ان کے خیالات
کی کوئی مضبوط اثباتی بنیاد نہیں اور اگرچہ وہ تعداد میں کم ہیں پھر بھی ایک دوسرے
سے متفق نہیں۔ ان کی طاقت صرف نفی میں ہے۔ انھیں ہر طرف غلطیاں ہی
دکھائی دیتی ہیں۔ وہ ان سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں اور امید رکھتے ہیں کہ وہ
اس طرح حقیقت تک پہنچ جائیں گے۔ سچ پوچھئے تو ان کے لئے حقیقت ہمیشہ
دو انتہائی مسلکوں کے بیچ میں کہیں پر ہوتی ہے۔ وہ ہر چیز پر جس میں انھیں
انتہا پسندی نظر آتی ہے اعتراض کرتے ہیں اور اس طرح وہ محسوس کرتے
رہتے ہیں کہ ہم نیک، اعتدال پسند اور اچھے ہیں۔ یہ طرز عمل انھیں غور و فکر کی
تکلیف دہ اور دشوار سلسلوں میں الجھنے سے بچائے رکھتا ہے اور وہ اس پر
بھی مجبور نہیں ہوتے کہ اپنی طرف سے کوئی تعمیری خیال پیش کریں۔ بعض کو
ایک طرح سے خیال ہوتا ہے کہ یورپ میں سرمایہ داری پورے طور پر کامیاب
نہیں ہوئی ہے اور اب مصیبت میں پڑی ہے لیکن دوسری طرف ان کے نزدیک
یہ بات بھی کھلی ہوئی ہے کہ اشتراکیت بری چیز ہے اس لئے کہ وہ مستقل حقوق
اور اغراض پر حملہ کرتی ہے۔ ممکن ہے آگے چل کر کوئی بیچ کا راستہ سمجھ میں
آجائے کوئی بیچ کی منزل۔ اس لئے اس درمیان میں تو مستقل شخصی حقوق املاک
وغیرہ کا تحفظ کرنا چاہئے۔ اگر کبھی یہ بحث چھڑے کہ دنیا گول ہے تو غالباً یہ لوگ
ان دونوں خیالات کو جس سے انتہا پسندی ظاہر ہوتی ہے رد کرکے کام
چلانے کے لئے یہ کہہ دیں کہ وہ شاید چوکور یا بیضاوی ہو۔

یہ لوگ فضول اور غیر اہم باتوں پر غصے سے برانگیختہ ہو جاتے ہیں اور ایسی
چیخ پکار مچاتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ جان بوجھ کر اور اس لئے بھی کہ یہ
خصوصیت ان کے شعور کی تہ میں بیٹھ گئی ہے۔ وہ بنیادی مسائل سے پہلو

بچاتے ہیں۔ کیونکہ ایسے مسائل بنیادی اصلاح اور مردانہ [illegible] اندیشی اور عمل کے طالب ہوتے ہیں۔ اس لئے لبرلوں کی ہار جیت دونوں یکساں بے اثر ہوتی ہے۔ ان کا کسی اصول سے تعلق نہیں ہوتا گویا اس پارٹی کی سب سے بڑی خصوصیت (اور اگر ایسے بیہودے ہیں یہ بات ممکن ہو تو اس کی خاص علامت) ہر بُری اور اچھی چیز میں اعتدال ہے۔ یہی [illegible] غرض جیسا منصب ہے اور اس پارٹی کا پرانا نام یعنی موڈریٹ ہی شاید اس کے لئے سب سے زیادہ مناسب تھا۔

میں میانہ روی میں اپنی خاص شان سمجھتا ہوں
وگ مجھے ٹوری سمجھتے ہیں اور ٹوری وگ خیال کرتے ہیں(۱)
(الیگزینڈر پوپ)

لیکن میانہ روی چاہے جتنی قابل تعریف چیز ہو، وہ ایک دلچسپ یا درخشاں صفت نہیں ہے، وہ مزاج میں خشکی پیدا کرتی ہے اور اس طرح بدقسمتی سے ہندوستانی لبرل رونے والوں کی فوج بن گئے ہیں۔ ان کے چہرے افسردہ اور روکھے، ان کی تحریر اور بات بے رس ہوتی ہے۔ اور وہ زندہ دلی سے بالکل ناآشنا ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان میں سبھی ایسے نہیں اور ان لوگوں میں جنھیں مستثنیٰ کرنا ضروری ہے سر تیج بہادر سپرو سب سے زیادہ قابل ذکر ہیں۔ شخصی طور پر سر تیج بہادر ہرگز غیر دلچسپ آدمی نہیں ہیں۔ ان میں ظرافت کی کمی نہیں اور خود ان پر کوئی فقرہ چست کیا جائے تو اس کا لطف اٹھا سکتے ہیں لیکن مجموعی طور پر لبرل جماعت کا فلسفہ تن پروری اور دولت پرستی کے نقطۂ نظر اور کھوسٹ پن کا معراج ہے۔ الہ آباد کے اخبار "لیڈر" نے جو لبرل اخبار [illegible]

(۱) وگ انگلستان کی پرانی حریت پسند اور ٹوری قدامت پسند پارٹی کا نام تھا۔

میں سب سے کم رہے۔ پار سال ایک اڈیٹوریل میں لکھا تھا جس سے اصل صورت حال خوب ظاہر ہوتی ہے۔ اس میں بیان کیا تھا کہ بڑے اور غیر معمولی صفات کے لوگ ہمیشہ دنیا کے سر بلا میں لوٹے ہیں اور اس لئے معمولی اوسط قابلیت کے آدمیوں کو ان پر ترجیح دینا چاہئے۔ کس دیدہ دلیری سے یہاں کند ذہنی اور سست روی کا جھنڈا لہرایا گیا ہے۔

میانہ روی، قدامت پسندی، خطرے اور اچانک تبدیلی سے بچنے کی خواہش ایسی خصوصیتیں ہیں جو بڑھاپے کے ساتھ لگی ہوئی ہوتی ہیں اور اکثر کے لئے ان میں مبتلا ہو جانا لازمی ہے۔ نوجوانوں میں ان کا ہونا اتنا مناسب نہیں لیکن ہمارا ملک پرانا ہے اور کبھی کبھی تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے یہاں بچے تک تھکے ماندے پیدا ہوتے ہیں اور ان کے چہروں پر پھیکا پن اور بڑھاپے کے آثار نظر آتے ہیں لیکن اس پرانے ملک کو بھی وہ قوتیں جو زندگی کو بدلتی ہیں اٹھنے نہیں دے رہی ہیں۔ اور میانہ روی کا فلسفۂ حیات درہم برہم ہو گیا ہے پرانی دنیا دم توڑ رہی ہے اور لبرل لوگوں کی ساری میٹھی میٹھی معقول پسندی سے اس میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ طوفان، سیلاب اور زلزلے کسی کی دلیلیں نہیں سنتے۔ لبرلوں نے اب تک جن تصورات پر اپنے عقیدے اور عمل پر مبنی کیا تھا وہ سب جواب دے رہے ہیں اور ان میں اب اتنی ہمت نہیں ہے کہ غور و فکر اور عمل کے لئے نئی راہیں نکالیں۔ ڈاکٹر اے این وائٹ ہیڈ یورپ کی تہذیبی روایات کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں "ان تمام نظریات کو اس مفروضے نے ختم کر دیا ہے کہ ہر نسل کم و بیش اسی ماحول میں اپنی زندگی گذارے گی جس میں کہ پچھلی نسلوں نے گذاری تھی۔ اور اس ماحول کو اسی وقت تشکیل کے ساتھ اپنی اولاد کی زندگی پرانے سانچے میں ڈھالنے کے لئے چھوڑ جائے گی۔ ہم

انسانی تاریخ کے اس دور میں رہتے ہیں جب کہ پہلی بار یہ فرضیہ غلط ثابت ہوا ہے " ڈاکٹر وائٹ ہیڈ نے اپنی تشریح میں بہت زیادہ نرمی سے کام لیا ہے۔ اس لئے کہ یہ فرضیہ ایک ہمارے زمانے کے لیے نہیں بلکہ ہمیشہ غلط رہا ہے۔ اگر یورپی روایات میں بھی قدامت پسندی ہے تو ہماری روایات میں قدامت پسندی سے بھی کچھ اور زیادہ ہے۔ لیکن جب تغیرات کا وقت آتا ہے تو زندگی کی تشکیل نو میں ان روایات کا ذرا بھی خیال نہیں کیا جاتا ہے۔ ہم بے بس کھڑے دیکھتے رہتے ہیں اور اپنے منصوبوں کی ناکامی کا الزام دوسروں پر لگاتے ہیں اور یہ کیفیت کہ مسٹر جیرالڈ ہرڈ نے دکھایا ہے " خود فریبی کی سب سے تباہ کن صورت ہے یہ اس تصور کو ذہن میں قائم کر دیتی ہے کہ ہماری تدبیریں کارگر نہیں ہوتیں تو یہ ہماری تدبیروں کا قصور نہیں بلکہ کسی دوسرے کا جان بوجھ کر ہمارے کام کو بگاڑنے کا نتیجہ ہے۔"

ہم سب اس افسوسناک خود فریبی میں مبتلا ہیں۔ کبھی کبھی مجھے خیال ہوتا ہے کہ گاندھی جی بھی اس سے بالکل بچے ہوئے نہیں ہیں۔ لیکن ہم کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہیں اس کی کوشش کرتے ہیں کہ زندگی کی حقیقتوں سے غافل نہ ہو جائیں۔ ہمارے تجربے اور ہماری غلطیاں کبھی کبھی اس خود فریبی کے زور کو کم کر دیتی ہیں اور ہم ٹھوکریں کھاتے ہوئے آگے بڑھتے رہتے ہیں لیکن لبرلوں میں یہ مرض ہمارے مقابلے میں کہیں زیادہ شدید ہے وہ غلطی کرنے کے ڈر سے کچھ کرتے ہی نہیں۔ گرنے کے ڈر سے جگہ ہی سے نہیں ہٹتے۔ عوام کے ساتھ وہ تعلقات قائم نہیں کرتے۔ جو دماغ اور حوصلہ کی درستی کے لئے ضروری ہیں اور آپ تصورات کی کوٹھریوں میں اس طرح بیٹھے رہتے ہیں گویا ان پر کسی نے جادو کیا ہے یا خود انھوں نے اپنے آپ کو ہلنے جلنے کی قوت

سے محروم کر دیا ہے۔ کوئی ڈیڑھ سال ہوا سری نواس شاستری صاحب نے اپنے لبرل بھائیوں کو خبردار کرنے کے لیے کہا تھا کہ یہ نہ ہو کہ آپ الگ کھڑے رہیں اور بس جو کچھ ہوتا ہو اسے ہونے دیں۔ اس آگاہی کا پورا مطلب شاید سری نواس شاستری صاحب خود بھی نہیں سمجھے۔ ان کا غور و فکر حکومت کی کارروائیوں تک محدود ہے اور دراصل ان دستوری تغیرات کی طرف اشارہ کر رہے تھے جنھیں مختلف سرکاری کمیٹیاں عمل میں لانے کی تدبیریں کر رہی تھیں۔ لیکن لبرلوں کی بدقسمتی یہ ہے کہ جب ان کی اپنی قوم کے لوگ قدم بڑھائے آگے چلے جا رہے تھے تب بھی وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے۔ وہ اپنے ملک کے عوام سے ڈرتے تھے۔ انھوں نے اپنے اور عوام کے درمیان خلیج کا پیدا ہونا گوارا کیا مگر حاکموں سے نہیں بگاڑی۔ پھر کیا تعجب ہے کہ وہ اپنے دیس میں پردیسی بن گئے۔ زندگی کا قافلہ گزر گیا اور انھیں الگ کھڑے چھوڑ گیا۔ اس وقت جب ان کے ملک والے جان اور آزادی کے لیے جی توڑ کر لڑ رہے تھے تو اس میں کسی کو شک نہیں تھا کہ لبرل زمانے کے کس طرف ہیں۔

زمانے کے دوسری طرف سے وہ ہمیں اچھے مشورے دے رہے تھے اور بڑی سنجیدگی سے ایسے اخلاقی اصول بیان کر رہے تھے جنھیں ہر کوئی جانتا ہے۔ اور جنھیں سن کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی گاڑھا لیس دار روغن ہمارے منہ پر لیپ رہا ہے۔ گول میز کانفرنسوں میں حکومت برطانیہ کے ساتھ ان کے اتحاد عمل نے حکومت کو جو اخلاقی تقویت پہنچائی اس کا خاصہ اثر ہوا۔ اگر وہ اتحاد عمل سے انکار کرتے تو اس سے ضرور فرق پڑتا۔ یہ بات قابل غور ہے کہ ان کانفرنسوں میں سے ایک میں برطانیہ کی لبرل پارٹی شریک نہیں ہوئی۔ مگر ہمارے لبرلوں کو بھلا کون چیز روک سکتی تھی۔ ان سے بعض

انگریزوں نے بھی درخواست کی کہ آپ شریک نہ ہوں، پر وہ نہ مانے۔ ہم سب میانہ رو یا انتہا پسند ہوتے ہیں، کوئی کم کوئی زیادہ۔ کبھی غرض کے لیے کبھی کسی کے لیے۔ اگر ہمارا دل کسی بات میں لگا ہے تو اس کا ہمارے جذبات پر اثر ہوگا۔ ہر معاملے میں جہاں اس سے بحث ہوگی ہم نرمی کی بہ نسبت گرمی کی طرف مائل ہوں گے۔ جب ایسا نہ ہو تو اس میں ہمارا کوئی نقصان نہیں اگر ہم خوشی کے ساتھ رواداری برتیں اور ایک فلسفیانہ میانہ روی اختیار کریں جس کا اصل مقصد بے خلقی پر پردہ ڈالنا ہوتا ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ نرم سے نرم موڈریٹ نہایت انتہا پسند اور زہر اگلنے پر آمادہ ہو گئے ہیں۔ جب یہ تجویز پیش ہوتی ہے کہ ملک کے کوئی مستقل حقوق یا املاک وغیرہ مٹا دیے جائیں ہمارے لبرل دوست ایک حد تک خوش حال اور دولت مند لوگوں کے نمائندے ہیں۔ ان کا سوراج کے لیے انتظار کرتے ہیں کوئی حرج نہیں اس لیے وہ سوراج کے معاملے میں برانگیختہ نہیں ہوتے۔ لیکن بنیادی معاشرتی اصلاح کی ہر تجویز انھیں ہمیشہ ہی گھبرا دیتی ہے۔ وہ اپنی میانہ روی بھول جاتے ہیں اور دوسرے کی بات ماننے پر خوشی سے آمادہ بھی نہیں ہوتے۔ یعنی ان کی میانہ روی دراصل اس رویہ تک محدود ہے جس کا تعلق برطانوی حکومت ہند سے ہے اور وہ اپنے دل میں اس امید کی پرورش کر رہے ہیں کہ اگر وہ ادب سے بات کرتے اور سمجھوتہ پر آسانی سے راضی ہوتے رہے تو شاید انھیں اس نیک چلنی کے بدلے میں شنوائی کا شرف بخشا جائے۔ ان کے لیے انگریزوں کی رائے تسلیم کرنا ناگزیر ہے۔ وہ نیلی کتابوں کا شوق اور انہماک سے مطالعہ

کرتے ہیں۔ برنکو ہے کی تصنیف "پارلیمنٹ کے رواج" اور اسی قسم کی دوسری کتابیں ہر وقت ان کے پاس رہتی ہیں۔ اور کوئی نئی سرکاری رپورٹ شائع ہوئی ہے تو ان کے یہاں بڑی چہل پہل ہوتی ہے اور خیالی گھوڑے دوڑائے جانے لگتے ہیں۔ لبرل لیڈر جب انگلستان سے واپس آتے ہیں تو ایک عجیب پر اسرار انداز سے وائٹ ہال کے بڑے آدمیوں کی کارروائیوں کا حال بیان کرتے ہیں۔ کیونکہ وائٹ ہال لبرلوں، جوابی تعاونیوں اور ایسی جماعتوں کا بیکنٹھ ہے پہلے کہا جاتا تھا کہ جب نیک امریکن مرتے ہیں تو ان کی روحیں پیرس پہنچتی ہیں اور اب ممکن ہے کہ اچھے لبرلوں کی روحیں وائٹ ہال کے گرد و نواح میں گشت لگاتی ہوں۔

میں لکھ تو رہا ہوں لبرلوں کے متعلق، لیکن یہ سب ہم لوگوں کے متعلق بھی، جو کانگریس ہیں کہا جا سکتا ہے۔ جوابی تعاون والوں کی نسبت یہ اور بھی زیادہ صحیح ہے۔ کیونکہ وہ میانہ روی میں لبرلوں سے بھی دو قدم آگے ہیں۔ معمولی لبرل اور معمولی کانگریسی میں بہت بڑا فرق ہے لیکن دونوں کی ایسی حد بندی نہیں کی جا سکتی جو صاف ہو اور مغالطہ کی گنجایش نہ چھوڑے۔ کیونکہ خیالات اور تصورات کو دیکھئے تو ان لبرلوں میں جو اپنی جماعت میں سب سے زیادہ آزاد خیال ہیں، اور میانہ رو کانگریسیوں میں ایک کو دوسرے پر برتر ثابت کرنا مشکل ہے۔ لیکن گاندھی جی کی بدولت یہ تو ہو گیا ہے کہ ہر کانگریسی کا اپنی سرزمین اور ملک کے رہنے والوں سے تھوڑا بہت تعلق ہو گیا ہے۔ اس نے سیاسیات کے میدان میں ہاتھ پیر مارنے کی کوشش کی ہے اور اس طرح وہ مبہم اور ناقص تصورات کے چند برے نتیجوں سے بچ گیا ہے۔ لبرلوں کا حال کچھ اور ہے۔ ان کا رشتہ پرانی دنیا سے بھی ٹوٹ گیا ہے اور نئی دنیا سے بھی۔ مجموعی حیثیت سے وہ انسان کی ان قسموں میں سے ہیں جو اب ناپید ہو رہی ہیں۔

میں سمجھتا ہوں ہم میں سے اکثر ان احساسات کو کھو چکے ہیں جو مذہبوں کے عروج سے پہلے انسان کی رہبری کرتے تھے اور بصیرت کی نئی شکل ہمیں حاصل نہیں ہوئی ہے۔ ہماری قسمت میں نہ پروٹیس[1] کو سمندر سے نکلتے ہوئے دیکھنا ہے نہ بوڑھے ٹرٹین کو اپنا پیچ دار سنکھ بجاتے سننا" اور بہت تھوڑے ہی ایسے خوش قسمت ہیں کہ

"ریت کے ذرے میں ایک دنیا دیکھ سکیں
اور ایک جنگلی پھول میں فردوس کا سماں
فضائے لامحدود کو ہتھیلی پر رکھ سکیں
اور ایک گھڑی میں ابدیت محسوس کر لیں"

ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم میں سے اکثر فطرت کی رگوں میں خون کو دوڑتے پھرتے نہیں محسوس کر سکتے۔ نہ اپنے کان کے پاس اس کے دھیمے بول سن سکتے ہیں، نہ اس کے چھونے سے ہمارے جسم میں مسرت کا لرزہ آتا ہے۔ وہ دن تو گئے، لیکن اگر ہم پہلے کی طرح فطرت میں عظمت کے آثار نہیں دیکھ سکتے تو ہم نے نوع انسانی کی فتح اور شکست میں اس کے زبردست خوابوں اور اندرونی طوفانوں میں اس کے تڑپا دینے والے درد اور اس کی ناکامیوں میں اس کی کشمکش اور اس کی مصیبتوں میں اور اس یقین میں جو اور سب کیفیتوں پر چھایا رہتا ہے اور اس کا عظیم الشان مقصد اور اس کی آرزوئیں پوری ہوں گی یہی چیز دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ یہ ایک طرح سے معاوضہ ہے ان تمام دل شکنیوں کا جو ایسی کوشش اور جستجو کے ساتھ لگی ہوتی ہیں

---

[1] پروٹیس اور ٹرٹین یونانیوں کے دریائی دیوتا تھے۔

اور اس نے ہمیں اکثر حقیر حوصلوں کو بھلا کر بلندی کی طرف مائل کیا ہے۔ لیکن بہتیرے ایسے ہیں جنھوں نے انسانی سرگذشت میں حقیقت کو تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی ہے اور چونکہ انھوں نے پرانی وضع کو چھوڑ دیا ہے انھیں اب کسی طرف کوئی راہ نظر نہیں آتی اور نہ بہتر زندگی کے خواب دیکھتے ہیں نہ ان میں عمل کی صلاحیت ہے۔ ان کی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ فرانس کے بڑے انقلاب میں اور روسی انقلاب میں نوع انسانی نے کس طرح بےتاب ہو کر پلٹے کھائے۔ نوعِ انسانی کی وہ خواہشیں جو مدتوں سے دبی ہوئی ہیں جب اپنی تمام ہیبت ناکیوں اور عظمت کو آتش کی طرح اچانک اور بے دردی کے ساتھ آگ برسانے لگتی ہیں تو وہ ڈر جاتے ہیں۔ ان کے نزدیک نوعِ انسانی نے اپنے قید خانے کی ایک دیوار بھی نہیں گرائی ہے۔

لوگ خود پسندی کے غصہ میں اکثر کہتے ہیں کہ "وطن پرستی کانگریسیوں کا اجارہ نہیں ہے" یہی فقرہ بار بار اس طرح دہرایا جاتا ہے کہ آدمی یہی بات سننے سے مایوس ہو کر پریشان ہو جاتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ کسی کانگریسی نے اس جذبہ میں اکیلی دونی کے حصے دار ہونے کا دعویٰ نہ کیا ہو گا۔ بہر حال میں اسے ہرگز کانگریس کا اجارہ نہیں سمجھتا اور جو کوئی بھی چاہتا ہو میں خوشی سے اسے اس کے حوالے کر دوں گا۔ وطن پرستی اکثر ان لوگوں کی جائے پناہ ہوتی ہے جو موقع سے فائدہ اٹھانا یا اپنی حیثیت بنانا چاہتے ہیں اور ہر مذاق اور غرض اور طبقے کے لوگوں کے لئے اس کی ایک مناسب قسم مل جاتی ہے۔ اگر حضرت عیسٰی کا دنا چیلا جس نے انھیں دغا دی تھی آج ملک ہوتا تو وہ بھی وطن پرستی کی آڑ لیتا۔ وطن پرستی اب کافی نہیں رہی ہو ہمیں اب اس سے برتر، اس سے وسیع تر اور بلند تر مسلک درکار ہے۔

میانہ روی بذاتِ خود بھی کافی نہیں۔ ضبط اچھی چیز ہے اور ہماری شائستگی کا اسی سے اندازہ کیا جاتا ہے۔ لیکن ضبط کے ساتھ وہ بھی تو چاہیئے کہ جسے روکے گئے اور قابو میں رکھئے۔ انسان کی قسمت میں ازل سے مقدر ہے کہ وہ عناصر قدرت کو قابو میں لائے۔ بجلی پر سوار ہو، آگ کے لپکتے ہوئے شعلوں اور پانی کے تیز اور ابلتے دھاروں کو اپنے کام میں لائے۔ لیکن اس کے لئے سب سے زیادہ مشکل ان جذبات کی روک تھام کرنا اور انھیں قابو میں لانا ہے جو اس کے اندر امنڈتے اور ابلا کرتے رہتے ہیں۔ جب تک وہ انھیں اپنے قبضے میں نہ کرلے وہ انسانیت کے پورے ورثہ کا حق دار نہیں ہو سکتا۔ لیکن کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم ان ٹانگوں کو آگے نہ بڑھائیں جو خود چلنے سے معذور ہیں، ان ہاتھوں سے کام نہ لیں جن پر فالج گرا ہے؟

اس موقع پر رائے کیمپل کے چار مصرعے لکھے بغیر نہیں رہا جاتا جو اس نے جنوبی افریقہ کے چند ناول نویسوں پر کہے تھے۔ یہ ہندوستان کی بعض سیاسی جماعتوں پر بھی اسی طرح پورے اترتے ہیں۔

لوگ اس بات کی تعریف کرتے ہیں کہ تمہارے ضبط پر کوئی جذبہ غالب نہیں آسکتا۔
اس معاملے میں مجھے تم سے پورا اتفاق ہے۔
تم لگام اور دہانے کو تو خوب استعمال کرتے ہو۔
مگر یہ تو بتاؤ کہ گھوڑا کم بخت کہاں ہے؟

ہمارے لبرل دوست کہتے ہیں کہ وہ اعتدال کے تنگ راستے پر چلتے ہیں اور کانگریس اور حکومت ہند کے دونوں کناروں کے بیچ میں اپنی کشتی کو چلاتے ہیں۔ انھوں نے اس کا فیصلہ کرنا اپنے ذمے لے لیا ہے کہ اس میں یا اس میں کون سی خامی ہے۔ اور اس بات پر اپنی [illegible] کر گئے ہیں کہ ان میں میانہ اس کے

عیب ہیں نہ اس کے۔ وہ ترازو اپنے ہاتھ میں رکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور انصاف کی دیوی کی طرح شاید وہ اپنی آنکھیں بند رکھتے ہیں۔ یا ان پر پٹی باندھ لیتے ہیں۔ کیا میرا یہ خیال ہی ہے جو مجھے صدیوں پیچھے لے جاتا ہے اور مجھے یہ مشہور کلمے سناتا ہے۔

"عالموں اور خود پسند عابدو!....... تم اندھے رہبر ہو کہ ایک گناہ سے جو اونٹ کے برابر ہو چشم پوشی کر سکتے ہو اور ذرا ذرا سی بات تمھاری نظروں میں کھٹکتی ہے!"

(۵۲)

درجۂ نوآبادی اور کامل آزادی

پچھلے سترہ برس میں جن لوگوں نے کانگریس کی سیاست طے کی ہے وہ بیشتر متوسط طبقہ کے لوگ تھے۔ خواہ وہ لبرل ہوں ہوں یا کانگریسی۔ وہ تھے ایک ہی طبقے کے لوگ اور انھوں نے ایک سے ماحول میں تربیت پائی تھی۔ انکی زندگی ان کا میل جول، ان کے تعلقات ایک ہی رنگ کے تھے۔ اور بورژوا[1] نصب العین کی دو قسمیں جن سے انھیں الگ الگ عقیدت تھی۔ البتہ انہیں یوں سمجھئے کہ ایک ہی سے تھے۔ مزاج اور طبیعت کے اختلاف نے ان کو ایک دوسرے سے علیحدہ کر دیا اور ان کے نقطۂ نظر کو بدل دیا۔ ایک گروہ کی نگاہ حکومت اور متوسط طبقے کے سربرآوردہ ان دار آدمیوں کی طرف اٹھی۔ دوسرے کی متوسط طبقے کے کم حیثیت والے حصے کی طرف جھکی۔ ان کے خیالات در اصل ایک سے تھے۔ ان کے مقاصد میں کوئی فرق نہ تھا۔ لیکن دوسرے گروہ کو بازار کے ادنیٰ پیشوں کے لوگوں اور تعلیم یافتہ مگر بے روزگار آدمیوں کی کثیر تعداد پیچھے سے ڈھکیلنے لگی۔ ان کا لہجہ بدل گیا۔

---

[1] بورژوا (Bungeois) کے اصلی معنی ہیں متوسط طبقہ کے لوگ لیکن اشتراکی ادب میں اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو چاہے خود بڑے سرمایہ دار نہ ہوں مگر سرمایہ داری کے معاشرتی نظام اور تہذیب کو قائم رکھنا چاہتے ہیں اور اسی طرح وہ ہر اس شخص کے لئے استعمال ہو سکتا ہے جو اشتراکی نہ ہو۔

انھوں نے مراتب کا لحاظ اور ادب سے بات کرنا چھوڑ دیا اور زور سے اور بڑھ چڑھ کر بولنے لگے۔ ان میں اتنی طاقت نہ تھی کہ عمل میں تاثیر پیدا کریں۔ اس لئے انھوں نے سخت کلامی کر کے کچھ تسکین حاصل کی۔ سیاسیات کو اس طرح کروٹ بدلتے دیکھ کر اعتدال پسند (موڈریٹ) ڈر گئے۔ انھوں نے اس دوڑ میں شریک ہونے کا خیال چھوڑ دیا اور تنہائی کو سلامتی جانا۔ اس حالت میں بھی کانگریس کے اندر متوسط طبقے کے اونچے درجے کے نمائندوں کی تعداد بہت تھی۔ اگرچہ اکثریت انہیں کی رہی جو ادنیٰ درجے کے تھے ان کو ادھر یہی ایک حوصلہ کھینچ کر نہیں لایا کہ قوم کو جنگ میں کامیابی ہو بلکہ وہ اس جنگ کے ذریعہ اپنے دل کی ایک خواہش بھی پوری کرنا چاہتے تھے۔ وہ اس کی بدولت اپنی کھوئی ہوئی آبرو اور خودداری حاصل کرنا اور اپنی بگڑی حیثیت کو بنانا چاہتے تھے۔ قومیت کا جذبہ عام طور سے اسی طرح ابھرتا ہے اور اگرچہ چھوٹے بڑے ہر خیال کے لوگوں میں یکساں پائی جاتی تھیں۔ اعتدال اور انتہا پسندوں کے مزاج کا فرق یہیں پر ظاہر ہوا۔ آہستہ آہستہ متوسط طبقہ کا ادنیٰ درجہ کانگریس پر حاوی ہو گیا اور اس کے بعد کسانوں کا اثر بھی محسوس ہونے لگا۔

جیسے جیسے کانگریس دیہاتی آبادی کی نمائندگی کرنے لگی، اس کے اور لبرلوں کے درمیان جو خلیج حائل ہو گئی تھی وہ بڑھتی گئی یہاں تک کہ لبرلوں کے لئے کانگریس کا نقطۂ نظر سمجھنا اس قدر پہچاننا ناممکن سا ہو گیا۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھنے والے بڑے آدمی کے لئے پھونس یا مٹی کے جھونپڑے میں زندگی بسر کرنے والے کی بات سمجھنا مشکل ہے۔ لیکن ان اختلافات کے باوجود دونوں کا فلسفہ قومی اور بورژوا تھا یا فرق جو تھا وہ قسم کا نہیں تھا، شدت کا تھا بہت سے لوگ جو لبرل جماعت میں بے تکلفی سے کھپ سکتے تھے آخر وقت تک کانگریس میں رہے۔

کئی پشتوں تک انگریز ہندوستان کو اسی وضع کا ایک بہت بڑا

زمینداروں کا گھر سمجھتے رہے جیسے کہ اگلے زمانہ میں انگلستان میں ہوتے تھے۔ وہ گویا میاں لوگ تھے جو اس مکان کے مالک تھے اور اس کے سب سے اچھے حصوں میں رہتے تھے۔ اور ہندوستانی ملازموں کی طرح شاگرد پیشے برتن دھونے کے کمرے اور باورچی خانے میں رکھ دئے گئے تھے۔ ہر باضابطہ زمیندار گھرانے کی طرح جن میں ملازموں کے مراتب مقرر ہوتے ہیں یعنی خانساماں منتظم، باورچی، خادمہ، سائیس وغیرہ۔ ویسے ہی یہاں کا بھی قاعدہ تھا اور اس کا بہت خیال رکھا جاتا تھا کہ کس کا درجہ بڑا ہے کس کا کم لیکن اس گھرانے کے اعلیٰ اور ادنیٰ طبقہ کے درمیان معاشی اور سیاسی تفاوت تھا جس کا مٹنا ناممکن تھا ہمیں اس بات پر تعجب نہ کرنا چاہئے کہ برطانی حکومت نے ایسے انتظام کو ہمارے اوپر مسلط کیا تعجب کی بات یہ ہے کہ ہم نے یا ہم میں سے ایک بڑی تعداد نے اسے منظور کر لیا اور اسے اپنی زندگی یا اپنے مستقبل کا ایک قدرتی اور لازمی نظام سمجھا ہم میں وہی ذہنیت پیدا ہو گئی جو ایک زمیندار گھرانے کے اچھے نوکر کی ہوتی ہے کبھی کبھی ہمیں یہ انوکھی عزت بخشی جاتی تھی کہ ڈرائنگ روم میں چائے کی ایک پیالی پینے کو دے دی جاتی تھی اور ہمارے حوصلہ کی انتہا یہ تھی کہ شریف سمجھے جائیں اور فرداً فرداً ترقی کر کے اعلیٰ طبقہ میں پہنچ جائیں۔ انگریزوں کا ہماری طبیعتوں کو اس طرح قابو میں کر لینا ایک کارنامہ تھا۔ جس کی عظمت ان کے تدبر اور ان کی فوج کی کامیابیوں سے زیادہ تھی۔ جیسا کہ اگلے زمانے کے حکما نے کہا ہے۔ غلام کے دماغ میں غلامی سرایت کر گئی وہ غلام کی طرح سوچنے بھی لگا۔

زمانہ بدل گیا ہے اب اس وضع کی تہذیب جس کا نمونہ انگریز زمینداروں کا گھرانا تھا انگلستان میں خوشی سے تسلیم کی جاتی ہے نہ ہندوستان میں، پھر بھی ہم میں ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو شاگرد پیشہ ہیں انھیں رہنا چاہتے

ہیں اور ملازمت کی سنہری پیٹیوں اور وردیوں پر ناز کرتے ہیں۔ دوسرے ہیں جو لبرلوں کی طرح اس زمینداروں کے گھر اور اس کے تمام لوازمات کو قابل قبول سمجھتے ہیں۔ عمارت اور طرز تعمیر کی تعریف کرتے ہیں لیکن اس کی امید رکھتے ہیں کہ ایک ایک کرکے خود اس کے مالکوں کی جگہ لے لیں گے۔ اسے وہ "ہندوستانی بنانا" یا "ہندیانہ" کہتے ہیں۔ ان کے نزدیک اصل مسئلہ یہ ہے کہ نظام حکومت کا رنگ بدل جائے یا زیادہ سے زیادہ کوئی نیا انتظام کیا جائے۔ بالکل نئی ریاست قایم کرسکنے کا تو یہ تصور بھی نہیں کرسکتے۔

ان کے لئے سوراج کے معنی یہ ہیں کہ ہر چیز پہلے کی سی حالت پر قایم رہے بس رنگ زیادہ گہرا ہو جائے۔ مستقبل کا بھی ایک نقشہ ان کے ذہن میں آسکتا ہے کہ وہ یا انھیں کے سے لوگ سیاسی ڈرامہ کا خاص پارٹ کریں اور اعلیٰ انگریز عہدہ داروں کے عہدے حاصل کریں۔ ملازمتوں، سرکاری محکموں، قانون ساز مجلسوں، تجارت، صنعت سب کی صورت یہی رہے۔ سول سروس والے اپنے کام میں لگے رہیں۔ راجہ مہاراجہ اپنے محلوں میں براجتے رہیں۔ اور کبھی کبھی فینسی ڈریس یا ناچ رنگ کے لباس، جواہرات کی چمک سے اپنی رعایا کو مرعوب کرنے کے لئے جلوہ افروز ہوں یا زمیندار ایک طرف خاص تحفظ کا مطالبہ کرتے اور دوسری طرف کاشتکاروں کو ستاتے رہیں۔ یا ساہوکار اپنی روپیوں کی تھیلیاں لئے زمیندار اور کاشتکار دونوں کی زندگی دوبھر کرتا رہے یا وکیل اپنی فیس وصول کرتے اور خدا اپنے آسمان پر رہے۔

اصل میں ان لوگوں کے فلسفہ کی بنیاد موجودہ صورت حال قایم رہنے پر ہے اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ جو تبدیلیاں وہ چاہتے ہیں۔ وہ بس شخصی ہیں۔ ان تبدیلیوں کو وہ انگریزوں کی رضامندی سے آہستہ آہستہ عمل میں لانا چاہتے

ہیں، جیسے کوئی چیز چھن کر قطرہ قطرہ آتی ہے۔ ان کی سیاسیات اور معاشیات کا دارومدار برطانوی سامراج کے استحکام اور بقا پر ہے۔ ان کے نزدیک اس سامراج کو کم سے کم ایک بڑی مدت تک زوال نہیں آ سکتا۔ انھوں نے اپنے آپ کو اسی کے مطابق ڈھال لیا ہے اور وہ اس کے سیاسی اور معاشی فلسفے ہی کو بجا تسلیم نہیں کرتے بلکہ اس کے اخلاقی معیار کو مانتے ہیں جو برطانوی تسلط کے قیام کو مدّ نظر رکھ کر مقرر کیا گیا ہے۔

اس رویہ سے کانگریس کا رویہ بالکل مختلف ہے۔ اس لئے کہ کانگریس انتظام حکومت کو بدلنا ہی نہیں بلکہ ایک نئی ریاست کی طرح ڈالنے کی فکر میں ہے۔ اس نئی ریاست کا نقشہ اوسط قابلیت کے کانگریسیوں کے ذہن میں بالکل صاف نہیں ہے اور لوگ اپنی اپنی رائے رکھتے ہیں۔ مگر سوا چند لوگوں کے جو ایک سرے پر ہیں اور میانہ روی کے قائل ہیں۔ کانگریسی عام طور سے اس پر متفق ہیں کہ موجودہ حالات اور طرز عمل نہ جاری رہ سکتا ہے اور نہ رہے گا۔ بنیادی تبدیلیاں کرنا ناگزیر ہے۔ اسی میں ہمیں درجۂ نوآبادی اور کامل آزادی کا فرق ظاہر ہوتا ہے۔ درجہ نوآبادی میں پرانے معاشرتی نظام کا باقی رہنا اور انگلستان کے معاشی نظام سے ہمارا ظاہری اور پوشیدہ زنجیروں سے جکڑے رہنا فرض کیا جاتا ہے۔ آزادی میں ہمیں اس کا اختیار ہو گا یا ہونا چاہیے کہ ہم اپنی ضروریات کے مطابق ایک نیا نظام تعمیر کریں۔

اس سے مراد یہ نہیں کہ انگلستان یا انگریزی قوم سے ایسی عداوت برتی جائے جسے کم یا دور کرنے کی گنجائش نہ ہو اور نہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم اس سے قطع تعلق کرنے کی خواہش کو ہر طرح کا نقصان اٹھا کر پورا کریں۔ گذشتہ واقعات کو دیکھتے ہوئے انگریزوں اور ہندوستانیوں کے درمیان بغض و کینہ

کا ہونا ایک تعارفی بات ہے۔ ٹیگور نے کہا ہے کہ بے سلیقہ طاقت کنجی کو خراب کر کے کلہاڑی سے تالا کھولتی ہے" ہمارے دلوں کی کنجی بنیں ہوئیں کہ توڑ ڈالی گئیں اور انگریزوں سے ہمیں اس بناء پر رغبت ہو نہیں سکتی تھی کہ انھوں نے اس کنجی کی جگہ بے تکلف کلہاڑی سے کام لیا۔ لیکن اگر ہمارا حوصلہ یہ ہے کہ چھوٹی باتوں سے گذر کر ہندوستان اور نوعِ انسان کی بڑی خدمات انجام دیں تو ہمارے سے اس کا موقع نہیں ہے کہ اپنے آپ کو وقتی جوش کے حوالے کر دیا اور اگر ہم اس طرف مائل بھی ہوں تو وہ سخت تربیت جو گاندھی جی پندرہ برس سے دے رہے ہیں ہمیں روک لے گی۔ میں یہ باتیں انگریزوں کے بنائے ہوئے جیل خانے میں بیٹھا لکھ رہا ہوں۔ سات مہینے سے میرے دل میں طرح طرح کے اندیشے پیدا ہو رہے ہیں اور جتنی تکلیف مجھے اس قید تنہائی میں ہوئی اتنی جیل میں پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ بہت سے واقعات سے میرا دل غصہ اور عداوت سے بھر آیا ہے۔ لیکن میں اپنے دل کی گہرائیوں میں ڈھونڈھتا ہوں تو وہاں مجھے انگلستان یا انگریزوں سے عداوت کا کوئی پتہ نہیں ملتا۔ مجھے برطانوی ملوکیت سے نفرت ہے اور مجھے اس پر غصہ آتا ہے کہ ہندوستان اس کا شکار ہوا ہے۔ مجھے سرمایہ داری کے نظام سے نفرت ہے اور جس طرح برطانیہ کے حاکم طبقے ہندوستان کا خون چوستے ہیں اس سے مجھے اور بھی نفرت ہے۔ اور اس پر بہت زیادہ غصہ آتا ہے۔ لیکن میں انگلستان یا تمام انگریزی قوم کو اس کا ذمہ دار نہیں ٹھیراتا۔ اگر میں ایسا کرتا بھی تو اس سے کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ اس لئے کہ پوری قوم کی قوم سے خفا ہو جانا یا اسے ملزم قرار دینا کس قدر حماقت کی بات ہے۔ وہ بھی حالات سے اتنی ہی مجبور ہوتی ہے جتنے کہ ہم۔

اپنی نسبت میں کہہ سکتا ہوں کہ انگلستان کا میری ذہنی ساخت پر اتنا زیادہ اثر ہے کہ میں اس سے کبھی بھی پوری علیحدگی نہیں برت سکتا۔ میں چاہے جتنی کوشش کروں، میں ان ذہنی عادتوں، اس معیار اور دوسری قوموں اور عام زندگی کے بارے میں رائے قائم کرنے کے ان طریقوں سے جو میں نے انگلستان کے اسکول اور کالج میں سیکھے تھے پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔ سیاسی معاملات کے سوا میرے ذہنی میلانات بھی مجھے انگلستان کی طرف مائل کرتے ہیں اور اگر میں ہندوستان میں انگریزی حکومت کا ایسا کٹر مخالف ہوگیا ہوں جو کسی مصالحت پر راضی نہیں ہوسکتا تو اس سے میری تربیت اور طبیعت کا کوئی قصور نہیں۔ انگریزوں کی قوم نہیں بلکہ یہ حکومت، یہ تسلط اصل چیز ہے جس پر ہمیں اعتراض ہے اور اسی سے ہم خوشی سے مصالحت کرنے پر تیار نہیں ہوسکتے۔ ہم چاہیں تو انگریزوں سے اور دوسری غیر قوموں سے ضرور گاڑھا میل جول رکھ سکتے ہیں۔ ہندوستان میں ہم کو تازی ہوا چاہیے۔ تازے اور جاں بخش خیالات اور ایسا اتحاد عمل جس سے ہماری سیرت کو نقصان نہ پہنچے، کیونکہ ہم سنبھل گئے ہیں، ہمارے خیالات بوسیدہ ہو گئے ہیں، لیکن اگر انگریز مشیر بن کر آنا چاہیں تو انہیں دوستی یا اتحاد عمل کی توقع نہ رکھنی چاہیے۔ ملوکیت کے مشیر کا اسی کی سی بے دردی سے مقابلہ کیا جائے اور آج ہمارے ملک کا اس خوں خوار جانور سے سابقہ ہے جنگل کے وحشی چیتے کو سدھانا اور اس کی خلقی خونخواری کو تربیت کے جادو سے دور کرنا ممکن ہے لیکن جب سرمایہ داری اور ملوکیت مل جائیں اور کسی بدقسمت ملک پر چھاپا ماریں تو انہیں قابو میں کرنے کی کوئی صورت نہیں۔

کسی کا یہ کہنا کہ وہ یا اس کی قوم مصالحت نہ کرے گی ایک معنی میں بے دقوفی ہے۔ کیونکہ دنیا میں ہر وقت مصالحت کرنے پر مجبور کرتی رہتی ہے اور

جب یہ بات کسی اور قوم یا ملک کے بارے میں کہی جائے تب تو وہ صریحی حماقت ہے۔ لیکن لوگ اس پر اڑ جائیں کہ ہم فلاں نظام کو تسلیم نہ کریں گے یا فلاں صورت حال کو گوارا نہ کریں گے تو اس میں صداقت ہو سکتی ہے اور تب انھیں کوئی انسانی قوت اس پر مجبور نہیں کر سکتی کہ مصالحت کر لیں۔ ہندوستانی آزادی اور برطانوی ملوکیت ایک دوسرے کی ضد ہیں اور انھیں نہ فوجی عمل داری ہم آہنگ اور یکجا کر سکتی ہے اور نہ بروں کی ساری لیس پوت۔ ہندوستانیوں اور انگریزوں کے درمیان سچے اتحاد عمل کے لئے موافق حالات اسی وقت پیدا ہوں گے جب ہندوستان سے برطانوی ملوکیت مٹا دی جائے۔

ہم سے کہا جاتا ہے کہ آج کل کی دنیا میں جب ہر روز ایک ملک کو دوسرے کی ضرورت روز بروز زیادہ ہو رہی ہے کامل آزادی کا عقیدہ رکھنا تنگ نظری ہے اور ہم آزادی کا مطالبہ کرتے ہیں تو گویا زمانہ کی گھڑی کو پیچھے کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لبرل اور امن پرست اور برطانیہ کے وہ لوگ جو اپنے آپ کو اشتراکی کہتے ہیں سب یہی دلیل پیش کر کے ہماری تنگ نظر قومیت پر ہماری سرزنش کرتے ہیں اور ضمناً یہ خیال پیش کرتے ہیں کہ ہمارے لئے مکمل قومی زندگی کا ذریعہ برطانوی اقوام کی کامن ویلتھ ہے۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ انگلستان میں ہر رنگ کی حکمت (لبرل، امن پرست، اشتراکی وغیرہ) سامراج کے قیام کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ ٹروٹسکی نے لکھا ہے کہ "حاکم قوم کی یہ خواہش کہ ہر چیز بس اپنے حال پر قائم رہے اکثر ایک خاص انداز اختیار کرتی ہے جو اپنے کو "قومیت" کے خیال پر برتر جتاتا ہے۔ بالکل جیسے فاتح قوم مال غنیمت کو قبضہ میں رکھنے کے لئے بڑی آسانی سے امن پرست بن جاتی ہے۔ اس طرح گاندھی جی کے مقابلہ میں میکڈونلڈ اپنے آپ کو بین الاقوامی میل جول

کا کام سمجھاتے۔

مجھے معلوم نہیں کہ سیاسی آزادی حاصل کرنے کے بعد ہندوستان کیا کرے گا اور اس کا کیا حال ہوگا۔ لیکن اتنا میں جانتا ہوں کہ وہی لوگ جو آج قومی آزادی چاہتے ہیں وہی ہمارے بین الاقوامی تعلقات کو بھی زیادہ سے زیادہ وسیع کرنا چاہتے ہیں۔ اشتراکیوں کے نزدیک تو قومیت کے کوئی معنی ہی نہیں۔ لیکن وہ لوگ جو اشتراکی نہیں اور کانگریس کی اگلی صفوں میں ہیں وہ بھی بین الاقوامی میل ملاپ سے پختہ عقیدہ رکھتے ہیں۔ اگر آج ہم کامل آزادی کا مطالبہ کرتے ہیں تو اس سے ہمارا مطلب دنیا سے قطع تعلق نہیں ہے۔ اس کے برخلاف ہم تیار ہیں کہ دوسرے ملکوں کے ساتھ اپنی اس آزادی کے ایک حصہ سے دست بردار ہو جائیں تاکہ ایک بین الاقوامی نظام قائم کیا جاسکے۔ ملوکیت کا کوئی نظام، اس کا نام چاہے جتنا شاندار ہو، ایسی تنظیم کا دشمن ہوگا اور اگر ہم دنیا میں اتحاد عمل اور امن چاہتے ہیں تو اسے حاصل کرنے کے لئے ملوکیت کا نظام کبھی کام نہ آئے گا۔

حال کے واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ دنیا کے تمام سامراجی نظام خود کفالتی اور معاشی سامراج کے ذریعہ اپنے آپ کو روز بروز دوسروں سے جدا کر رہے ہیں۔ اس لئے کہ بجائے اس کے کہ قوموں کا تعلق زیادہ گہرا ہو، ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے بالکل خلاف ہو رہا ہے۔ اس کے اسباب دریافت کرنا کچھ مشکل نہیں اور ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ موجودہ معاشی نظام کمزور ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس حکمت عملی کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ جہاں اس علاقے میں جو خود کفیل ہو اتحاد عمل بڑھ جاتا ہے۔ وہاں دوسری طرف باقی دنیا سے علیحدگی بھی اختیار کرنا پڑتی ہے۔ اوٹاوا اور دوسرے فیصلوں کا اثر یہ ہوا

ہے کہ برطانوی سامراج کے سوا اور ملکوں سے ہمارے تعلقات اور میل جول میں کمی ہو رہی ہے۔ ہم پہلے سے زیادہ برطانوی صنعت کے دست نگر ہو گئے ہیں اور ان نقصانات کے علاوہ جو ہم برداشت کر چکے آگے چل کر اس حکمت عملی کے خطرے بھی ظاہر ہیں۔ معلوم تو یہ ہوتا ہے کہ درجۂ نوآبادی ہمارے بین الاقوامی تعلقات کو بڑھانے کی جگہ ہمیں الٹا اور دنیا سے جدا کر دے گا۔

مگر ہمارے لبرل دوستوں میں یہ حیرت انگیز صفت ہے کہ وہ دنیا اور خصوصاً اپنے ملک کو برطانیہ کی خالص قومی رنگ کی عینکوں سے دیکھتے ہیں۔ وہ یہ سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے کہ کانگریس کیا کہتی ہے اور کیوں کہتی ہے۔ بس انگریزوں کے اس پرانے اعتراض کو کہ آزادی درجۂ نوآبادی کے مقابلے میں تنگ ہے اور روح کو اس سے اتنا فروغ نہیں ہو سکتا دہراتے رہتے ہیں۔ ان کی بین الاقوامی دنیا بس وائٹ ہال ہے۔ اس لئے کہ دوسرے ملکوں کے بارے میں کچھ تو زبان کی دشواری کے سبب سے مگر زیادہ تر اسی وجہ سے کہ وہ دوسرے ملکوں کو اطمینان کے ساتھ نظر انداز کر سکتے ہیں انھیں مطلق کوئی علم نہیں ہوتا۔ ہندوستان کے اندر تو وہ ہر اس طرز عمل کے خلاف ہوئے ہیں جس میں حکومت کی براہ راست مخالفت ہو یا جس سے جنگ جوئی ظاہر ہوتی ہو۔ لیکن یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ ان کے بعض لیڈروں کو اس وقت کوئی اعتراض نہیں ہوتا جب کسی دوسرے ملک میں یہی طریقہ اختیار کیا جائے۔ وہ ایسی چیزوں کو دور سے سمجھ سکتے ہیں اور ان کی قدر بھی کر سکتے ہیں اور مغربی ملکوں کے کئی حاکم مطلق ہیں جنھیں ان سے ذہنی احترام اور عقیدت کا خراج ملتا رہتا ہے۔

ناموں سے غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے۔ اس وقت ہمارے سامنے اصل سوال یہ ہے کہ ہمارے پیش نظر ایک نئی ریاست ہے یا صرف ایک بدلا ہوا انتظام حکومت

لبرل اس کا جو جواب سوچتے ہیں وہ صاف ہے انھیں ایک بدلے ہوئے انتظام حکومت سے زیادہ اور کچھ نہیں چاہیے اور وہ بھی ان کے نزدیک ایک ایسی منزل مقصود ہے جہاں تک ہم ایک لمبا سفر کر کے بتدریج ہی پہنچیں گے۔ وہ کبھی کبھی درجہ نوآبادی کا ذکر کرتے ہیں لیکن فی الحال جو چیز دراصل ان کے مدنظر ہے وہ "مرکز میں ذمہ داری" کے پراسرار الفاظ سے ظاہر کی جاتی ہے۔ ایسے جوشیلے لفظ جیسے کہ طاقت، خودمختاری، حریت، آزادی انھیں نہیں بھلتے۔ ان کی تو آواز سے معلوم ہوتا ہے کہ خطرناک ہیں۔ قانون دانوں کی زبان اور بحث کا طریقہ انھیں بہت پسند ہے۔ اگرچہ ان سے عوام کے دلوں میں گرمی پیدا نہیں ہوتی۔ تاریخ میں ہمیں اس کی بے شمار مثالیں ملیں گی کہ افراد اور جماعتوں نے عقیدے اور آزادی کے لئے خطروں کا مقابلہ کیا اور جان کو بھی داؤں پر لگا دیا۔ مگر اس میں شک ہے کہ "مرکز میں ذمہ داری" یا کسی ایسی قانونی اصطلاح کی خاطر کوئی شخص کبھی جان بوجھ کر ایک وقت کا کھانا چھوڑ دے گا یا کسی کی گہری نیند ہلکی ہو جائے گی۔

یہ تو ہے ان کا مطمح نظر اور یہ مقصد حکومت کی کھلم کھلا مخالفت یا کسی طرح کی پیش قدمی کر کے حاصل نہ کیا جائے گا بلکہ جیسا کہ سری نواس شاستری صاحب نے فرمایا ہے "دانشمندی، تجربہ کاری، میانہ روی، دوسرے کو قائل کرنے کی قوت، خاموش اثر اور سچی مستعدی" کی خوبیوں کو نمایاں کر کے امید اس کی کی جاتی ہے کہ ہمارا نیک چلن اور ہمارے اچھے کام آخر کار ہمارے حاکموں کو اس پر آمادہ کر لیں گے کہ اقتدار ہمارے ہاتھ میں دے دیں۔ یعنی دوسرے الفاظ میں ہمارے حاکم آج کل ہماری مخالفت یا تو اس سبب سے کرتے ہیں کہ ہمیں لڑائی پر تلے دیکھ کر انھیں غصہ آتا ہے یا اس وجہ سے کہ انھیں ہماری استعداد پر شبہ

ہے۔ یا ممکن ہے یہ دونوں باتیں یکساں ان کے رویّہ پر اثر ڈال رہی ہوں۔
ملوکیت کی اور موجودہ حالات کی اس توضیح سے کسی قدر سادہ لوحی ظاہر ہوتی ہے۔ پروفیسر آر، ایچ ٹوٹی نے جو ایک تیز نظر انگریز مصنف ہیں۔ اس خیال کے متعلق کہ اقتدار درجہ بدرجہ اور حاکم طبقوں کی مدد سے حاصل کیا جاتا ہے۔ ایک جگہ بڑی اچھی اور چبھتی ہوئی بحث کی ہے۔ انھوں نے لکھا تو ہے برطانوی لیبر پارٹی کے متعلق، لیکن جو کچھ وہ کہتے ہیں ہندوستان پر اور بھی پورا اترتا ہے۔ کیونکہ انگلستان میں کم از کم جمہوری ادارے تو ہیں۔ جن کے ذریعہ سے اصولاً اکثریت کا ارادہ ظاہر کیا جا سکتا ہے پروفیسر ٹوٹی کہتے ہیں :-

"پیاز تو پرت پرت کر کے کھائی جا سکتی ہے۔ لیکن آپ چاہیں کہ زندہ شیر کی کھال کھینچیں، پہلے ایک پنجہ کی اور پھر دوسرے کی، تو یہ نہیں ہو سکتا چیرپھاڑ تو خود شیر کا پیشہ ہے۔ وہ پہلے کھال اتار لیتا ہے۔"

دنیا میں شاید کوئی ایسا ملک ہو جہاں کے سربرآوردہ اور حاکم طبقہ کے لوگ سب بدھو ہیں لیکن انگلستان تو ہرگز ایسے ملکوں میں نہیں۔ یہ خیال کہ لیبر پارٹی کے مطالبات پیش کرنے میں موقع شناسی اور دوستانہ انداز سے کام لیا جائے تو یہ لوگ اس دھوکے میں ڈالے جا سکتے ہیں کہ یہ ان کے اپنے مطالبات ہیں، ایسا ہی فضول ہے جیسے یہ کوشش کہ ایک چلتے ہوئے وکیل سے ایسی جائداد دھوکہ دھڑی سے حاصل کر لی جائے جس کی دستاویز حقیقت اس کے قبضہ میں موجود ہے۔ ہمارے یہاں کے وہ لوگ جن کے ہاتھ میں دولت اور اقتدار ہے خوش گوار اخلاق کے ہوشیار، زوردار اور اپنے آپ پر بھروسہ کرنے والے لوگ ہیں اور جب یہ زِچ ہوتے ہیں تو پھر تو کسی

اخلاقی اصول کا لحاظ بھی نہیں کرتے۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ روٹی پر مکھن کس طرف لگا ہے" اور وہ اس پر بھی تلے ہوئے ہیں کہ مکھن کی فراہمی میں کمی نہ ہو۔۔۔۔۔۔۔ اگر انھوں نے اپنے آپ کو خطرے میں دیکھا تو وہ ہر سیاسی اور معاشی چال چلیں گے اور ہر ہتھیار سے کام لیں گے، ایوان امرا، بادشاہ، اخبار فوج میں بدامنی، مالی دشواریاں، بین الاقوامی پیچیدگیاں اور جیسا کہ وہ حملہ جو جارحانہ ۱۹۳۱ء میں پاؤنڈ پر کیا تھا ظاہر کرتا ہے، وہ دیس تیاگیوں کی اس چال تک سے نہ چوکیں گے جس میں اپنے آپ کو نقصان سے بچانے کی خاطر ملک کو نقصان پہنچایا جاتا ہے"

برطانوی لیبر پارٹی کا ایک زبردست نظام ہے۔ مزدوروں کے یونین جس کے لاکھوں چندہ دینے والے اراکین ہیں اور جنھوں نے ایک نہایت مکمل امداد باہمی کا نظام مرتب کر لیا ہے اس کی پشت پر ہیں اور اعلیٰ پیشوں کے بہت سے لوگ اس کے رکن اور ہمدرد ہیں۔ برطانیہ میں جمہوری مشاورتی ادارے ہیں جن کی بنیاد عام حق رائے دہندگی پر ہے اور سیاسی آزادی کا رواج صدیوں سے قائم ہے۔ ان سب باتوں کے باوجود مسٹر ٹونی کی رائے ہے اور حال کے واقعات نے ثابت بھی کر دیا ہے کہ ان کی رائے درست ہے کہ لیبر پارٹی خالی مسکرانے اور نرمی سے بات سمجھانے سے اصل اقتدار حاصل نہیں کر سکتی۔ اگرچہ دونوں طریقے اپنی جگہ مفید اور پسندیدہ ہیں۔ مسٹر ٹونی کہتے ہیں کہ اگر ایوان عام میں لیبر پارٹی کی اکثریت ہو گئی تب بھی اسے بنیادی اصلاحیں عمل میں لانے کا ذرا بھی اختیار نہ ہو گا کیونکہ سربرآوردہ اور مقتدر طبقے کے لوگ جو ان کے مقابلے میں صف آرا ہیں، بہت سے سیاسی، معاشرتی، معاشی، مالی اور فوجی قلعوں پر

اپنا قبضہ جمائے ہوئے ہیں یہ کہنے کی تو ضرورت ہی نہیں کہ ہندوستان کی حالت بالکل اور ہے یہاں نہ جمہوری ادارے ہیں نہ روایات۔ بلکہ اس کے برخلاف آرڈیننس اور حکومت مطلق کا رواج پرانا اور مستند ہو گیا ہے۔ یہاں آئے دن شخصی اور تقریر، تحریر، اجتماع اور پریس کی آزادی کا سر کچلا جایا کرتا ہے۔ لبرلوں کی پشت پر کوئی مضبوط نظام نہیں ہے اس لئے انھیں بس اپنے تبسم ہی پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔

لبرل ہر تحریک کی جو دستور یا قانون کے خلاف ہو سختی سے مخالفت کرتے ہیں۔ ایسے ملکوں میں جہاں کا دستور جمہوری ہو "دستور" کے معنی بہت وسیع ہوتے ہیں۔ وہ قانون سازی پر حاوی ہوتا ہے۔ آزادی کا تحفظ کرتا ہے عاملہ کی روک تھام کرتا ہے اور سیاسی اور معاشی نظام میں تبدیلیاں کرنے کے جمہوری طریقہ معین کر دیتا ہے۔ لیکن ہندوستان میں ایسا کوئی دستور نہیں۔ اور یہاں یہ اصلاح ایسے کوئی معنی نہیں رکھتی[1]۔ اسے استعمال کر کے ہم صرف ایک تصور کو اپنی سیاسی بحث میں داخل کرتے ہیں۔ جس کے لئے ہماری موجودہ زندگی میں کوئی گنجائش نہیں عجیب بات یہ ہے کہ یہ لفظ اکثر عاملہ کی کم و بیش بے ضابطہ کارروائیوں کی تائید کے لئے کام میں لایا جاتا ہے، یا اس

---

[1] مسٹر سی وائی چنتامنی نے جو ایک ممتاز لبرل لیڈر اور اخبار "لیڈر" کے صدر مدیر ہیں یو پی کونسل میں پارلیمنٹری جوائنٹ سلکٹ کمیٹی کی رپورٹ پر تنقید کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا تھا کہ ہندوستان میں کسی قسم کی دستوری حکومت نہیں "بہتر یہ ہے کہ ہم موجودہ غیر دستوری حکومت کے ماتحت رہیں۔ بہ نسبت اس آیندہ کی حکومت کے جو اور بھی رجعت پسند اور بہت زیادہ غیر دستوری ہوگی"۔

سے مراد فقط "قانونی" ہوتا ہے ہمارے لئے بہت بہتر ہے اگر ہم "قانون" اور "خلاف قانون" پر اکتفا کریں۔ اگرچہ یہ اصطلاحیں بھی مبہم ہیں اور ان کے معنی آج کچھ ہوتے ہیں تو کل کچھ اور۔

ایک نیا قانون یا نیا آرڈیننس نئے جرم قایم کر دیتا ہے کسی پبلک جلسہ میں شریک ہونا جرم ٹھہرایا جاسکتا ہے۔ یا بائسکل پر چڑھنا، یا کوئی خاص کپڑے پہننا، یا مغرب سے پہلے گھر کے اندر نہ پہنچ جانا۔ یا تھانے میں روز حاضری نہ دینا ہندوستان کے بعض حصے ہیں جہاں آج کل یہ سب باتیں قانون کی خلاف ورزی ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ملک کے ایک حصے میں کوئی بات جرم مانی جائے اور دوسرے میں نہ مانی جائے۔ جب کوئی غیر ذمہ دار عاملہ مختصر سے مختصر اطلاع کے بعد ایسے قانون جاری کر سکتی ہے تو "قانون" سے مراد اس عاملہ کے ارادے کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ معمولاً ایسے قانون کی خوشی سے یا منہ بناکر تعمیل کی جاتی ہے۔ اس لئے کہ نافرمانی کے نتیجے ناگوار ہوتے ہیں۔ لیکن کوئی کہے کہ وہ ہمیشہ قانون کی فرماں برداری کرے گا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایک مطلق حکومت یا غیر ذمہ دار قوت کے سامنے زمین پر سر رکھ دیتا ہے۔ اپنے ضمیر کو اس کے حوالے کر دیتا ہے اور جہاں تک کہ اس کے اپنے عمل کا تعلق ہے آزادی حاصل کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔

آج کل ان ملکوں میں جہاں کی حکومت جمہوری ہے اس پر بحث ہو رہی ہے کہ معاشی نظام میں ان ذریعوں کی بدولت جو دستور نے مہیا کئے ہیں بنیادی تبدیلیاں معمولی کارروائی کے طور پر عمل میں لائی جاسکتی ہیں یا نہیں، بہت سے لوگوں کی رائے ہے کہ ایسا نہیں کیا جاسکتا اور کوئی غیر معمولی انقلابی تدبیر اختیار کرنا ہوگی۔ ہمارے لئے تو یہ دیکھنا بے کار ہے کہ اس بحث سے آیا

نتیجہ نکلتا ہے۔ کیونکہ ہم جو تبدیلیاں چاہتے ہیں انہیں عمل میں لانے کے لئے دستور نے کوئی ذریعے مقرر ہی نہیں کئے ہیں۔ اگر وائٹ پیپر ( ) والی یا ایسی ہی کسی اور تجویز نے قانون کی شکل پائی تو ہماری دستوری نشوونما کی طرف بالکل بند ہو جائے گی اور انقلابی یا غیر قانونی کارروائی کے سوا اس قید سے آزاد ہونے کا کوئی چارہ نہ رہے گا۔ تو پھر کیا کرنا چاہیے؛ کیا اصلاح کا خیال چھوڑ کر قسمت پر شاکر ہو بیٹھیں۔

آج کل جو صورت ہے وہ اور بھی زیادہ عجیب ہے۔ عاملہ کو اس کا اختیار ہے اور یہ اختیار کام میں بھی لایا جاتا ہے کہ ہر قسم کے پبلک کام کو بالکل بند کر دے یا اس میں رکاوٹیں پیدا کر دے۔ ہر کام جو اس کی رائے میں اس کے لئے خطرناک ہے ممنوع قرار دے دیا جاتا ہے اور اس طرح، جیسے کہ پچھلے تین سال میں ہوتا رہا ہے۔ قوم کی ہر نتیجہ خیز جد و جہد بند کی جا سکتی ہے۔ اس صورت کو گوارا کرنے کے معنی ہیں کہ ہر قومی کام چھوڑ دیا جائے اور اس کا مان لینا تو ایک ناممکن سی بات کو مان لینا ہے۔

اس کا دعویٰ کوئی بھی نہیں کر سکتا کہ وہ ہمیشہ اور بلا استثناء قانون کے مطابق عمل کرے گا۔ جمہوری ریاستوں میں بھی ایسی صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ جب انسان کا ضمیر اسے قانون کی خلاف ورزی پر مجبور کرتا ہے جس ملک کی حکومت استبدادی یا غیر ذمہ دارانہ ہو۔ ایسے موقعے بہت کثرت سے آتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ ایسی ریاست میں قانون اخلاقاً حق بجانب رہتا ہی نہیں۔

لبرل کہتے ہیں کہ براہ راست سیاسی عمل حکومت مطلق سے ملتی جلتی چیز ہے۔ جمہوریت سے نہیں اور جو لوگ چاہتے ہیں کہ جمہوری طرز حکومت کو

فتح ہو انھیں براہ راست سیاسی عمل کا یہ اصول چھوڑ دینا چاہئے یہ بات الجھے ہوئے خیالات اور مبہم عبارت کا ایک نمونہ ہے۔ کبھی کبھی یہ براہ راست سیاسی عمل مثلاً مزدوروں کی ہڑتال قانونی بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن یہاں غالباً صرف سیاسی کارروائیوں سے بحث ہے۔ جرمنی میں آج کل کس طرح کا عمل ممکن ہے؟ ہٹلر کی ذلت آمیز فرماں برداری یا کوئی انقلابی یا خلاف قانون کارروائی؟ جمہوریت کی وہاں اور کس طرح خدمت کی جا سکتی ہے؟

ہندوستانی لبرل اکثر جمہوریت کا ذکر کرتے ہیں مگر ان میں بہت سے اس کے قریب بھی جانا نہیں چاہتے۔ سرسی. پی. شو سوامی آئیر نے جو ہندوستان کے سب سے ممتاز لیڈروں میں سے ہیں مئی ۱۹۳۴ء میں کہا تھا "کانگریس کا یہ مطالبہ کہ ایک دستور ساز مجلس طلب کی جائے عوام کی سوجھ بوجھ پر بہت زیادہ بھروسہ کرنا ہے اور ان لوگوں کے خلوص اور قابلیت کے ساتھ ظلم ہے جنھوں نے مختلف گول میز کانفرنسوں میں حصہ لیا ہے۔ مجھے اس میں بہت شک ہے کہ دستور ساز مجلس اس سے کچھ بہتر کر دکھائی" اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جمہوریت کا جو تصور سر شو سوامی آئیر کے ذہن میں ہے وہ "عوام" سے ایک جدا چیز ہے اور ایسے "مخلص اور قابل" لوگوں کا اجتماع جنھیں برطانی حکومت نے نامزد کیا ہو اس سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ جناب موصوف وائٹ پیپر کی تجویزوں کو دعائیں دیتے ہیں۔ اس لئے کہ گو وہ ان سے "پورے طور پر مطمئن نہیں" وہ سمجھتے ہیں کہ ملک کا ساری کی ساری تجویزیں رد کر دینا عقلمندی کی بات نہیں" ہمیں اس کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ حکومت برطانیہ اور سر شو سوامی آئیر کے درمیان پورا اتحاد عمل نہ ہو۔

کانگریس نے جب سول نافرمانی بند کر دی تو لبرل ظاہر ہے بہت خوش

ہوئے۔ اور یہ بھی کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اس "حماقت آمیز اور خلاف مصلحت" تحریک سے الگ اور دور رہنے پر انھوں نے اپنی عقلمندی کی داد بھی لینا چاہی "دیکھو ہم نے کہا تھا نا"؟ وہ اکثر ہم سے کہا کرتے تھے۔ یہ دلیل بھی نرالی ہے۔ چونکہ ہم لڑنے کے لئے کھڑے ہوئے تھے اور لڑے بھی خوب تھے ہم گرا دئے گئے۔ اس لئے ہم کو نصیحت کی گئی کہ کھڑا ہونا بُرا ہے سب سے اچھی اور محفوظ چال پیٹ کے بل گھسٹنا ہے۔ آدمی اس طرح پڑا ہو تو نہ گرایا جا سکتا ہے نہ گر سکتا ہے۔

پرانا اور نیا ہندوستان

یہ ایک قدرتی اور لازمی بات تھی کہ قوم پرست ہندوستانی انگریزوں کی حکومت پر غصہ تھے۔ لیکن یہ ایک عجیب بات ہے کہ انیسویں صدی کے آخر تک بہت سے تعلیم یافتہ ہندوستانی شعوری یا غیر شعوری طور پر سلطنت کے برطانوی تصورات کو تسلیم کرتے رہے۔ وہ اپنی دلیلیں انہیں تصورات پر قایم کرتے تھے۔ اور انہیں صرف ان کے چند خارجی نتائج پر اعتراض کرنے کی ہمت ہوتی تھی ہمارے اسکولوں اور کالجوں میں تاریخ اور معاشیات کی جو تعلیم دی جاتی تھی اس کا نقطۂ نظر بالکل برطانوی ملوکیت کا تھا۔ اس میں ہماری پچھلی اور موجودہ خامیاں جتائی جاتی تھیں اور انگریزوں کے اوصاف اور ان کی بلند اقبالی ہم حالات کی اس بگڑی تصویر کو کسی حد تک صحیح مانتے تھے۔ اور جہاں طبیعت اسے قبول نہ کرتی وہاں بھی ہم پر اس کا اثر ضرور پڑتا۔ پہلے تو ذہن کو اس سے محفوظ رکھنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ کیونکہ ہم اور واقعات یا دلیلوں سے واقف ہی نہ تھے۔ اس لیے ہم نے مذہبی قومیت کے دامن میں پناہ لی۔ اس خیال سے کہ کم سے کم مذہب اور فلسفے کے میدان میں ہم کسی قوم سے ہیٹے نہیں مصیبت اور ذلت میں ہم اپنے آپ کو یقین دلاتے ہے کہ اگرچہ ہم میں مغرب کی سی ظاہری شان اور چمک دمک نہیں ہے۔ پھر بھی ہم اس باطنی دولت کے مالک ہیں جو اصل چیز ہے جس کی قدر و قیمت بہت زیادہ ہے اور جس کا

حاصل کرنا بہت بہتر ہے ۔ ایک طرف سوامی وویکانند اور ان جیسے اور لوگوں نے دوسری طرف اس ادل جیسی نے جو مغربی عالم ہمارے قدیم فلسفوں سے رکھتے تھے ہمیں پھر کسی قدر خودداری بنایا اور گذشتہ زمانے پر فخر کرنے کے جذبہ کو بیدار کیا۔

آہستہ آہستہ ہم ان باتوں پر جو انگریز ہمارے ماضی اور موجودہ حالات کے متعلق کہتے تھے شبہ کرنے لگے ہم نے ان کی تنقید شروع کر دی ۔ لیکن اب بھی ہمارا خیال اور عمل انگریزوں کے قائم کئے تصورات کے دائرے میں محدود رہا کوئی بری بات ہوتی تو ہم کہتے کہ یہ انگریزوں کی فطرت کے خلاف ہے ہندوستان میں کوئی انگریز بدتمیزی کرتا تو یہ قصور برطانوی نظام کا نہ ٹھہرایا جاتا بلکہ اس شخص کا ۔ لیکن برطانوی حکومت پر تنقیدوں کا مواد جمع ہوتا ۔ لکھنے والوں کی اعتدال پسندی کے باوجود ایک انقلاب کا کام کر گیا اور اس نے ہماری قومیت کی سیاسی اور اقتصادی بنیاد ڈال دی ۔ دادا بھائی نوروجی کی تصنیف "ہندوستان کا افلاس اور برطانوی فطرت کے خلاف حکومت" اور رمیش دت ولیم ڈگبی وغیرہ کی کتابوں نے قومیت کی نشوونما میں ایک انقلابی عنصر پیدا کر دیا ۔ قدیم تاریخ ہند کی تحقیق کی گئی تو ایسے درخشاں دوروں کا انکشاف ہوا جن میں تہذیب و تمدن عروج کو پہنچ گیا تھا اور ان کا حال پڑھ کر ہمیں بڑی تقویت حاصل ہوئی ہمیں یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ہندوستان میں انگریزوں کے کارنامے اس سے بہت مختلف تھے جو ہم ان کی تاریخ کی کتابیں پڑھ کر سمجھا کرتے تھے۔

ہندوستان کی تاریخ، معاشیات اور نظام حکومت کے متعلق انگریزوں کے جو بیانات تھے ۔ ان کی ہم تردید کرتے رہے ۔ لیکن اسی حلقے کے اندر جوان کے تصورات نے کھینچ دیا تھا جب نئی صدی شروع ہوئی تو مجموعی حیثیت کو

ہندوستانی قومیت کا یہ رنگ تھا۔ اب بھی لبرل جماعت چند اور چھوٹی پارٹیوں اور اعتدال پسند کانگریسیوں کی ایک تعداد کا یہی حال ہے۔ ان کے جذبات وقتاً فوقتاً انھیں آگے بڑھاتے ہیں۔ مگر خیالات کے اعتبار سے ان کی زندگی انیسویں صدی میں بسر ہو رہی ہے۔ اسی کے سبب سے ہندوستان کی آزادی کا تصور کسی لبرل کے دماغ میں سما ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ اس تصور اور انیسویں صدی کے طرز خیال میں بنیادی اختلاف ہے اور ان دونوں میں مفاہمت ہو ہی نہیں سکتی۔ لبرل یہ سوچتا ہے کہ وہ قدم بہ قدم اونچے عہدوں پر پہنچتا جائے گا۔ اس کے سامنے جو مسئلے پیش ہوں گے وہ زیادہ موٹی اور زیادہ اہم ہوتی جائیں گی۔ حکومت کا دربار اسی طرح جاری رہے گا بس اتنا فرق ہو جائے گا کہ بعد میں وہ خود رونق افروز ہوگا اور ایک گوشہ میں برطانوی فوج ادب سے کھڑی رہے گی کہ ضرورت کے وقت اس کی حفاظت کرے۔ لبرل کے نزدیک برطانوی سامراج کے اندر درجہ نو آبادی حاصل کرنے سے مراد یہ صورت حال ہے۔ یہ سادہ لوحی کا ایک خواب ہے جسے حقیقت کا روپ کبھی نصیب نہ ہوگا۔ کیونکہ انگریز حفاظت اسی وقت تک کریں گے جب تک ہندوستان غلام رہ کر حفاظت کی قیمت ادا کرے۔ قطع نظر اس کے کہ یہ بات ہمارے عظیم الشان ملک کے لئے باعث ننگ ہے۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ سر فرڈرک وائٹ جو ہرگز ہندوستانی قومیت کے حامی نہیں ہیں، اپنی تازہ تصنیف* میں لکھتے ہیں: وہ (یعنی ہندوستانی) اب تک سمجھتے ہیں کہ انگلستان مصیبت میں اس کے آڑے آئے گا اور جب تک وہ اس خیال خام میں مبتلا ہیں۔ وہ آزاد راج

---

* The Future of East and West.

کی جو کہ اس کا نصب العین ہے بنیاد نہیں رکھ سکتا" یہاں پر بظاہر مصنف کا اشارہ لبرل یا رجعت پسند یا فرقہ پرست ہندوستانیوں کی طرف ہے۔ کیونکہ جب وہ لیجسلیٹو اسمبلی کے صدر تھے تو انھیں لوگوں سے ان کا زیادہ سابقہ رہا ہوگا۔ کانگریس کا یہ عقیدہ نہیں ہے اور جو دوسری ترقی پسند جماعتیں ہیں ان کا تو ذکر ہی نہیں۔ مگر سر فریڈرک کے اس خیال سے انھیں اتفاق ہے کہ جب تک ہندوستانیوں کا یہ خیال خام نہ ہٹ جائے اور ہندوستان مفروضہ مصیبت کا سامنا کرنے کو اکیلا نہ چھوڑ دیا جائے تب تک آزادی حاصل نہیں ہو سکتی۔ برطانیہ کے فوجی تسلط کا بالکل دور ہو جانا ہندوستانی آزادی کا پہلا قدم ہوگا۔

یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ انیسویں صدی میں تعلیم یافتہ ہندوستانی برطانوی تصورات کے قائل تھے۔ حیرت تو اس پر ہوتی ہے کہ بیسویں صدی کے جوش دلانے والے واقعات اور تجربات کے بعد بھی بعض لوگ اس دام فریب میں گرفتار ہیں۔ انیسویں صدی میں برطانیہ کے حکمراں طبقے اپنی دولت کامیابی اور اقتدار کی روایات کی بناء پر دنیا میں امراء کی شان رکھتے تھے۔ ان روایات کے سائے میں تربیت پانے سے ان میں امارت کے کچھ اوصاف اور کچھ خامیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ ہم ہندوستانی اس بات سے تسلی حاصل کر سکتے ہیں کہ پچھلے پونے دو سو سال میں ہم نے انھیں اس اعلیٰ مرتبے پر فائز رہنے کے وسائل اور مواقع بہم پہنچائے۔ جیسا کہ پہلے بھی بہت سی نسلیں اور قومیں کر چکی ہیں۔ انگریز اپنے آپ کو خدا کے برگزیدہ بندے اور اپنی سلطنت کو خدا کی حکومت سمجھنے لگے۔ جب تک ان کا یہ مرتبہ تسلیم کیا گیا اور ان کے دعوائے فضیلت کی تردید نہیں ہوئی وہ لطف و کرم سے کام لیتے رہے۔ مگر وہیں تک جہاں تک ان کا کوئی نقصان نہ تھا لیکن ان کی [illegible] حکومت الٰہی کی [illegible]

اور یہ صریحی کفر تھا جس کا توڑنا لازم ہو گیا۔

مسیو آندرے ژیدے نے انگریزی سیرت کے اس پہلو پر بہت دلچسپ طریقے سے لکھا ہے۔[1]

"اقتدار اور دولت کی موروثی روایات نے رفتہ رفتہ ان میں ایک عظمت کی شان پیدا کر دی اور اس کے مدعی بن گئے کہ ان کی قوم کو حکومت کا خداداد حق حاصل ہے۔ ان کا یہ زعم اس حالت میں بڑھتا ہی گیا۔ جب لوگ ان کے دعوئے فضیلت کی تردید کرنے لگے یہاں تک کہ پچھلی صدی کے آخری حصہ کے نوجوان........ غیر شعوری طور پر سمجھنے لگے کہ ہمیں جو کامیابی حاصل ہوئی ہم واقعی اس کے مستحق ہیں۔

اس طرز خیال پر غور کرنا دلچسپی سے خالی نہیں۔ کیونکہ اس سے انگریزوں کی نفسیات کے ایک باریک پہلو پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ تو سبھی نے محسوس کیا ہوگا کہ انگلستان سمجھتا ہے کہ اس کی مشکلات کا سرچشمہ خارجی اسباب میں ہے۔ وہ ہر معاملے میں یہی کہتا ہے کہ فلاں کی غلطی ہے اور اگر یہ فلاں اپنی اصلاح کرنے پر راضی ہو جائے تو انگلستان پھر خوش حال ہو جائے گا۔......

ہر موقع پر انگریزوں کی اس جبلت کا اظہار ہوتا ہے کہ اپنی اصلاح کے بجائے کسی دوسرے کی اصلاح کریں۔"

اگر اور ملکوں کے ساتھ انگریزوں کا یہ عام رویہ تھا تو ہندوستان میں یہ اور بھی زیادہ نمایاں رہا۔ ہندوستان کے مسئلہ پر جس انداز سے انگریز غور

---

[1] Revue Britannique Annee Siecle

کرتے ہیں۔ وہ ہمارے لئے کتنا ہی تکلیف دہ ہو مگر دل کشی سے خالی نہیں ان کا راسخ عقیدہ ہے کہ وہ ہر حال میں حق پر ہیں اور ایک عظیم الشان فرض سے بہ خوبی عہدہ برآ ہو رہے ہیں۔ ان کی قوم خدا کی برگزیدہ قوم اور ان کی سلطنت دنیا کی بہترین سلطنت ہے۔ ان گنہ گاروں کو جو اس سچے عقیدے کے منکر ہیں وہ غصہ اور نفرت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اس طرز خیال میں ایک مذہبی رنگ کی جھلک ہے۔ کلیسا کے قدیم محکمہ احتساب کی طرح وہ اس پر تلے ہوئے ہیں کہ ہم چاہیں یا نہ چاہیں وہ ہمیں نجات ضرور دلا کر رہیں گے۔ اس روحانی کاروبار سے انھوں نے ضمناً دنیاوی منافع بھی حاصل کیا اور اس طرح ایک پرانی مثل کہ "ایمان داری سب سے زیادہ نفع کی چیز ہے" صحیح ثابت ہو گئی۔ ہندوستان کی ترقی کے معنی یہ قرار پائے کہ وہ برطانوی سلطنت میں کھپ جائے اور مخلف ہندوستانی ولایتی سانچے میں ڈھل جائیں۔ برطانوی نصب العین اور مقاصد کو ہم جتنا زیادہ اختیار کرتے اتنی ہی زیادہ ہم میں اپنے آپ پر حکومت کرنے کی صلاحیت تسلیم کی جاتی۔ جس وقت ہم یہ دکھا دیتے اور اس کا یقین دلا دیتے کہ ہم اپنی آزادی برطانیہ کی خواہشوں کے مطابق استعمال کریں گے اسی وقت آزاد کر دئے جاتے۔

برطانوی حکومت کے کارناموں کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے میں ہندوستانیوں اور انگریزوں کے درمیان ضرور اختلاف رائے ہوگا۔ یہ ایک قدرتی بات ہے مگر جب بڑے پائے کے انگریز عہدہ دار یہاں تک کہ بعض وزیر ہند ہندوستان کے گذشتہ اور موجودہ حالات کی خیالی تصویریں کھینچتے ہیں اور بے بنیاد باتیں کہتے ہیں تو آدمی دنگ رہ جاتا ہے۔ چند ماہروں اور دوسرے لوگوں کے سوا، ہندوستان کے متعلق عام انگریزوں کی لاعلمی نہایت

حیرت انگیز ہے۔ جب وہ ٹھوس واقعات کو نہیں دیکھ سکتے تو ظاہر ہے کہ
ہندوستان کی روح تک ان کی پہنچ کیسے ہو سکتی ہے۔ انھوں نے اس کے
جسم پر قبضہ کر لیا۔ لیکن یہ قبضہ جبر و تشدد کا تھا۔ وہ اس کی سیرت کو نہیں سمجھ
سکے اور نہ انھوں نے سمجھنے کی کوشش کی۔ انھوں نے کبھی اسے آنکھ سے
آنکھ ملا کر نہیں دیکھا کیونکہ ان کی نظریں پھری ہوئی تھیں اور ان کی نظریں شرم و
ذلت سے نیچی تھیں۔ صدیوں کے ساتھ کے بعد بھی باہمی اجنبیت دور نہیں ہوئی
اور دونوں ایک دوسرے سے بیزار ہیں۔

اس افلاس اور ذلت کے باوجود ہندوستان شرافت اور عظمت
سے خالی نہیں تھا۔ اگرچہ وہ قدیم روایات اور مصیبتوں کے بوجھ سے دبا
ہوا تھا اور اس کی آنکھوں میں تھکن اور نیند کا خمار تھا مگر اسی کے ساتھ اس میں
ایک حسن تھا جو روحانی کیفیت نے اس کے خد و خال میں پیدا کر دیا تھا۔ اس کے
عجیب و غریب تصورات نادر تخیلات اور پاکیزہ جذبات کے نقش ایک ایک
کر کے اس کے چہرے پر اٹھ آئے تھے۔ اس کے شکستہ جسم سے پہلی عظمت
عظمت و وقار کی جھلک اب تک نظر آتی ہے۔ اس نے تاریخ کی طویل منزلیں
طے کی ہیں اور اس سفر میں حکم و حکمت کا بہت بڑا ذخیرہ جمع کیا ہے۔ اسے
بہت سے اجنبیوں سے سابقہ پڑا اس نے انھیں اپنے وسیع خاندان میں
شامل کر لیا۔ اس نے بڑے نشیب و فراز اٹھائے، سخت ذلتیں اور مصیبتیں جھیلیں
اور عجیب عجیب تماشے دیکھے۔ لیکن اس لمبے سفر میں اول سے آخر تک اس
نے اپنی پرانی تہذیب کا دامن نہیں چھوڑا۔ اس سے تقویت اور زندگی حاصل
کی اور دوسرے ملکوں کو بھی اس میں سے حصہ دیا۔ جھولے کی طرح کبھی وہ اوپر کبھی
نیچے آیا۔ اٹھا تو اپنے تخیل کی پرواز سے آسمانوں کی خبر لایا۔ گرا تو پستی کے گڑھے

میں پاتال تک پہنچا۔ باوجود باطل اوہام اور لغو رسوم کے بوجھ کے جس نے اس کی کمر توڑ دی تھی۔ وہ اس روح افزا تعلیم کو بالکل بھولا نہیں تھا جو ابتدا میں اس کے دانا ترین، روشن ضمیر حکیموں نے اپنشد کے ذریعہ دی تھی۔ ان کے تیز ذہن جو تلاش حق کی خلش سے بے چین تھے ہمیشہ سعی و جستجو میں لگے رہتے تھے۔ انھوں نے مذہبی عقائد کے دامن میں پناہ نہیں لی بے جان رسوم اور معمولات پر تکیہ نہیں کیا۔ وہ اس لوک میں اپنی ذات کو تکلیف اور مصیبت سے بچانا اور پرلوک میں بیکنٹھ میں ٹھکانہ نہیں چاہتے تھے۔ بلکہ بصیرت اور معرفت کے طلبگار تھے "مجھے مجاز سے حقیقت تک پہنچا دے، اندھیرے سے روشنی تک۔ موت سے حیات دوام بخش"[1] یہ گایتری منتر یہ علم و بصیرت کی دعا، ان دعاؤں میں جو آج کل لاکھوں آدمی روزانہ پڑھتے ہیں سب سے زیادہ مشہور ہے۔

اگرچہ سیاسی اعتبار سے ہندوستانی روح اکثر منتشر رہی لیکن اس نے اپنے مشترک روحانی سرمایے کو ہمیشہ محفوظ رکھا اور اس کثرت میں وحدت کا رنگ جھلکتا رہا[2]۔ تمام قدیم ملکوں کی طرح ہندوستان بھی اچھائی اور برائی کا معجون مرکب تھا لیکن اس کی اچھائیاں چھپی ہوئی تھیں اور انھیں تلاش کرنے کی

---

[1] برہد آرنیک اپنشد: ۱، ۳، ۲۸

[2] ہندوستان میں جو تضاد پائے جاتے ہیں ان میں سب سے بڑا یہ ہے کہ اس کے اختلاف کی تہ میں ایک اتحاد موجود ہے یہ جلد محسوس نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ تاریخ کا کوئی ایسا دور نہیں ہوا جب اس اتحاد نے ملک میں سیاسی ربط پیدا کر کے اسے ایک واحد ہستی بنا دیا ہو لیکن یہ اتنی بڑی حقیقت ہے اور اتنی بڑی قوت رکھتی ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو بھی اس کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اس دائرے میں آکر (بقیہ صفحہ ۲۵۷ پر)

ضرورت تھی اور تنزل کے آثار کھلے ہوئے تھے۔ ہندوستان کی تیز بے رحم دھوپ انھیں اور جھلکاتی تھی۔

ہندوستان اور اطالیہ کی حالت کچھ ملتی جلتی ہے۔ دونوں پرانے ملک ہیں اور ان کی ہندوی روایات کا سلسلہ بہت دور تک پہنچتا ہے۔ البتہ اطالیہ ہندوستان کے مقابلے میں کم عمر ہے اور وسعت میں اس سے بہت کم ہے۔ دونوں میں سیاسی انتشار رہا۔ مگر متحدہ ہند اور متحدہ اطالیہ کا تصور کبھی فنا نہیں ہوا اور گوناگوں اختلافات کے باوجود اتحاد کا رنگ غالب رہا۔ اطالیہ کا اتحاد بڑی حد تک رومی اتحاد تھا۔ کیونکہ یہ عظیم الشان شہر ملک پر حاوی رہا تھا اور یہی اتحاد کا مرکز اور نشان تھا۔ ہندوستان میں کوئی ایسا مرکز کوئی ایسا شہر نہیں تھا۔ جو تمام ملک پر حاوی ہو۔ بنارس مشرق کا شہر لازوال[1] کہا جا سکتا ہے۔ نہ صرف ہندوستان کا بلکہ تمام مشرقی ایشیا کا۔ لیکن بنارس سے کبھی سلطنت کا عمل نہیں پھیلا۔ نہ کبھی دنیاوی اقتدار کی فکر میں سر کھپایا۔ ہندوستانی تہذیب سارے ملک میں اس طرح پھیلی ہوئی تھی کہ ملک کا کوئی حصہ اس کا مرکز نہیں ٹھہرایا جا سکتا تھا۔ جنوب میں راس کماری سے شمال میں بدری ناتھ اور امرناتھ تک۔ مشرق میں دوارکا سے مغرب میں پوری تک ایک ہی قسم کے خیالات جاری اور ساری تھے اور اگر کسی جگہ پر خیالات کا تصادم ہوتا ہو تو اس کی دھمک سارے ملک میں دور دور تک پہنچ جاتی تھی۔

(بقیہ صفحہ ۲۵۶) وہ اس سے بہت کچھ متاثر ہوئے، مسٹر فریڈرک وائٹ "مشرق اور مغرب کا مستقبل" (انگریزی)

[1] رومی سلطنت کے زمانے میں روم "شہر لازوال" کہلاتا تھا۔

جیسے اطالیہ نے مغربی یورپ کو مذہب اور تہذیب عطا کی اسی طرح ہندوستان نے مشرقی ایشیا کو یہ دولت بخشی۔ اگرچہ چین قدامت اور عظمت میں اس سے کم نہ تھا۔ اس زمانے میں بھی جب کہ سیاسی انتشار سے اطالیہ نحیف و زار تھا یورپ کی رگوں میں اسی کا خون دوڑ رہا تھا۔

اطالیہ کے متعلق شاید منرنش[1] نے کہا تھا کہ وہ "ایک جغرافی اصطلاح" ہے بہت سے لوگ جو منرنش بننا چاہتے ہیں ہندوستان کی نسبت بھی یہی خرافات کہتے ہیں اور اتفاق سے دونوں براعظموں میں ان ملکوں کا محل وقوع بھی ایک ہی سا ہے۔ لیکن اس سے زیادہ دلچسپ انگلستان اور آسٹریلیا کی مشابہت ہے اور بیسویں صدی کے انگلستان کا انیسویں صدی کے آسٹریلیا سے مقابلہ کیا بھی گیا ہے۔ انگلستان بھی اسی طرح متکبر اور مغرور اور بظاہر شاندار اور رعب دار ہے مگر وہ جڑیں جن سے اسے قوت حاصل ہوتی تھی اب سوکھ رہی ہیں اور اس عالی شان عمارت کی بنیادیں کھوکھلی ہو چکی ہیں۔

یہ ایک عجیب بات ہے کہ انسان ملکوں کو بھی اپنی طرح مجسم تصور کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ عادت اور قدیم ایتلافات کا اثر ہے۔ چنانچہ ہندوستان بھارت ماتا اور ہند ایک خوبصورت خاتون کی شکل اختیار کر لیتا ہے جو بہت بوڑھی ہیں مگر دیکھنے میں سدا جوان معلوم ہوتی ہیں۔ ان کی آنکھیں غم سے بھری اور دل حسرت و یاس سے معمور ہے۔ بدیسیوں کے ظلم سے نالاں ہیں۔ اور اپنے بچوں کو مدد کے لئے پکارتی ہیں۔ یہی تصور ہے جو لاکھوں آدمیوں کے جذبات کو ابھارتا ہے اور انھیں عمل اور ایثار پر آمادہ کرتا ہے لیکن ہندوستان

---

[1] آسٹریا کا مشہور مدبر جو ۱۸۱۵ء اور ۱۸۴۸ء تک یورپ کی سیاسی زندگی پر حاوی رہا۔

میں زیادہ تر مزدور اور کسان بستے ہیں۔ اور وہ دیکھنے میں حسین نہیں ہیں کیونکہ افلاس میں کوئی حسن نہیں ہوتا۔ اب سوال یہ ہے کہ ہمارے تخیل کی خوبصورت خاتون کھیتوں اور کارخانوں کے ننگے اور گرسنہ مزدوروں کی نمائندگی کرتی ہیں یا ان لوگوں کی چھوٹی سی جماعت کی جو صدیوں سے غریبوں کو پیروں تلے روندتی اور ان کا خون چوستی رہی ہے جس نے انھیں ظالمانہ رسم و رواج کی زنجیروں میں جکڑ دیا ہے اور ان میں سے بہتوں کو اچھوت تک بنا دیا ہے۔ ہم حقیقت پر تخیلات کا پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ واقعات کی دنیا سے بھاگ کر خواب و خیال کی دنیا میں پناہ لیں۔

لیکن ان مختلف طبقوں اور ان کی باہمی کشمکش کے باوجود ایک رشتہ تھا جو ان سب کو مربوط کئے ہوئے تھا اور یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ یہ رشتہ کتنا مضبوط اور پائدار تھا۔ اس کی مضبوطی کا راز کیا تھا؟ یہ محض روایات اور جمود کی انفعالی قوت نہیں تھی۔ اگرچہ یہ قوت بہت بڑی ہوتی ہے اس میں کوئی جاندار اور حیات بخش جوہر کام کر رہا تھا کیونکہ اس نے قومی خارجی اثرات کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ اور ان داخلی اثرات کو جو اس میں انتشار پیدا کرنا چاہتے تھے جذب کر لیا۔ لیکن اپنی اس قوت کے باوجود وہ سیاسی آزادی کو محفوظ نہ رکھ سکا اور سیاسی اتحاد پیدا نہ کر سکا۔ ان چیزوں کو اس قابل ہی نہیں سمجھا گیا کہ ان کے لئے زحمت اٹھائی جائے۔ انھوں نے حماقت سے ان کی اہمیت کو نظر انداز کیا اور ہم اس غفلت کا نتیجہ بھگت رہے ہیں۔ اپنی تاریخ میں ہم شروع سے آخر تک دیکھتے ہیں کہ ہندوستان کے قدیم نصب العین میں سیاسی اور فوجی کامیابی کو کبھی وقعت نہیں دی گئی اور دولت پیدا کرنے والے ہاتھ ہمیشہ حقیر سمجھے گئے۔ عزت اور دولت کا ساتھ نہیں ہوتا تھا اور عزت ہمیشہ ہم

نظری طور پر ان لوگوں کا حصہ سمجھی جاتی تھی جو ادنیٰ معاوضے پر سماج کی خدمت کریں یہ پرانی تہذیب بہت سے سخت طوفانوں سے سلامت گزر گئی لیکن اگرچہ اس کی ظاہری صورت قائم رہی اس میں باطنی حقیقت باقی نہیں رہی۔ آج کل وہ خاموشی کے ساتھ مگر جی توڑ کر ایک نئے اور نہایت طاقتور حریف سے مقابلہ کر رہی ہے یعنی مغربی سرمایہ داری کی "بنیوں والی تہذیب" اسے اس نئے حریف سے وہ شکست کھا جائے گی۔ کیونکہ مغرب اپنے ساتھ سائنس لایا ہے۔ اور سائنس سے لاکھوں فاقہ کشوں کو روٹی ملنے کی امید ہے لیکن قائلہ تہذیب کے زہر کا تریاق بھی مغرب اپنے ساتھ لایا ہے اور وہ اشتراکیت ہے۔ یعنی اتحادِ عمل اور عام مفاد کی خاطر جماعت کی خدمت کرنے کا اصول برہمنوں کا جو پرانا خدمت کا نصب العین تھا اس سے یہ کچھ زیادہ مختلف نہیں لیکن اس کا تقاضا یہ ہے کہ ہر طبقہ اور جماعت کو برہمن کا رتبہ دیا جائے (ظاہر ہے کہ یہاں برہمن کے مذہبی معنی مراد نہیں) اور طبقوں کی تفریق اور امتیازات مٹا دیے جائیں۔ ممکن ہے ہندوستان جب اپنا نیا لباس پہنے اور وہ تو پہنتا ہی ہے اس لیے کہ پرانا پھٹ کر چیتھڑے چیتھڑے ہو گیا ہے تو اس کی تراش ایسی ہو کہ موجودہ حالات اور پرانی وضع دونوں کے ساتھ نبھ سکے۔ جو رنگ وہ اختیار کرے وہ ایسا ہونا چاہیے کہ قدیم رنگ میں کھپ جائے۔

انگریزی حکومت کی کارگزاری

ہندوستان میں برطانوی حکومت کی کارگزاری کیا ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ شاید ہی کوئی انگریز یا ہندوستانی اس لمبی کارگزاری کو ایک خارجی چیز ٹھہرا کر اس پر ٹھنڈے دل سے نظر ڈال سکے گا۔ اور اگر یہ ممکن بھی ہو تو نفسیاتی اور دوسرے غیر مادی عناصر کا تولنا اور ان کا اندازہ لگانا اور بھی مشکل ہوگا۔ ہم سے کہا جاتا ہے کہ برطانوی حکومت نے ہندوستان کو وہ دیا ہے جو پورے گزشتہ زمانے میں کبھی اسے حاصل نہ تھا یعنی ایک حکومت جس کا حکم اس ملک میں جو ایک بر اعظم سے کم نہیں ہر جگہ بے چون و چرا تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس نے قانون کی عملداری قائم کی ہے اور ایک نظام حکومت جو عدل پر مبنی اور کارپرواز ہے۔ اس نے ہندوستان میں نیابتی حکومت اور شخصی آزادی کے تصورات رائج کئے اور برطانوی ہند کو ایک واحد منفرد ریاست بنا کر اس نے ہندوستانیوں میں سیاسی اتحاد کا احساس پیدا کیا اور اس طرح قومیت کی اس کے ابتدائی مدارج میں پرورش کی[۱]" یہ دعوے انگریزوں کی طرف سے پیش کئے جاتے ہیں لہٰذا بہت صحیح بھی ہیں۔ اگرچہ قانون

---

[۱] یہ اقتباس ہندوستان کے دستور کی اصلاح کے متعلق جو مشترک پارلیمنٹری کمیٹی بنی تھی اس کی رپورٹ سے لئے گئے تھے۔

کی علمداری اور شخصی آزادیاں اب کئی برس سے دیکھنے میں نہیں آئی ہیں۔

ہندوستانی اس دور پر نظر ڈالتے ہوئے اور بہت سے پہلوؤں پر زور دیتے ہیں اور یہ جتاتے ہیں کہ انگریزوں کی حکومت نے ہم کو کیا کیا مادی اور روحانی نقصان پہنچایا ہے۔ یہ نقطۂ نظر اس قدر مختلف ہے کہ وہی چیزیں جسے انگریز تعریف کے لائق سمجھتے ہیں اس کی ہندوستانی مذمت کرتے ہیں۔ جیسے کہ ڈاکٹر آنند کمار سوامی نے لکھا ہے "ہندوستان میں برطانوی حکومت کی سب سے عجیب خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ ہندوستانی قوم پر جو سب سے بڑی زیادتیاں کی گئیں وہی بظاہر نعمتیں معلوم ہوتی ہیں۔"

واقعہ یہ ہے کہ پچھلی صدی یا اس سے کچھ زیادہ میں ہندوستان کے اندر جو تبدیلیاں ہوئیں وہ عالمگیر تھیں اور مشرق اور مغرب کے ملکوں میں یکساں ہوئیں ہیں۔ مغربی یورپ میں اور اس کے بعد باقی دنیا میں صنعتی ترقی نے ہر جگہ اپنے ساتھ ساتھ قومیت کا احساس اور ایک مضبوط مرکزی ریاست پیدا کی۔ انگریز اس کی داد تو لے سکتے ہیں کہ انھوں نے سب سے پہلے مغرب کے نئے ہندوستان کا دروازہ کھولا اور ایک نوعیت کی صنعت اور سائنس کو یہاں پہنچایا لیکن یہ کرنے کے بعد صنعت کا گلا دبا کر اس کی ترقی روکے رہے جب تک کہ حالات نے انھیں مجبور نہیں کر دیا۔ ہندوستان پہلے بھی وہ مقام تھا جہاں دو مختلف تہذیبیں آکر ملیں۔ مغربی ایشیا کی اسلامی تہذیب اور مشرقی تہذیب جو اس کی اپنی تھی اور مشرق بعید تک پھیلی ہوئی تھی۔ اب ذرا اور دور مغرب سے ایک تیسری اور پچھلی تہذیبوں سے زیادہ قوی لہر آئی اور ہندوستان مختلف پرانے اور نئے تصورات کا مرکز اور میدان جنگ بن گیا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ تیسری تہذیب فتحیاب ہوئی

اور اس طرح ہندوستان کے کئی پرانے مسائل حل کر دیتی۔ مگر انگریز جنھوں نے اسے یہاں پر قدم جمانے میں مدد کی تھی اس کو اور آگے بڑھنے سے روکنے کی کوشش کرنے لگے۔ انھوں نے ہماری صنعت کو نشو و نما نہیں پانے دیا اور اس طرح ہماری سیاسی ترقی میں بھی حائل ہوئے اور تمام ملک میں انھیں نظام جاگیرداری یا اور جو بھی فرسودہ آثار تھے ان کا انھوں نے تحفظ کیا۔ انھوں نے ہمارے بدلتے اور کسی قدر اصلاح پذیر قانون اور رسموں کے ساتھ کچھ ایسا کیا کہ وہ جس حالت میں تھیں اسی میں ٹھٹھر کر رہ گئیں اور ہمارے لئے ان کی زنجیروں سے رہا ہونا مشکل کر دیا۔ ہندوستان میں بورژوا طبقے نے ان کی خوشنودی یا مدد سے فروغ نہیں پایا۔ لیکن ریل اور صنعت کی پیدا کی ہوئی اور چیزوں کو ایک مرتبہ رائج کرنے کے بعد پھر وہ اس گاڑی کا آگے چلنا اور تغیرات کا سلسلہ جاری رہنا بند نہیں کر سکتے تھے، ہاں یہ ممکن تھا کہ وہ رکاوٹیں ڈالیں اور رفتار سست کر دیں اور یہ انھوں نے بیّن طور پر اپنے فائدے کے لئے کیا۔

"حکومت ہند کی شاہانہ عمارت اسی پختہ بنیاد پر قائم ہے۔ اور اس کا یقین کے ساتھ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ ۱۸۵۸ء سے جب کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے تمام مقبوضات برطانوی تاج کے زیر نگیں ملائے گئے اس وقت تک ہندوستان نے جو تعلیمی اور تمدنی ترقی کی ہے وہ اسے حاصل کرنا اس کی لمبی اور رنگارنگ تاریخ کے کسی دور میں اس کے بس کی بات نہ تھی۔"[1] یہ دعویٰ ایسا واضح اور یقینی نہیں ہے جیسا کہ معلوم ہوتا ہے اور یہ اکثر کہا گیا ہے کہ دراصل

---

[1] مشترکہ پارلیمنٹری کمیٹی کی رپورٹ (۳۴-۱۹۳۳ء)

برطانوی حکومت قائم ہونے کے بعد پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد کم ہو گئی لیکن اگر یہ بیان پورا پورا صحیح بھی ہوتا تو اس کا مطلب موجودہ صنعتی دور کا پچھلے زمانے سے مقابلہ کرنا ہوا پچھلے سو سال میں سائنس اور صنعت کی بدولت دنیا کے ہر ملک نے بے حساب تعلیمی اور تمدنی ترقی کی ہے اور ہم کسی ایسے ملک کی نسبت کہہ سکتے ہیں کہ اس قسم کی ترقی حاصل کرنا "اس کی لمبی اور رنگا رنگ تاریخ کے کسی دور میں اس کے بس کی بات نہ تھی" چاہے اس کی تاریخ ہندوستان کے مقابلہ میں لمبی نہ کہی جا سکے تو کیا یہ ہماری بے کار کی کٹ حجتی اور کم فہمی ہو گی۔ اگر ہم کہیں کہ اس صنعتی دور میں ہم بہر حال کچھ نہ کچھ میکانکی ترقی کر ہی لیتے اور برطانوی حکومت کے بغیر بھی کر لیتے اور در اصل اگر ہم اپنی حالت کا اور بہتیرے ملکوں سے مقابلہ کریں تو کیا ہم بغیر غلطی کے خوف کے یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہماری یہ ترقی زیادہ ہوتی۔ کیونکہ خود انگریز اس ترقی کا گلا گھونٹنے کے لئے جو کچھ کر رہے تھے اس کے خلاف ہم کو جد و جہد کرنا پڑی؟ ریلیں، تار برقی، ٹیلیفون، لاسلکی۔ ان سے اور ایسی دوسری چیزوں سے برطانوی حکومت کی اچھائی اور فیض رسانی کو جانچنا درست نہیں۔ یہ اچھی چیزیں ہیں اور ضروری تھیں۔ اور چونکہ انگریز اتفاق سے انھیں پہلے پہل یہاں لائے ہیں ان کا احسان ماننا چاہیے۔ لیکن صنعتی نظام کے یہ پیش خیمے ہمارے یہاں بالخصوص اس لئے آئے کہ برطانوی حکومت مستحکم ہو جائے یہ شاہراہیں اور شہ رگیں ہیں جن میں قوم کے خون کو دوڑنا چاہیے تھا۔ انھیں اس کی تجارت کو بڑھانا، اس کی پیداوار کو جگہ جگہ لے جانا اور اس کے لاکھوں کروڑوں آدمیوں میں نئی جان ڈالنا اور انھیں دولت مند بنانا چاہیے تھا۔ یہ تو صحیح ہے کہ بالآخر ان سے کوئی ایسا نتیجہ نکلنے والا تھا لیکن ان کی تنظیم اور ان سے کام لینے کا مقصد کچھ اور ہی تھا یعنی ملوکیت کی گرفت کو مضبوط کرنا اور منڈیوں

کو برطانوی مال کے لئے قبضہ میں کرنا اور یہ مقصد ان کی بدولت حاصل ہو گیا۔
میں صنعتی تنظیم اور نقل و حمل کے جدید ترین ذریعوں کا بالکل موافق ہوں۔ لیکن
کبھی کبھی ہندوستان کے میدانوں سے تیزی کے ساتھ گذرتے وقت مجھے
ایسا معلوم ہوا کہ یہ ریلیں جو ملک کو زندگی بخشتی ہیں ایک طرح کی آہنی بیڑیاں
اور ہتھکڑیاں ہیں جو ہندوستان کو جکڑے اور قید کئے ہوئے ہیں۔

جس تصور کے مطابق انگریزوں نے ہندوستان پر حکومت کی اس میں
ریاست پولس کی عملداری ہے۔ حکومت کا کام یہ تھا کہ ریاست کی حفاظت
کرے اور باقی سب دوسروں پر چھوڑ دے۔ انگریزی مالیات کا موضوع بس
فوج کے اخراجات، پولس، نظام حکومت، سرکاری قرضے کا سود تھے۔ شہریوں کی
معاشی اغراض کی نگرانی نہیں کی گئی۔ بلکہ انہیں انگریزی اغراض پر قربان کیا گیا۔
سوائے ایک مٹھی بھر آدمیوں کے باقی سب کو تہذیبی اور دوسری ضروریات کی
مطلق پروا نہیں کی گئی۔ مالیات عامہ کے نئے تصورات۔ جن کی بدولت دوسرے
ملکوں میں سرکاری خرچ سے ہر ایک کی تعلیم، عام صحت کی ترقی، غریب اور
کمزور دماغ والوں کی دیکھ بھال، مزدوروں کا بیمہ کہ بیماری، بڑھاپے اور
بے روزگاری کے زمانے میں بالکل محتاج ہو جائیں نہ اور دوسری باتوں کا انتظام
کیا جاتا ہے ہماری حکومت کی حد نظر سے بالکل باہر تھیں۔ اس طرح کے کاموں
کے لئے جن میں خرچ ہی خرچ ہوتا ہے اس کے یہاں کوئی گنجائش ہی نہیں
تھی۔ کیونکہ جس اصول پر اس نے لگان مقرر کئے تھے وہ بالکل الٹا تھا جن لوگوں
کی آمدنی کم تھی ان سے بڑی آمدنی والوں کی بہ نسبت حساب سے بہت زیادہ
لیا جاتا تھا اور ملک کے تحفظ اور حکومت کے محکموں پر اس کا خرچ بے انتہا
تھا اور ساری آمدنی کو کھا جاتا تھا۔

انگریزی حکومت کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ وہ اپنی پوری توجہ ان باتوں پر صرف کرتی تھی جن کے ذریعہ سے اس کا سیاسی اور معاشی تسلط بڑھتا تھا۔ باقی سب ضمنی تھا۔ اگر انھوں نے ایک نہایت طاقتور مرکزی حکومت تعمیر کی اور پولس کو بہت مستعد رکھا تو یہ ایک کارنامہ تھا جس پر وہ خود فخر کر سکتے تھے۔ لیکن ہندوستانی قوم اس کو اپنی کامیابی نہیں سمجھ سکتی۔ اتحاد بڑی اچھی چیز ہے مگر غلامی میں اتحاد کوئی فخر کی بات نہیں۔ ایک استبدادی حکومت کی طاقت لوگوں پر اور بھی گراں ہو سکتی ہے اور پولس اگرچہ وہ بے شک کئی اعتبار سے کار آمد ہوتی ہے۔ انھی لوگوں کے خلاف استعمال کی جا سکتی ہے اور کی جا چکی ہے جس کی حفاظت کرنا اس کا کام سمجھا جاتا ہے۔ برٹرنڈ رسل نے موجودہ اور قدیم یونانی تہذیب کا مقابلہ کرتے ہوئے حال ہی میں لکھا ہے "یونانی تہذیب اگر ہماری تہذیب پر فضیلت رکھتی ہے تو اس لحاظ سے کہ اس کا پولیس کا نظام خراب تھا جس کی بدولت بھلے آدمیوں کی نسبتاً زیادہ بڑی تعداد اس سے بچ نکلتی تھی!"

انگریزوں کا تسلط ہونے سے ہم کو امن ملا اور ان تکلیفوں اور مصیبتوں کے بعد جو مغل سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے پر ہمیں سہنا پڑی ہیں۔ ہندوستان کو بے شک امن کی ضرورت تھی۔ امن ایک قیمتی چیز ہے۔ ہر قسم کی ترقی کے لئے ضروری ہے اور ہمیں جب وہ حاصل ہوا تو ہم نے اس کی آؤ بھگت بھی کی۔ لیکن امن بھی بہت گراں داموں خریدا جا سکتا ہے۔ اگر وہ قبر کے کامل سکون یا پنجرے یا قید خانے کی قطعاً محفوظ زندگی کے برابر ہو جائے امن ایسے لوگوں کی اشک آلود مایوسی سے بھی پیدا ہو سکتا ہے جو اپنی حالت کو بہتر نہیں بنا سکتے۔ وہ امن جو کسی اجنبی فاتح نے جبراً قایم کیا ہو۔ اصلی امن کی

تھکن مٹانے اور تسکین دلانے والی صفات پا ہی نہیں سکتا۔ جنگ ایک بڑی خوفناک چیز ہے اور اس سے بچنا چاہیئے لیکن چند اوصاف کو وہ ترقی دیتی ہے جولفسیات کے ماہر ولیم جیمس کے مطابق "وفاداری، ربط، استقلال، بہادری، ضمیر کی بیداری، تعلیم، جدت کا مادہ، کفایت شعاری اور جسمانی صحت اور قوت کے اوصاف ہیں۔ اسی سبب سے جیمز ایک اخلاقی محرک کی تلاش میں تھا جو لڑائی کا اندھیر ڈھائے بغیر کسی انسانی جماعت میں ان اوصاف کو ترقی دے۔ اگر اسے عدم تعاون اور سول نافرمانی کی خبر ہوتی تو اسے ایک ایسی چیز مل جاتی جو اس کے دل کو لگتی۔ یعنے لڑائی کا ہم وزن اخلاقی اور پر امن محرک۔

تاریخ کے امکانات پر اور اس پر غور کرنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا تضیع اوقات ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہندوستان کے لئے اچھا تھا کہ اس کا مغرب کی سائنس اور صنعت سے سابقہ پڑا۔ سائنس مغرب کی بڑی دین تھی، ہندوستان میں اس کی کمی تھی اور اس کے بغیر اس کی حالت کا بد سے بدتر ہونا لازمی تھا جس طریقہ پر ہمارا ایک دوسرے سے سابقہ ہوا وہ قابل افسوس تھا لیکن دوسری طرف یہ بات بھی ہے کہ جب تک ہم کو متواتر صدمے نہ پہنچتے ہماری غفلت دور نہیں ہو سکتی تھی۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھئے تو پروٹسٹنٹ انفرادیت پسند اینگلو سیکسن قوم کے انگریز ہمارے لئے سب سے زیادہ موزوں تھے کیونکہ مغربی قوموں میں وہی تھے جو ہم سے سب سے زیادہ مختلف ہیں اور ہمیں زیادہ سے زیادہ صدمے پہنچا سکتے تھے۔

انھوں نے ہمیں سیاسی اعتبار سے متحد کر دیا اور یہ ایک بہت اچھی بات ہے لیکن یہ اتحاد موجود ہوتا یا نہ ہوتا۔ ہندوستان میں قومیت

بڑھتی اور سیاسی اتحاد کا مطالبہ کرتی ۔ آج کل عرب کئی الگ الگ ریاستوں میں تقسیم کر دیے گئے ہیں ۔ جن میں سے بعض آزاد ہیں ۔ بعض کا کسی یورپی قوم سے اپنے آپ کو محافظ ٹھیرایا ہے ۔ بعض کا کسی نے اپنے آپ کو نگراں اور اتالیق بنا لیا ہے یا ایسا ہی کچھ اور ۔ لیکن عرب اتحاد کی خواہش سب میں موجزن ہے ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر مغربی ملوکیت راستہ روکے نہ کھڑی ہوتی تو وہ اس اتحاد کو بڑی حد تک عمل میں لے آتے ۔ لیکن ہندوستان کی طرح وہاں بھی ان مغربی ریاستوں کا مقصد یہ ہے کہ انتشار کے میلانات کو تقویت پہنچائیں ۔ اقلیتوں کے مسائل پیدا کریں جو قومیت کے جذبہ کو کمزور کریں اور ایک حد تک اس کا ردعمل ہوتے ہیں اور ملوکیت پرست ریاست کو اس کا موقع دیتے ہیں کہ وہ قبضہ جمائے رہے اور غیر جانب دار پنچ بنی رہے ۔

ہندوستان کا سیاسی اتحاد تو برطانوی ملوکیت کی ترقی کے لیے جو کوششیں کی گئیں ان کا بس ایک ضمنی نتیجہ تھا ۔ بعد کو جب یہ اتحاد جذبہ قومیت کے ساتھ مل گیا اور غیروں کی حکومت کا مقابلہ کرنے کو کھڑا ہوا تو ہم نے دیکھا کہ انتشار اور فرقہ بندیوں کی جو ہماری آیندہ ترقی کے رستہ میں زبردست رکاوٹیں ہیں، جان بوجھ کر پرورش کی گئی ہے ۔

انگریزوں کو یہاں آئے اور تسلط حاصل کیے بھی کتنا زمانہ ہو گیا ہے پونے دو صدی ! وہ سیاہ و سفید کے مالک تھے ۔ جیسے کہ استبدادی حکومتیں ہوا کرتی ہیں اور ہندوستان کی زندگی کو اپنی مرضی کے مطابق تشکیل دینے کا انھیں ایک نایاب موقع ملا تھا ۔ اس دوران میں ساری دنیا انگلستان، یورپ، امریکہ، جاپان سب اس قدر بدل گئے ہیں کہ پہچانے نہیں جا سکتے ۔

بحر اٹلانٹک کے ساحل کی وہ امریکی نوآبادیاں جن کی اٹھارویں صدی میں کوئی حیثیت نہیں تھی اب دنیا کی سب سے دولت مند اور طاقتور قوم ہیں اور صنعت میں سب سے آگے ہیں۔ جاپان میں ذرا سی مدت میں حیرت انگیز تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ روس کی وسیع سرزمین میں، جہاں ابھی کل تک زار کی حکومت کا بھاری ہاتھ ترقی اور نشوونما کا گلا دبائے رہتا تھا ایک نئی زندگی کا خون دوڑ رہا ہے اور ہماری آنکھوں کے سامنے ایک نئی دنیا بنائی جا رہی ہے۔ ہندوستان میں بھی تغیرات ہوئے ہیں یہ ملک اب وہ نہیں ہے جو اٹھارویں صدی میں تھا اب ہم ریلیں دیکھتے ہیں۔ آب پاشی کا انتظام، کارخانے، اسکول اور کالج، بڑے بڑے سرکاری دفتر وغیرہ وغیرہ

لیکن ان تغیرات کے باوجود ہندوستان کی اس وقت کیا حالت ہے؟ ہندوستان ایک غلاموں کی ریاست ہے جس کی عظیم الشان قوت ایک پنجرے میں بند ہے جس میں آزادی سے سانس لینے کی ہمت نہیں جس پر اجنبی دور سے بیٹھے راج کر رہے ہیں۔ اس کے باشندوں سے زیادہ غریب کہیں کے باشندے نہیں۔ ان کی عمریں کم ہوتی ہیں ان میں بیماری اور وبا کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں ہوتی۔ یہاں جہالت کا دور دورہ ہے۔ بڑے بڑے علاقے ہیں جن میں صفائی اور طبی امداد کا کوئی انتظام نہیں۔ متوسط طبقے اور عوام میں بے روزگاری بے پناہ ہے۔ ہم سے کہا جاتا ہے کہ آزادی، جمہوریت، اشتراکیت، اشتمالیت کے نعرے، ناقابل عمل حوصلوں کے شیدائی، عقیدوں کے کٹر پرستار یا فلسفی لگاتے ہیں۔ اصل معیار لوگوں کی اجتماعی بہبودی ہے بے شک سب سے اہم معیار یہی ہے اور اس پر آج کل کا ہندوستان جانچا جائے تو اس کی قدر بہت ہی حقیر نکلے گی۔ دوسرے ملکوں میں بے روزگاری میں امداد

کرنے اور مصیبت زدوں کو سہارا دینے کے لئے جو بڑے انتظامات تجویز ہوئے ہیں ان کے متعلق ہم پڑھتے ہیں۔ لیکن ہمارے ملک میں جو کروڑوں بے روزگار ہیں اور جس طرح ملک کے بیشتر حصے میں مصیبتیں گلے کا طوق بنی ہیں اس کے لئے کیا کیا جاتا ہے۔ دوسری جگہوں کے متعلق ہم پڑھتے ہیں کہ رہنے کے لئے مکانوں کا بندوبست کیا جا رہا ہے۔ ہمارے یہاں ان کروڑوں کے رہنے کے لئے کیا سوچا جاتا ہے جو مٹی کے جھونپڑوں میں رہتے ہیں۔ یا جنھیں چھت کا سایہ بھی میسر نہیں؟ پھر اس میں ہمارا کیا قصور ہے اگر ہم ایسے ملکوں پر رشک کریں جہاں تعلیم، صفائی، طبی امداد کے وسائل، مہذب زندگی کا سامان اور صنعتی پیداوار میں روز افزوں ترقی ہوئی ہے جب کہ ہم اسی ایک حال میں پڑے ہوئے ہیں۔ یا بڑھتے ہیں تو گھونگھے کی رفتار سے۔ روس نے کوئی بارہ برس کے مختصر سے عرصہ میں ایک حیرت انگیز کوشش کر کے اپنے وسیع ملک میں جہالت کا خاتمہ کر دیا اور ایک نفیس اور جدید ترین اصولوں پر مبنی طریقہ تعلیم رائج کر دیا ہے جس کا عوام کی زندگی سے گہرا تعلق ہے۔ اتاترک مصطفےٰ کمال کی رہبری میں ترکی جو پیچھے رہ گیا تھا لمبے لمبے ڈگ رکھ کر تعلیم کو عام کرنے میں دوسروں کے برابر پہنچ گیا ہے۔ فاشسٹ اٹلی نے اپنے نئے مسلک پر پہلا قدم رکھتے ہی جہالت پر ایک زور دار حملہ کیا۔ وزیر تعلیم جنٹیلے نے اعلان کیا کہ "جہالت کی فوج کا قلب مارنا چاہیئے۔ اس ناسوری مرض کو جو ہمارے جسم سیاسی کو سڑائے ڈالتا ہے دہکتے ہوئے لوہے سے جلا کر دور کرنا چاہیئے"۔ یہ بہت سخت الفاظ ہیں جنھیں کسی ڈرائنگ روم میں زبان پر لانا نامناسب ہوگا۔ لیکن یہ ظاہر کرتے ہیں کہ بات کہنے والے میں جوش کتنا ہے اور عقیدہ کتنا پختہ ہے۔ ہم یہاں پر زیادہ شائستہ ہیں اور ہماری زبان شستہ اور نرم ہوتی ہے۔ ہم کمال احتیاط

سے قدم رکھتے ہیں اور ہماری ساری قوت کمیشنوں اور کمیٹیوں میں صرف ہو جاتی ہے۔

ہندوستانیوں پر الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ باتیں بہت کرتے ہیں اور کام کم۔ یہ الزام صحیح ہے۔ لیکن کیا انگریزوں میں کمیٹی اور کمیشن بنانے کی جو بے شمار و حساب استعداد ہے۔ اس پر ہم اپنی حیرت ظاہر نہ کریں۔ وہ کمیٹیاں اور کمیشن جن میں سے ہر ایک مدتوں محنت کرنے کے بعد ایک عالمانہ رپورٹ پیش کرتا ہے "ایک اہم سرکاری تالیف" جس کی حسب دستور تعریف کی جاتی ہے اور پھر حسب دستور کسی خانے میں رکھ دی جاتی ہے اس طرح کہ ہم کو احساس ہوتا ہے کہ ہم آگے بڑھ رہے ہیں۔ ترقی کر رہے ہیں اور یہ فائدہ بھی ہوتا ہے کہ جہاں ہیں وہیں پر رہتے ہیں۔ خودداری جو چاہتی ہے وہ بھی ہو جاتا ہے اور مستقل اغراض وابستہ ہیں ان کا بال بیکا نہیں ہوتا اور وہ محفوظ رہتی ہے۔ دوسرے ملکوں میں اس پر بحث کی جاتی ہے کہ ترقی کیسے کریں۔ ہم روکنے اور بریک لگانے اور حقوق کا تحفظ کرنے کی تدبیریں کرتے ہیں کہ کہیں بہت زیادہ تیزی سے آگے نہ بڑھ جائیں۔

۱۹۳۴ء کی مشترک پارلیمنٹری کمیٹی کی رپورٹ میں مغل عہد کی نسبت ہمیں بتایا گیا ہے کہ "شہنشاہ کی شان و شوکت رعایا کی غربت کا پیمانہ ہو گئی تھی" یہ خیال بالکل صحیح ہے لیکن کیا آج کل بھی ہم اسی پیمانے سے نہیں ناپ سکتے؟ آپ آج کل کی نئی دہلی اور وائسرائے کے ٹھاٹھ اور صوبے کے گورنروں اور ان کے دکھاوے اور نمائش کو کیا کہیں گے؟ ان کا پس منظر بھی وہی انتہائی اور حیرت انگیز غربت ہے۔ دونوں کو مقابلہ پر دیکھ کر تکلیف ہوتی ہے اور یہ سمجھنے میں دشواری ہوتی ہے کہ حساس لوگ اسے کیسے گوارا کرتے ہیں۔ شہنشاہی

عمارت کے روکار کے پیچھے ہندوستان کا جو منظر ہے اس پر افلاس اور ویرانی برستی ہے۔ سامنے تو جوڑ جاڑ کر اور لیپ پوت کر کچھ حیثیت بنا لی گئی ہے لیکن اس کے پیچھے بد قسمت متوسط طبقے کے ادنیٰ لوگ ہیں جنھیں موجودہ زمانہ کا نظام حیات روز بروز اور بے بس کیے دیتا ہے اور آگے بڑھیے تو مزدور ہیں جو بڑی تکلیف سے رہتے ہیں اور غربت کی چکی میں پسے جاتے ہیں۔ پھر ہمارا کسان ہے۔ ہندوستان کا قومی نشان جس کی قسمت میں زندگی کو ایک سدا چھائی ہوئی رات کے اندھیرے میں گذارنا لکھا ہے۔

"صدیوں کے بوجھ سے جھکا ہوا
وہ اپنے پھاوڑے کی ٹیک لگائے زمین کو تک رہا ہے،
یگوں کی محرومی اس کے چہرے پر نقش ہے۔
اور دنیا کا بار اس کی پیٹھ پر ہے

....

ہزاروں برس جو دکھ سہے گئے ان کی جھلک اس ہیبت ناک
شکل میں نظر آتی ہے
سارے زمانے کا الم اس دکھتی اور جھکی ہوئی کمر میں ہے۔
یہ بھیانک شکل اس نوع انسانی کی
جسے دغا دی گئی، جو لٹی، رسوا ہوئی اپنے حق سے محروم کی گئی۔
صدائے احتجاج ہے ان قوتوں کے سامنے جنھوں نے دنیا کو بنایا۔
اور یہ احتجاج ایک پیشین گوئی بھی ہے"[1]

---

[1] یہ اقتباسات ایک امریکی شاعر مارکھم (کا) بقیہ صفحہ ۲۶۵

ہندوستان کی تمام مصیبتوں کا الزام انگریزوں پر لگانا مہمل ہے
یہ ذمہ داری ہم کو اپنے سر لینا ہوگی اور ہمیں اس سے بچنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیئے۔ اپنی کمزوریوں کے لازمی نتائج کا ذمہ دوسروں کے سر تھوپنا بہت بری بات ہے۔ ایک تحکم پسند نظام حکومت خصوصاً اگر وہ غیر ملکی ہو لازمی طور پر غلامی کے جذبے کو ترقی دے گا اور محکوموں کے ذہن و نظر کو محدود کرنے کی کوشش کرے گا۔ یہ نوجوانوں کی بہترین صفات حوصلہ مندی، من چلے پن، جدت طبع، تیزی اور طراری کو کچل ڈالے گا اور بزدلی، کاہلی، بے کورانہ اطاعت، افسروں کو خوش رکھنے اور ان کی خوشامد کرنے کی خواہش کو بڑھائے گا۔ ایسا نظام سچے جذبۂ خدمت کو نہیں ابھارتا، قوم کی خدمت کا حوصلہ اور نصب العین کی محبت نہیں پیدا کرتا بلکہ ان لوگوں کو چن لیتا ہے جن میں جوش قومی سب سے کم ہو اور جن کا مقصد صرف ذاتی ترقی ہو۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوستان میں انگریزوں کو کس قسم کے آدمی ملتے ہیں، ان میں سے بعض تیز فہم ہوتے ہیں اور اچھا کام کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، وہ سرکاری یا نیم سرکاری ملازمتوں کی طرف ڈھل جاتے ہیں، اس لیے کہ اور کسی طرف جانے کا موقع نہیں ہوتا۔ یہاں ان کی ساری تیزی جاتی رہتی ہے۔ وہ اس بڑی مشین کے پرزے بن کر رہ جاتے ہیں اور ان کے ذہن اس گھسی پٹی لیک میں پڑ کر کند ہو جاتے ہیں۔ ان میں دفتری حکومت کے خاص اوصاف پیدا ہو جاتے ہیں "یعنی کلرک کی قابلیت اور دفتری کام کی حکمت عملی" بہت ہوا تو انہیں اپنے کام سے کچھ دھیمی سی محبت ہو جاتی ہے۔ سرگرمی اور جوش کا تو کوئی سوال ہی

(صفحہ ۲۷۲ کا بقیہ: نظم "پھاوڑے والا" سے لیے گئے ہیں۔)

نہیں۔ کیونکہ غیروں کی حکومت میں یہ چیز ناممکن ہے۔

ان کو چھوڑ کر چھوٹے عہدہ دار عموماً کچھ قابل تعریف نہیں ہوتے کیونکہ وہ بس اپنے افسروں کی خوشامد کرنا اور اپنے ماتحتوں پر دھونس جمانا جانتے ہیں۔ اس میں ان کا قصور نہیں۔ یہ نظام حکومت انھیں تربیت ہی ایسی دیتا ہے اگر اس فضا میں خوشامد اور رعایت کا زور ہو جیسا کہ اکثر ہوتا ہے تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ ان لوگوں کا ملازمت میں کوئی نصب العین نہیں ہے بلکہ روزگار اور اس کے ساتھ فاقہ کشی کا خوف بھوت کی طرح ان کے پیچھے لگا رہتا ہے اور ان کا سارا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اپنے عہدہ پر برقرار رہیں اور اپنے عزیزوں اور دوستوں کے لئے اور نوکریاں حاصل کر لیں۔ جہاں جاسوس اور وہ ذلیل ترین مخلوق یعنی مخبر ہمیشہ گھات میں لگے رہتے ہوں۔ وہاں لوگوں میں عمدہ صفات کا نشو و نما پانا آسان نہیں۔

حال کے واقعات نے ان لوگوں کے لئے جو حساس طبیعت اور جذبہ قومی رکھتے ہیں سرکاری ملازمت اختیار کرنا اور بھی دشوار کر دیا ہے حکومت ان کو پسند نہیں کرتی اور وہ بھی جب تک معاشی حالات انھیں مجبور نہ کر دیں حکومت سے تعلق رکھنا نہیں چاہتے۔

لیکن دنیا جانتی ہے کہ برطانوی سامراج کا بار گورے آدمی سنبھالے ہوئے ہیں نہ کہ کالے آدمی۔ ہمارے یہاں سامراج کی روایت کو قائم رکھنے کے لئے متعدد امپیریل سروسیں ہیں اور ان کے خاص حقوق کی حفاظت کے لئے کافی تحفظات ہیں اور ہم سے کہا جاتا ہے کہ یہ سب ہندوستان کے مفاد کے لئے ہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ ہندوستان کا مفاد اسی چیز میں ہوتا ہے جس میں ان سروسوں کا صریحی فائدہ ہو۔ اگر انڈین سول سروس کا کوئی

خاص حق یا کوئی بڑا عہدہ ان کے ہاتھ سے نکل جائے تو ایک شور مچ جاتا ہے کہ اس سے بد انتظامی اور بد دیانتی پھیلے گی۔ انڈین میڈیکل سروس کے وہ عہدے جو گورے آدمیوں کے لئے مخصوص ہیں کم کر دیے جائیں تو "ہندوستانیوں کی صحت عامہ کے لئے خطرہ پیدا ہوتا ہے" اور ظاہر ہے کہ اگر فوج کے اس حصے کو جس میں انگریز ہیں ہاتھ بھی لگایا گیا تو دنیا بھر کی آفتیں ہم پر ٹوٹ پڑیں گی۔

میرے خیال میں یہ ایک حد تک ٹھیک ہے کہ اگر اعلیٰ عہدہ دار سب یکبارگی چلے جائیں اور اپنے محکموں کو اپنے ماتحتوں کے حوالے کر دیا تو کارگزاری کا معیار گر جائے گا۔ لیکن اس کا سبب یہ ہے کہ یہ سارا نظام قائم ہی اسی ڈھنگ سے ہوا ہے۔ اور ماتحت نہ تو قابلیت کے لحاظ سے منتخب کئے گئے ہیں اور نہ کبھی ان پر ذمہ داری ڈالی گئی ہے مجھے یقین ہے کہ ہندوستان میں قابل آدمی کثرت سے موجود ہیں اور اگر صحیح طریقہ اختیار کیا جائے تو تھوڑے ہی عرصہ میں یہ لوگ کام کے بنائے جا سکتے ہیں۔ لیکن اس کے معنی یہ ہیں کہ ہماری حکومت اور ہماری سماج کا نقطۂ نظر بالکل بدل جائے یعنی ایک نئی ریاست وجود میں آئے۔

اس وقت صورت یہی کہ ہم سے کہا جاتا ہے دستور میں چاہے جیسے تغیرات ہوں ان بڑی سروسوں کا جو ہماری محافظ اور پشت پناہ ہیں یہ سنگین قلعہ بدستور قائم رہے گا۔ یہ سروسیں حکومت کے اسرار کی حامل ہیں وہ اپنے مندر کی پاسبانی کریں گی اور نامحرموں کو اس حریم پاک میں قدم نہیں رکھنے دیں گی۔ رفتہ رفتہ جوں جوں ہم اس عزت کے مستحق ہوتے جائیں گے وہ پردوں کو ایک ایک کرکے ہٹاتے جائیں گے یہاں تک کہ کبھی نہ کبھی وہ دن آئے گا جب آخری پردہ ہٹ جائے گا اور یکایک اس معبد کا اندرونی

حصہ ہماری متحیر اور متوقع نگاہوں کے سامنے آجائے گا۔

امپیریل سروسوں میں سب سے بڑا ذریعہ ہندوستانی سول سروس کا ہے اور ہندوستان کی حکومت کو چلانے کی نیک نامی یا بدنامی اسی کے حصہ میں آتی ہے۔ اس سروس کے چند خوبصورت اوصاف ہیں بارہا سنائے جاچکے ہیں اور سامراج کے نظام میں اس کو جو عظمت حاصل ہے وہ ضرب المثل ہوگئی ہے۔ لیکن ہندوستان میں اس کا مسلسل اقتدار، اسے قریب قریب استبدادی حکومت کے اختیارات حاصل ہونا اور پھر اس طرح آسمان پر چڑھایا جانا کسی فرد یا جماعت کے ذہنی توازن کے لیے مفید نہیں ہوسکتا۔ سول سروس کی میرے دل میں جو قدر ہے اس کے باوجود مجھے یہ کہنا پڑتا ہے کہ انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے یہ حضرات بہت جلد اس بیماری کا شکار ہوجاتے ہیں جو پرانے زمانے سے چلی آتی ہے اور آج کل اور بڑھ گئی ہے۔ یعنی اپنی بڑائی کا مالیخولیا۔

سول سروس کی خوبیوں سے انکار کرنا فضول ہے۔ اس لئے کہ انھیں بھولنے کا ہم کو موقع ہی نہیں ملتا۔ لیکن اس کی تعریف میں اتنی لغو باتیں کہی جاچکی ہیں اور کہی جارہی ہیں کہ کبھی کبھی جی چاہتا ہے ذرا ان لغویات کی قلعی کھول دی جائے۔ امریکی ماہر معاشیات ویلن نے امتیازی حقوق رکھنے والے طبقوں کو "داشتہ طبقے" کہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آئی سی ایس اور دوسری امپیریل سروسوں کو "داشتہ سروسیں" کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ بہ حیثیت ہمیں بڑا مہنگا پڑتا ہے۔

میجر گراہیم پول سے جو پارلیمنٹ کے سابق لیبر ممبر ہیں اور ہندوستان کے معاملات سے بہت دلچسپی رکھتے ہیں۔ کچھ دن ہوئے "موڈرن ریویو"

میں لکھا تھا کہ" ابھی تک کسی نے یہ انکار نہیں کیا کہ آئی سی ایس ایک نہایت قابل اور مستند سروس ہے" چونکہ انگلستان میں ایسی باتیں اکثر کہی جاتی ہیں اور مان لی جاتی ہیں اس لئے اس قول پر تنقیدی نظر ڈالنے کی ضرورت ہے اس طرح کے قطعی دعوے جن کی آسانی سے تردید ہو سکتی ہے خطرے سے خالی نہیں اور میجر گرہیم کا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ اس بات سے کسی نے انکار نہیں کیا۔ بارہا اس کا انکار کیا جا چکا ہے۔ بہت دن ہوئے مسٹر گوکھلے نے آئی سی ایس کو کھری کھری سنائی تھیں۔ آج بھی تمام ہندوستانی خواہ وہ کانگریسی ہوں یا نہ ہوں میجر گرہیم پول کے اس قول کی تردید کرنے کو تیار ہو جائیں گے۔ مگر یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں فریقوں کی رائے اپنی اپنی جگہ صحیح ہو۔ ان کا اشارہ مختلف صفات کی طرف ہو۔ دیکھنا یہ ہے کہ سول سروس میں جو قابلیت اور مستعدی ہے وہ کس قسم کی ہے۔ اگر اس قابلیت اور مستعدی کا اندازہ اس نقطۂ نظر سے کیا جائے کہ ہندوستان میں برطانوی سلطنت کس حد تک مستحکم کی گئی اور اس ملک سے ناجائز فائدہ اٹھانے میں کتنی مدد پہنچائی گئی تو بے شک آئی سی ایس والے یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ انھوں نے بڑی کامیابی حاصل کی لیکن اگر معیار ہندوستان کے عوام کی بہبودی ہے تو وہ صریحاً ناکامیاب رہے اور ان کی ناکامیابی اور بھی نمایاں ہو جاتی ہے جب دیکھتے ہیں کہ آمدنی اور معیار زندگی کے لحاظ سے ان میں اور عام لوگوں میں جن کی خدمت کی غرض سے وہ رکھے گئے ہیں اور جن پر ان کی تنخواہوں کا بار پڑتا ہے زمین آسمان کا فرق ہے۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ مجموعی حیثیت سے اس سروس نے ایک خاص معیار قائم کر رکھا ہے۔ یہ معیار لازمی طور پر اوسط درجے کی قابلیت کا ہے۔ اگرچہ کبھی کبھی اس میں غیر معمولی لوگ بھی نکلے ہیں۔ اس قسم کی سروس سے اس سے زیادہ

توقع بھی نہیں کی جا سکتی تھی۔ اصل میں اس میں انگلستان کے پبلک اسکول کی اسپرٹ مع اپنی تمام خوبیوں اور خرابیوں کے کام کر رہی ہے (اگرچہ اس وقت آئی سی ایس کے بہت سے لوگ پبلک اسکول کے تعلیم یافتہ نہیں) گو آئی سی ایس نے ایک معیار قایم رکھا۔ مگر وہ مقررہ نمونے کے مطابق نہ ہونے کو سخت ناپسند کرتی تھی اور اس کے افراد کی خاص صلاحیتیں کچھ تو اپنے بندھے ہوئے ڈھرے میں پڑ جانے کی وجہ سے اور کچھ اس خوف سے کہ کہیں وہ دوسروں سے مختلف نہ ہوں ٹھٹھر کر رہ گئیں۔ اس میں بہت سے لوگ دل سے کام کرنے والے تھے بہت سے ایسے جن کے سامنے خدمت کا ایک نصب العین تھا۔ مگر یہ خدمت برطانوی سلطنت کی خدمت تھی۔ ہندوستان کا نمبر دوسرا تھا اور بہت بعد میں آتا تھا۔ اپنی تربیت حالات کے لحاظ سے سول سروس کا طرز عمل اس کے سوا کچھ اور ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ چونکہ وہ تعداد میں کم تھے اور انھیں ایک غیر قوم سے سابقہ تھا جو اکثر ان کی مخالف رہتی تھی اس لیے انھوں نے باہمی اتفاق اور ایک خاص معیار قایم رکھا اور چونکہ انھیں بڑی حد تک مطلق العنانی حاصل تھی۔ انھیں ہر قسم کی تنقید ناگوار ہونے لگی۔ اسے گناہ کبیرہ سمجھنے لگے۔ اس کی ناروا داری بڑھتی گئی۔ ان کا انداز معلمانہ ہوتا گیا اور ان میں غیر ذمہ دار حاکموں کے بہت سے عیب پیدا ہو گئے۔ وہ خود پسند اور برخود غلط، تنگ نظر اور بے لوچ ہو کر رہ گئے۔ یعنی ایک ترقی پذیر ماحول سے انھیں بالکل مناسبت نہیں رہی۔ جب ان سے زیادہ قابل اور ماحول سے مطابقت رکھنے والے دماغ ہندوستان کے مسئلہ پر غور کرنے لگے تو انھیں بہت برا معلوم ہوا وہ ان لوگوں کو برا بھلا کہنے لگے انھیں دبانے لگے اور ان کے راستے میں ہر طرح کے روڑے اٹکانے لگے جب جنگ عظیم کے بعد کے تغیرات نے دنیا میں ایک ہیجان اور حرکت پیدا کر دی

تو ان کی عقل چکرا گئی اور یہ نئے حالات سے نمٹنے کے قابل نہیں رہے۔ ان کی محدود اور جامد تعلیم نے انھیں غیر معمولی موقعوں اور نئی صورتوں کے لیے تیار نہیں کیا تھا۔ ایک مدت تک غیر ذمہ دار رہنے سے ان کی عادتیں بگڑ گئی تھیں۔ ایک جماعت کی حیثیت سے وہ قریب قریب خود مختار تھے بعض برائے نام برطانوی پارلیمنٹ کے ماتحت تھے۔ لارڈ ایکٹن نے کہا ہے کہ "اقتدار آدمی کو بگاڑ دیتا ہے اور کامل اقتدار تو بالکل ہی بگاڑ دیتا ہے۔"

مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے تو اپنی بساط کے موافق یہ لوگ بھروسے کے عہدہ دار تھے۔ جو اپنا روزمرہ کا کام خوش اسلوبی سے انجام دیتے تھے۔ اگرچہ اس میں کوئی خاص ذہانت نہیں پائی جاتی تھی۔ ان کی تربیت ہی ایسی تھی کہ اگر کوئی غیر متوقع صورت پیدا ہو جاتی تو وہ رہ جاتے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اپنی خود اعتمادی، ضابطہ پسند طبیعت اور باہمی اتحاد کی بدولت فوری مشکلات پر قابو پا لیتے۔ عراق میں جو گڑبڑ ہوئی تھی اس نے ظاہر کر دیا کہ ہندوستان کی برطانوی حکومت کتنی سست اور ٹھس ہے۔ اس قسم کے واقعات بہت ہوتے ہیں۔ مگر ظاہر نہیں ہونے پاتے۔ سول نافرمانی کو روکنے کے لیے جو کارروائیاں حکومت نے کیں وہ بھی بہت بھونڈی تھیں۔ بندوق اور لاٹھی چلا کر مخالفوں کو تھوڑی دیر کے لیے دبا سکتے ہیں۔ مگر اس سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا بلکہ خود وہ برتری کا احساس جس کا تحفظ مقصود ہے اندر سے کھوکھلا ہو جاتا ہے۔ اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ ان لوگوں نے ایک بڑھتی ہوئی جارحانہ قومی تحریک کا مقابلہ کرنے کے لیے تشدد سے کام لیا۔ یہ لازمی تھا کیونکہ سلطنتوں کا دارومدار اسی پر ہے اور ان کو مخالفت کا سامنا کرنے کا اور کوئی طریقہ سکھایا نہیں گیا تھا۔ لیکن یہ بے ضرورت اور حد سے زیادہ تشدد سے

کام لینا یہ ظاہر کرتا ہے کہ معاملہ ان کے قابو سے باہر ہو گیا تھا اور معمولی حالت میں جو ضبط و استقلال ان میں نظر آتا تھا وہ اس وقت باقی نہیں رہا تھا۔ اکثر وہ بدحواس ہو جاتے تھے اور ان کی پبلک تقریروں میں ہسٹریائی سی کیفیت نظر آتی تھی۔ کوئی نازک موقع آتا ہے تو ہٹ دھرمی سے وہ سب کی قلعی کھول دیتا ہے اور طبیعت کی گہرائیوں میں جو کمزوریاں چھپی ہوں انھیں سطح پر لے آتا ہے۔ سول نافرمانی ایسی ہی آزمائش کا موقع تھا اور مورچے کے دونوں طرف، یعنی کانگریس اور گورنمنٹ دونوں کے یہاں ایسے لوگ بہت ہی کم تھے جو اس آزمائش میں پورے اترے۔ مسٹر لائڈ جارج کہتے ہیں "نازک موقعوں پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ مرد اور عورتیں جن میں واقعی اعلیٰ درجے کی قابلیت ہے بہت کم ہیں اور باقی لوگ ایسے موقعوں پر بیکار ہیں۔ جب کوئی بڑا سیلاب آتا ہے تو وہ ٹیلے جو یوں نمایاں بلند نظر آتے تھے ڈوب جاتے ہیں اور صرف سب سے اونچی چوٹیاں پانی کی سطح کے اوپر نظر آتی ہیں۔"

آئی سی ایس کے لوگ اپنے ذہن اور جذبات کے اعتبار سے اس طوفان کے لئے جو ہندوستان میں آیا بالکل تیار نہ تھے۔ ان میں سے اکثر کی اصل تعلیم کلاسیکی طرز پر ہوئی تھی جس سے ان میں ایک خاص قسم کی شائستگی اور ایک خاص قسم کی دل کشی پیدا ہو گئی تھی لیکن یہ طرز پرانے زمانے کا تھا جو عہد وکٹوریہ کے لئے موزوں تھا مگر موجودہ حالات سے بالکل مناسبت نہیں رکھتا تھا۔ یہ لوگ اپنی ایک تنگ محدود دنیا، اینگلو انڈین دنیا، میں رہتے تھے۔ جو نہ انگریزی تھی نہ ہندوستانی۔ وہ ان قوتوں کی قدر و قیمت کا جو اس کے عہد کی سماج میں کارفرما ہیں کوئی اندازہ نہیں لگا سکتے تھے۔ باوجود اس مضحک دعوے کے کہ وہ ہندوستان کے عام لوگوں کے ولی اور امین ہیں وہ ان سے بہت کم

واقفیت رکھتے تھے اور نئے اوسط کے طبقے کے شہریوں سے اور بھی کم۔ وہ ہندوستانیوں کی بصیرت کا اندازہ ان خوشامدیوں اور ملازمت کے خواستگاروں کو دیکھ کر کرتے جو انھیں گھیرے رہتے تھے باقی سب کو مفسد اور شریر جان کر قابل التفات نہ سمجھتے۔ لڑائی کے بعد ساری دنیا میں جو تغیرات خصوصاً معاشی زندگی میں ہوئے ان کا علم انھیں بہت ہی کم تھا۔ وہ اپنے اسی پرانے ڈھب پر چلتے تھے اور بدلتے ہوئے حالات کے مطابق اپنے آپ کو بدلنا ان کے لئے ناممکن تھا۔ انھوں نے یہ محسوس نہیں کیا کہ جس نظام کی وہ نمایندگی کر رہے ہیں وہ اب فرسودہ اور بے کار ہو گیا ہے۔ اور وہ ایک جماعت کی حیثیت سے وہی طرز عمل اختیار کر رہے ہیں جس کا نقشہ ٹی۔ ایس ایلیٹ نے اپنی تصنیف "کھوکھلے آدمی" میں کھینچا ہے۔

یہ فرسودہ نظام اس وقت تک قائم رہے گا جب تک کہ برطانوی سلطنت قائم ہے اور اب بھی خاصی طاقتور ہے اور اس کے چلانے والے قابل اور باتدبیر ہیں۔ ہندوستان کی برطانوی حکومت اس دانت کی طرح ہے جو سڑ گیا ہے مگر مسوڑھوں میں جڑ پکڑے ہوئے ہے۔ اس سے درد ہوتا ہے مگر اس کو اکھاڑنا آسان نہیں۔ یہ درد اسی طرح ہوتا رہے گا بلکہ اور بڑھتا جائے گا جب تک کہ دانت نکالا نہ جائے یا خود ہی نہ گر جائے۔

انگلستان میں بھی پبلک اسکول کے پڑھے لکھے لوگوں کا دور دورہ ختم ہو چکا ہے۔ وہ اب تک ملکی معاملات میں دخیل ہیں۔ مگر اب ان کی وہ پہلی سی بات نہیں رہی۔ ہندوستان میں وہ اور بھی زیادہ بے محل ہیں۔ جارحانہ قومی تحریک سے نبھانا ان کے لئے محال ہے اور سماجی انقلاب تحریک سے نبھانا تو کسی طرح ممکن ہی نہیں۔

بے شک آئی سی ایس میں بہت سے اچھے لوگ ہیں۔ انگریز بھی اور ہندوستانی بھی لیکن جب تک موجودہ نظام قائم ہے ان کے یہ اوصاف ان مقاصد میں کام آئیں گے جو ہندوستانیوں کے حق میں مفید نہیں۔ سول سروس کے بعض ہندوستانی بہ ایک اسکول کے رنگ میں اس قدر ڈوب جاتے ہیں کہ وہ "بادشاہ سے بھی زیادہ بادشاہی کے حامی" بن جاتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار میں آئی سی ایس کے ایک نوجوان ہندوستانی سے ملا تھا جو اپنے متعلق بہت اچھی رائے رکھتے تھے۔ مگر افسوس ہے کہ مجھے ان کی رائے سے اتفاق نہ تھا۔ انھوں نے سروس کے بہت سے اوصاف جتائے اور آخر میں برطانوی راج کی حمایت میں وہ دلیل پیش کی جس کا کوئی جواب نہیں کہ کیا برطانوی راج رومی اور چنگیزی اور تیموری راج سے بہتر نہیں؟

آئی سی ایس والوں کے خیالات کی بنیاد یہ ہے کہ وہ اپنے فرائض نہایت قابلیت سے انجام دیتے ہیں اس لئے انھیں حق ہے کہ اپنے چند در چند مطالبات پر جتنا چاہیں زور دیں۔ اگر ہندوستان غریب ہے تو یہ اس کے معاشرتی رسم و رواج کا قصور ہے۔ یا اس کے بنیوں اور ساہوکاروں اور سب سے زیادہ اس کی بے شمار آبادی کا۔ ہندوستان کے سب سے بڑے بنئے یعنی برطانوی حکومت کو وہ چپ چاپ نظر انداز کر جاتے ہیں معلوم نہیں آبادی کی کثرت کا وہ کیا علاج کریں گے۔ اس لئے کہ گو انھیں آئے دن کے قحط، وبا اور شرح اموات کی عام زیادتی سے بہت بڑی مدد ملتی ہے مگر پھر بھی آبادی ہے کہ بڑھتی چلی جاتی ہے۔ لوگ ضبط تولید کی تجویز پیش کرتے ہیں اور میں خود اس سے پوری طرح متفق ہوں کہ ضبط تولید کے طریقوں کے متعلق لوگوں کو معلومات بہم پہنچائی جائیں لیکن ان تدبیروں پر عمل ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ عام لوگوں کا

معیار زندگی بہت بلند ہو۔ ان میں تھوڑی بہت تعلیم پھیل جائے۔ اور سارے ملک میں بے شمار اسپتال قائم ہوں۔ موجودہ حالات میں ضبط تولید کے وسائل عام لوگوں کی پہنچ سے بالکل باہر ہیں۔ البتہ اوسط طبقے کے لوگ ان سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور میرے خیال میں بڑی حد تک اٹھا رہے ہیں۔

لیکن آبادی کی کثرت کا مسئلہ دوسرے پہلو سے بھی غور و توجہ کا مستحق ہے۔ آج کل دنیا کے سامنے جو مسئلہ درپیش ہے وہ غذا اور ضروریات کی کمی کا نہیں بلکہ اصل میں کھانے والوں کی کمی کا ہے۔ یعنی حاجت مندوں میں خریدنے کی استطاعت نہ ہونے کا

دنیا سے قطع نظر خود ہندوستان میں بھی غذا کی کمی نہیں۔ اگرچہ آبادی بڑھ گئی ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ اشیائے خوردنی کی رسد آبادی کے تناسب سے زیادہ بڑھی ہے اور بڑھائی جاسکتی ہے اور پھر ہندوستان کی آبادی کا یہ اضافہ جس کا اس قدر شور ہے (بجز پچھلے دس سال کے) اکثر مغربی ممالک کے مقابلہ میں بہت کم رہا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ آگے چل کر یہ فرق بہت زیادہ ہو جائے گا۔ کیونکہ مختلف محرک مغربی ملکوں میں آبادی کے بڑھنے کی رفتار کم کر رہے ہیں بلکہ روک رہے ہیں لیکن ایسے اسباب ہندوستان میں بھی جلد پیدا ہو جائیں گے جو آبادی کو بڑھنے سے روکیں گے۔

جب کبھی ہندوستان آزاد اور اس قابل ہوگا کہ اپنی نئی زندگی کو حسب دلخواہ تعمیر کرے تو اسے لازمی طور پر اس کام کے لئے بہترین مرد اور عورتیں درکار ہوں گی۔ اچھے آدمی ہمیشہ کمیاب ہوتے ہیں اور ہندوستان میں اور بھی کمیاب ہیں۔ اس لئے کہ برطانیہ کی حکومت میں ہمارے لئے مواقع کی

لگی رہی ہے ہم کو اپنے اجتماعی کاروبار کے کئی شعبوں میں غیر ملکی ماہروں کی ضرورت پڑے گی۔ خاص طور پر ان شعبوں میں جن کے لئے میکانکی یا علمی واقفیت درکار ہوتی ہے۔ ان لوگوں میں جنھوں نے آئی سی ایس یا دوسری امپیریل سروسوں میں کام کیا ہے بہت سے ہندوستانی اور غیر ملکی ہوں گے جو نئے نظام کے لئے مفید ہوں گے اور خوشی سے رکھے جائیں گے۔ لیکن اس بات کا مجھے پورا یقین ہے کہ ہندوستان میں کوئی نیا نظام اس وقت تک تعمیر نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ آئی سی ایس کی روح ہمارے نظام حکومت اور سرکاری محکموں میں سمائی ہوئی ہے۔ تحکم پسندی شہنشاہی کی رفیق ہے اور آزادی کے ساتھ کسی طرح نہیں نبھ سکتی۔ یا تو یہ آزادی کو مٹا کر رہے گی یا خود مٹا دی جائے گی۔ یہ تو ریاست کے صرف ایک طرز میں کھپ سکتی ہے یعنی فاشستی طرز میں۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ آئی سی ایس اور اسی قسم کی اور سروسوں کا موجودہ حالت میں باقی رہنا ناممکن ہے۔ ان کو توڑے بغیر حقیقی معنوں میں کوئی نیا نظام تعمیر ہی نہیں کیا جا سکتا۔ افراد کی حیثیت سے ان سروسوں کے لوگ اگر وہ نیا کام کرنا چاہتے ہوں اور کرنے کی استعداد رکھتے ہوں تو خوشی سے لے لئے جائیں گے مگر نئی شرائط پر۔ تو اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ انھیں یہ لمبی چوڑی تنخواہیں اور الاؤنس جو آج کل ملتے ہیں دئے جا سکیں گے۔ نئے ہندوستان کی خدمت کے لئے ایسے آدمیوں کی ضرورت ہوگی جو مخلص اور مستعد ہوں۔ جو اپنے نصب العین پر ایمان رکھتے ہوں اور اس کے حاصل کرنے کی دل و جان سے کوشش کرتے ہوں اور جو کام اس لئے کرتے ہوں کہ اس سے مسرت اور عزت حاصل ہوتی ہے اس لئے نہیں کہ بڑی بڑی تنخواہیں ملتی ہیں۔ روپیے کے لالچ کو جس طرح بھی ہو سکے کم کرنا پڑے گا۔ میرا خیال ہے کہ سب سے کم مانگ ان انتظامی افسروں کی ہوگی جو کسی قسم

کی فنی واقفیت نہیں رکھتے۔ ایسے لوگ ہندوستان میں بہت نکل آئیں گے۔
میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ ہمارے یہاں کی لبرل پارٹی اور دوسری جماعتوں نے ہندوستان کے نظم و نسق کے معاملے میں برطانوی خیالات کو آنکھ بند کر کے تسلیم کر لیا ہے۔ سروسوں کے معاملے میں یہ بات خاص طور پر نمایاں ہے کیونکہ ان حضرات کا مطالبہ صرف یہ ہے کہ ان میں ہندوستانی رکھے جائیں۔ یہ نہیں کہ ان سروسوں کی نوعیت، ذہنیت اور ریاست کا سارا نظام بدلا جائے۔ یہ ایک نہایت اہم معاملہ ہے جس میں دوسرے کی بات مان لینا ممکن نہیں کیونکہ ہندوستان کی آزادی کا مسئلہ صرف برطانوی فوج اور سروسوں کے چلے جانے سے حل نہیں ہو سکتا بلکہ اس کی ضرورت ہے کہ سرکاری ملازموں کی تحکم پسندی مٹائی جاوے اور ان کی تنخواہ اور امتیازی حقوق عام طور پر کم کر دیے جائیں۔ اس دستور سازی کے زمانے میں تحفظات کا بڑا چرچا ہے۔ اگر یہ تحفظات ہندوستان کے فائدے کے لئے ہیں تو ان میں ایک دفعہ یہ بھی ہونی چاہیے کہ آئی سی ایس اور اس قسم کی دوسری سروسوں کی موجودہ صورت کا جس میں انھیں غیر محدود اختیارات اور امتیازی حقوق حاصل ہیں خاتمہ کر دیا جائے اور انھیں نئے دستور میں کوئی دخل نہ ہو۔

آئی سی ایس سے بھی زیادہ پراسرار وہ سروسیں ہیں جو محافظ سروسیں کہلاتی ہیں۔ ہم ان کے بارے میں زبان بھی نہیں ہلا سکتے۔ اس لئے کہ بھلا ہم ان معاملات کو کیا جانیں؟ ہمارا کام تو صرف یہ ہے کہ چپ چاپ کروڑوں روپئے دے جائیں۔ تھوڑے ہی دن ہوئے ستمبر ۱۹۳۴ء میں ہندوستان کے کمانڈر انچیف سر فلپ چٹوڈ نے کونسل آف اسٹیٹ کے جلسے میں جو شملہ میں ہو رہا تھا ہندوستان کے سیاست دانوں سے اپنی اکھڑ فوجی زبان میں

کہا کہ تم لوگ اپنے کام سے کام رکھو۔ میرے کام میں دخل نہ دو کسی صاحب نے ایک ریزولیوشن میں جو پیش کی تھی ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا گیا وہ اور ان کے دوست یہ سمجھتے ہیں کہ انگریز جیسی جنگ آزمودہ قوم جس نے تلوار کے زور سے سلطنت حاصل کی اور تلوار ہی کے زور سے جس پر اب تک قابض ہے آرام کرسی پر بیٹھ کر تنقید کرنے والوں کی باتوں کو اپنی صدیوں کی جنگی قابلیت اور تجربے کے مقابلے میں کوئی وقعت دے گی؟" اس کے علاوہ انھوں نے اور دلچسپ باتیں کہیں اور اس خیال سے کہ کہیں ہم یہ نہ سمجھ لیں کہ انھوں نے دفعتہً جوش میں یہ باتیں کہہ دی تھیں۔ ہم کو یہ بھی بتا دیا گیا کہ انھوں نے اپنی تقریر بہت سوچ سمجھ کر لکھی تھی اور اسے دیکھ دیکھ کر پڑھ رہے تھے۔

اس میں شک نہیں کہ ایک ناواقف فن کے لئے کسی کمانڈر انچیف سے فوجی معاملات پر بحث کرنا گستاخی ہے۔ لیکن دو چار باتیں کہنے کی اجازت تو آرام کرسی پر بیٹھ کر تنقید کرنے والوں کو بھی ملنی ہی چاہئے۔ ممکن ہے کہ ان لوگوں کے اغراض جو سلطنت پر تلوار کے زور سے قابض ہیں کچھ اور ہوں اور ان غریبوں کے اغراض کچھ اور جن کے سر پر تلوار منڈلاتی رہتی ہو۔ ہندوستانی فوج سے ہندوستان کے فائدے کا کام بھی لیا جا سکتا ہے اور برطانوی سلطنت کے فائدے کا بھی اور ان دونوں کا مفاد کچھ ضروری نہیں کہ ایک ہو۔ اس میں اختلاف بلکہ تصادم بھی ہو سکتا ہے۔ آرام کرسی پر بیٹھنے والا نقاد اس بات میں بھی شبہ کا اظہار کر سکتا ہے کہ جنگ عظیم کے تجربے کے بعد بڑے بڑے جرنیلوں کا یہ مطالبہ کہ ان کے کام میں دخل نہ دیا جائے جائز ہے یا نہیں۔ جنگ عظیم میں یہ حضرات سیاہ و سفید کے مالک تھے

اور ہر طرف سے یہی سننے میں آتا ہے کہ انگریزی، فرانسیسی، جرمن، آسٹروی، اطالوی اور روسی غرض تمام فوجوں میں انھوں نے ہر کام کو چوپٹ کر دیا۔

انگلستان کی فوج کے نامور مورخ اور فن جنگ کے ماہر کیپٹن لڈل ہارٹ نے اپنی جنگ عظیم کی تاریخ میں ایک جگہ لکھا ہے کہ ایک زمانہ ایسا بھی تھا جب انگریزی سپاہی دشمنوں سے لڑ رہے تھے۔ اور انگریز جنرل آپس میں لڑ رہے تھے۔ قومی خطرے ان کے خیالات اور جدوجہد میں یکجہتی نہیں پیدا کر سکے۔ پھر وہ لکھتے ہیں کہ اس لڑائی نے "ہماری بت پرستی کو ہیرو ورشپ کے اس عقیدے کو کہ بڑے آدمی معمولی مٹی کے نہیں کسی اور مٹی کے بنے ہوئے ہیں۔ بالکل مٹا دیا۔ لیڈروں کی اب بھی ضرورت ہے بلکہ شاید پہلے سے بھی زیادہ لیکن یہ احساس جو ہم میں اب پیدا ہو گیا ہے کہ وہ بھی ہمارے ہی جیسے آدمی ہیں، ہم کو اس غلطی سے محفوظ رکھے گا کہ ان سے بہت زیادہ توقع رکھیں۔ یا ان پر حد سے زیادہ بھروسہ کریں۔"

سیاست دانوں کے جگت گرو مسٹر لائڈ جارج نے اپنے تذکرۂ جنگ میں جرنیلوں اور امیر البحروں کی ان کمزوریوں اور غلطیوں کی ایک ہیبت ناک تصویر کھینچی ہے جس کی بدولت لاکھوں آدمیوں کی جانیں ضائع ہوئیں۔ انگلستان اور اس کے اتحادی لڑائی تو جیت گئے، لیکن خون میں نہا کر لڑکھڑاتے ہوئے فتح کی منزل تک پہنچے۔ بڑے افسروں نے آدمیوں اور موقعوں سے اس ناعاقبت اندیشی سے کام لیا کہ انگلستان کی تباہی کی نوبت آگئی تھی اور وہ اور اس کے اتحادی زیادہ تر اس وجہ سے بچ گئے کہ ان کے حریفوں سے ان سے زیادہ ناقابل یقین حماقتیں سرزد ہوئی تھیں۔ یہ ہے انگلستان کے عہد جنگ کے وزیر اعظم کا بیان۔ وہ کہتے ہیں کہ انھیں

عمل جراحی کے ذریعہ امیر البحر لارڈ جیلیکو کی کھوپڑی میں معقول خیالات ٹھونسنے پڑے۔ خصوصاً بدقہ جہاز بھیجنے کے معاملہ میں۔ فرانسیسی مارشل فرنچ کے متعلق ان کی رائے یہ معلوم ہوتی ہے کہ ان کا خاص وصف یہی تھا کہ ان کی صورت سے مستقل مزاجی ظاہر ہوتی تھی اور اس سے لوگوں کی ہمت بڑھتی تھی۔" پریشانی کے مارے ہوئے لوگ مصیبت کے وقت میں ایسی ہی چیزوں کا سہارا ڈھونڈھتے ہیں۔ وہ غلطی سے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ انسان کی عقل ٹھوڑی میں ہوتی ہے۔"

لیکن لائڈ جارج نے سب سے زیادہ قابل الزام فوج کے اعلیٰ افسر فیلڈ مارشل ہیگ کو قرار دیا ہے۔ انھوں نے دلائل سے ثابت کیا کہ لارڈ ہیگ انتہائی خود پسندی کی وجہ سے سیاست دانوں اور دوسرے لوگوں کی رائے سننا بھی نہیں چاہتے تھے۔ یہاں تک کہ انھوں نے خود برطانوی مجلس وزراء سے بعض نہایت اہم معاملات پوشیدہ رکھے اور فرانس میں برطانیہ کی فوج کو اتنا سخت نقصان پہنچایا جتنا ساری لڑائی میں کہیں نہیں پہنچا تھا اور اس وقت بھی جب شکست سر پر کھڑی تھی وہ آخر تک اپنی بات پر اڑے رہے اور کئی مہینے تک انھوں نے پاشنڈیل اور کامبرے کی سیلابی دلدل میں اپنی غلط پیش قدمی جاری رکھی یہاں تک کہ ۱۷ ہزار نو صرف افسر کام آئے اور چار لاکھ بہادر انگریزی سپاہی مقتولوں اور مجروحوں کی فہرست میں داخل ہو گئے۔ غنیمت ہے کہ "گمنام سپاہی" کی آج اس کے مرنے کے بعد عزت کی جا رہی ہے۔ اس کا خون پانی کی طرح بہایا گیا اور جب تک وہ زندہ تھا کسی کو اس کی پروا بھی نہ تھی۔

دوسرے لوگوں کی طرح سیاست دان بھی اکثر غلطی کرتے ہیں لیکن

جمہوری ملک کے سیاست دانوں کو اشخاص اور واقعات سے متاثر ہونا اور ان کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ عموماً وہ اپنی غلطیوں کو محسوس کر لیتے ہیں اور ان کی تلافی کی کوشش کرتے ہیں۔ سپاہی کی تربیت اور ہی فضا میں ہوتی ہے۔ جہاں تحکم پسندی کا دور دورہ ہوتا اور تنقید گوارا نہیں کی جاتی۔ اس لئے سپاہی کو دوسروں کا مشورہ برا لگتا ہے۔ اور جب وہ غلطی کرتا ہے تو دل کھول کر کرتا ہے اور اس پر اڑا رہتا ہے۔ اس کے لیے تھوڑی ذہن اور دماغ سے زیادہ اہم چیز ہوتی ہے۔ ہندوستان میں ہم نے ایک مشترک ٹائپ پیدا کیا ہے۔ ہمارے ملکی نظام حکومت نے تحکم پسندی اور خود بینی کی ایک نیم فوجی فضا میں پرورش پائی ہے۔ اس لیے ملکی حکام کی تھوڑی بھی بڑی حد تک سپاہیوں کی سی ہے اور ان میں دوسرے سپاہیانہ اوصاف بھی پائے جاتے ہیں۔

ہم سے کہا جاتا ہے کہ فوج میں ہندوستانی عنصر بڑھایا جا رہا ہے۔ اور بہت ممکن ہے کہ تیس پینتیس برس کے بعد کوئی ہندوستانی جنرل بھی ہندوستانی اسٹیج پر نمودار ہو۔ شاید سو سوا سو سال میں ہماری فوج میں ہندوستانی عنصر ایک معقول حد تک بڑھ جائے۔ ہم یہ سوچتے ہیں کہ آخر انگلستان نے ایک دو سال کے اندر کروڑوں آدمیوں کی زبردست فوج کیسے تیار کر لی۔ اگر اسے ہمارے جیسے دانا مشیر نصیب ہوئے ہوتے تو شاید اس نے زیادہ احتیاط سے اور پھونک پھونک کر قدم رکھا ہوتا۔ یہ اور بات ہے کہ اس اعلیٰ تربیت یافتہ فوج کے تیار ہونے سے پہلے لڑائی کا فیصلہ ہو جاتا۔ اسی کے ساتھ ہمیں روسی فوج کا بھی خیال آتا ہے جو کچھ دن پہلے صفر کے برابر تھی جس نے تھوڑی سی مدت میں حیرت انگیز ترقی کی بے شمار دشمنوں کا مقابلہ

کیا اور ان پر فتح پائی اور دنیا کی سب سے جرار فوجوں میں سمجھی جاتی تھی۔
شاید انھیں مشورہ دینے کے لئے ایسے "جنگ آزمودہ" جرنیل نہیں ملتے تھے۔

اب ہمارے یہاں دہرہ دون میں ایک فوجی اکادمی ہے۔ جہاں شریف خاندانوں کے امیدوار فوجی افسری کی ٹریننگ حاصل کرتے ہیں۔ ہم سے کہا جاتا ہے کہ پریڈ میں وہ بہت ہوشیار معلوم ہوتے ہیں اور یقیناً بہت اچھے افسر ہوں گے۔ لیکن کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ اس ٹریننگ سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔ اگر اسی کے ساتھ جدید آلات جنگ کا استعمال بھی نہ سکھایا جائے۔ پیادے اور سوار آج کل اتنے ہی کام آسکتے ہیں جتنی رومی لشکر کی صفیں۔ اور ایسے زمانے میں جب کہ ہوائی جہاز، گیس کے بم، ٹینک اور بڑی زبردست توپیں جنگ کے آلات ہیں، رائفل بھی تیر و کمان سے کچھ ہی زیادہ کارآمد ہو سکتی ہے۔ فوجی اکادمی کے استاد اور دانش مند مشیران سب باتوں کو سمجھتے ہی ہوں گے۔

اب سوال یہ ہے کہ ہندوستان میں برطانوی حکومت کی کارگزاری کیسی رہی؟ ہم اس کی خامیوں کی کس منہ سے شکایت کریں۔ جب یہ خامیاں ہماری اپنی کمزوریوں کا نتیجہ تھیں۔ اگر ہم دنیا کے تغیرات کے دھارے کو چھوڑ کر کسی کھاڑی میں پناہ لیں، اپنے فدرح کی خیر منائیں اور اپنی حالت میں مگن رہیں گڑھیا کے مینڈک کی طرح یہ نہ جانیں کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے تو یہ ہمارا ہی قصور ہے اور ہمیں کو اس کی سزا بھگتنی ہے۔ انگریز یہاں بحر ہستی کے ایک نئے سیلاب کے زور میں زبردست تاریخی قوتوں کے نمائندے بن کر آئے اگرچہ انھیں خود اس کا احساس نہ تھا۔ اس سے کیا فائدہ کہ ہم اس طوفان کی شکایت کریں جو ہمیں اٹھا کر پھینک دیتا ہے۔ یا اس سرد ہوا کی

سے ہمارا بدن کانپتا ہے ، ہمیں چاہیے کہ ہمنی کے جھگڑوں سے پیچھا چھڑا کر مستقبل کا سامنا کریں۔ ہمیں انگریزوں کا شکر گذار ہونا چاہیے کہ وہ سائنس اور اس کے بیش بہا ایجادات کا تحفہ اپنے ساتھ لائے۔ لیکن یہ بات ہمارے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتی ہے۔ اور ہم اسے کبھی نہیں بھول سکتے کہ برطانوی حکومت ہمارے ملک میں تفرقہ پیدا کرنے والے رجعت پسند، فرقہ پرست اور مطلب پرست عناصر کی ہمت افزائی کرتی ہے۔ مگر شاید یہ بھی ہمارے لیے ایک ضروری آزمائش ہے۔ اور ہندوستان کو نئی زندگی اسی وقت عطا ہوگی جب وہ بار بار اس آگ میں تپے جو کھوٹ اور میل کو جلا دیتی ہے اور کچے لوہے کو فولاد بنا دیتی ہے۔

(۵۵)

سول میرج[1] اور رسم الخط کا مسئلہ

میں تقریباً ایک ہفتہ پونہ اور بمبئی رہ کر وسط ستمبر ۱۹۳۳ء میں لکھنؤ واپس آیا۔ والدہ ابھی تک اسپتال ہی میں تھیں اور رفتہ رفتہ صحت یاب ہو رہی تھیں۔ کملا بھی لکھنؤ میں تھی اور تیمارداری کی کوشش کرتی تھی۔ حالانکہ خود اس کی صحت کچھ زیادہ اچھی نہ تھی۔ بہنیں ہر سنیچر کو الہ آباد سے آجاتی تھیں۔ میں دو تین ہفتہ لکھنؤ ہی میں رہا۔ الہ آباد میں شاید اتنی فرصت نہ ملتی جتنی یہاں نصیب ہوئی۔ میں دو بار اسپتال جایا کرتا تھا۔ فارغ اوقات میں اخبارات کے لئے چند مضامین لکھنا شروع کر دئے جن کی اشاعت سارے ملک میں خوب ہوئی۔ اس سلسلۂ مضامین کا عنوان تھا "ہندوستان کدھر جا رہا ہے"۔ اور ان مضامین میں، میں نے واقعات عالم کا تعلق ہندوستانی حالات سے بتا کر ان واقعات کا جائزہ لیا تھا۔ یہ مضامین بہت مقبول ہوئے۔ بلکہ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ کابل اور طہران میں بھی ان مضامین کا ترجمہ فارسی زبان میں شائع کیا گیا۔ جو لوگ حالات حاضرہ اور جدید مغربی افکار اور خیالات سے واقف ہیں ان کے لئے ان مضامین میں نہ کوئی ندرت تھی نہ کوئی جدت۔ لیکن ہندوستان میں ہم لوگ اپنی خانگی مشکلات اور مصائب میں اس قدر پھنسے ہوئے ہیں کہ ہمیں

---

[1] ملاحظہ "قانونی شادی"

مطلق خبر نہیں کہ دوسرے ملکوں پر کیا گذر رہی ہے۔ میرے مضامین کو جو مقبولیت حاصل ہوئی اس سے نیز بہت سی اور علامتوں سے یہ معلوم ہوا کہ ہم لوگوں میں بھی زیادہ وسیع نقطہ نظر اب پیدا ہو رہا ہے۔

والدہ اسپتال رہتے رہتے اب عاجز آگئی تھیں۔ اس لئے ہم لوگوں نے انہیں الہ آباد واپس لے جانے کا فیصلہ کیا۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میری بہن کرشنا کی نسبت کا اعلان حال ہی میں ہو چکا تھا۔ اور ہم لوگ چاہتے تھے کہ قبل اس کے کہ میں اچانک پھر جیل خانے پہنچا دیا جاؤں جس قدر جلد ممکن ہو شادی سے فراغت کر لی جائے۔ مجھے بھی مطلق اس کا اندازہ نہ تھا کہ کتنے دن اور مجھے آزاد رہنے دیا جائے گا۔ اس لئے کہ کانگریس کی طرف سے سول نافرمانی کی تحریک باقاعدہ جاری تھی اور خود کانگریس اور اس کے علاوہ بیسیوں دیگر انجمنیں اور ادارے خلاف قانون قرار دئے جا چکے تھے۔

شادی اکتوبر کے تیسرے ہفتے میں بمقام الہ آباد قرار پائی۔ اور یہ بھی طے ہوا کہ مروجہ سول قانون نکاح کے مطابق عقد کیا جائے۔ مجھے اس بات سے خوشی ہوئی۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اس معاملہ میں ہم لوگوں کے طے کرنے نہ کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ وہ مختلف ذاتوں یعنی برہمن اور غیر برہمن کے درمیان رشتہ قائم کیا جا رہا تھا اور برطانوی ہندی قانون کے مطابق یہ عقد جائز نہیں۔ لیکن خوش قسمتی سے اسی زمانے میں نیا سول نکاح کا قانون بنا تھا۔ جس نے ہمیں تمام پریشانیوں سے بچا لیا۔ اس وقت دو قانون رائج ہیں اور دوسرا قانون جس کے مطابق میری بہن کی شادی ہوئی صرف ہندوؤں یا ان قبیلوں کے دیگر مذاہب مثلاً بدھ مت، جین اور سکھ مت والوں کے لئے ہے۔ لیکن اگر فریقین کا شمار بوجہ پیدائش یا بوجہ تبدیلی دین ان مذاہب میں نہیں

ہو سکتا تو پھر پہلے قانون کی طرف رجوع کرنا ہوتا ہے اور یہ پہلا قانون فریقین سے اس بات کا مطالبہ کرتا ہے کہ وہ تمام مشہور مذاہب سے انکار کریں یا کم از کم یہ بیان داخل کریں کہ ان کا کوئی تعلق ان سے نہیں ہے۔ یہ بلا ضرورت انکار بہت تکلیف دہ معلوم ہوتا ہے۔ اور اکثر لوگ جنھیں گو مذہبی نہیں کہا جاسکتا لیکن وہ اس قسم کا غیر ضروری اعلان کرنے پر معترض ہوتے ہیں اس قانون سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ یا مختلف مذاہب کے کٹر لوگ ان تمام باتوں کی مخالفت کرتے ہیں جن سے آپس کے شادی بیاہ میں آسانیاں پیدا ہوں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ یا تو مجبور ہو کر انکاری بیان داخل کرتے ہیں یا محض حدود قانون میں رہنے کی خاطر صرف زبان سے تبدیلی مذہب کا اعلان کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ذاتی طور پر میں تو مختلف فرقوں کے درمیان شادی بیاہ کا حامی ہوں۔ لیکن خواہ اس کی کوئی حمایت کرے یا نہ کرے یہ بے حد ضروری ہے کہ سول نکاح کا ایک عام قانون ہو۔ جس کا اطلاق تمام مذاہب کے لوگوں پر ہو۔ اور ان کو اجازت دی جائے کہ مذہب کی تبدیلی یا کسی دین کو ترک کرنے کا اعلان کئے بغیر آپس میں شادی بیاہ کر سکیں۔

میری بہن کی شادی بغیر کسی دھوم دھام کے نہایت سادہ طریقہ پر ہوئی۔ ہندوستان میں شادیوں کے موقع پر جو بکھیڑا اور دھوم دھام ہوتی ہے وہ مجھے یوں بھی ناپسند ہے۔ پھر والدہ بیمار تھیں اور علاوہ اس کے سول نافرمانی ابھی جاری تھی۔ میرے بہت سے ساتھی ابھی جیل خانے میں تھے۔ ان حالات میں کوئی ایسی بات کرنا جس سے جشن کی صورت پیدا ہوتی بے موقع اور نامناسب تھی۔ صرف چند اعزا اور مقامی دوستوں کو میں نے شرکت کی دعوت دی۔ حالانکہ میرے والد کے بعض قدیم دوستوں کو بجا طور پر ملال بھی ہوا کہ میں نے

انھیں اس موقع پر عمداً نظر انداز کیا۔

شادی کے سلسلہ میں نیوتہ کا جو مختصر سا خط ہم لوگوں نے بھیجا وہ ہندوستانی زبان اور لاطینی رسم الخط میں لکھا گیا تھا۔ یہ ایک جدت تھی اس لیے کہ نیوتہ ہمیشہ یا تو ناگری یا فارسی رسم الخط میں لکھے جاتے ہیں اور علاوہ فوجی یا عیسائی مشنری حلقوں کے کسی جگہ لاطینی رسم الخط میں ہندوستانی زبان لکھنے کا بالکل رواج ہی نہیں۔ میں نے تجربہ کے طور پر لاطینی رسم الخط اختیار کیا تھا محض یہ دیکھنے کے لیے کہ مختلف لوگوں پر اس کا کیا اثر ہوتا ہے۔ اس نیوتہ کے متعلق موافق اور مخالف دونوں قسم کی رائیں معلوم ہوئیں۔ لیکن زیادہ لوگ مخالف ہی تھے۔ بہت تھوڑے لوگ بلائے گئے تھے اگر اور زیادہ لوگوں کو بلایا جاتا تو مخالفت بھی اور زیادہ ہوتی۔ گاندھی جی نے بھی میری اس جدت کو ناپسند کیا۔

گو لاطینی رسم الخط مجھے ایک عرصہ سے پسند ہے لیکن نہ میں اس کا قائل ہوں اور نہ اس لیے میں نے اس کو اختیار کیا تھا۔ ترکی اور وسط ایشیا میں اس کی کامیابی سے ضرور متاثر ہوا اور اس کی تائید میں دلائل بھی خاصے وزنی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود میں اس کا حامی نہیں ہوں اور اگر میں اس کا قائل بھی ہوتا تو بھی میں خوب جانتا تھا کہ ہندوستان کے موجودہ حالات میں اس کو اختیار کرنے کا ذرہ برابر امکان نہیں۔ قوم پرست، مذہب پرست، ہندو مسلمان، قدیم اور جدید غرض ہر گروہ کی طرف سے اس کی شدید مخالفت کی جائے گی۔ اور یہ بھی میں جانتا ہوں کہ یہ مخالفت محض جذباتی نہیں ہوگی۔ رسم الخط کا اور ادب کا بہت ہی گہرا تعلق ہے اور رسم الخط کی تبدیلی اس زبان کے لئے بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے جس کا ماضی

شاندار رہا ہے۔ رسم الخط بدلنے کے ساتھ الفاظ کی شکلیں بدل جاتی ہیں آوازیں بدل جاتی ہیں اور خیالات بدل جاتے ہیں۔ قدیم اور جدید ادب کے درمیان ایک ناقابل عبور دیوار حائل ہو جاتی ہے۔ اور قدیم ادب ایک ایسی اجنبی زبان کا ادب بن کر رہ جاتا ہے جو مردہ ہو چکی ہے۔ جس زبان میں کوئی ایسا ادب موجود نہیں کہ اس کی حفاظت کی ضرورت ہو وہاں البتہ یہ تبدیلی کر کے دیکھ لینا چاہئے لیکن ہندوستان میں رسم الخط تبدیل کرنے کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا۔ صرف اس لئے کہ ہمارے ادب اور زبان کا خزانہ بے حد گراں قدر اور انمول ہے بلکہ اس لئے بھی کہ ہماری تاریخ اور ہماری ذہنی ترقی اس سے وابستہ ہے۔ نیز عوام الناس کی زندگی سے اس کا گہرا تعلق ہے۔ زبردستی اس قسم کی تبدیلی کرنے کے یہ معنی ہیں کہ ہم اپنی زندہ زبان کو بے رحمی سے ذبح کرنا چاہتے ہیں جس سے عوام الناس کی تعلیمی ترقی بالکل مسدود ہو جائے گی۔

لیکن ہندوستان میں یہ مسئلہ اب صرف ایک علمی مسئلہ نہیں ہے اور میرے نزدیک رسم الخط کی اصلاح کے سلسلہ میں دوسرا قدم یہ ہوگا کہ سنسکرت کی مختلف شاخوں یعنی ہندی، بنگالی، مرہٹی اور گجراتی کے لئے ایک مشترکہ رسم الخط اختیار کر لیا جائے۔ ان زبانوں کے رسم الخط کی اصل ایک ہے۔ اور ان میں بہت زیادہ اختلاف بھی نہیں ہے۔ اس لئے ایک مشترکہ رسم الخط اختیار کر لینا زیادہ دشوار نہ ہوگا جس کی بدولت یہ چاروں زبانیں ایک دوسرے سے قریب تر ہو جائیں۔

منجملہ دیگر افسانوں کے ایک یہ افسانہ بھی ہمارے انگریز حکمرانوں نے تمام دنیا میں مشہور کر رکھا ہے کہ ہندوستان میں کئی سو زبانیں (مجھے صحیح تعداد اس وقت یاد نہیں) رائج ہیں اور یہ بھی ایک عجیب دلچسپ واقعہ ہے کہ بہت تھوڑے انگریز ایسے ملیں گے جو تمام عمر ہندوستان میں گذار

دینے کے باوجود ان سینکڑوں زبانوں میں سے ایک زبان بھی معمولی طور پر جانتے ہوں
یہ لوگ تمام زبانوں کو ایک ہی درجہ میں شمار کرتے ہیں۔ اس کا نام ورنا کو زیعنے
غلاموں کی زبان رکھا ہے۔ (لاطینی زبان میں "ورنا" کے معنی ہیں خانہ زاد غلام)
اور ہم میں سے اکثر لوگوں نے بغیر جانے بوجھے اس اصطلاح کو اختیار کر لیا ہے
واقعی یہ حیرت کی بات ہے، کہ یہ انگریز لوگ ساری ساری عمر ہندوستان
میں گذار دیتے ہیں، لیکن ہماری زبان اچھی طرح سیکھنے کی زحمت گوارا نہیں
کرتے، ان لوگوں نے خانساموں اور آیاؤں کی مدد سے ایک عجیب زبان
ایجاد کی ہے، جو ایک طرح کی گٹ پٹ گورا شاہی ہندوستانی ہے، یہ اسی کو
اصل زبان سمجھتے ہیں، جیسے ہندوستان کی طرز معاشرت اور زندگی کے
متعلق وہ اپنے ماتحتوں اور خوشامدیوں کی باتوں سے حالات معلوم کرتے ہیں
اسی طرح ہندوستانی زبان کے متعلق ان کی معلومات کا واحد ذریعہ گھر کے نوکر
اور بیرے ہوتے ہیں، جو ہمیشہ اپنی زبان توڑ مروڑ کر صاحب لوگوں سے انہیں
کی ٹوٹی پھوٹی زبان میں بات چیت کرتے ہیں، اس خیال سے کہ کوئی اور زبان
صاحب سمجھ ہی نہیں سکتے، انگریز لوگوں کو یہ بالکل معلوم ہی نہیں کہ ہندوستانی
زبان میں نیز دیگر ملکی زبانوں میں ہر قسم کا اعلیٰ ادب موجود ہے۔

اگر ہمیں مردم شماری کی رپورٹ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں
دو تین سو زبانیں ہیں، تو اسی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے، کہ جرمنی میں بھی پچاس
ساٹھ زبانیں بولی جاتی ہیں۔ لیکن میں تو یہ نہیں جانتا، کہ کسی شخص نے بھی
اس واقعہ کو جرمنی کے اندر اختلافات اور جھگڑوں کے ثابت کرنے کے لئے بطور دلیل
کے پیش کیا ہو؟ اصل بات یہ ہے کہ مردم شماری میں تو ہر قسم کی ان چھوٹی چھوٹی
زبانوں کو بھی گنوا دیا جاتا ہے، جن کے بولنے والوں کی تعداد چند ہزار سے

زیادہ نہیں ہوتی۔ اور بسا اوقات ایک ہی زبان کی مختلف بولیوں کو جو مقامی طور پر بولی جاتی ہیں محض علمی ترتیب کی خاطر اصل زبان کے درجہ میں شمار کر دیا جاتا ہے۔ ہندوستان کی وسعت اور رقبہ کو دیکھتے ہوئے مجھے تو اس بات پر تعجب ہوتا ہے کہ یہاں اتنی کم زبانیں کیوں ہیں۔ یورپ کے اسی رقبہ آبادی سے مقابلہ کیجیے، تو معلوم ہوگا، کہ ہم لوگ یہاں باعتبار زبان ایک دوسرے سے بہت زیادہ قریب تر ہیں۔ لیکن چونکہ بے پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اس لیے کوئی مشترکہ معیاری زبان نہیں پیدا ہو سکی، اور مقامی بولیاں رائج ہو کر رہ گئیں، برما کو چھوڑ کر ہندوستان کی خاص خاص زبانیں یہ ہیں:۔ ہندوستانی (جس کی دو شاخیں ہیں۔ یعنی اردو اور ہندی)، بنگالی، گجراتی، مرہٹی، تامل، تلنگو، ملیالم اور کناری اوڑ۔ اور اگر اس میں سے آسامی، اوڑیا، سندھی، پشتو اور پنجابی کو بھی شامل کر لیا جائے تو اس میں پورے ملک کی زبانیں آجاتی ہیں۔ سوائے چند پہاڑی اور جنگلی قبائل کی بولیوں کے اس میں سے ہندی، آریائی نسل کی تمام زبانیں جو شمالی، مغربی اور وسطی ہند میں بولی جاتی ہیں۔ ایک دوسرے سے بہت ملتی جلتی ہیں۔ البتہ جنوبی ہند کی دراوڑی زبانیں گو بہت مختلف ہیں۔ لیکن اس پر بھی سنسکرت کا بہت اثر پڑا ہے۔ اور یہ بھی سنسکرت لفظوں سے بھری پڑی ہیں۔

مندرجہ بالا آٹھ خاص زبانوں کا ادب بہت قدیم اور گراں قدر ہے اور ان میں سے ہر ایک زبان آج ایک بہت وسیع علاقے میں بولی جاتی ہے، ہر لسانی علاقے کے حدود بھی متعین طور پر بتلائے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ یہ زبانیں لکھنے والوں کی تعداد کے لحاظ سے، دنیا کی بڑی بڑی زبانوں میں شمار کی جا سکتی ہیں، پانچ کروڑ آدمی بنگالی زبان بولتے ہیں، جہاں تک ہندوستانی کا تعلق ہے مجھے صحیح تعداد تو یاد نہیں پڑتے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اس زبان کی مختلف بولیوں

کے بولنے والوں کی تعداد چودہ کروڑ سے کم نہیں۔ اس کے علاوہ اس زبان کے تھوڑا بہت سمجھنے والوں کی ایک بہت بڑی تعداد اور ہے۔ جو پورے ملک میں پھیلی ہوئی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی زبان کی ترقی کے لئے بڑے امکانات ہیں

سلہ ہندوستانی زبان کے حامیوں نے حسب ذیل اعداد و شمار دئے ہیں، مجھے صحیح نہیں معلوم، کہ یہ اعداد سنہ ۳۱ کی مردم شماری سے جمع کئے گئے ہیں یا سنہ ۲۱ کی مردم شماری سے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ سنہ ۲۱ ہی کی مردم شماری سے لئے گئے ہیں۔ اور اگر موجودہ اعداد و شمار جمع کئے جائیں، تو اس مرتبہ اور زیادہ اضافہ نظر آئے گا۔

ہندوستانی (بشمولیت ہندی پنجابی اور راجستھانی)	۱۳۹،۳ ملین
بنگالی	۴۹،۳ "
تلنگی	۲۳،۶ "
مرہٹی	۱۸،۸ "
تامل	۱۸،۸ "
کناری	۱۰،۳ "
اڑیا	۱۰،۱ "
گجراتی	۹،۶ "
میزان	۲۷۹،۸ "

بعض زبانیں مثلاً پشتو، آسامی اور برمی (جو لسانی اور مقامی دونوں اعتبار سے ایک بالکل مختلف خاندان سے تعلق رکھتی ہیں) اس فہرست میں شامل نہیں ہیں۔

یہ سنسکرت زبان کی مستحکم بنیادوں پر قائم ہے اور فارسی زبان سے اس کا گہرا تعلق ہے۔ چنانچہ دونوں زبانوں کے خزانوں سے یہ مالا مال ہو سکتی ہے' اور اب تو کچھ عرصہ سے انگریزی زبان سے بھی اس نے استفادہ کیا ہے۔ جنوبی ہند میں صرف دراوڑی علاقہ ہی ایسا ہے۔ جہاں ہندوستانی زبان تقریباً ایک اجنبی زبان کی حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن وہاں بھی لوگ اس کو سیکھنے کی جان توڑ کوشش کر رہے ہیں۔ دو سال ہوئے ۳۶ء میں ایک انجمن نے جو محض خدمت کی غرض سے جنوبی ہند میں ہندی زبان پھیلانے کا کام کر رہی ہے۔ چند اعداد و شمار شائع کئے تھے۔ اس سے مجھے معلوم ہوا، کہ چودہ سال کے اندر جب سے کہ وہ انجمن قائم ہوئی۔ تقریباً ساڑھے پانچ لاکھ آدمیوں نے محض اس انجمن کی کوشش سے احاطۂ مدراس کے اندر ہندی زبان سیکھ لی' ایک ایسے ادارے کی کوشش جس کو سرکار کی طرف سے کوئی مدد نہ ملے۔ بہت قابل تعریف ہے۔ اکثر لوگ جو ہندی زبان سیکھ لیتے ہیں' وہ خود بھی اس زبان کی تبلیغ کا کام کرنے لگتے ہیں۔

بہرحال مجھے تو اس بارے میں مطلق کوئی شبہ نہیں کہ ہندوستانی زبان آگے چل کر پورے ہندوستان کی مشترکہ زبان بن جائے گی۔ اور سچ پوچھئے تو آج بھی معمولی کاموں کے لئے اس زبان کی یہی حیثیت ہے۔ لیکن فارسی اور دیوناگری رسم الخط کے متعلق احمقانہ جھگڑوں کی وجہ سے اور فریقین کی اس غلط روش کی وجہ سے کہ ہر ایک یا تو اپنی زبان میں سنسکرت کے الفاظ ضرورت سے زائد ٹھونستا ہے' یا فارسی کے الفاظ' اس زبان کی ترقی رک گئی ہے' چونکہ اس جھگڑے کی وجہ سے بڑا غصہ اور گرمی پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے رسم الخط کی مشکل حل کرنے کی کوئی صورت نہیں سوائے اس کے کہ دونوں کو سرکاری طور پر تسلیم کر لیا جائے اور لوگوں کو اسکی اجازت دی جائے کہ جس خط میں وہ چاہیں لکھیں لیکن یہ کوشش ضرور

کرنا چاہیئے کہ انتہا پسندی کے رجحانات کو روکا جائے۔ اور بول چال کی زبان جو عام طور پر رائج ہے، اسی طرح کی ایک ملی جلی ادبی زبان پیدا کی جائے جب تعلیم عام ہوگی تب تو لازماً اس کا نتیجہ یہی نکلے گا۔ لیکن اس وقت متوسّط طبقے کے کچھ لوگ جو ادبی ذوق اور طرز انشا کے ناقد اور استاد سمجھے جاتے ہیں، بد قسمتی سے بہت زیادہ تنگ نظر اور لکیر کے فقیر واقع ہوئے ہیں۔ یہ لوگ بس ایک مردہ قالب اور فرسودہ زبان کے محاوروں میں الجھے ہوئے ہیں۔ جس میں نہ کوئی زندگی ہے، نہ اپنی قوم کے عوام الناس کی زبان سے کوئی تعلّق ہے۔ اور نہ دنیا کی دوسری زبانوں کے ادب سے کوئی واسطہ۔

ہندوستانی زبان کی ترقی اور رواج میں کوئی تصادم نہ ہوگا۔ لیکن بعض زبانیں ہندوستانی زبان کے مقابلہ میں پہلے ہی سے زیادہ ترقی یافتہ اور علمی حیثیت سے افضل ہیں۔ اور اپنے اپنے علاقے میں ان زبانوں کو تعلیمی اور دیگر کاموں کے لئے سرکاری زبان کی حیثیت برقرار رکھنا چاہیئے۔ انہیں زبانوں کے ذریعہ تعلیم اور تمدن عوام میں پھیلایا جا سکتا ہے۔

بعض لوگوں کا گمان ہے کہ شاید انگریزی ہندوستان کی مشترکہ عام زبان بن جائے گی، لیکن مجھے تو یہ خیال بالکل دور از کار اور لغو معلوم ہوتا ہے۔ اعلیٰ طبقہ کے مٹھی بھر پڑھے لکھے لوگوں میں ممکن ہے، کہ یہ زبان رائج ہو، لیکن جہاں تک کہ عوام الناس کی تعلیم اور ان کے تمدنی مسائل کا تعلّق ہے۔ انگریزی زبان ہمارے لیے محض بے کار ہے۔ یہ بھی ممکن ہے، کہ انگریزی زبان کا استعمال کاروباری ضروریات علمی اور فنی کاموں میں اور بالخصوص بین الاقوامی تعلقات کے سلسلہ میں روز بروز بڑھتا جائے۔ یہ بھی مانتا ہوں کہ ہم میں سے کچھ لوگوں کے لئے بدیسی زبانوں کا جاننا ضروری ہے، تاکہ دنیا کے حالات اور واقعات سے ہم لوگ

کمزوری میں مبتلا ہونے والا ہوں۔ رومن کیتھولک مذہب والوں نے بھی بہت شدت سے ضبط تولید کی مخالفت کی ہے لیکن وہ منطقی استدلال کی اس انتہا تک نہیں پہنچے جہاں گاندھی جی پہنچ گئے ہیں۔ انہوں نے مصلحت سے کام لیا ہے اور انسانی فطرت کا جو تصور ان کے ذہن میں ہے اس کی رعایت ملحوظ رکھی ہے لہ لیکن گاندھی جی نے اپنے دلائل کو دُھر تک پہنچا دیا ہے اور وہ کسی حالت میں بھی جماع کے جواز اور ضرورت کو تسلیم ہی نہیں کرتے سوائے اس کے کہ وہ بچہ پیدا کرنے کی غرض سے کیا جائے۔ بلکہ وہ تو اس سے بھی انکار کرتے ہیں کہ مرد اور عورت کے درمیان کوئی فطری جنسی کشش ہوتی ہے وہ کہتے ہیں کہ "مجھ سے کہا جاتا ہے کہ یہ اصول ناقابل عمل ہے اور میں نے اس فطری کشش کا لحاظ نہیں رکھا جو مرد اور عورت میں ہوتی ہے میں اسے ہرگز نہیں مانتا کہ جس شہوانی کشش کا یہاں ذکر کیا گیا ہے وہ کسی صورت میں بھی فطری کہی جا سکتی ہے۔ اگر ایسا ہو تو پھر ہماری تباہی یقینی ہے۔ عورت مرد کا فطری تعلق اور کشش تو وہ ہے جو بھائی بہن، ماں بیٹے، باپ بیٹی کے درمیان ہوتی ہے، اور یہی فطری کشش ہے جس سے دنیا قائم ہے۔" اور اس سے بھی زیادہ پُرزور الفاظ میں "نہیں میں اپنی پوری قوت کے ساتھ یہ کہتا ہوں کہ شوہر اور بیوی کے درمیان شہوانی کشش خلاف فطرت ہے۔"

لہ پاپائے اعظم پائس یازدہم اپنے فرمان میں، جو عیسائیوں کے نکاح کے متعلق ۳۱ دسمبر ۱۹۳۱ء کو جاری کیا تھا، فرماتے ہیں "یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ شادی شدہ لوگ قانون فطرت کے خلاف عمل کرتے ہیں اگر وہ اپنے وقوف کا استعمال فطری اور معقول وجوہ کی بنا پر کریں، چاہے اس صورت میں وقت کے حالات یا کسی نقص کی وجہ سے بچہ پیدا ہونے کا امکان نہ بھی ہو۔" "وقت کے حالات" کا اشارہ صریحی طور پر اس "بے خطر" زمانے کی طرف ہے جب استقرار حمل کا احتمال نہ ہو۔

اس زمانے میں جب اڈیپس گرنتھی[1] اور فرائڈ اور تحلیل نفسی کا دور دورہ ہے یہ عقیدہ، جو اس زور شور سے ظاہر کیا گیا ہے، عجیب اور دور از کار معلوم ہوتا ہے۔ دونوں صورتوں میں۔ یا تو انسان اس عقیدے پر ایمان لائے یا اس سے انکار کر دے۔ کوئی درمیانی راہ اختیار کرنا ناممکن ہے۔ اس لئے کہ یہ عقل کا نہیں بلکہ عقیدے کا سوال ہے جہاں تک میرا تعلق ہے میں یہ سمجھتا ہوں کہ گاندھی جی اس معاملہ میں سراسر غلطی پر ہیں۔ ممکن ہے کہ بعض خاص صورتوں کے لئے ان کا مشورہ موزوں ہو لیکن اگر یہ عام اصول قرار دیا جائے تو اس کا نتیجہ لازمی طور پر مایوسی، نفسی رکاوٹ، خلل اعصاب اور طرح طرح کی جسمانی اور اعصابی بیماریاں ہوں گی۔ ضبط نفس یقیناً پسندیدہ چیز ہے لیکن مجھے یہ شبہ ہے۔ کہ گاندھی جی کے اصول کی پابندی سے ضبط نفس کا فروغ پانا دشوار ہے یہ اصول بے حد سخت ہے اور اکثر لوگ یہی فیصلہ کرتے ہیں کہ اس پر عمل کرنا ان کی قدرت سے باہر ہے اس لئے یا تو وہ اپنے پرانے طریقے پر قائم رہتے ہیں یا پھر میاں بیوی میں ان بن ہو جاتی ہے۔ بظاہر گاندھی جی کا یہ خیال معلوم ہوتا ہے کہ ضبط تولید کا منشا لازمی طور پر نفس پرستی اور بے اعتدالی ہے۔ اور اگر عورت و مرد کے درمیان جنسی کشش کو تسلیم کر لیا جائے تو پھر ہر مرد ہر عورت کے پیچھے اور ہر عورت ہر مرد کے پیچھے دوڑتی پھرے گی۔ لیکن یہ دونوں نتیجے بے انصافی پر مبنی ہیں اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ گاندھی جی کے ذہن پر جنسی مسئلہ، وہ کتنا ہی اہم سہی، کیوں اس قدر مسلط ہو گیا ہے ان کے نزدیک تو "سیاہ و سفید" کا سوال ہے۔ ان دونوں کے بیچ میں کوئی اور رنگ ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ ضبط نفس اور نفس پرستی دونوں کو انتہائی صورت میں پیش کرتے ہیں۔ جو میرے نزدیک غیر طبعی اور خلاف فطرت ہے شاید یہ ان جنسیات کی کتابوں کا رد عمل ہو جو آج کل سیلاب کی طرح امڈ رہی ہیں۔ میرا اپنے متعلق یہ خیال ہے کہ میں ایک طبعی انسان

[1] تحلیل نفسی کا یہ نظریہ کہ ماں بیٹے اور باپ بیٹی کے درمیان جنسی کشش ہوتی ہے۔

ہماری اور میری زندگی میں جنسی جذبات کو بھی دخل رہا ہے لیکن یہ کبھی میرے نفس پر مسلط ہوئے اور نہ ان کی وجہ سے میرے دوسرے کاموں میں رکاوٹ پیدا ہوئی یہ محض ایک ضمنی حیثیت رکھتے تھے۔

اصل میں ان کی پرستش ایک تارک الدنیا راہب کی سی ہے جو زندگی کی نفی کرتا ہے اور اس کو شر محض سمجھتا ہے۔ ایک راہب کے لئے تو یہ ایک قدرتی بات ہے، لیکن اس اصول کو دنیادار مردوں اور عورتوں میں جو زندگی کا اثبات کرتے ہیں اور اس سے لطف اٹھانا چاہتے ہیں، نافذ کرنا دور از کار معلوم ہوتا ہے اس طرح ایک برائی سے بچنے کیلئے بہت سی دوسری برائیوں کو اختیار کرنا پڑتا ہے جو اس سے کہیں زیادہ شدید ہیں۔

بات میں بات نکل آئی اور میں اپنے موضوع سے دور ہو گیا۔ لیکن علی پور جیل میں ان مصیبت کے دنوں میں میرے دل پر ان خیالات کا ہجوم تھا اور وہ بھی ربط اور سلسلے کے ساتھ نہیں بلکہ بے حد بے ترتیبی اور پریشانی کی حالت میں جس سے مجھے سخت الجھن اور کوفت تھی۔ اور پھر تنہائی اور اداسی کا احساس تھا جس میں جیل اور اس کال کوٹھری کی دم گھوٹنے والی فضا نے اور اضافہ کر دیا تھا۔ اگر میں جیل کے باہر ہوتا تو اس صدمے کا اثر زیادہ دیر تک نہ رہتا۔ بلکہ میں بہت جلد نئے حالات سے نبٹ لیتا اور اظہار خیال اور عمل سے تسکین حاصل کرتا۔ مگر جیل میں اس قسم کی تسکین کی کوئی صورت نہ تھی اور میں نے کچھ دن بڑی مصیبت اور تکلیف میں گذارے۔ خوش قسمتی سے میری طبیعت میں اتنی لچک ہے کہ مجھے مایوسی کے دورے سے بہت جلد افاقہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ میری یہ افسردگی رفتہ رفتہ دور ہونے لگی اور اس کے بعد جیل میں کملا سے میری ملاقات بھی ہوئی۔ اور اس سے مجھے بے حد خوشی ہوئی اور تنہائی کا احساس جاتا رہا۔ میں نے سوچا کہ جو کچھ بھی ہو کم سے کم ہم دونوں ایک دوسرے کا ساتھ دینے کو موجود ہیں۔

(۶۲)

متضاد باتیں

جو لوگ گاندھی جی سے ذاتی طور پر واقف نہیں ہیں اور صرف ان کی تحریروں کو پڑھتے ہیں وہ غالباً یہ خیال کرتے ہوں گے کہ گاندھی جی اسی قسم کے آدمی ہیں جیسے مذہبی پیشوا ہوا کرتے ہیں۔ یعنی روتی صورت، بسورتی شکل کے زاہد خشک، کالوِنی زمانے کے پیرمردوں کی طرح خوشی اور زندہ دلی کے دشمن، ان پادریوں سے کچھ مشابہ "جو سیاہ چغے پہنے ہوئے پیدل پھرا کرتے ہیں" لیکن ان کی تحریریں ان کی غلط تصویر پیش کرتی ہیں۔ اور ان کی شخصیت اس سے کہیں زیادہ بڑی ہے۔ یہ بڑی بے انصافی ہوگی کہ ہم صرف ان کی تحریروں کو سامنے رکھ کر ان پر تنقید کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ کالوِنی پادریوں کے بالکل برعکس ہیں۔ ان کی مسکراہٹ دل کو بھاتی ہے۔ ان کی ہنسی روتوں کو ہنساتی ہے، ان کی ذات فرحت و انبساط کا سرچشمہ ہے۔ ان میں بچوں کا سا بھولاپن ہے جس میں ایک عجیب دلکشی ہے۔ جب وہ کسی کمرے میں داخل ہوتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے تازہ ہوا کا جھونکا آ گیا جس نے فضا کی کثافت کو دور کر دیا۔

وہ ایک عجیب مجموعہ اضداد ہیں۔ اور میرا خیال ہے کہ سب بڑی شخصیتیں کسی حد تک ایسی ہی ہوتی ہیں۔ سالہا سال سے میں اس الجھن میں ہوں کہ آخر اس تمام محبت اور شفقت کے باوجود جو انہیں غریبوں کے ساتھ ہے۔ وہ کیوں ایک ایسے نظام کی حمایت کرتے ہیں جو خود ہی لوگوں کو مفلس بناتا ہے اور پھر

انہیں کچلتا ہے؟ اس کی کیا وجہ ہے کہ وہ عدم تشدد کی اس قدر جوش خروش سے تلقین کرتے ہیں اور اسی کے ساتھ ایک ایسے سیاسی اور معاشرتی نظام کے حامی ہیں جس کی بنیاد جبر و تشدد پر ہے۔ لیکن شاید یہ کہنا صحیح نہیں ہے۔ کہ وہ اس نظام کے حامی ہیں۔ اصل میں وہ ایک قسم کے نراجی فلسفے کے قائل ہیں۔ لیکن چونکہ نراجی ریاست کا قیام ابھی بہت دور ہے اور اس کا آسانی سے تصور بھی نہیں کیا جا سکتا اس لئے وہ چار ناچار موجودہ نظام کو قبول کرتے ہیں۔ میرے خیال میں سماجی نظام کو تشدد کے ذریعے سے بدلنے پر انہیں جو اعتراض ہے وہ محض وسائل تک محدود نہیں ہے اس لئے کہ وسائل سے قطع نظر کر کے اس کے نظام کو بدلنے کا ایک ایسا نصب العین مقرر کیا جا سکتا ہے جو مستقبل قریب میں حاصل ہو سکے۔

کبھی کبھی وہ اپنے آپ کو اشتراکی کہتے ہیں لیکن وہ اس لفظ کو ایک خاص معنی میں استعمال کرتے ہیں جو انہیں کے ذہن میں ہیں اور ان کی اشتراکیت کو سوسائٹی کے اس معاشی نظام سے کوئی تعلق نہیں جو بالعموم اشتراکیت کے نام سے مشہور ہے۔ ان کی تقلید میں بہت سے ممتاز کانگریسیوں نے بھی اس لفظ کا استعمال شروع کر دیا ہے۔ اور اس سے ان کی مراد ایک قسم کی انسانی ہمدردی ہے۔ سیاسی اصطلاحوں کا یہ مبہم استعمال انہیں حضرات کے لئے مخصوص نہیں بلکہ بہت بڑے بڑے آدمی ان کے ساتھ شریک ہیں چنانچہ ان کے سامنے برطانیہ کی نیشنل گورنمنٹ کے وزیر اعظم[1] کی مثال موجود ہے۔ میں

---

[1] اپنے ایک پیام میں جو قدامت پسند اور اتحادی پارٹی کی متحدہ انجمن کو جس کا جلسہ جنوری ۱۹۳۵ء میں اڈنبرگ میں ہوا بھیجا گیا تھا۔ مسٹر ریمزے میکڈونلڈ (بقیہ صفحہ ۴۰۷ پر)

جانتا ہوں کہ گاندھی جی اس موضوع سے ناواقف نہیں ہیں انہوں نے معاشیات اشتراکیت بلکہ مارکس کے فلسفے پر بھی متعدد کتابیں پڑھی ہیں اور اس پر دوسروں سے بحث اور تبادلۂ خیال کر چکے ہیں۔ لیکن میرا روز بروز یہ خیال ہوتا جاتا ہے۔ کہ اہم معاملات میں عقل و دماغ بجائے خود ہماری کچھ زیادہ رہنمائی نہیں کر سکتے ولیم جیمس نے لکھا ہے "اگر تمہارا دل نہ چاہے تو یقیناً تمہارا دماغ تمہیں کبھی قائل نہیں کر سکتا جذبات ہمارے تصورِ زندگی پر حاوی ہیں اور دماغ پر حکومت کرتے ہیں۔ ہماری گفتگو خواہ وہ مذہبی ہو یا سیاسی یا معاشی اصل میں جذبات اور وجدان ان پر مبنی ہوتی ہے، جیسا کہ شوپنہار نے کہا ہے۔ "انسان جو ارادہ کرے وہ کر سکتا ہے مگر ارادہ اس کے اختیار میں نہیں ہے"

جنوبی افریقہ کے ابتدائی دور میں گاندھی جی کے خیالات میں ایک عظیم الشان تبدیلی واقع ہوئی جس نے انہیں بے حد متاثر کیا اور ان کا سارا تصورِ زندگی بدل دیا۔ اس وقت سے ان کے خیالات ایک خاص بنیاد پر قائم ہو گئے ہیں۔ اور ان کا دماغ نئی باتوں کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہے جو لوگ نئی تجویزیں پیش کرتے ہیں ان کی باتوں کو وہ بہت صبر و سکون اور توجہ سے سنتے ہیں، لیکن اس دلچسپی کے باوجود وہ اخلاقاً ظاہر کرتے ہیں بات کہنے والے کو یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسے شخص سے گفتگو کر رہا ہے جس کے دل کا دروازہ بند ہے۔ وہ اس مضبوطی سے بعض خیالات پر قائم ہیں کہ ان کے

(صفحہ ۴۰۶ کا بقیہ) فرماتے ہیں "زمانے کی مشکلات ہر قوم کو متحد ہونے اور ایک مرکز پر جمع ہونے پر مجبور کر رہی ہیں یہی حقیقی اشتراکیت ہے یہی حقیقی قومیت بھی ہے بلکہ یہی حقیقی انفرادیت بھی ہے"

علاوہ اور تمام باتیں ان کو غیر اہم معلوم ہوتی ہیں۔ دوسرے ضمنی معاملات پر زور دینے سے اس بڑے کام میں خلل پڑتا ہے جو ان کے پیش نظر ہے، جب انسان ایک بنیادی خیال پر رہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دوسرے مسائل خود بخود ہم آہنگ ہو جائیں گے۔ اگر مقدمات صحیح ہیں تو نتیجہ یقیناً صحیح ہوگا۔

یہ میرے نزدیک ان خیالات کی اصل بنیاد ہے۔ وہ اشتراکیت خصوصاً مارکسیت کو شبہے کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اس لئے کہ یہ تحریکیں تشدد سے وابستہ ہیں "طبقوں کی جنگ" کے الفاظ ہی سے ان کو تشدد اور لڑائی کی بو آتی ہے۔ اور اس لئے انہیں اس سے نفرت ہے۔ وہ بھی یہ نہیں چاہتے کہ عام لوگوں کا معیار زندگی ایک مقررہ حد سے بڑھنے نہ پاتے۔ اس لئے کہ بلند معیار زندگی اور فرصت سے اندیشہ ہے کہ لوگ عیش پرستی اور گناہ میں مبتلا ہو جائیں گے۔ یہی کیا کم برا ہے کہ تھوڑے سے خوش حال لوگ عیش پرست بن گئے ہیں۔ یہ اور بھی برا ہوگا کہ ان کی تعداد میں اضافہ کیا جائے سنہ ۱۹۲۶ء میں انہوں نے ایک خط لکھا تھا جس سے اس قسم کے نتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں یہ ایک خط کا جواب تھا جو کوئلے کی بڑی ہڑتال کے زمانے میں ان کے پاس انگلستان سے آیا تھا۔ لکھنے والے نے لکھا تھا کہ اس معاملہ میں مزدوروں کو شکست ہوگی کیونکہ ان کی تعداد بہت زیادہ ہے اور انہیں چاہیئے کہ ضبط تولید کا طریقہ استعمال کر کے اپنی تعداد کو کم کریں۔ گاندھی جی نے اپنے جواب کے سلسلے میں لکھا تھا کہ "آخر میں مجھے یہ کہنا ہے کہ اگر کانوں کے مالک حق پر نہ ہونے کے باوجود جیت جائیں تو اس کا سبب یہ نہیں ہوگا کہ مزدوروں کے حد سے زیادہ اولاد ہوتی ہے بلکہ یہ کہ مزدور کسی چیز میں بھی ضبط نفس سے کام نہیں لیتے۔ اگر مزدوروں کے اولاد نہ ہوتی تو ان کے لئے ترقی کا کوئی محرک نہ رہتا۔

اور وہ مزدوری بڑھانے کے لئے کوئی ایسی دلیل نہ پیش کر سکتے جس کا ثبوت آسان ہوتا کیا ان کے لئے شراب نوشی، جوا کھیلنا، تمباکو پینا ضروری ہے؟ یہ کوئی جواب نہیں کہ کانوں کے مالک بھی یہی سب حرکتیں کرتے ہیں۔ اور پھر بھی غالب رہتے ہیں، اگر مزدور سرمایہ داروں سے بہتر ہونے کا دعوےٰ نہیں کرتے تو انہیں دنیا کی ہمدردی چاہنے کا کیا حق ہے؟ یہی کہ سرمایہ داروں کی تعداد میں اور اضافہ ہو اور سرمایہ داری کو قوت حاصل ہو جائے؟ ہم سے کہا جاتا ہے۔ کہ جمہوریت کی حمایت کرو اس لئے کہ جب اس کا دور دورہ ہوگا تو دنیا کی حالت بہتر ہو جائیگی یہ نہ ہو کہ ہم انہیں برائیوں کو جو سرمایہ دار اور سرمایہ داری کی طرف منسوب کی جاتی ہیں۔ بہت بڑے پیمانے پر پیدا کردیں۔" [1]

جب میں اس کو پڑھ رہا تھا تو فاقہ کش مزدور کان کنوں ان کی بیویوں اور بچوں کے اترے ہوئے چہرے میری آنکھوں میں پھر گئے، جن کو میں نے ۱۹۲۶ء کی گرمیوں میں بے بسی کی حالت میں ایک ایسے خوفناک نظام کا مقابلہ کرتے دیکھا تھا جو انہیں کچلے ڈالتا تھا۔ گاندھی جی کے بیان کردہ واقعات بھی صحیح نہیں ہیں۔ اس لئے کہ کان کن مزدوری میں اضافے کا مطالبہ نہیں کر رہے تھے بلکہ اس لئے لڑ رہے تھے کہ ان کی مزدوری کم کر دی گئی تھی اور وہ کام سے ہٹا دیئے گئے تھے۔ بہر حال اس وقت ہمیں اس سے کوئی بحث نہیں۔ اور نہ اس سے غرض ہے کہ کان کن مزدور ضبط تولید کے طریقے استعمال کریں یا نہ کریں اگرچہ اس میں شک نہیں کہ صنعتی جھگڑوں کو حل کرنے کے لئے یہ ایک غیر معمولی تجویز ہے۔

میں نے گاندھی جی کے جواب سے یہ ٹکڑا اس لئے نقل کیا ہے کہ یہ اندازہ

---

[1] ضبط نفس اور نفس پرستی مصنفہ ایم کے گاندھی سے یہ ٹکڑا نقل کیا گیا ہے۔

ہو سکے کہ مزدوروں کے مسائل اور ان کے معیار زندگی کو بڑھانے کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر کیا ہے۔ یہ نقطۂ نظر اشتراکیت بلکہ سرمایہ داری کے نقطۂ نظر سے بھی کوسوں دور ہے۔ یہ اگر کہا جائے کہ سائنس اور صنعتی تنظیم آج ہر شخص کے کھانے پہننے، رہنے سہنے کا معقول بندوبست کر سکتی ہے اور ان کے معیار زندگی کو بہت بلند کر سکتی ہے۔ بشرطیکہ مستقل حقوق رکھنے والے اس میں مداخلت نہ کریں، تو اس سے انہیں کچھ زیادہ دلچسپی نہیں ہوتی کیونکہ وہ لوگوں کے معیار زندگی کو ایک خاص حد سے آگے بڑھانے کے قابل ہی نہیں۔ چنانچہ اشتراکیت سے جو امیدیں ہیں وہ ان کے لئے کوئی کشش نہیں رکھتیں بلکہ ان کے نزدیک سرمایہ داری پھر بھی ایک حد تک قابل برداشت ہے اسی لئے کہ وہ عیش پرستی کے گناہ کو ایک چھوٹے سے دائرے میں محدود رکھتی ہے۔ انہیں ان دونوں میں سے ایک بھی پسند نہیں۔ لیکن فی الحال وہ سرمایہ داری سے نباہ رہے ہیں اس لئے کہ یہ اتنی بری نہیں، اور پھر یہ ایک امر واقعہ کی حیثیت رکھتی ہے جس کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

ممکن ہے کہ میں یہ خیالات ان کی طرف منسوب کرنے میں غلطی کرتا ہوں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ان کے ذہن کا عام رجحان یہی ہے اور ان کی تحریر و تقریر میں ہمیں جو الجھن اور پیچیدگی نظر آتی ہے اس کی وجہ اصل میں یہ ہے کہ ان کے خیال کی بنیاد ہی دوسری ہے۔ وہ یہ نہیں چاہتے کہ لوگ روز افزوں آرام و آسائش اور فرصت کو اپنی زندگی کا مقصد قرار دیں، بلکہ ان کی تعلیم یہ ہے کہ ہم اپنی اخلاقی زندگی کو سدھارنے کی فکر کریں۔ بری عادتوں کو ترک کریں، خواہشات کو کم کرتے رہیں اور اس طریقے سے اپنی انفرادی اور روحانی اصلاح کریں، اور جو لوگ عوام کی خدمت کرنا چاہتے ہیں ان کا کام یہ نہیں ہے کہ ان کی مادی زندگی کا سطح کو بلند

کریں بلکہ خود ان کی سطح پر اتر آئیں اور مساوی حیثیت سے ان کے ساتھ میل جول پیدا کریں۔ اگر ایسا کیا گیا تو لازمی طور پر عام لوگوں کی سطح زندگی کسی قدر بلند ہو جائیگی یہی گاندھی جی کے نزدیک حقیقی جمہوریت ہے۔ اس بیان میں جو انہوں نے ۱۱ ستمبر ۱۹۴۲ء کو شائع کیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ "بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ میری مخالفت کرنا بیکار ہے اس لئے کہ میرے آگے کسی کی نہیں چلتی۔ میرے جیسے پیدائشی جمہوریت پسند کے لئے یہ انکشاف باعث شرم ہے۔ اگر وہ شخص جس نے اپنے آپکو غریب سے غریب لوگوں میں کھپا دیا ہے، جس کی یہ آرزو ہے کہ انہیں کی سی زندگی بسر کرے اور اسی کے ساتھ پوری کوشش کرتا ہے کہ جہاں تک ہو سکے اس سطح پر پہنچ جائے، جمہوریت پسندی کا دعویٰ کر سکتا ہے تو میں یہ دعویٰ کرتا ہوں۔

اس استدلال سے غالباً موجودہ زمانے کا کوئی جمہوریت پسند یا سرمایہ دار، یا اشتراکی اتفاق نہیں کرے گا بجز اس کے کہ یہ بات معیوب اور نامناسب ہے کہ ہم عام لوگوں سے اپنا رشتہ بالکل منقطع کریں اور اپنے تعیشات اور بلند تر معیار زندگی کی نمائش ان بے شمار آدمیوں کے سامنے کریں جو ادنیٰ سے ادنیٰ ضرورت کی چیزوں کے بھی محتاج ہیں۔ البتہ ایک ایسا شخص جو قدیم مذہبی نقطۂ نظر رکھتا ہے شاید کسی حد تک اس سے متفق ہو اس لئے کہ دونوں اپنے جذبات کے اعتبار سے ماضی سے وابستہ ہیں اور ہر چیز کو ماضی کے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں انہیں اس کی زیادہ فکر ہے کہ کیا ہو چکا ہے بہ نسبت اس کے کہ کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونے والا ہے۔ ان لوگوں میں جو نفسیاتی حیثیت سے ماضی سے وابستہ ہیں اور ان میں جو مستقبل پر نظر رکھتے ہیں زمین آسمان کا فرق ہے۔ قدیم زمانے میں عام لوگوں کی معاشی سطح کو بلند کرنے کا خیال بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ غریبوں کا وجود لازمی تھا۔ مٹھی بھر دولتمند آدمی اس زمانے میں سماج کے روح رواں تھے اور ان کا ہونا نظام دولت آفرینی کے

لئے ضروری تھا اس لئے اخلاقی معلموں، مصلحوں، اور اہل دل نے ان کے وجود کو جائز رکھا لیکن اسی کے ساتھ انہیں یہ تلقین کرتے رہے کہ ان کے حاجتمند بھائیوں کا بھی ان پر کچھ حق ہے۔ وہ غریبوں کے امانت دار ہیں۔ انہیں خیرات کرنا چاہیئے۔ چنانچہ خیرات کا شمار ان بڑی نیکیوں میں ہونے لگا جن کی مذہب نے تاکید کی ہے۔ گاندھی جی بھی ہمیشہ اس نظریہ پر زور دیتے ہیں کہ راجہ مہاراجہ، بڑے بڑے زمیندار اور سرمایہ دار غریبوں کے امانت دار ہیں۔ ان سے پہلے بہت سے مذہبی آدمی بھی کہتے آتے ہیں۔ پاپائے اعظم نے یہ اعلان کیا ہے۔ "امیروں کو یہ سمجھنا چاہیئے۔ کہ وہ خدا کی طرف سے خدمت خلق پر مامور ہیں۔ اور اس کی دولت کے خازن اور قاسم ہیں اور خود حضرتِ مسیح نے غریبوں کی قسمت ان کے سپرد کی ہے۔" ہندو دھرم اور اسلام کا عام عقیدہ بھی یہی ہے۔ یہ دونوں امیروں کو خیرات کی تاکید کرتے ہیں۔ جس کی تعمیل میں یہ حضرات مندر، مسجد، دھرم شالے بنواتے ہیں۔ اپنی وافر دولت میں سے تانبے کے پیسے اور چاندی کے روپے غریبوں کو خیرات کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم بڑے نیک اور دیندار ہیں۔

دنیائے قدیم کے مذہبی نقطۂ نظر کی ایک نمایاں مثال پاپائے اعظم لیو سیزدہم کا مشہور فرمان "ریرم نوارم" ہے جو مئی ۱۸۹۱ء میں جاری کیا گیا تھا۔ وہ جدید صنعتی حالات کا استدلال کرتے ہوئے لکھتے ہیں "غرض مصیبت سہنا اور تکلیف اٹھانا نوعِ انسانی کی قسمت میں لکھا ہے۔ انسان چاہے جتنی کوشش کرے کوئی طاقت اور کوئی تدبیر انسانی زندگی کو اس درد و عالم سے نجات دلانے میں کامیاب نہیں ہو سکتی جو اسے ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ جو لوگ اس کے خلاف دعویٰ کرتے ہیں، اور مصیبت زدوں کو یہ امید دلاتے ہیں کہ انہیں رنج و الم سے نجات مل جائے گی۔ اور دائمی راحت و عشرت نصیب ہوگی، دھوکا دے رہے ہیں اور سبز باغ دکھا رہے ہیں۔ اور ان کے یہ جھوٹے وعدے اور زیادہ ابتری پیدا کر دیں گے۔ انسان کی

فلاح اسی میں ہے کہ وہ دنیا کو اس کی اصلی حالت میں دیکھے اور ان مصیبتوں کا علاج کھیں، اور تلاش کرے۔

آگے چل کر بتایا جاتا ہے کہ یہ کہیں اور کا اشارہ کدھر ہے "اس دنیا کو نہ تو ہم اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں اور نہ ان کی صحیح قدر کر سکتے ہیں۔ جب تک اس زندگی کا لحاظ نہ رکھیں جو آنے والی ہے اور ہمیشہ ہمیشہ قائم رہے گی جس حقیقت عظمیٰ کا سبق خود فطرت ہمیں دیتی ہے وہی عیسائی مذہب کا عظیم الشان عقیدہ ہے جس پر مذہب کی بنیاد قائم ہے اور وہ یہ ہے کہ ہماری اصلی زندگی اس وقت شروع ہوگی جب موجودہ زندگی ختم ہو جائے گی۔ خدا نے ہمیں اس دنیا کی آنی جانی چیزوں کے لئے نہیں پیدا کیا ہے بلکہ ان آسمانی چیزوں کے لئے جو ہمیشہ رہنے والی ہیں، اس نے اس دنیا کو ہمارے لئے عارضی جلا وطنی کی جگہ بنایا ہے نہ کہ ہمارا حقیقی وطن، روپیہ پیسہ اور دوسری چیزیں جنہیں لوگ اچھا اور پسندیدہ سمجھتے ہیں، خواہ ہمارے پاس افراط سے ہوں یا بالکل نہ ہوں، جہاں تک ہماری ابدی راحت و مسرت کا تعلق ہے کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔"

یہ مذہبی طرز خیال اس قدیم زمانے سے وابستہ ہے، جب موجودہ مصیبتوں سے نجات پانے کا صرف یہی ایک راستہ تھا کہ آنے والی زندگی کا سہارا ڈھونڈا جائے۔ لیکن باوجود اس کے کہ حالات بدل گئے اور انسان کی مادی خوش حالی کی سطح اتنی بلند ہو گئی جو زمانہ قدیم میں انسان کے خواب و خیال میں بھی نہ آ سکتی تھی، لیکن ماضی کے خیالات اب بھی ہم پر مسلط ہیں البتہ اب زیادہ زور چند مبہم روحانی قدروں پر دیا جاتا ہے جن کے جانچنے کا کوئی پیمانہ نہیں۔ کیتھولک عیسائی ہمیشہ بارہویں اور تیرھویں صدی کے خیال میں مگن رہتے ہیں (یہ وہی زمانہ ہے جسے دوسرے لوگ عہد مظلمہ کہتے ہیں) اور اسے عیسائیت کا عہد زریں سمجھتے ہیں، جب اولیا کا دور دورہ

تھا عیسائی فرمان روا صلیبی لڑائیاں لڑنے کو جایا کرتے تھے اور گوتھک فرزنک کے بڑے بڑے گرجے تعمیر ہو رہے تھے ان کے خیال میں یہ زمانہ "سچی عیسائی جمہوریت کا تھا جو ہمیشہ وروں کی انجمنوں کے ماتحت ترقی کے اس درجہ پر پہنچ گئی تھی جس پر نہ اس سے پہلے کبھی پہنچ سکی اور نہ اس کے بعد" مسلمان بڑی حسرت سے ابتدائی عہد خلافت کی "اسلامی جمہوریت" اور اس دور کی حیرت انگیز فتوحات کو یاد کیا کرتے ہیں۔ اسی طرح ہندو بھی ویدوں کے عہد اور رامائن اور مہابھارت کے زمانے کی دھن میں رہتے ہیں اور "رام راج" کا خواب دیکھتے ہیں۔ مگر تاریخ ہمیں یہی بتلاتی ہے۔ کہ اسی عہد ماضی میں لوگوں کی بہت بڑی تعداد انتہائی مصیبت کی حالت میں زندگی بسر کرتی تھی اور اسے پیٹ بھر کھانا اور زندگی کی ادنیٰ ترین ضروریات بھی میسر نہ تھیں۔ ممکن ہے کہ چھوٹے سے حکمران طبقہ کو فرصت اور فراغت حاصل ہو لیکن جہاں تک زندگی کا لطف اٹھانے سے اور لوگوں کا تعلق ہے یہ تصور کرنا دشوار ہے کہ وہ سوائے قوت لایموت کی جدوجہد میں لگے رہنے کے اور بھی کچھ کر سکتے تھے اس شخص کے لیے جو بھوکوں مر رہا ہو کسی قسم کی تمدنی اور روحانی ترقی ممکن نہیں، اسے تو بس ایک ہی فکر ہو گی کہ کسی طرح کھانے کو روٹی مل جائے۔

صنعتی دور اپنے ساتھ بہت سی برائیاں لایا ہے، جن پر فوراً ہماری نظر پڑتی ہے۔ لیکن ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ مجموعی طور پر دنیا میں خصوصاً ان حصوں میں جہاں صنعت کو سب سے زیادہ فروغ ہوا ہے، اس نے مادی خوش حالی کی ایک ایسی بنیاد قائم کر دی ہے جس سے لوگوں کی بہت بڑی تعداد کے لیے تمدنی اور روحانی ترقی آسان ہو گئی ہے۔ ہندوستان اور دوسرے محکوم ملکوں میں ہمیں اس کے کوئی آثار نظر نہیں آتے اس لیے کہ ہمیں صنعتی ترقی سے فائدے کی جگہ نقصان پہنچا ہے ہمیں تو صنعتی نظام نے خوب لوٹا ہے اور ہر لحاظ سے یعنی مادی اعتبار سے بھی، اور

اس سے زیادہ تمدنی اور روحانی اعتبار سے ہماری حالت پہلے سے بھی بد تر کر دی ہے لیکن قصور صنعتی نظام کا نہیں بلکہ بدیسی حکومت کا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ ہندوستان میں نام نہاد مغربیت نے اس وقت تو نظام جاگیرداری کو اور مستحکم کر دیا ہے۔ اور ہماری دشواریوں کو حل کرنے کے بجائے انہیں اور زیادہ شدید بنا دیا ہے۔

لیکن یہ ہماری بدنصیبی ہے اور اس سے متاثر ہو کر ہمیں آج کل کی دنیا کے دیکھنے اور سمجھنے میں غلطی نہیں کرنی چاہیئے۔ موجودہ حالات میں امیروں کا وجود سماج کے نظام و دولت آفرینی کے لئے ضروری اور مناسب نہیں رہا امرا کا طبقہ بالکل بیکار ہے اور اکثر اس کی وجہ سے رکاوٹیں پیدا ہوتی ہیں۔ اسی طرح مذہبی پیشواؤں کا یہ پرانا مشغلہ بھی اب بالکل بے معنی ہو گیا ہے کہ امیروں کو خیرات کی تلقین کی جائے۔ اور غریبوں کو قناعت کی صبر و شکر کی کفایت شعاری اور نیک چلنی کی۔ انسان کے وسائل اور ذرائع اس قدر وسیع ہو گئے ہیں کہ دنیا کے مسائل سے اچھی طرح نبٹ سکتا ہے۔ امیروں میں سے بہت سے لوگ صریحی طور پر طفیلی بن گئے ہیں۔ اور ایک طفیلی طبقے کا وجود نہ صرف ترقی کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرتا ہے۔ بلکہ اس کی وجہ سے وسائل دولت ضائع ہوتے ہیں یہ طبقہ اور وہ نظام جو اسے پیدا کرنے کا ذمہ دار ہے کام کو اور دولت آفرینی کو روکتا ہے۔ اور دو طرح سے بیکاری کو بڑھاتا ہے یعنی ایک تو ان لوگوں کی ہمت افزائی کرتا ہے۔ جو اوروں کی محنت پر بسر کرتے ہیں دوسرے بہت سے مزدوروں کو کام سے محروم رکھتا ہے۔ اور فاقے کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ خود گاندھی جی نے کچھ عرصہ گذرا لکھا تھا "ان لوگوں کے سامنے جو بھوکوں مرتے ہیں اور بیکار ہیں خدا صرف ایک ہی شکل میں ظاہر ہو سکتا ہے یعنی کام کی اور روٹی کی شکل میں۔ خدا نے انسان کو اس لئے پیدا کیا تھا کہ محنت

کر کے روٹی کمائے اور یہ کہا تھا کہ جو لوگ بغیر محنت کے کھاتے ہیں وہ چور ہیں"

دنیا نے جدید کے پیچیدہ مسائل کو سمجھنے کے لئے اس وقت کے قدیم طریقوں اور اصولوں سے کام لینا جب ان ہی مسائل کا وجود نہ تھا اور ان کا ذکر دقیانوسی الفاظ میں کرنا محض الجھن پیدا کرتا ہے اور اس سے کوئی فائدہ نہیں حاصل ہو سکتا خود ذاتی ملکیت کا تخیل جو بعض لوگوں کے نزدیک دنیا کے بنیادی تخیلات میں ہے، ہمیشہ تبدیل ہوتا رہا ہے۔ ایک زمانے میں غلام بھی املاک میں شامل تھے اور یہی حال عورتوں اور بچوں کا تھا اس کے علاوہ جاگیردار ہر دلہن کی شب عروسی کا، سڑکوں، مندروں کشتیوں، پلوں، مفاد عامہ کی چیزوں کا، زمین اور ہوا کا مالک تھا، جانور آج بھی پالنے والوں کی ملک سمجھے جاتے ہیں۔ حالانکہ بعض ملکوں میں ملکیت کے حقوق قانوناً محدود کر دیئے گئے ہیں، جنگ کے زمانے میں برابر حقوق ملکیت میں دست اندازی کی جاتی ہے۔ املاک روز بروز غیر مرئی صورت اختیار کرتی جاتی ہے مثلاً کمپنی کے حصے اعتبار وغیرہ۔ جیسے جیسے ملکیت کا تصور تبدیل ہوتا جاتا ہے۔ حکومت کی مداخلت بڑھتی جاتی ہے۔ رائے عامہ برابر جائداد والوں کے لا محدود حقوق کو محدود کرنے کا مطالبہ کرتی رہتی ہے اور قانون اس مطالبے کو پورا کرتا رہتا ہے۔ طرح طرح کے بڑے بڑے محصول لگائے جاتے ہیں۔ جنہیں ایک طرح کی ضبطی سمجھنا چاہیئے۔ اور اس طرح مفاد عامہ کی خاطر حقوق ملکیت کم ہوتے جاتے ہیں مفاد عامہ کا خیال پبلک پالیسی کی بنیاد بنتا جاتا ہے اور کسی شخص کو یہ حق نہیں ہے کہ مفاد عامہ کے خلاف کوئی کام کرے، خواہ اس کی غرض اپنے حقوق ملکیت کا تحفظ ہو اور پرانے زمانے میں تو اکثر لوگ حقوق ملکیت سے محروم بلکہ خود دوسروں کی ملکیت تھے۔ آج بھی یہ حقوق صرف تھوڑے سے لوگوں کو حاصل ہیں۔ "ہم مستقل حقوق" کا ذکر بہت سنتے آئے ہیں۔ لیکن آج کل ایک نیا "مستقل حق" اور تسلیم کر لیا گیا ہے۔ اور وہ یہ ہے۔

کہ ہر مرد اور ہر عورت کو یہ حق ہے کہ زندہ رہے، محنت کرے، اور اپنی محنت کا پھل پائے۔ ان نئے نظریوں کی رو سے املاک اور سرمایہ معدوم نہیں ہو جاتے۔ بلکہ بہت سے لوگوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں اور ان کے چند اشخاص کے ہاتھ میں جمع ہو جانے سے ان اشخاص کو دوسروں پر جو اقتدار حاصل ہو گیا تھا اسے سماج ان سے واپس لے لیتی ہے۔

گاندھی جی کے پیش نظر افراد کی باطنی، اخلاقی، اور روحانی اصلاح ہے اور اس کے ذریعہ سے وہ خارجی ماحول کو تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی تعلیم یہ ہے کہ لوگ بری عادتوں کو اور لذتوں کو ترک کریں اور پاکباز بن جائیں، وہ اس پر بھی زور دیتے ہیں کہ مجامعت اور شراب اور تمباکو کے استعمال سے پرہیز کیا جائے ممکن ہے اس بارے میں اختلاف رائے ہو کہ ان میں کون چیز زیادہ بری ہے اور کون کم، کیا اس میں کوئی شبہ ہو سکتا ہے کہ انفرادی نقطۂ نظر سے بھی، اور اس سے زیادہ سماجی نقطۂ نظر سے ان ذاتی کمزوریوں سے بدرجہا بدتر لالچ، خود غرضی، زرپرستی افراد کا ذاتی نفع کے لیے جھگڑنا، طبقوں اور جماعتوں کی وحشیانہ کش مکش، ایک طبقے کا دوسرے کو بے دردی سے لوٹنا اور کچلنا، قوموں کی ہولناک لڑائیاں ہیں۔ ظاہر ہے کہ گاندھی جی ان تمام ذلت آفریں جھگڑوں سے اور ہر قسم کے تشدد سے نفرت کرتے ہیں لیکن کیا یہ چیزیں آج کل کی زبردست سماج کی فطرت میں داخل نہیں ہیں جس کا قانون یہ ہے کہ زبردست کمزور کو ستاتے اور جس کا عمل اس پرانے مقولے پر ہے "جس میں طاقت ہو وہ چھین لے اور جو رکھ سکے وہ رکھے"۔ نفع کی خواہش آج کل لازمی طور پر جھگڑا پیدا کرتی ہے، اور ہمارا نظام انسان کی غارت گرانہ جبلتوں کی سرپرستی کرتا ہے اور اسے ان سے کام لینے کا پورا پورا موقع دیتا ہے، اس میں شک نہیں کہ وہ بعض پسندیدہ جذبات

کو بھی ابھارتا ہے لیکن اس سے کہیں زیادہ انسان کے کمینے جذبات کو وہ تقویت دیتا ہے۔ کامیابی کے معنے یہ سمجھے جاتے ہیں کہ دوسروں کو نیچے گرا کر ان کی جگہ لے لی جائے۔ جب ہماری سماج ایسے ارادوں اور حوصلوں کی ہمت افزائی کرتی ہے۔ ہمارے بہترین آدمی ان کی طرف کھنچ جاتے ہیں تو کیا گاندھی جی یہ امید کر سکتے ہیں کہ وہ اس ماحول میں انسان کی اخلاقی تکمیل کا مقصد حاصل کر لیں گے؟ وہ لوگوں میں خدمت کا جذبہ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ چند افراد کو متاثر کرنے میں انہیں ضرور کامیابی ہوگی لیکن جب تک سماج ان لوگوں کو جو دوسروں کو لوٹ کر ترقی کرتے ہیں کامیابی کا نمونہ بنا کر پیش کرے گی اور ذاتی نفع کی خواہش کو عمل کا محرک قرار دے گی اس وقت تک بہت بڑی اکثریت اسی راہ پر چلتی رہے گی۔

لیکن یہ مسئلہ محض اخلاق اور فلسفہ اخلاق کا نہیں ہے بلکہ آج کل کے عملی اور ضروری مسائل میں سے ہے، دنیا سخت مشکل میں گرفتار ہے اور اس مشکل کو کسی نہ کسی طرح حل کرنا ہے۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ڈکنس کے مکاپر کی طرح ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہیں کہ کچھ نہ کچھ ہو ہی رہے گا اور نہ منفیانہ طرز اختیار کرنے سے کام چل سکتا ہے۔ کہ سرمایہ داری، اشتراکیت اور اشتمالیت وغیرہ کے خراب پہلوؤں کی نکتہ چینی کرتے رہیں اور دھندلی سی امید کا سہارا لیں کہ کوئی بہترین درمیانی طریقہ خود بخود نکل آئے گا جس میں ماضی اور حال کے سب طریقوں کی خوبیاں جمع ہوں گی، ضرورت اس کی ہے کہ مرض کی تشخیص کی جائے۔ علاج تجویز کیا جائے۔ اور اسے عمل میں لانے کی کوشش کی جائے۔ بالکل یقینی بات ہے کہ قومی اور بین الاقوامی حیثیت سے ہم موجودہ حالات پر قائم نہیں رہ سکتے یا تو ہمیں پیچھے ہٹنا ہے یا آگے بڑھنا ہے۔ بلکہ سچ پوچھیے تو پیچھے ہٹنے کا تو اب کوئی سوال ہی نہیں رہا ہے۔

مگر گاندھی جی کی اکثر کارروائیوں سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ وہ ہمیں اس محدود قومی معیشت کی طرف واپس لے جانا چاہتے ہیں جس میں صرف قوم اور قوموں سے بلکہ ہر گاؤں اور گاؤنوں سے معاشی حیثیت سے بے نیاز ہو۔ بس قدیم زمانے کی سماج میں ہر گاؤں ایک مستقل معاشی حیثیت رکھتا تھا' اپنا کھانا کپڑا اور دوسری ضرورت کی چیزیں خود ہی پیدا کرتا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں معیار زندگی بہت ہی پست ہوتا ہے میں سمجھتا ہوں کہ گاندھی جی یہ حالت صرف عارضی طور پر چاہتے ہیں کیونکہ مستقل طور پر تو یہ چل ہی نہیں سکتی بعض ملکوں کی بڑی بڑی آبادیوں کا اس صورت میں زندہ رہنا دشوار ہو جائے گا اور وہ یہ ہرگز گوارا نہ کریں گے کہ عسرت اور فاقے کی زندگی کی طرف لوٹیں۔ ممکن ہے کہ ہندوستان جیسے زراعتی ملک میں جہاں ہمارا موجودہ معیار زندگی بے حد پست ہے۔ دیہی صنعتوں کی ترقی سے عام لوگوں کی حالت کسی قدر بہتر ہو جائے لیکن اوروں کی طرح ہم بھی دنیا کے دوسرے ملکوں سے وابستہ ہیں اور میرے خیال میں ان سے قطع تعلق کرنا بالکل ناممکن ہے اس لئے ہمیں ان مسائل پر ساری دنیا کے نقطۂ نظر سے غور کرنا چاہیئے اور اس نقطۂ نظر سے محدود قومی حیثیت کا کوئی سوال ہی نہیں اور میں تو ذاتی طور پر اسے ہر پہلو سے ناپسند کرتا ہوں۔

ہر پھر کر ہم اسی چیز پر پہنچ جاتے ہیں جس کے سوا اس مسئلے کا اور کوئی حل نہیں یعنی ایک اشتراکی نظام کا قیام۔ پہلے قومی دائرے کے اندر اور پھر ساری دنیا میں۔ جس میں دولت کی پیدائش اور تقسیم ریاست کی نگرانی میں مفاد عامہ کے لحاظ سے کی جائے۔ یہ انقلاب کس طریقے سے ہونا چاہیئے۔ یہ ایک جداگانہ سوال ہے۔ لیکن یہ بات بالکل واضح ہے کہ جب چیزیں ایک پوری قوم بلکہ نوع انسانی کی بھلائی ہو وہ محض اس وجہ سے نہیں روکی جا سکتیں کہ کچھ لوگ جو موجودہ نظام

سے فائدہ اٹھاتے ہیں اس تبدیلی کے مخالف ہیں۔ اگر سیاسی یا سماجی ادارے اس تبدیلی کی راہ میں حائل ہیں تو ان کو مٹا دینا چاہیئے۔ ان چیزوں کی خاطر ایسے مفید اور پسندیدہ مقصد کو قربان کرنا بہت بڑی غداری ہو گی۔ ممکن ہے کہ دنیا کے عام واقعات کسی حد تک اس قسم کی تبدیلی پیدا کرنے میں یا اس کی رفتار کو تیز کرنے میں مدد دیں، لیکن جب تک ملک کے لوگوں کی بہت بڑی اکثریت راضی نہ ہو جائے یہ انقلاب مشکل ہی سے ہو سکے گا۔ اس لئے ان لوگوں کو سمجھا کر اپنا ہم خیال بنانا ہے ایک چھوٹی سی جماعت کی سازش اور تشدد سے کام نہیں چل سکتا۔ ظاہر ہے کہ ہمیں اس بات کی کوشش کرنی چاہیئے کہ ان لوگوں کو بھی اپنا ہم خیال بنا لیں جو موجودہ نظام سے فائدہ اٹھاتے ہیں مگر یہ بہت بعید از قیاس ہے کہ ہم ان میں سے کچھ زیادہ لوگوں کو قائل کر سکیں گے۔

کھادی کی تحریک یعنی ہاتھ سے کاتنا اور بننا جس سے گاندھی جی کو خاص شوق ہے ایک ایسی چیز ہے جو دولت آفرینی کے انفرادی طریقے کو تقویت پہنچاتی ہے۔ اور ہمیں قبل صنعتی عہد کی طرف واپس لے جاتی ہے۔ آجکل کے کسی اہم مسئلے کو ان طریقوں سے حل کرنا ممکن نہیں ہے۔ بلکہ ان سے ایک ایسی ذہنیت پیدا ہو جاتی ہے جو ترقی کی صحیح راہ میں حائل ہو سکتی ہے۔ پھر بھی میں اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ ایک وقتی اور عارضی تدبیر کی حیثیت سے اس تحریک سے بہت فائدہ پہنچا ہے۔ آئندہ بھی اس وقت تک پہنچتا رہے گا جب تک خود حکومت زرعی اور صنعتی مسائل کا کوئی معقول حل نہ تلاش کرے گی جو وسیع پیمانے پر سارے ملک میں جاری کیا جا سکے۔ ہندوستان میں اس وقت لاکھوں کروڑوں بے روزگار ہیں جن کا کوئی ریکارڈ نہیں اور اس سے بھی زیادہ کثرت سے وہ لوگ ہیں جو دیہاتی علاقوں میں سال کے ایک حصہ میں بیکار رہتے ہیں۔ حکومت نے بے روزگاری کو دور کرنے

یا بے روزگاروں کی مدد کرنے کی کوئی کوشش اب تک شروع نہیں کی ہے اس لئے معاشی حیثیت سے کھادی کی تحریک نے ان لوگوں کی تھوڑی بہت مدد کی جو بالکل بے روزگار ہیں یا کچھ عرصے بیکار رہا کرتے ہیں۔ اور چونکہ یہ ترقی خود اپنی کوشش سے ہوئی ہے اس لئے ان لوگوں کی خودداری بڑھ گئی اور ان میں خود اعتمادی کا احساس پیدا ہو گیا ہے۔ مگر اصل میں جو نمایاں تبدیلی ان لوگوں میں پیدا ہوئی ہے وہ نفسیاتی تبدیلی ہے۔ کھادی نے کسی حد تک اس فصل کو دور کیا جو شہر اور دیہات میں پیدا ہو گیا تھا۔ اس نے اوسط طبقے کے تعلیمیافتہ لوگوں کو کسانوں سے قریب تر کر دیا۔ اس لباس کا پہننے والوں اور دیکھنے والوں پر بہت گہرا نفسیاتی اثر پڑتا ہے۔ اوسط طبقے میں کھادی کے رواج سے سادگی آ گئی ہے' نمود و نمائش اور بدمذاقی کم ہو گئی ہے اور عام لوگوں سے میل جول کا احساس پیدا ہو گیا ہے' اوسط طبقے کے لوگ اب نہ تو لباس کے معاملہ میں امیروں کی نقالی کی کوشش کرتے ہیں۔ اور نہ سستی پوشاک پہننے میں ذلت و شرم محسوس کرتے ہیں بلکہ سچ پوچھئے تو یہ لوگ کھادی کے لباس کو خاصا باوقار سمجھتے ہیں اور ان لوگوں کے مقابلے میں جواب بھی ریشم اور ساٹن پہن کر اتراتے ہیں' اپنی قومیت کا احساس رکھتے ہیں۔ غریب سے غریب لوگوں میں بھی یہ خودداری اور وقار کا احساس پیدا ہو گیا ہے۔ کھادی پہننے والوں کے بڑے مجمعوں میں یہ پہچاننا مشکل ہو گیا ہے۔ کہ کون غریب ہے۔ اور کون امیر اور اس سے برادری کے جذبے کو ترقی ہوئی۔ اس میں بھی شبہ نہیں ہے کہ عام لوگوں تک پہنچنے میں کانگریس کو کھادی سے بڑی مدد ملی۔ اس کو لوگ قومی آزادی کی وردی سمجھنے لگے۔

ملوں کے مالکوں کے اس رجحان کو بھی کہ اپنے مال کی قیمت بڑھانے

چلے جائیں کھادی ہی نے روکا ورنہ پہلے ان کی روک تمام تر بدیسی اور خصوصاً لنکا شائر کے مقابلے کی وجہ سے ہوا کرتی تھی اور جب کبھی یہ مقابلہ بند ہوا مثلاً جنگ عظیم کے زمانے میں، تو کپڑے کی قیمتیں ہندوستان بھر میں غیر معمولی طور پر بڑھ گئیں، اور ہندوستانی ملوں نے کروڑوں روپیہ کمایا۔ سودیشی کی تحریک اور بدیشی مال کے بائیکاٹ کی تحریک سے آگے چل کر ان ملوں کو بڑی مدد ملی، لیکن کھادی کی تحریک کا یہ اثر ہوا ہے کہ قیمتیں اب اتنی زیادہ نہیں بڑھ سکتیں۔ ان ملوں نے (اور جاپان نے بھی) کھادی کی ہر دلعزیزی سے ناجائز فائدہ اٹھایا اس قسم کا موٹا کپڑا تیار کیا کہ اس میں اور ہاتھ کے کتے اور ہاتھ کے بنے کپڑے میں تمیز کرنا مشکل ہو گیا۔ اگر اب کوئی غیر معمولی صورت پیدا ہو جائے مثلاً جنگ چھڑ جائے جس سے بدیسی کپڑے کی درآمد بند ہو جائے تو غالباً ہندوستان کے ملوں کے مالک خریداروں کو اتنا نہیں لوٹ سکیں گے جتنا کہ سنہ ۱۹۱۴ء سے کئی سال تک لوٹتے رہے۔ کھادی کی تحریک اس کو روکے گی اور کھادی کی تنظیم میں اتنی گنجائش ہے کہ تھوڑی سی مدت کے اندر بہت پھیل جائے۔

ان تمام فوائد کے باوجود جو اس وقت ہندوستان کو کھادی کی تحریک سے حاصل ہیں میرے خیال میں یہ محض عارضی چیز ہے۔ ممکن ہے کہ بعد میں بھی ایک ضمنی تحریک کی حیثیت سے باقی رہے تاکہ اس مدت میں جو ایک اعلیٰ معاشی نظام کے اختیار کرنے میں لگ جائے گی اس سے کام چلتا رہے لیکن آئندہ ہماری اصل کوشش یہ ہوگی کہ زراعتی نظام کی از سر نو تنظیم کی جائے اور صنعت کو ترقی دی جائے۔ اس سے کوئی فائدہ نہیں کہ آراضی کے نظام میں دفع الوقتی کے لئے چھوٹی موٹی تبدیلیاں کی جائیں اور طرح طرح کے کمیشن مقرر ہوں جن پر

لاکھوں روپیہ صرف ہوا۔ وہ کچھ اوپری چیزوں کی اصلاح کر دیں۔ ہمارا نظام آراضی دیکھتے ہی دیکھتے بیٹھ رہا ہے اور موجودہ صورت میں دولت کی پیدائش اور تقسیم اور بڑے پیمانہ پر معقول طریقہ سے کام کرنے میں حائل ہے جارے عہد کے حالات کے لحاظ سے بغیر اس بنیادی تبدیلی کے کام نہیں چل سکتا۔ چھوٹی چھوٹی زمینیں اسامیوں کو بانٹنے کا طریقہ ختم کر دیا جائے اور اس کی جگہ منظم طور پر امداد باہمی کے اصول کے مطابق اجتماعی کاشت شروع کی جائے تاکہ محنت سے زیادہ پیداوار ہو سکے۔ زراعت ہماری ساری آبادی کبھی نہیں کھپا سکتی۔ بڑے پیمانے پر کاشت کرنے سے رجیسا کہ گاندھی جی کا اندیشہ ہے، زراعت کا کام کرنے والوں کی تعداد کم ہو جائے گی۔ باقی لوگوں میں سے بعض شاید چھوٹی گھریلو صنعتوں میں کھپ جائیں مگر ان کی بہت بڑی تعداد کو بڑے پیمانے کی اشتراکی سماجی خدمت کے کاموں میں لگانا پڑے گا۔

یقیناً بعض علاقوں کو کھادی کی تحریک سے تھوڑی بہت مدد ملی ہے لیکن اسی کامیابی میں جو اس کو حاصل ہوتی ہے خطرے کا بھی عنصر موجود ہے یعنی یہ تحریک ایک زوال پذیر نظام آراضی کو سہارا دے رہی ہے اور اسی حد تک ایک بہتر نظام کے قیام میں تاخیر پیدا کر رہی ہے۔ اس کا اثر اتنا زیادہ نہیں کہ اس سے کوئی نمایاں فرق پیدا ہو لیکن یہ رجحان اس میں بہرحال موجود ہے۔ کسانوں یا کاشتکاروں یا زمینداروں کو زمین کی پیداوار کا حصہ جو ملتا ہے وہ اس کے لئے بھی کافی نہیں کہ جب پست ترین سطح پر وہ پہنچ گئے ہیں اسی پر قائم رہ سکیں اس لئے ان کو اپنی قلیل آمدنی میں اضافے کی صورتیں تلاش کرنی پڑتی ہیں۔ ورنہ لگان یا مالگذاری کی ادائیگی کے لئے ادر قرض لینا پڑتا ہے۔ اگر انفرادی طور پر بعض کاشتکاروں کی آمدنی میں اضافہ ہو جائے تو اس سے

زمیندار یا حکومت کو اپنا مطالبہ وصول کرنے میں مدد ملتی ہے جو شاید معمولی حالت میں نہ وصول ہو سکتا۔ اگر یہ اوپر کی آمدنی کچھ زیادہ ہو تو لگان اتنا ہی اور بڑھا دیا جاتا ہے۔ موجودہ نظام کے ماتحت کاشتکاروں کی زائد محنت اور کفایت شعاری کی کوشش سے اصل فائدہ زمین کے مالک ہی کو پہنچتا ہے، جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے۔ ہنری جارج نے اپنی کتاب "ترقی اور غربت" میں اس مسئلہ پر بھی بحث کی ہے۔ اور بہت سی مثالیں دی ہیں۔ جو زیادہ تر آئرستان کی ہیں۔

دیہی صنعتوں کو دوبارہ زندہ کرنے کی جو کوشش گاندھی جی کر رہے ہیں وہ اصل میں کھادی کے پروگرام ہی کی توسیع ہے اس سے فوری طور پر ضرور فائدہ ہوگا، جس میں سے کچھ کم و بیش مستقل ہوگا مگر زیادہ تر محض وقتی۔ اس سے دیہاتیوں کی موجودہ تکلیفوں میں کچھ کمی ہو جائے گی۔ اور ہماری تہذیب کے بعض خوشنما نمونے جو مٹ رہے تھے، محفوظ ہو جائیں گے لیکن جہاں تک کہ اس کا مقصد کلوں کی اور صنعتی نظام کی مخالفت ہے اس میں یہ تحریک کامیاب نہیں ہو سکتی۔ گاندھی جی نے حال میں "ہریجن" میں دیہی صنعتوں پر ایک مضمون لکھا ہے۔ اس میں فرماتے ہیں: "کلوں کو رواج دینا اس وقت مفید ہوتا ہے جب کام بہت ہو اور کرنے والے تھوڑے ہوں لیکن جب ضرورت سے زیادہ آدمی کام کرنے کے لئے موجود ہوں جیسا کہ ہندوستان میں ہے تو یہ چیز مضر ثابت ہوتی ہے ہمارے سامنے یہ مسئلہ نہیں ہے کہ لاکھوں، کروڑوں آدمیوں کے لئے جو دیہات میں رہتے ہیں فرصت کا وقت نکالا جائے۔ سوال یہ ہے۔ کہ ان کے خالی وقت کو جو سال میں چھ مہینے سے کم نہیں کس طرح کام میں لگایا جائے۔" یہ اعتراض کچھ فرق کے ساتھ ان تمام ملکوں پر وارد ہوتا ہے جو

بے روزگاری میں مبتلا ہیں۔ لیکن اصل میں دقّت کام کی کمی کی نہیں ہے۔ بلکہ یہ ہے کہ منافع حاصل کرنے کے موجودہ نظام کے ماتحت آجروں کو کام میں خاطر خواہ نفع نہیں ہوتا۔ کثرت سے ایسے کام موجود ہیں، جو پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ آؤ اور ہمیں کرو۔ مثلاً سڑکوں اور مکانوں کی تعمیر، آب پاشی کی اسکیم حفظانِ صحت، طبّی وسائل، صنعت وحرفت اور برقی قوت کی ترقی، سماجی اور تمدّنی خدمات، تعلیم اور ان بیسیوں ضروری اشیاء کی فراہمی، جس کی لوگوں کو ضرورت ہے۔ ہمارے یہ کروڑوں آدمی آئندہ پچاس سال تک سخت محنت کرتے رہیں۔ تب بھی کام ختم نہ ہوگا۔ لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب کام کی محرک نفع کی خواہش نہیں، بلکہ سماجی ترقی کی خواہش ہو، اور سماج کی تنظیم مفادِ عامّہ کو پیشِ نظر رکھ کر کی جائے۔ روس کی سوویٹ یونین میں اور چاہے جو نقائص ہوں، لیکن وہاں بے روزگاری بالکل نہیں ہے۔ ہمارے یہاں لوگ کام نہ ہونے کی وجہ سے بیکار نہیں ہیں، بلکہ اس وجہ سے، کہ ان کے لئے کام کرنے کی اور تمدّنی اصلاح وترقی کی کوئی سہولتیں فراہم نہیں کی جاتیں۔ اگر بچوں سے کام لینا بند کردیا جائے۔ ایک معقول عمر تک لازمی تعلیم کا بندوبست ہو جائے، تو لڑکے، مزدوروں، اور بے روزگاروں کے زمرے سے خارج ہو جائیں گے۔ اور مزدوروں کی منڈی کئی کروڑ آدمیوں کے بوجھ سے ہلکی ہو جائے گی۔

گاندھی جی نے اس بات کی کوشش کسی قدر کامیابی کے ساتھ کی ہے کہ چرخے اور تکلی میں اصلاح وترمیم کی جائے۔ اور ان کی قوت پیداوار بڑھائی جائے۔ یہ بھی تو اوزار اور کل کو ترقی دینے کی کوشش ہے اور اگر یہ ترقی اسی طرح جاری رہی، تو بہت ممکن ہے گھریلو صنعتوں میں بھی

بجلی کی قوت سے کام لیا جانے لگے) تو منافع کی خواہش پھر نمودار ہو جائے۔ اور اس کی وجہ سے وہی چیز پیدا ہو گی، جس کو "ضرورت سے زیادہ پیداوار" اور بے روزگاری کہتے ہیں۔ اگر دیہی صنعتوں میں جدید صنعتی طریقوں سے کام نہ لیا گیا، تو وہ ان ضروری، مادی اور تمدنی اشیاء کو بھی تیار نہیں کر سکتیں، جو ہمیں اس وقت درکار ہیں۔ اور پھر وہ کلوں کے ساتھ مقابلہ کیونکر کریں گی؟

کیا ہندوستان میں بڑی بڑی کلوں کے رواج کو روکنا مفید ہے۔ اور فرض کیجیے کہ مفید ہو، تو کیا یہ ممکن بھی ہے؟ گاندھی جی نے بار بار یہ کہا ہے کہ وہ سرے سے کلوں کے مخالف نہیں ہیں۔ بلکہ ان کا یہ خیال معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ہندوستان کے لیے ان کا استعمال موزوں نہیں، پھر میں یہ سوچتا ہوں، کہ کیا بنیادی صنعتیں مثلاً لوہے اور فولاد کی صنعت یا اس سے کم درجے کی صنعتیں جو پہلے سے موجود ہیں، مثالی [illegible]

یہ بات صریحی طور پر ناممکن ہے۔ جب ہمارے یہاں ریلیں، پل، نقل و حمل کے وسائل وغیرہ موجود ہیں، تو یا تو ہم یہ چیزیں خود پیدا کریں، یا دوسروں کے محتاج رہیں؟ اس کے علاوہ اگر ہم چاہتے ہیں، کہ ملک کی حفاظت اور مدافعت کے وسائل ہمارے پاس ہوں، تو ہمیں نہ صرف بنیادی صنعتوں کی، بلکہ ایک نہایت ترقی یافتہ صنعتی نظام کی ضرورت ہے۔ آج کوئی ملک جو صنعتی حیثیت سے ترقی یافتہ نہیں ہے۔ نہ حقیقی معنوں میں آزاد ہے، اور نہ بیرونی حملے کی مدافعت کر سکتا ہے۔ اب مشکل یہ ہے کہ ایک بنیادی صنعت کی مدد اور تکمیل کے لئے دوسری بنیادی صنعتیں درکار ہیں۔ اور پھر کلیں بنانے کی صنعت ضروری ہو جاتی ہے۔ جب یہ بنیادی صنعتیں قائم ہو جائیں۔ تو پھر لازمی طور پر دوسری صنعتیں بھی پھیل جاتی ہیں، جن کا سیلاب کسی طرح روکا نہیں جا سکتا۔ اس لئے کہ نہ صرف ہم [illegible] مادی

اور تمدنی ترقی بلکہ ہماری آزادی کا بھی اسی پر انحصار ہے۔ جوں جوں بڑے پیمانے کی صنعت پھیلتی جائے گی۔ چھوٹی چھوٹی دیہاتی صنعتوں کو اس کا مقابلہ کرنا دشوار ہوتا جائے گا۔ اشتراکی نظام میں توان کے لئے پھر بھی کچھ موقع ہے۔ مگر نظام سرمایہ داری میں ان کی مطلق گنجائش نہیں۔ اشتراکی ریاست میں بھی وہ گھریلو صنعتوں کی حیثیت سے باقی رہ سکتی ہیں۔ جن میں وہ چیزیں تیار ہوتی ہیں۔ جو بڑے پیمانے پر تیار نہ کی جا سکیں۔

کانگریس کے بعض لیڈر صنعت کی ترقی سے خوف زدہ ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ صنعتی ممالک کی تمام موجودہ مشکلات اور پریشانیاں بڑے پیمانے پر مال تیار کرنے کی وجہ سے ہیں۔ لیکن یہ صورت حال کے متعلق ایک عجیب غلط فہمی ہے[۵]۔ اگر عام لوگوں کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو اس میں کیا برائی ہے۔ کہ وہ کافی مقدار میں تیار کی جائے؟ کیا لوگ اس کو ترجیح دیں گے، کہ خواہ ان کی ضرورت پوری نہ ہو، لیکن بڑے پیمانے پر چیزیں نہ تیار کی جائیں؟ واقعہ یہ ہے کہ دولت آفرینی کے طریقے میں کوئی خرابی نہیں۔ بلکہ تقسیم دولت کا موجودہ نظام بہت ناقص اور مہمل ہے۔

ایک اور مشکل جس کا دیہی صنعت کے حامیوں کو سامنا کرنا ہے۔ یہ ہے کہ ہماری زراعت دنیا کی منڈی کی پابند ہے۔ کسان اس پر مجبور ہے کہ اپنی

[۵] ۳ جنوری ۳۰ء کو سردار ولبھ بھائی پٹیل نے احمد آباد میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا، کہ "حقیقی اشتراکیت دیہاتی صنعتوں کی ترقی پر موقوف ہے۔ ہم اپنے ملک میں وہ ابتری پیدا نہیں کرنا چاہتے۔ جو مغربی ملکوں میں بڑے پیمانے کی پیداوار کی وجہ سے پیدا ہو گئی ہے۔"

چیزوں کی کاشت کرے۔ جن کی بازار میں مانگ ہے۔ اور وہی قیمتیں رکھے جو
اور ملکوں میں ہیں۔ قیمتیں گھٹتی بڑھتی رہتی ہیں۔ اور اس کو اپنا مقررہ لگان یا
مالگذاری نقد کی صورت میں ادا کرنی پڑتی ہے۔ اس لئے کسی نہ کسی طرح اس کو
یہ روپیہ فراہم کرنا پڑتا ہے۔ یا کم سے کم وہ اس کی کوشش ضرور کرتا ہے
اس لئے وہ ایسی چیز بوتا ہے۔ جو اس کے نزدیک زیادہ سے زیادہ قیمت
میں فروخت ہوگی۔ وہ ان چیزوں کی کاشت نہیں کرسکتا۔ جن کی اس کو
خود ضرورت ہے۔ تاکہ وہ اور اس کے بال بچے کم سے کم کھانے کے معاملہ
میں دوسرے کے محتاج نہ رہیں۔

حال ہی اجناس خوردنی اور دوسری چیزوں کی زرعی قیمتیں
یکبارگی گر جانے کی وجہ سے لاکھوں کسانوں کو خصوصًا صوبہ متحدہ اور بہار
میں مجبورًا "گنے" کی کاشت کرنی پڑی۔ باہر کی شکر پر محصول لگ جانے کی وجہ
سے شکر کے کارخانے برساتی مینڈکوں کی طرح پیدا ہوگئے۔ اور گنے کی مانگ
بہت بڑھ گئی۔ لیکن بہت جلد رسد طلب سے کہیں زیادہ ہوگئی۔ کارخانوں
کے مالکوں نے بڑی بے رحمی سے کسانوں کو لوٹنا شروع کردیا۔ اور "گنے"
کی قیمت گر گئی۔

ان تمام امور اور ان کے علاوہ اور بہت سی باتوں کی وجہ سے نہ یہ
مناسب ہے اور نہ ممکن ہے کہ ہمارے زرعی اور صنعتی مسائل محدود ملکی
مصلحتوں کے مطابق حل کئے جاسکیں۔ اور یہی صورت ہماری قومی زندگی کے ہر
پہلو کی ہے۔ ہم مبہم اور جذبات انگیز فقروں میں پناہ نہیں لے سکتے۔ بلکہ ہمیں زندگی
کے واقعات کا سامنا کرنا ہے۔ اور ان سے مطابقت پیدا کرنا ہے۔ تاکہ ہم تاریخ
کی بساط کے شاطر بنیں۔ اس کے مہرے بن کر نہ رہ جائیں۔

پھر مجھے اس مجموعہ اضداد یعنی گاندھی جی کا خیال آجاتا ہے،[1] باوجود اپنی نیز نہمی اور مظلوموں کے جوش حمایت کے وہ کیوں اس زوال پذیر نظام کی حمایت کرتے ہیں، جو موجودہ مصیبت اور اسراف کا ذمہ دار ہے۔ یہ صحیح ہے کہ وہ اس مصیبت سے نجات پانے کی راہ ڈھونڈ رہے ہیں۔ لیکن کیا ماضی کی راہ قطعاً مسدود نہیں ہو چکی ہے؟ ایک طرف تو وہ راہ کی تلاش میں مصروف ہیں۔ اور دوسری طرف پرانے نظام کے بچے کھچے آثار جو ترقی کی راہ میں حائل ہیں۔ مثلاً دیسی ریاستیں بڑی بڑی زمینداریاں، اور تعلقہ داریاں اور موجودہ سرمایہ داری کا نظام، ان سب پر اپنا دست شفقت رکھے ہوئے ہیں۔ کیا "امانت داری" کے اس نظریے کو عقل تسلیم کر سکتی ہے، کہ ایک فرد کو غیر محدود دولت اور اختیارات دے دیئے جائیں۔ اور پھر اسی سے یہ توقع کی جائے کہ وہ اس کو مفاد عامہ

---

(۱) سنہ ۱۹۳۱ء میں لندن کی گول میز کانفرنس کے جلسے میں گاندھی جی نے فرمایا تھا "سب سے بڑی بات یہ ہے کہ کانگریس اپنے اصل مقصد کے لحاظ سے ہندوستان کے کروڑوں بے زبان نیم فاقہ کش غریبوں کی نمائندہ ہے۔ جو ملک کے طول و عرض میں سات لاکھ گانوؤں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ چاہے وہ برطانوی ہند کے ہوں، یا "ہندی ہند" کے جن جن گروہوں کی اغراض کانگریس کے نزدیک قابل حمایت ہیں۔ ان میں سب پر مقدم ان بے زبانوں کی فلاح ہے۔ اکثر یہ اغراض ایک دوسرے سے ٹکراتی نظر آتی ہیں۔ اگر سچ مچ ایسا ہو کہ مختلف گروہوں کی اغراض ٹکرا جائیں۔ تو میں بے دھڑک کہتا ہوں، کہ کانگریس ہر گروہ کی اغراض کو ان کروڑوں بے زبانوں کی فلاح پر قربان کر دے گی"۔

کے لئے استعمال کرے گا؟ کیا ہم میں سے بہتر سے بہتر لوگ بھی اخلاقی تکمیل کے اس درجے پر پہنچ گئے ہیں کہ ان پر اس طریقہ سے اعتماد کیا جا سکے؟ افلاطون کے فلسفی بادشاہ بھی مشکل ہی سے اس بوجھ کے اٹھانے کے اہل ثابت ہوئے، اس کے علاوہ کیا دوسروں کے لئے یہ اچھا ہوگا کہ یہ شفیق مافوق الانسان ان پر مسلّط کر دیئے جائیں۔ لیکن دنیا میں نہ تو کوئی مافوق الانسان ہے، نہ کوئی فلسفی بادشاہ
١ یہاں تو ناقص انسان بستے ہیں۔ جو یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے ذاتی مفاد میں اور ان کے خیالات کے پھیلنے میں ساری قوم کا بھلا ہے، اس خیال کی بدولت خاندانی شرافت اور دولت کا اقتدار ہمیشہ کے لئے قائم ہو جاتا ہے۔ جس کے نتائج ہر طرح مہلک ثابت ہو سکتے ہیں۔

میں پھر یہ کہوں گا کہ اس وقت میں اس مسئلے پر غور نہیں کر رہا ہوں، کہ سماجی نظام کی تبدیلی کس طرح عمل میں آئے۔ اور اس کی راہ میں جو رکاوٹیں ہیں، وہ کیونکر دور کی جائیں۔ جبر سے یا خیالات پر اثر ڈالنے کے ذریعے سے، تشدّد سے، یا عدم تشدد سے، اس پہلو سے میں بعد میں بحث کروں گا۔ بہرحال تبدیلی کی ضرورت کو تسلیم کر لینا چاہیئے۔ اور اس کو صاف الفاظ میں بیان کر دینا چاہیئے جب تک سیاسی اور ذہنی رہنما اس بات کو وضاحت کے ساتھ نہیں سمجھتے۔ اور صاف صاف بیان نہیں کرتے۔ اس وقت تک وہ یہ توقع کیسے کر سکتے ہیں کہ کسی شخص کو اپنا ہم خیال بنا سکیں گے۔ یا لوگوں میں وہ ذہنیت پیدا کر سکیں گے جس کی ضرورت ہے، اس میں شک نہیں، کہ واقعات خود سب سے بہتر معلم ہوتے ہیں، لیکن اگر ان واقعات کی صحیح اہمیت کو ظاہر کرنا ہے۔ اور ان سے مناسب کام لینا ہے۔ تو اس کی ضرورت ہے، کہ ہم خود انہیں اچھی طرح سمجھیں، اور دوسروں کو سمجھائیں۔

کبھی کبھی میرے احباب اور رفقاء میری باتوں سے چڑ کر پوچھتے ہیں، کہ کیا آپ نے کبھی کوئی کریم النفس رئیس، مخیر زمیندار، نیک نیت اور بامروت سرمایہ دار اب تک نہیں دیکھا۔ بیشک میں نے ایسے لوگ دیکھے ہیں۔ بلکہ میں خود اس طبقے سے ہوں، جو زمینداروں اور دولت مندوں سے میل جول رکھتا ہے۔ میں خود ایک نمونہ کا "بورژوا"(۱) ہوں۔ اسی ماحول میں میری تربیت ہوئی اور اسی کے خیالات نے ابتدا میں مجھے متاثر کیا۔ بعض اشتمالیوں نے مجھے "پیٹی بورژوا"(۲) کہا تھا۔ اور بالکل ٹھیک کہا تھا۔ غالباً اب وہ مجھے "اپنے گناہوں سے توبہ کرنے والا بورژوا" کہیں گے۔ لیکن یہاں اس سے کچھ بحث نہیں، کہ میں کیا ہوں، یہ بالکل مہمل بات ہے۔ کہ قومی، بین الاقوامی، معاشی اور سماجی مسائل پر غور کرتے وقت افراد کی ذاتی حیثیت کو اہمیت دی جائے، وہی احباب، جو مجھ پر اعتراض کرتے ہیں، برابر یہ دعویٰ کرتے رہتے ہیں کہ ہمارا جھگڑا گناہ سے ہے، نہ کہ گنہگار سے۔ میں اتنا بڑا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ میرا جھگڑا ایک نظام سے ہے۔ نہ کہ افراد سے۔ مگر ہر نظام بڑی حد تک افراد اور جماعتوں سے وابستہ ہوتا ہے۔ اور جو شخص نظام کو بدلنا چاہتا ہے، اسے ان افراد اور جماعتوں سے لڑنا ہے۔ یا انہیں اپنا ہم خیال بنانا ہے۔ اگر کوئی نظام اب ہمارے لئے مفید نہیں رہا۔ اور ترقی کی راہ میں حائل ہے۔ تو وہ مٹ کر رہے گا۔ اور جو طبقے اور جماعتیں اس سے وابستہ ہیں۔ ان کو بھی اپنی کایا پلٹ کرنی پڑے گی اس عمل تغیر میں جہاں تک ہو سکے تکلیف کے عنصر کو کم کرنا چاہیئے۔ لیکن بدقسمتی سے صورت ہی ایسی ہے کہ لوگوں کو تکلیف پہنچنا اور معاملات کا درہم برہم ہونا ناگزیر ہے۔

---

(۱) اوسط طبقہ کا شہری (۲) نیچے اوسط طبقہ کا شہری

بہرحال یہ تو ہم کہہ نہیں سکتے کہ اتنی بڑی برائی کو اس ڈر سے برداشت کرتے رہیں کہ کہیں چھوٹی چھوٹی برائیاں نہ اٹھ کھڑی ہوں۔ یہ برائیاں تو پیدا ہوتی ہی ہیں، اور ان کا روکنا ہمارے اختیار سے باہر ہے۔

ہر قسم کی انسانی جماعتیں خواہ وہ سیاسی ہوں، یا معاشی یا معاشرتی۔ کسی نہ کسی فلسفے پر مبنی ہوتی ہیں۔ اور جب ان جماعتوں میں کوئی تبدیلی پیدا ہو تو یہ ضروری ہے کہ اس بنیادی فلسفے میں بھی تبدیلی کی جائے۔ تاکہ وہ نئے خیالات کے ساتھ کھپ سکے۔ اور اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جائے۔ مگر عموماً فلسفہ واقعات کی رفتار سے پیچھے رہ جاتا ہے۔ اور اسی سے ساری خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ انیسویں صدی میں جمہوریت اور سرمایہ داری کی نشوونما ساتھ ساتھ ہوئی۔ لیکن وہ ایکدوسرے کے ساتھ کوئی مناسبت نہیں رکھتی تھیں، ان میں ایک بنیادی تضاد تھا۔ کیونکہ جمہوریت اس بات پر زور دیتی تھی، کہ زیادہ لوگوں کو سیاسی قوت حاصل ہو، اور سرمایہ داری اصل قوت کو صرف چند افراد تک محدود رکھنا چاہتی تھی۔ لیکن ان دونوں کا بے تکا ساتھ اس لئے نبھ گیا، کہ سیاسی پارلیمنٹی جمہوریت خود ایک بہت محدود قسم کی جمہوریت ہے۔ اور اس نے قوت کے چند افراد کے ہاتھ میں جمع ہونے اور اجارہ داری کی نشوونما میں بہت کم مداخلت کی۔ مگر جوں جوں جمہوریت کے خیال کو ترقی ہوتی گئی۔ ان دونوں کا نباہ مشکل ہوتا گیا۔ اور اب وہ وقت آ گیا ہے کہ یہ ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں۔ پارلیمنٹی جمہوریت اب بہت بدنام ہو گئی۔ یہ اسی کا ردعمل ہے، کہ دنیا میں طرح طرح کی نئی آوازیں اٹھ رہی ہیں۔ اسی کی وجہ سے ہندوستان میں بھی برطانوی حکومت اور زیادہ رجعت پسند بن گئی ہے۔ اور اسے ایک بہانہ ہاتھ آ گیا ہے، کہ سیاسی آزادی کی ظاہری شکلوں سے بھی ہمیں محروم رکھے۔ لطف تو یہ ہے کہ ریاستیں بھی پارلیمنٹی جمہوریت کی ناکامی کو اپنی غیر محدود مطلق العنانی کے

جائز ہونے کی دلیل قرار دیتی ہیں۔ اور بڑی ڈھٹائی سے یہ ارادہ ظاہر کرتی ہیں، کہ اپنے یہاں وہی قرون وسطیٰ کا طرز قائم رکھیں گی جس کا دنیا میں کہیں اور وجود نہیں ہے

لہ ۲۲ جنوری ۱۹۳۵ء کو مہاراجہ پٹیالہ چانسلر مجلس رؤسائے چیمبر کے اجلاس دہلی میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان کے بعض سیاسی دفاقی نظام کی تائید اس امید پر کرتے ہیں کہ حالات خود بخود دیسی ریاستوں کو اس پر مجبور کردیں گے کہ وہ بھی اپنے یہاں جمہوری طرز حکومت قائم کریں۔ اس کے متعلق انہوں نے یہ فرمایا "اگرچہ دیسی ریاستیں ہمیشہ اس بات کی خواہاں رہی ہیں، کہ اپنی رعایا کے لئے وہ سب کچھ کریں۔ جو ان کے لئے بہتر ہے۔ اور آئندہ بھی وہ اس کے لئے تیار رہیں۔ کہ زمانے کے ساتھ ساتھ چلیں۔ اور اپنی ریاستوں کے دستور اساسی میں مقتضائے وقت کے لحاظ سے ترمیم کریں۔ ہم صاف صاف یہ کہہ دینا چاہتے ہیں۔ کہ اگر برطانوی ہند اس دھوکے میں ہے کہ وہ ہمارے تندرست سیاسی جسم کو ایک بدنام سیاسی نظریئے کی اترن پہننے پر مجبور کردیگا تو وہ ایک خیالی دنیا میں رہتا ہے۔ جسے حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں"

(صفحہ ۴۹۰ پر دیوان میسور کی تقریر کا حوالہ بھی ملاحظہ ہو) اسی روز مجلس رؤسا میں تقریر کرتے ہوئے مہاراجہ بیکانیر نے فرمایا "ہم دیسی ریاست کے فرماں روا قسمت آزمائی کرنے والے سپاہی نہیں ہیں۔ میں یہ عرض کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ کئی صدی کی خاندانی روایات کی بنا پر ہم یہ دعوےٰ کر سکتے ہیں کہ حکومت ہماری گھٹی میں پڑی ہے۔ اور حکمت عملی اور تدبر میں ہمیں تھوڑا بہت حصہ ملا ہے۔ ہمیں بڑی احتیاط سے کام لینا چاہئے۔ کہ کہیں دوسروں کے دباؤ میں آکر ہم عجلت میں بے سوچے سمجھے کوئی فیصلہ نہ کر بیٹھیں۔ اگر اجازت ہو، تو میں نہایت انکسار کے ساتھ عرض کر دوں گا، کہ ہندوستانی رئیس ہرگز اس کے لئے تیار نہیں (باقی صفحہ ۴۳۴ پر)

لیکن پارلیمنٹی جمہوریت کی ناکامی کی وجہ یہ نہیں ہے - کہ وہ بہت آگے بڑھ گئی ہے - بلکہ یہ ہے، کہ وہ زمانے کی رفتار سے پیچھے رہ گئی ہے - یہ جمہوریت ناقص تھی - اس لئے کہ اس نے معاشی جمہوریت کو نظر انداز کر دیا - اس کا طریق کار بہت سست اور تیزی سے بدلتے ہوئے حالات کے لئے بالکل ناموزوں تھا"

دیسی ریاستیں غالباً آج دنیا میں انتہائی مطلق العنانی کا نمونہ ہیں - اس میں شک نہیں کہ وہ برطانیہ کی محکوم ہیں - لیکن برطانوی حکومت ان کے معاملات میں صرف اسی حد تک دخل دیتی ہے - جہاں تک برطانوی مفاد کا تقاضا ہے - یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ یہ قدیم جاگیرداری نظام کے نمونے جو چھوٹے چھوٹے جزیروں کی طرح غیر ملکی حکومت کے سمندر میں گھرے ہوئے ہیں - کیونکر بغیر کسی تغیر اور تبدیلی کے بیسویں صدی تک باقی رہے - وہاں اب تک ہوا بند اور بھاری ہے - پانی دھیرے دھیرے بہتا ہے - اور ایک نو وارد جو تبدیلی اور حرکت کا عادی ہے - بلکہ شاید اس سے کسی قدر گھبرا بھی گیا ہے - وہاں پہنچ کر اونگھنے لگتا ہے - اور اس پر ایک جادو کی سی کیفیت چھا جاتی ہے - ایک بے جان تصویر سی نظر آتی ہے - جو وقت کی حرکت سے محفوظ ہمیشہ ایک حالت پر قائم رہتی ہے - تقریباً بالکل غیر محسوس طریقے پر

(بقیہ نوٹ ۳۴۳) کہ کسی سے دب کر حکومت سے دست بردار ہو جائیں - اور اگر بدقسمتی سے کبھی ایسا وقت آ گیا کہ تاج برطانیہ اپنے عہدناموں کے شرائط کے مطابق دیسی ریاستوں کی حفاظت نہ کر سکا - تو رئیس اور ریاستیں مرتے دم تک میدان سے ہٹنے والی نہیں "

دیکھنے والا ماضی کے تصور میں ڈوب جاتا ہے، اور بچپن کے خواب اس کی نظروں میں پھرنے لگتے ہیں۔ طرح دار جوان زرہ بکتر سے آراستہ، حسین لڑکیاں، منارہ دار قلعے سورماؤں کا زمانہ، سپاہیانہ آن بان، بے نظیر شجاعت، اور جاں بازی، خصوصاً اگر وہ راجپوتانہ کے علاقے میں ہے۔ جو رومان اور من چلے پن کے کارناموں کا گھر ہے۔

لیکن بہت جلد یہ تصور دھندلا پڑ جاتا ہے، اور ہوا کی کثافت سے دم گھٹنے لگتا ہے، سانس لینا مشکل ہو جاتا ہے۔ دھیرے دھیرے بہنے والے تالاب کی تہہ میں بند پانی کی سڑاند محسوس ہوتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انسان ہر طرف سے گھرا ہوا ہے۔ اور اس کا جسم اور دماغ زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ ایک طرف پرجا کی انتہائی پستی اور مصیبت اور دوسری طرف راجا کے محل کے ٹھاٹ کو دیکھ کر دل پر عجیب اثر پڑتا ہے۔ ریاست کی دولت کا کتنا بڑا حصہ محل میں رئیس کے تعیشات اور ذاتی ضروریات کی نذر ہوتا ہے۔ اور کتنا تھوڑا حصہ عام لوگوں کی بھلائی کے کاموں میں صرف ہوتا ہے۔ یہ رئیس ریاست کو بڑے مہنگے پڑتے ہیں، ان پر اتنا خرچ کر کے اس کے بدلے میں کیا ملتا ہے؟

ان ریاستوں پر راز کا پردہ پڑا ہوا ہے، اخبار وہاں چلنے نہیں دئے جاتے۔ زیادہ سے زیادہ ایک ادبی یا نیم سرکاری ہفتہ وار اخبار چل سکتا ہے بیرونی اخبارات کا داخلہ اکثر بند کر دیا جاتا ہے۔ سوائے چند جنوبی ریاستوں کے مثلاً ٹراونکور اور کوچین وغیرہ، (جہاں پڑھے لکھوں کی تعداد برطانوی علاقے کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے) اور ریاستوں میں عام تعلیم بہت کم ہے، سب سے اہم خبریں جو ریاستوں سے آتی ہیں، وہ یہ ہوتی ہیں:-

وائسرائے کی تشریف آوری کا تزک و احتشام، دربار، ایک دوسرے

کی اندرونی ہوں تقریریں، رئیس کی شادی یا سالگرہ کا پر تکلف جشن، یا پھر کسانوں کی شورش۔ خود برطانوی ہند میں رئیسوں کو لوگوں کی نکتہ چینی سے محفوظ رکھنے کے لئے خاص قوانین بنا دئیے گئے ہیں۔ اور ریاست کے اندر تو معمولی سے معمولی تنقید بھی نہایت سختی کے ساتھ دبا دی جاتی ہے، عام جلسے قریب قریب مفقود ہیں۔ یہاں تک کہ وہ جلسے بھی جو کسی معاشرتی مقصد سے کئے جائیں، اکثر روک دئے جاتے ہیں[1]۔ اکثر باہر کے سربرآوردہ قومی کارکنوں کا داخلہ ریاستوں میں روک دیا جاتا ہے۔ سنہ ۱۹۳۰ء کے وسط میں مسٹر سی آر داس، بہت بیمار تھے، اور انہوں نے صحت حاصل کرنے کی غرض سے کشمیر جانے کا فیصلہ کیا۔ اس میں کوئی سیاسی غرض نہیں تھی۔ مگر کشمیر کی سرحد پر پہنچنے کے بعد وہ آگے بڑھنے سے روک دئے گئے۔ مسٹر جناح کو بھی حیدرآباد میں داخل ہونے کی ممانعت کر دی گئی۔ اور مسز نائیڈو جن کا گھر خاص حیدرآباد شہر میں

---

(۱) حیدرآباد کی ایک اخباری اطلاع مورخہ ۳ر اکتوبر سنہ ۳۲ء مظہر ہے "گاندھی جی کی سالگرہ منانے کے لئے جو عام جلسہ دو یک دروتی تھیٹر میں ہونے والا تھا وہ نہیں ہو سکا جلسے کا انتظام حیدرآباد ہریجن سیوک سنگھ کی طرف سے کیا گیا تھا۔ اس انجمن کے سکریٹری نے اخبارات کے نام ایک خط میں بیان کیا ہے کہ جلسے کے وقت سے ۲۴ گھنٹے پہلے حکام نے یہ اطلاع دی کہ جلسہ کرنے کی اجازت صرف اس شرط پر دی جائیگی کہ دو ہزار روپے کی نقد ضمانت داخل کی جائے۔ اور یہ وعدہ کیا جائے کہ سیاسی نوعیت کی تقریر نہ کی جائے گی۔ اور حکام ریاست کے کسی سرکاری فعل پر کسی قسم کی نکتہ چینی نہیں کی جائے گی۔ چونکہ اتنا وقت نہ تھا، کہ دائمی حکام سے مل کر معاملات طے کر سکتے۔ اس لئے جلسہ کا خیال مجبوراً ترک کر دیا گیا۔"

ہے۔ ایک مدت تک وہاں نہیں جانے پائیں۔

جب ریاستوں کی یہ حالت تھی، تو ظاہر ہے، کہ کانگریس کو ریاست کے باشندوں کے بنیادی حقوق کی حمایت اور ان کی پامالی پر نکتہ چینی کرنی چاہیئے تھی، لیکن گاندھی جی نے ریاستوں کے متعلق ایک انوکھی پالیسی ایجاد کی۔ یعنی "ریاستوں کے اندرونی معاملات میں عدم مداخلت" اس "چپ چپ" کی پالیسی پر وہ ان تمام غیر معمولی اور افسوسناک واقعات کے باوجود قائم رہے۔ جو ریاستوں میں پیش آئے۔ حالانکہ ریاستوں کی حکومتیں بے وجہ کانگریس پر حملے کرتی رہیں بظاہر شاید یہ خطرہ ہے کہ کانگریس کی نکتہ چینی رئیسوں کو ناراض کر دے گی اور پھر ان کو ہم خیال بنانا اور زیادہ دشوار ہو جائے گا۔ گاندھی جی نے اپنے جولائی ۱۹۳۴ء کے خط میں جو انہوں نے ریاستوں کی رعایا کی کانفرنس کے صدر مسٹر این۔ سی کیلکر کے نام لکھا تھا۔ اپنے اس خیال کو دہرایا کہ عدم مداخلت کی پالیسی بالکل صحیح اور دانشمندانہ ہے۔ ان ریاستوں کی آئینی اور قانونی حیثیت کے متعلق جو خیال انہوں نے ظاہر کیا، وہ عجیب و غریب تھا۔ انہوں نے لکھا تھا، کہ "یہ دیسی ریاستیں برطانوی قانون کے مطابق بالکل آزاد حیثیت رکھتی ہیں۔ اور ہندوستان کے اس حصے کو جو برطانوی ہند کہلاتا ہے۔ ان ریاستوں کی پالیسی کی تشکیل کا اس سے زیادہ اختیار نہیں، جتنا کہ مثلاً افغانستان اور سیلون کی پالیسی میں دخل دینے کا۔" چنانچہ کوئی تعجب کی بات نہیں، کہ دیسی ریاستوں کی رعایا کی نرم اور اعتدال پسند کانفرنس اور لبرل پارٹی نے بھی ان کی رائے اور مشورے پر اعتراض کیا لیکن یہ خیالات رئیسوں کو بہت پسند آئے۔ انہوں نے ان سے پورا فائدہ اٹھایا۔ ایک ہی مہینے کے اندر حکومت ٹراونکور نے اپنے حدود میں نیشنل کانگریس کو ممنوع قرار دے دیا۔ اس کے تمام جلسوں کو اور ممبر بنانے کی

تحریک کو روک دیا۔ اس کارروائی کے ساتھ اس نے یہ اعلان کیا کہ ذمہ دار لیڈروں نے خود ہی یہ مشورہ دیا ہے۔ (صریحاً یہ اشارہ گاندھی جی کے بیان کی طرف تھا) یہ بھی ملحوظ رہے کہ یہ ممانعت اس وقت کی گئی جب برطانوی ہند میں سول نافرمانی موقوف ہو چکی تھی (ریاستوں سے اسے کوئی تعلق نہ تھا) اور حکومت ہند نے کانگریس کو دوبارہ مطابق قانون قرار دے دیا تھا۔ یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ حکومت تراونکور کے مشیر قانونی اس وقت سر سی۔ پی راما سوامی آئر تھے۔ جو اب تک ہیں۔ جو ایک زمانے میں کانگریس اور ہوم رول لیگ دونوں کے جنرل سکریٹری تھے۔ آگے چل کر لبرل بن گئے۔ اور حکومت ہند اور حکومت مدراس میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوئے۔

کانگریس کی پالیسی اور گاندھی جی کے مشورہ کے مطابق حکومت تراونکور کے اس بے وجہ حملے کے جواب میں جو امن کے زمانے میں کانگریس پر کیا گیا۔ اس کی طرف سے ایک لفظ بھی نہیں کہا گیا[1]۔ حالانکہ بعض لبرل حضرات نے بڑے زور و شور سے اس کے خلاف احتجاج کیا۔ حقیقت میں ریاستوں کے معاملے میں گاندھی جی نے لبرل پارٹی سے کہیں زیادہ اعتدال اور احتیاط کی روش اختیار کر رکھی ہے۔ سر برآوردہ قومی لیڈروں میں شاید صرف پنڈت مدن موہن مالوی ایک ایسے شخص ہیں جو بہت سے رئیسوں سے گہرے تعلقات رکھنے کی وجہ سے اس قدر احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ اور اس کا لحاظ رکھتے ہیں کہ والیان ریاست کے جذبات کو ٹھیس نہ لگنے پائے۔

---

[1] سردار ولبھ بھائی پٹیل نے ۹ جنوری ۱۹۳۵ء کو بڑودہ میں تقریر کرتے ہوئے اسی عدم مداخلت کی پالیسی پر زور دیا۔ انہوں نے کہا کہ ریاستوں کے کارکنوں کو چاہیے کہ ریاست کی عائد کی ہوئی پابندیوں کے دائرہ میں رہ کر اپنا کام کریں۔ اور ریاست کے کام پر نکتہ چینی کرنے کے بجائے یہ کوشش کریں کہ رعایا اور راجی کے درمیان عمدہ تعلقات قائم رہیں۔

گاندھی جی پہلے رئیسوں کے معاملے میں اتنے زیادہ محتاط نہ تھے بسنہ ۱۶ء میں ایک مشہور موقع پر جب بنارس میں ہندو یونیورسٹی کی افتتاحی رسمیں ادا ہورہی تھیں۔ انہوں نے ایک جلسے میں تقریر کی تھی۔ جس کے صدر ایک مہاراجہ تھے۔ اور جس میں بہت سے اور رئیس شریک تھے۔ وہ نئے نئے افریقہ سے واپس آئے تھے۔ اور ہندوستان کی ریاست کا بوجھ ہنوز ان کے کاندھوں پر نہ تھا۔ سچے مصلحانہ جوش سے انہوں نے ان حضرات کو ہدایت کی، کہ اپنے اطوار کو درست کریں۔ اور خود پسندانہ عیش و عشرت اور شان و شوکت کو چھوڑ دیں۔ انہوں نے کہا۔ "رئیسو! جاؤ اور اپنے زیور اور جواہرات کو بیچ ڈالو۔" زیورات اور جواہرات تو وہ نہ بیچے، مگر چیں ضرور گئے، سراسیمگی کی حالت میں ایک ایک دو دو کرکے سب رئیس وہاں سے اٹھ گئے۔ یہاں تک کہ جناب صدر بھی مقرر کو تنہا چھوڑ کر چل دئے۔ مسز بسنٹ بھی جو اس وقت وہاں موجود تھیں۔ گاندھی جی کی باتوں سے خفا ہو گئیں۔ اور جلسے کو چھوڑ کر چلی گئیں۔

ایک خط میں جو گاندھی جی نے مسٹر کیلکر کے نام لکھا تھا۔ وہ فرماتے ہیں "میں چاہتا ہوں، کہ ریاستیں اپنی رعایا کو خود اختیاری حکومت عطا کریں اور رئیس اپنے آپ کو جمہور کا امانت دار سمجھیں"۔ اگر واقعی اس "امانت داری" کے نظریے میں کوئی بات ہے، تو ہم پھر برطانوی حکومت کے اس دعوے پر کیوں اعتراض کرتے ہیں، کہ "وہ ہندوستان کی حکومت کی امانتدار ہے"۔ بجز اس کے کہ وہ بدیسی ہے۔ اس میں اور ہندوستانی رئیسوں میں کیا فرق ہے؟ اور رنگ، نسل، اور تہذیب کا اختلاف تو خود ہندوستان کے لوگوں میں بھی موجود ہے۔

گذشتہ چند سال سے ریاستوں میں تیزی کے ساتھ برطانوی حکام ہٹائے جا رہے ہیں۔ رئیس عموماً اس کے مخالف ہیں۔ مگر وہ بالکل بے بس ہیں، یوں تو حکومت ہند ہمیشہ سے ریاستوں پر تسلط رکھتی ہے، مگر اب ریاستیں اندر سے بھی جکڑ دی گئیں۔ چنانچہ جب کبھی ریاستوں کی زبان سے کچھ نکلتا ہے، تو اصل میں یہ حکومت ہند کی بدلی ہوئی آواز ہوتی ہے۔ جو جاگیرداری نظام کے پردے سے بولتی ہے۔

یہ میں سمجھ سکتا ہوں کہ ریاستوں میں ہمیشہ اس قسم کی جدوجہد جیسی برطانوی ہند میں ہوتی ہیں نہیں ہوسکتی، خود برطانوی ہند کے مختلف صوبوں کی زراعتی، صنعتی، فرقہ دارانہ اور انتظامی حالت میں بھی بہت فرق ہے۔ اس لیے یہ ضروری نہیں، کہ ایک ہی پالیسی سب کہیں قابل عمل ہو، لیکن جدوجہد کے طریقے میں حالات کے لحاظ سے اختلاف ہونا اور بات ہے۔ ہماری عام پالیسی مختلف علاقوں میں مختلف نہیں ہونی چاہیے۔ اور جو چیز ایک جگہ بری سمجھی جاتی ہے، وہ دوسری جگہ بری سمجھی جانی چاہیئے۔ ورنہ ہم پر یہ الزام لگایا جائے گا، اور لگایا جا چکا ہے، کہ ہم کوئی مستقل پالیسی اور اصول نہیں رکھتے۔ بلکہ ہمارا مقصد صرف قوت اور اقتدار حاصل کرنا ہے۔

مختلف ملتوں اور دوسری اقلیتوں کو جداگانہ حق انتخاب دیئے کے خلاف بجا طور پر بہت کچھ نکتہ چینی کی جاتی ہے، اور کہا جاتا ہے کہ یہ طریقہ جمہوریت کے ساتھ کسی طرح نہیں کھپ سکتا۔ ظاہر ہے کہ جب حلقہ ہائے انتخاب مذہبی جماعتوں میں جو ایک دوسرے سے بالکل الگ ہوں تقسیم کر دیئے جائیں۔ تو جمہوریت یا ذمہ دار حکومت کے قائم ہونے کا کوئی امکان نہیں لیکن جو لوگ اس پر بڑے زور شور سے نکتہ چینی کرتے ہیں۔ مثلاً پنڈت مدن موہن مالوی

یا ہندو سبھا کے لیڈر، تعجب ہے کہ وہ ریاستوں کے حالات سے مطمئن ہیں اور بظاہر اس پر آمادہ ہوگئے ہیں کہ استبدادی ریاستوں اور جمہوری برطانوی ہند (یہ حضرات اسے جمہوری کہتے ہیں) کے درمیان وفاقی اتحاد ہوجائے۔ اس سے زیادہ بے تکا اور نامعقول اتحاد مشکل سے تصور میں آسکتا ہے۔ لیکن ہندو سبھا کے حامیان جمہوریت وقومیت بے تکلف اسے قبول کرنے کے لئے تیار ہیں۔ بات یہ ہے کہ ہم زبان سے تو منطق صحت اور استقامت کا دعویٰ کرتے ہیں مگر ہمارے عمل کا بنیادی محرک اب تک جذبات کے سوا کچھ نہیں۔

غرض ریاستوں کے متعلق کانگریس کا رویہ ایک عجیب معمّا ہے۔ مجھے ٹامس پین کا ایک جملہ یاد آگیا جو اس نے تقریباً ڈیڑھ سو سال ہوئے برک کے متعلق کہا تھا کہ انہیں پروں پر ترس آتا ہے مگر یہ نہیں دیکھتے کہ چڑیا مری جاتی ہے۔ گاندھی جی مرتی ہوئی چڑیا کو تو دیکھتے ہیں مگر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ پروں کو اس قدر اہمیت کیوں دیتے ہیں۔

کم وبیش یہی صورت تعلقہ داریوں اور بڑی زمینداریوں کے نظام کی ہے۔ اس معاملہ میں تو اب کسی دلیل وبحث کی ضرورت ہی نہیں معلوم ہوتی کہ یہ نیم جاگیرداری نظام فرسودہ ہوگیا ہے اور دولت آفرینی اور عام ترقی کی راہ میں حائل ہے۔ خود سرمایہ داری کے ترقی پذیر نظام کے ساتھ اس کا نبھنا ممکن نہیں چنانچہ قریب قریب دنیا کے سب ملکوں میں بڑی بڑی زمینداریاں غائب ہوتی جاتی ہیں اور کاشتکاران زمینداران کی جگہ لے رہے ہیں۔ میرا اب تک یہی خیال تھا کہ ہندوستان میں اگر کوئی سوال پیدا ہوسکتا ہے تو وہ یہ ہے کہ جن زمینداروں سے زمین چھینی جائے انہیں اس کا کوئی معاوضہ دیا جائے۔ لیکن سال گذشتہ مجھے یہ معلوم کرکے تعجب ہوا کہ گاندھی جی موجودہ تعلقہ داری نظام کو

فی نفسہ پسند کرتے ہیں اور اسے برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ جولائی ۱۹۳۴ء میں انہوں
نے کانپور میں کہا تھا "زمیندار اور کسان کے دل میں ایک دوسرے کی محبت اور
ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو جائے تو ان کے تعلقات بہتر ہو سکتے ہیں۔ پھر دونوں امن
اور سلوک سے رہ سکتے ہیں۔ میں ہرگز تعلقہ داری اور زمینداری نظام کو مٹا دینے
کا حامی نہیں ہوں اور جو لوگ اس کو مٹانا چاہتے ہیں وہ خود اپنے خیالات کا
صحیح اندازہ نہیں کر سکتے" (یہ انہوں نے بڑی بے انصافی کی بات کہی)

آگے چل کر انہوں نے فرمایا "میں ہرگز اس کوشش میں شریک نہیں ہوں گا
کہ املاک رکھنے والے طبقے سے اس کی املاک چھین لی جائے، میرا مقصد آپ کے
دلوں پر اثر ڈالنا اور آپ کو اپنا ہم خیال بنانا ہے (وہ بڑے بڑے زمینداروں
کے ایک وفد سے مخاطب تھے) تاکہ آپ اپنی ذاتی املاک کو رعایا کی امانت
کے طور پر رکھیں اور اس کا اصل مصرف ان کی فلاح و بہبود کو سمجھیں
اگر بے انصافی سے اس بات کی کوشش کی گئی کہ آپ کی جائداد
آپ سے چھین لی جائے تو آپ دیکھیں گے کہ میں آپ کی طرف
سے لڑوں گا مغرب کی اشتراکیت اور اشتمالیت کی بنیاد ایسے تصورات
پر ہے جو بنیادی طور پر ہمارے تصورات سے مختلف ہیں۔ ان میں
سے ایک ان کا یہ عقیدہ ہے کہ خود غرضی انسان کی فطرت میں داخل
ہے اس لئے ہماری اشتراکیت اور اشتمالیت کی بنیاد عدم تشدد
پر اور مزدور اور سرمایہ دار زمیندار اور کاشتکار کے ہم آہنگ تعاون
پر ہونی چاہیئے" میں نہیں کہہ سکتا کہ مشرق اور مغرب کے بنیادی تصورات
میں اسی قسم کا اختلاف ہے یا نہیں، ممکن ہے کہ ہو مگر اس زمانے میں تو
صرف یہ اختلاف نظر آتا ہے کہ ہندوستانی سرمایہ دار اور زمیندار، مزدوروں اور

کسانوں کے مفاد سے مغربی سرمایہ داروں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ غفلت اور بے پروائی برتتے ہیں۔ ہندوستان کے زمیندار نے کبھی اس کی کوشش نہیں کی کہ کسانوں کی فلاح و بہبود کے کاموں میں دلچسپی لیں۔ ایک یو۔پی۔ سی۔ این بریلس فورڈ نے ہندوستان کے حالات کا مطالعہ کرکے یہ خیال ظاہر کیا ہے "کہ ہندوستانی ساہوکار اور زمیندار ایسی خون چوسنے والی جونکیں ہیں جن کی مثال کسی موجودہ سماجی نظام میں نہیں مل سکتی"[1] لیکن غالباً ہندوستانی زمیندار کی اس میں کوئی خطا نہیں ہے۔ وہ خود زمانے کے حالات سے مجبور رہے۔ اس کی حالت گرتی چلی جاتی ہے اور اب ایسی مشکل میں پڑ گیا ہے۔ جس سے نجات پانا اس کے بس کی بات نہیں مہاجنوں نے اکثر زمینداروں کی جائداد پر قبضہ کرلیا ہے اور چھوٹے زمیندار اس حالت کو پہنچ گئے ہیں۔ کہ اسی زمین پر جس کے وہ کسی زمانے میں مالک تھے، کاشتکار کی حیثیت سے رہتے ہیں۔ شہر کے مہاجنوں نے جائداد یں رہن رکھیں اور روپیہ وقت پر ادا نہ ہونے سے فائدہ اٹھا کر ان پر قبضہ کرلیا۔ اس طرح وہ زمیندار بن بیٹھے۔ گاندھی جی کے قول کے مطابق یہ لوگ امانت دار ہیں ان غریبوں کے جن سے انہوں نے خود زمینیں چھینی ہیں اور ان سے یہ توقع ہے کہ اپنی آمدنی کا اصل مصرف اسامیوں کی فلاح و بہبود کو سمجھیں گے۔

اگر واقعی تعلقہ داری نظام اچھا ہے تو اسے سارے ہندوستان میں کیوں نہ رائج کیا جائے؟ ہندوستان میں بڑے بڑے علاقے ہیں جہاں کسان حق ملکیت رکھتا ہے۔ کیا گاندھی جی اسے پسند کریں گے کہ گجرات میں بڑے بڑے زمیندار اور تعلقہ دار پیدا ہو جائے

---

[1] "شکست یا امن؟" مصنفہ ایچ این بریلس فورڈ

جائیں؟ میرے خیال میں تو ہرگز پسند نہیں کریں گے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ صوبہ متحدہ یا بہار یا بنگال کے لئے تو کوئی اور نظام اچھا ہو اور گجرات یا پنجاب کے لئے کوئی اور غالباً شمالی اور جنوبی، مشرقی اور مغربی ہندوستان کے لوگوں میں کچھ بہت زیادہ فرق نہیں ہے اور ان کے بنیادی تصورات ایک ہی ہیں۔ مطلب اصل میں یہ ہے کہ جو چیز جیسی ہے ویسی ہی رہے" حالت موجودہ میں کوئی تغیر نہ کیا جائے نہ تو کسی معاشی تحقیقات کی ضرورت ہے کہ کون سی چیز لوگوں کے لئے سب سے زیادہ مناسب اور مفید ہے اور نہ کسی قسم کی تبدیلی کرنے کی۔ ضرورت صرف اس کی ہے کہ لوگوں کے دل میں محبت اور ہمدردی پیدا کر دی جائے۔ یہ زندگی اور اس کے مسائل پر غور کرنے کا خالص مذہبی نقطۂ نظر ہے اور اسے سیاسیات، معاشیات اور اجتماعیات سے ذرا بھی لگاؤ نہیں۔ مگر گاندھی جی مذہب کے دائرے سے آگے بڑھ کر سیاسی اور قومی معاملات میں بھی اس سے کام لینا چاہتے ہیں۔

اس قسم کے متضاد حالات اور خیالات آجکل ہندوستان کے سامنے ہیں۔ ہم نے اپنی زندگی میں بہت سی گتھیاں ڈالی ہیں جن کو سلجھائے بغیر آگے بڑھنا ناممکن ہے۔ مگر یہ جذبات کی مدد سے نہیں سلجھ سکتیں۔ اب سے بہت پہلے اسپنوزا نے یہ سوال کیا تھا کہ کون سی چیز بہتر ہے "علم اور عقل کے ذریعے آزادی حاصل کرنا یا جذبات کی زنجیروں میں جکڑے رہنا؟" اس نے پہلی صورت کو ترجیح دی تھی۔

(۶۳)

خیالات پر اثر ڈالنا بہتر ہے یا جبر سے کام لینا

سولہ برس گذرے گاندھی جی نے ہندوستان پر اپنے اہنسا کے اصول کا سکہ بٹھا دیا تھا۔ اس وقت سے اب تک ہندوستانی سیاست پر اس کا تسلط رہا ہے بے شمار لوگ ایسے ہیں جنہوں نے بغیر سمجھے بوجھے اس کی تائید کی بعض نے اسے بڑی کش مکش کے بعد شروط یا غیر مشروط طور پر قبول کیا اور بعض نے کھلم کھلا اس کا مذاق اڑایا ہماری سیاسی اور سماجی زندگی پر اس کا بہت گہرا اثر پڑا اور ہندوستان کے باہر بھی دوسرے ممالک میں اس کا بہت چرچا ہوا۔ یوں تو یہ اصول اس وقت سے چلا آتا ہے جب سے انسان میں قوت فکر پیدا ہوئی۔ لیکن غالباً گاندھی جی پہلے آدمی ہیں۔ جنہوں نے اس سے بڑے پیمانے پر سیاسی اور سماجی تحریکوں میں کام لیا۔ ابتدا میں یہ ایک انفرادی چیز تھی اور اس وجہ سے اس کی حیثیت در اصل مذہبی تھی۔ اس کا مقصد انفرادی ضبط نفس ہوتا تھا اور اس کے ذریعہ سے انسان ذاتی اغراض سے بری اور دنیاوی کش مکش سے بلند ہو کر ایک قسم کی شخصی آزادی اور نجات حاصل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ اس میں یہ مقصد پیش نظر نہیں رکھا گیا تھا کہ اس کے ذریعے بڑے بڑے سماجی مسائل کو حل کیا جائے اور سماجی حالات میں انقلاب پیدا کیا جائے۔ ہاں بالواسطہ اس کا کسی قدر سماجی زندگی پر پڑتا تھا۔ اصل میں موجودہ سماجی نظام اور اس کی بے انصافیوں اور عدم مساوات کو لوگ اٹل سمجھ کر بے چون و چرا تسلیم کرتے تھے۔ گاندھی جی نے یہ کوشش کی کہ اس شخصی نصب العین کو بدل کر

ایک اجتماعی نصب العین بنا دیں۔ وہ سیاسی اور سماجی حالات دونوں میں انقلاب پیدا کرنا چاہتے تھے اور اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر انہوں نے بالارادہ اس اہنسا کے طریقے کو اس وسیع اور نئے مقصد کے لئے استعمال کیا۔ انہوں نے لکھا ہے کہ "جو لوگ انسانوں کے ماحول اور ان کے حالات زندگی میں کوئی اہم تبدیلی کرنا چاہتے ہیں ان کے لئے اس کے سوا اور کوئی ذریعہ نہیں کہ وہ سوسائٹی میں ایک ذہنی ہیجان پیدا کریں۔ اس کے دو ہی طریقے ہو سکتے ہیں یا تشدد اور جبر سے کام لیا جائے یا اہنسا پر عمل کیا جائے۔ جبر کا دباؤ انسان کے جسم پر پڑتا ہے اور اس سے کام لینے والا خود ذلیل ہوتا ہے۔ اور دوسرے کو پست کرتا ہے لیکن اہنسا کا دباؤ جو خود تکلیف اٹھا کر مثلاً فاقہ کشی کے ذریعے ڈالا جائے اس سے بالکل مختلف اثر پیدا کرتا ہے۔ یہ جن لوگوں کے خلاف استعمال کیا جائے، ان کے جسم پر نہیں بلکہ ان کی اخلاقی قوتوں پر اثر ڈالتا ہے اور انہیں تقویت پہنچاتا ہے۔" (۱)

یہ خیال ایک حد تک ہندوستانی فلسفہ سے ہم آہنگ ہے، اس لئے لوگوں نے اس کو کم سے کم سطحی طور پر نہایت جوش کے ساتھ قبول کر لیا۔ بہت کم لوگوں کو یہ اندازہ تھا کہ اس کے نتائج کتنی دور تک پہنچتے ہیں، اور جنہیں تھا انہوں نے بھی اس کے نظری پہلو کو سمجھے بغیر محض عقیدے اور عمل کے دامن میں پناہ لی۔ مگر جب عمل کا جوش کم ہوا تو لوگوں کے ذہن میں بے شمار سوالات پیدا ہوئے جن کا جواب دینا مشکل ہو گیا۔ ان سوالوں کا کوئی خاص اثر اس موجودہ سیاسی طرز عمل پر نہیں پڑا بلکہ یہ دراصل اس تمام فلسفہ حیات سے متعلق تھے جس پر اس قسم کے بے تشدد مقابلے کی بنیاد ہے۔ سیاسی نقطۂ نظر سے اس تحریک کو ابھی کامیابی نہیں ہوئی کیونکہ ہندوستان اب تک

---

(۱) یہ اقتباس گاندھی جی کے ایک بیان سے لیا گیا ہے جو انہوں نے اپنے ایک برت کے موقع پر دسمبر ۱۹۳۲ء کو دیا تھا۔

شہنشاہیت کے پنجے میں گرفتار ہے۔ سماجی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اس سے ابھی کسی زبردست سماجی انقلاب کا تصور بھی پیدا نہیں ہوا۔ مگر باوجود اس کے اگر کسی شخص میں تھوڑی سی نظر بھی ہے تو دیکھ سکتا ہے کہ اس کی بدولت ہندوستان کے کروڑوں باشندوں میں کس قدر زبردست تغیر پیدا ہو گیا ہے۔ اس نے ان میں سیرت کی پختگی، قوت اور خود اعتمادی پیدا کر دی ہے اور یہ ایسی صفات ہیں جن کے بغیر سیاسی اور سماجی ترقی حاصل کرنا یا اس کا قائم رکھنا بہت دشوار ہے۔ اس کا فیصلہ آسانی سے نہیں ہو سکتا کہ یہ فوائد کہاں تک اہنسا کے اصول کی وجہ سے حاصل ہوتے ہیں اور کہاں تک ہماری سیاسی کش مکش کا لازمی نتیجہ ہیں۔ بہت سی قوموں کو اکثر موقعوں پر یہ تمام فوائد ایسی کش مکش سے بھی حاصل ہوئے ہیں جس میں تشدد کو دخل تھا۔ لیکن میرے خیال میں یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اس اعتبار سے عدم تشدد (اہنسا) کا طریقہ ہمارے ملک کے لئے بیحد مفید ثابت ہوا ہے۔ اسی کی وجہ سے ہمیں سوسائٹی میں وہ "ذہنی ہیجان" پیدا کرنے میں مدد ملی ہے جس کی طرف گاندھی جی نے اشارہ کیا تھا، گو یہ واقعہ ہے کہ وہ ہیجان بعض بنیادی حالات اور اسباب کا نتیجہ ہے اس نے عام لوگوں میں ایک نئی روح پھونک دی ہے جو ہر انقلاب کی تمہید ہوا کرتی ہے۔

اہنسا کی یہ خوبی تو کھلی ہوئی ہے مگر یہ بجائے خود کافی نہیں۔ اصل شبہات اس سے دور نہیں ہوتے۔ بدقسمتی سے خود گاندھی جی سے اس مسئلے کے حل میں کچھ زیادہ مدد نہیں ملتی۔ انہوں نے اس موضوع پر بے شمار موقعوں پر تقریریں کی ہیں اور مضامین لکھے ہیں لیکن جہاں تک مجھے علم ہے انہوں نے کبھی پبلک میں اس کے تمام فلسفیانہ اور عملی نتائج پر روشنی نہیں ڈالی۔[1] وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ذرائع مقصد سے

[1] رچارڈ۔ ب۔ گرگ نے اپنی کتاب "عدم تشدد کی قوت" میں اس مسئلے پر علمی بحث کی ہے ان کی کتاب بہت دلچسپ اور محرک فکر ہے۔

زیادہ اہم ہیں روحانی اثر جبر سے بہتر ہے اور ان کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ اہنسا کو حق اور خیر سے تعبیر کریں بلکہ وہ اکثر انہیں ہم معنی الفاظ کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ ایک رجحان یہ بھی ہے کہ ان سب لوگوں کو جو اس اصول سے اتفاق نہ کریں حلقہ خاص میں شامل نہ کیا جائے اور وہ قانون اخلاق کی خلاف ورزی کے مجرم قرار دیے جائیں۔ گاندھی جی کے بعض چیلوں پر اس کا لازمی طور پر یہ اثر ہوا ہے کہ وہ اپنے آپ کو بہت مقدس سمجھنے لگے ہیں۔ لیکن ہم میں سے جو لوگ اس قدر عقیدت نہیں رکھتے انہیں بہت سے شکوک اور شبہات ہیں۔ ان شکوک کا تعلق جیسا میں ابھی کہہ چکا ہوں فوری ضروریات سے نہیں بلکہ اس ذہنی ضرورت سے ہے کہ عمل کے لئے کوئی ایسا کیر نگ فلسفہ اختیار کیا جائے جو انفرادی نقطۂ نظر سے اخلاقی قدر بھی رکھتا ہو اور سماجی لحاظ سے بھی مفید اور مؤثر ہو۔ مجھے اعتراف ہے کہ میرے دل میں ابھی یہ شکوک باقی ہیں اور اس مسئلے کا کوئی تشفی بخش حل سمجھ میں نہیں آتا۔ میں جبر اور تشدد کو سخت ناپسند کرتا ہوں۔ لیکن خود مجھ میں تشدد موجود ہے اور میں جان بوجھ کر یا بے جانے بوجھے اکثر دوسروں پر جبر کرنا چاہتا ہوں اور پھر یہ سوال ہے کہ اس ذہنی جبر سے بڑھ کر اور کونا جبر ہو سکتا ہے۔ جس سے گاندھی جی اپنے خاص پیروؤں اور رفیقوں کے دماغ کو معطل کر دیتے ہیں۔

مگر اصل سوال یہ ہے کہ آیا قومیں اور جماعتیں اہنسا کے اس انفرادی اصول کو پوری طرح اختیار کر بھی سکتی ہیں کیونکہ یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ نوع انسانی بحیثیت مجموعی محبت اور نیکی کی بلند تر سطح پر پہنچ جائے۔ یہ صحیح ہے کہ ہمارا انتہائی نصب العین یہی ہونا چاہیے کہ انسانوں کو اس بلندی پر پہنچائیں۔ اور نفرت، شر اور خود غرضی کو مٹائیں۔ یہ امر بجائے خود بحث طلب ہے کہ کبھی ایسا ہو بھی سکتا ہے یا نہیں

لیکن اس امید کے بغیر زندگی ایک بے معنی چیز بن جائے گی "کسی دیوانے کی کہانی جس میں شور ہی شور ہے مطلب کچھ نہیں" کیا اس مقصد کے حاصل کرنے کا یہی طریقہ ہے کہ ہم براہِ راست ان اخلاقی خوبیوں کی تلقین کریں اور ان رکاوٹوں کا مطلق خیال نہ کریں جو اس کے راستے میں حائل ہیں اور اس کے مخالف رجحانات کو تقویت پہنچاتی ہیں؟ یا یہ بہتر ہوگا کہ پہلے ان رکاوٹوں کو دور کرکے ہم ایک زیادہ موزوں اور سازگار ماحول تیار کریں جس میں محبت، حسن اور خیر نشو ونما پاسکیں؟ یا ان دونوں طریقوں کو ملانے کی ضرورت ہے؟

پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا تشدد اور عدم تشدد، روحانی اثر اور جبر کی حدِ فاصل اس قدر صاف اور واضح ہے جیسا عام طور پر کہا جاتا ہے۔ بعض دفعہ اخلاقی قوت کا جبر جسمانی تشدد سے کہیں زیادہ سخت ہوتا ہے۔ کیا اہنسا اور حق ایک ہی چیز ہیں؟ حق کیا ہے؟ اس قدیم سوال کے ہزاروں جواب دئے گئے ہیں اور پھر بھی یہ سوال آج تک حل نہیں ہوا۔ لیکن خواہ اس کی ماہیت کچھ بھی ہو اس کو اہنسا کا ہم معنی نہیں قرار دیا جاسکتا۔ تشدد بجائے خود بری چیز ہے لیکن لازمی طور پر خلافِ اخلاق نہیں۔ اس کی بہت سی شکلیں اور بہت سے مدارج ہیں اور ممکن ہے کہ بعض حالات میں یہ اور طریقوں پر قابلِ ترجیح ہو۔ گاندھی جی نے خود کہا ہے کہ تشدد بزدلی، خوف اور غلامی سے بہتر ہے اور اس فہرست میں اور بھی بہت سی چیزوں کا اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ سچ ہے کہ عام طور پر تشدد کا تعلق نفرت اور بدخواہی سے ہوتا ہے۔ لیکن کم سے کم نظری طور پر یہ کوئی لازمی تعلق نہیں۔ یہ بات قیاس میں آسکتی ہے کہ تشدد کی بنیاد خیرخواہی پر ہو (مثلاً ایک سرجن کا تشدد) اور جو چیز خیرخواہی پر مبنی ہو وہ اصولاً خلافِ اخلاق نہیں ہوسکتی۔ اخلاق کا اصل معیار نیت کا اچھا یا برا ہونا ہے۔ لہٰذا اگرچہ تشدد اکثر اوقات اخلاقاً ناجائز ہوتا ہے اور اس لحاظ سے اس کو خطرناک سمجھنا چاہیے

لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ ہمیشہ ایسا ہی ہو۔

زندگی میں جنگ اور تشدد کا دور دورہ ہے۔ یہ صحیح ہے کہ عموماً تشدد کا نتیجہ تشدد ہی ہوتا ہے اور اس طرح یہ سلسلہ کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس کو بالکل ترک کر دینے کے معنی یہ ہیں کہ ایک بالکل ہی فلسفیانہ رویہ اختیار کیا جائے جو زندگی سے سراسر بے تعلق ہے۔ موجودہ حکومت اور نظام معاشرت کی بنیاد تمام تر تشدد پر ہے۔ ریاست کے تشدد کے بغیر نہ ٹیکس وصول ہو سکتے ہیں نہ زمینداروں کو اپنی زمینوں کا لگان مل سکتا ہے، نہ ذاتی ملکیت قائم رہ سکتی ہے۔ قانون فوجی قوت کی امداد سے ایک شخص کو دوسرے کی ذاتی ملکیت میں دخل دینے سے روکتا ہے۔ خود قومی ریاست کی بنیاد جارحانہ دفاعی تشدد اور مدافعانہ تشدد پر قائم ہے۔

اس میں شک نہیں کہ گاندھی جی کا اہنسا کا اصول محض ایک منفیانہ نظریہ نہیں ہے۔ یہ عدم مقاومت نہیں بلکہ بے تشدد مقاومت ہے جو اس سے مختلف اور ایک مثبت اور موثر طریق کار ہے۔ یہ ان لوگوں کے لئے نہیں جو موجودہ حالات کو بے چون وچرا تسلیم کر لیتے ہیں۔ یہ تو جاری ہی اس مقصد سے کیا گیا تھا کہ سوسائٹی میں ایک ہیجان برپا کیا جائے اور اس طرح موجودہ حالات میں تبدیلی کی جائے۔ خواہ یہ روحانی اثر ڈالنے کی نیت سے جاری کیا گیا ہو مگر عملاً یہ جبر کا ایک پرزور آلہ ثابت ہوا ہے اگرچہ یہ جبر بہت ہی مہذب اور معقول قسم کا تھا۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ خود گاندھی جی نے اپنی ابتدائی تحریروں میں "جبر" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ چنانچہ ۱۹۲۰ء میں لارڈ چیمزفورڈ وائسرائے ہند کی اس تقریر پر نکتہ چینی کرتے ہوئے جو انہوں نے پنجاب میں مارشل لاء کے مظالم کے متعلق کی تھی وہ لکھتے ہیں:

ہزاکسلنسی نے کونسل کی افتتاح کے موقع پر جو تقریر کی، اس سے ایک ایسا ذہنی رجحان ظاہر ہوتا ہے جس کے ہوتے ہوئے کسی خوددار شخص کے لئے ان کے یا ان

کی حکومت کے ساتھ کسی قسم کا تعلق رکھنا ممکن نہیں پنجاب کے متعلق جو کچھ انہوں نے کیا ہے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کوئی تلافی کرنے کو تیار نہیں ہیں سو وہ چاہتے ہیں کہ ہم "مستقبل" قریب کے مسائل پر اپنی پوری توجہ صرف کریں! ہمارے لئے مستقبل کا فوری مسئلہ یہ ہے کہ گورنمنٹ کو مجبور کریں کہ اس نے جو کچھ پنجاب میں کیا ہے اس پر پچھتائے اور اس کی تلافی کرے مگر اس کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ بہ خلاف اس کے ہز اکسلنسی معترضوں کو جواب دینے سے بچنا چاہتے ہیں جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان تمام اہم مسائل میں جن کا تعلق ہندوستان کی قومی خودداری سے ہے۔ ان کی رائے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ وہ تمام معاملات کو تاریخ کے فیصلے پر چھوڑنے کے لئے تیار ہیں۔ میری رائے میں اس قسم کے الفاظ سے ہندوستانیوں کو اور زیادہ اشتعال ہوگا۔ تاریخ کا فیصلہ ان غریبوں کے کس کام آئے گا جن پر ظلم کیا گیا ہے اور جو اب تک ایسے حکام کے پنجۂ غضب میں گرفتار ہیں۔ جنہوں نے اپنے آپ کو اعتماد اور ذمہ داری کے عہدوں کا سراسر نااہل ثابت کیا ہے؟ پنجاب کے ساتھ انصاف کرنے سے صریحاً انکار کرنا اور اس کے ساتھ ساتھ تعاون عمل کی دعوت دینا سراسر ریاکاری ہے۔"

یہ بات تو سب کو معلوم ہے کہ حکومتوں کا قیام تشدد پر منحصر ہے اور یہ تشدد محض فوجی قوت کا کھلا ہوا تشدد ہی نہیں ہوتا بلکہ اس سے بھی زیادہ خوفناک اور چھپا ہوا تشدد ہوتا ہے جس میں جاسوسوں، مخبروں، حکومت کے کرگوں سے کام لیا جاتا ہے مدرسوں اور اخباروں وغیرہ کے ذریعے پروپگنڈا کیا جاتا ہے مذہب اور دوسری قوتوں کا دباؤ ڈالا جاتا ہے۔ افلاس اور فاقہ کشی سے کمر توڑ دی جاتی ہے جہاں تک حکومتوں کے باہمی معاملات کا تعلق ہے، یہ بات مسلمہ ہے کہ نہ صرف جنگ کے زمانے میں بلکہ صلح کے زمانے میں بھی ہر قسم کا جھوٹ اور دغابازی جائز ہے

بشرطیکہ وہ پوشیدہ رہے۔ تین سو برس گزرے سر ہنری ووٹن نے جو شاعر تھے اور
برطانوی سفیر بھی تھے سفیر کی تعریف ان الفاظ میں کی تھی کہ "وہ دیانت دار آدمی جو اپنے
ملک کی خاطر جھوٹ بولنے کے لئے دوسرے ملکوں کو بھیجا جاتا ہے" آج کل سفیروں
کے ساتھ بہت سے فوجی بحری اور تجارتی مددگار ہوتے ہیں جن کا کام ہی یہ ہے کہ وہ
ان ملکوں میں جاسوسی کریں جہاں وہ تعینات ہیں۔ ان کی مدد کے لئے خفیہ پولیس کا
وسیع انتظام ہوتا ہے جس کی ریشہ دوانیوں اور فریب کاریوں کا جال دور دور تک پھیلا
ہوتا ہے۔ جس کے اپنے جاسوس الگ ہوتے ہیں اور دوسرے ملکوں کے جاسوسوں
کی کاٹ کرنے والے الگ، جس میں جرائم پیشہ لوگوں سے کام لیا جاتا ہے اور رشوت کے
ذریعہ انسانی فطرت ذلیل کی جاتی ہے۔ اور لوگ پوشیدہ طور پر قتل کرائے جاتے ہیں
یہ چیزیں امن کے زمانے میں بھی کچھ کم نہیں ہوتیں لیکن جنگ میں ان کی اہمیت اور بڑھ
جاتی ہے اور ان کا تباہ کن اثر ہر طرف پھیل جاتا ہے، جنگ عظیم کے زمانے میں جو جھوٹا پروپگنڈا
کیا گیا، مخالف ملکوں کے متعلق جو غلط خبریں پھیلائی گئیں اور اس کام پر اور محکمہ جاسوسی
پر جو بے اندازہ رقمیں صرف ہوئیں ان کا حال پڑھ کر حیرت ہوتی ہے۔ لیکن آج کل امن
بھی محض دو جنگوں کے درمیان کے وقفے اور جنگ کی تیاری کا نام ہے اور اس زمانے
میں بھی اقتصادی میدان اور دوسرے میدانوں میں لڑائی جاری رہتی ہے۔ فاتحوں
اور مفتوحوں شہنشاہی حکومتوں اور ان کی نوآبادیوں، لوٹنے والوں اور لٹنے والوں
میں برابر ایک کشمکش رہتی ہے۔ غرض اس نام نہاد صلح میں بھی ایک حد تک جنگ کی
فضا مع اپنے لوازم یعنی فریب و تشدد کے قائم رہتی ہے اور فوجی اور ملکی ملازموں کو اسی
کی تربیت دی جاتی ہے۔ لارڈ ولزلی نے اپنی کتاب "فیلڈ سروس کی پاکٹ بک" میں
لکھا ہے "ہم اس عقیدے کو ہمیشہ دہراتے رہیں گے کہ دیانتداری سب سے بہتر پالیسی ہے اور
جیت ہمیشہ حق کی ہوتی ہے۔ یہ جملے ایک بچے کی کاپی پر بہت اچھے معلوم ہوتے ہیں

لیکن جو شخص جنگ میں ان اصولوں پر عمل کرنا چاہتا ہے اس کے لئے بہتر ہے کہ وہ ہمیشہ کے لئے اپنی تلوار میان میں رکھ لے۔"

آج کل قوموں اور جماعتوں میں جو اختلافات اور کشمکش ہیں ان کی وجہ سے سیاسی زندگی کا تشدد اور جھوٹ کی بنیاد پر قائم ہونا تقریباً ناگزیر سا معلوم ہوتا ہے جو قومیں اور جماعتیں دوسروں سے زیادہ حقوق رکھتی ہیں وہ اپنے حقوق کو قائم رکھنا اور دوسروں کی نشوونما کے مواقع کو روکنا چاہتی ہیں۔ لہٰذا وہ اس پر مجبور ہیں کہ تشدد جبر اور جھوٹ سے کام لیں۔ اس کا امکان ضرور ہے کہ جب رائے عامہ کا اثر زیادہ بڑھ جائے اور لوگ ان مخالفتوں اور رکاوٹوں کی اصل حقیقت سے آگاہ ہو جائیں تو اس تشدد میں کمی ہو جائے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ حال میں جو کچھ تجربہ اس بارے میں ہوا ہے اس سے برعکس نتیجہ نکلتا ہے اور جوں جوں موجودہ اداروں پر زیادہ زور کے ساتھ حملہ کیا گیا ان کا تشدد اور بڑھتا گیا۔ اگر کھلے ہوئے تشدد میں کچھ کمی بھی ہوئی تو اس نے زیادہ خطرناک اور پوشیدہ شکلیں اختیار کر لیں۔ تشدد کا یہ رجحان نہ تو اقلیت کی نشوونما سے رک سکا اور نہ مذہب و اخلاق سے بیشک بعض افراد نے انسانیت کے مدارج میں ترقی کی ہے اور اعلیٰ درجے کے نہ سہی مگر اوسط درجے کے لوگ پہلے سے بہت زیادہ ہیں۔ اس لحاظ سے سماج نے ترقی کی ہے اور ایک حد تک قدیم وحشیانہ جبلتوں پر قابو پانے کی کوشش بھی شروع ہو گئی ہے۔ لیکن یہ افراد تک محدود ہے۔ جماعتوں اور گروہوں کے طرزِ عمل میں کوئی خوشگوار تغیر نہیں ہوا افراد کے مہذب ہو جانے سے ان کے بہت سے ابتدائی جذبات اور برائیاں جماعت کی طرف منتقل ہو گئی ہیں اور چونکہ تشدد کو ہمیشہ وہی لوگ پسند کرتے ہیں جو اخلاقاً کمتر درجے کے ہوں، اس لئے ان جماعتوں کے لیڈر ان کے بہترین اشخاص نہیں بن سکے۔ لیکن اگر ہم یہ فرض بھی کر لیں کہ تشدد کی بدترین صورتیں رفتہ رفتہ دور

ہو جائیں گی اس وقت بھی ہم اس بات کو نظر انداز نہیں کر سکتے کہ حکومت اور سماجی زندگی دونوں کے قیام کے لئے جبر کی ضرورت ہے۔ سماجی زندگی کے لئے کسی قسم کی حکومت ضروری ہے اور جو لوگ برسر حکومت ہوں وہ اس پر مجبور ہیں کہ وہ ان تمام انفرادی اور اجتماعی رجحانات کی روک تھام کریں جو سراسر خود غرضی پر مبنی ہیں اور جن سے سوسائٹی کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ عموماً وہ اس معاملے میں ضرورت کی حد سے بڑھ جاتے ہیں کیونکہ حکومت اور قوت کا خاصہ ہے کہ جس کے ہاتھ میں ہوتی ہے اس کے اخلاق کو خراب اور پست کر دیتی ہے۔ اس کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ خواہ ان لوگوں کو آزادی سے کتنی ہی محبت ہو اور وہ جبر کو کتنا ہی ناپسند کرتے ہوں ان کے لئے لازم ہے کہ وہ سرکشوں پر جبر کریں اور یہ اس وقت تک ہوتا رہے گا جب تک ملک کے تمام افراد اخلاقی حیثیت سے کامل، بے غرض، بے نفس اور دل و جان سے فلاح عامہ کے طالب بن جائیں حکومت کے اراکین کو ان بیرونی جماعتوں کے خلاف بھی جبر و تشدد سے کام لینا پڑے گا جو ملک پر حملہ کریں یعنی انہیں قوت کے مقابلے میں قوت استعمال کر کے اپنی مدافعت کرنی پڑے گی۔ اس کی ضرورت اس وقت تک باقی رہے گی جب تک ایک عالمگیر سلطنت قائم نہ ہو جائے۔

اگر قوت اور جبر بیرونی مدافعت اور اندرونی نظم و استحکام دونوں کے لئے ضروری ہے تو اس کی حدود کس طرح قائم کی جائیں؟ جیسا کہ رائن ہولڈ نائی بور (۱) نے کہا ہے "جب ایک دفعہ اخلاق کی طرف سے سیاست کو جبر کی اجازت دے دی جائے اور اسے سماجی استحکام کا ایک لازمی ذریعہ تسلیم کر لیا جائے تو تشدد آمیز اور بے تشدد جبر کے درمیان کوئی معین حد فاصل قائم نہیں کی جا سکتی اور حکومت کے جبر اور انقلاب پسندوں کے جبر میں بھی تمیز نہیں ہو سکتی۔"

---

(۱) اپنی کتاب "نیک فرد اور بد جماعت" میں

میں یقین سے نہیں کہہ سکتا مگر میرا خیال ہے کہ گاندھی جی اس بات کو تسلیم کریں گے کہ اس ناقص دنیا میں قومی ریاست کو بھی بیرونی طاقتوں کے حملوں کی مدافعت کے لئے تشدد سے کام لینا پڑے گا یقیناً ریاست کو اپنے ہمسایوں اور دوسری ریاستوں سے دوستانہ اور پرامن تعلقات کی توقع کرنی چاہیئے۔ لیکن حملے کے امکان سے انکار کرنا سراسر بہل بات ہے۔ اس کے علاوہ ریاست کو کچھ جبری اور تشدد آمیز قوانین بھی پاس کرنے پڑیں گے یعنی ایسے قوانین جن سے مختلف گروہوں اور جماعتوں کے کچھ حقوق اور مراعات ان سے چھین لئے جائیں گے اور ان کی آزادیٔ عمل محدود ہو جائے گی۔ پھر کچھ نہ کچھ جبر و تشدد تو بھی قوانین میں پایا جاتا ہے۔ کانگریس کے کراچی والے پروگرام کے مطابق "عوام کی محنت سے جو ناجائز فائدہ اٹھایا جا رہا ہے اسے ختم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہندوستان کی سیاسی آزادی کے مفہوم میں اس ملک کی کروڑوں فاقہ کش باشندوں کی حقیقی معاشی آزادی کو بھی شامل کیا جائے" اس مناسب خواہش کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ان لوگوں کو جنہیں آج ضرورت سے زیادہ مراعات حاصل ہیں اپنے حصے میں سے بہت کچھ انہیں دینا پڑے گا جو ان مراعات سے محروم ہیں مزید براں اس پروگرام میں یہ بھی ہے کہ مزدوروں کو کم سے کم اتنا مزدور ملنا چاہیئے کہ ان کی زندگی بسر ہو سکے اور انہیں دوسری ضروری سہولتیں میسر آسکیں۔ نیز یہ کہ جائداد پر خاصے محاصل عائد کئے جائیں گے "ریاست بنیادی صنعتوں اور حکموں، معدنی ذرائع دولت، ریلوے، بحری راستوں، جہازوں اور دوسرے ذرائع نقل و حمل کی یا خود مالک ہوگی یا ان پر نگرانی رکھے گی"۔ آبادی کی ایک کثیر تعداد اس کی مخالفت کرے گی، وہ اکثریت کی مرضی کو گوارا کریں گے لیکن اسی حالت میں جب ان کے دل میں نافرمانی کے نتائج کا خوف موجود ہو گا۔ دراصل جمہوری حکومت کے معنی ہی یہ ہیں کہ اکثریت اقلیت کو ڈرا کر اور دھمکا کر اپنے قابو میں رکھتی ہے۔

اگر اکثریت کوئی ایسا قانون پاس کرتی ہے جس سے حقوق ملکیت پر اثر پڑتا ہے یا وہ بالکل منسوخ کر دئیے جاتے ہیں تو کیا اس پر یہ اعتراض کیا جائے گا کہ یہ جبر و تشدد ہے؟ ظاہر ہو کہ اس قسم کا اعتراض نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہی طریقہ تمام جمہوری قوانین کے پاس کرنے میں اختیار کیا جاتا ہے۔ اس لئے جبر و تشدد کا الزام تو نہیں لگایا جا سکتا البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اکثریت غلطی پر ہے یا اخلاقی قوانین کی خلاف ورزی کر رہی ہے۔ پھر یہ سوال رہ جاتا ہے کہ جس قانون کو اکثریت نے پاس کیا ہے وہ کسی اخلاقی اصول کے منافی تو نہیں لیکن اس کا فیصلہ کون کرے۔ اگر افراد اور جماعتوں کو یہ حق دیدیا جائے کہ اپنے مفاد کے مطابق اخلاقی قوانین کی تعبیر کر لیا کریں تو جمہوری طرز حکومت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ ذاتی طور پر میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ انفرادی ملکیت کی وجہ سے (اگر وہ ایک مقررہ حد سے بڑھ جائے) افراد کو جماعت کے مقابلہ میں مجموعی طور پر ایک خطرناک اقتدار حاصل ہو جاتا ہے۔ جو جماعت کے لئے سخت مضر ہے۔ میں اس اقتدار کو اخلاقی اصول کے خلاف اور شراب خواری سے بدتر سمجھتا ہوں کیونکہ اس سے زیادہ نقصان فرد کو پہنچتا ہے نہ کہ جماعت کو۔

بعض لوگ عدم تشدد کا عقیدہ رکھنے کے مدعی ہیں۔ کہتے ہیں کہ ذاتی ملکیت کو اس کے مالکوں کی مرضی کے خلاف قومی ملکیت بنانے کی کوشش کرنا جبر ہے، اس لئے یہ عدم تشدد کے خلاف ہے۔ لطف یہ ہے کہ اس دلیل کو نہایت شد و مد کے ساتھ وہ بڑے بڑے زمیندار میرے سامنے پیش کرتے ہیں۔ جنہیں اپنے لگان کو حکومت کی امداد سے جبراً وصول کرنے میں مطلق باک نہیں اور وہ سرمایہ دار جو بیسوں کارخانوں کے مالک ہیں اور جنہیں یہ گوارا نہیں کہ ان کے علاقے میں مزدور اپنی آزاد انجمن قائم کریں۔ یہ کافی نہیں سمجھا جاتا کہ اکثریت موجودہ نظام میں تبدیلی چاہتی ہے بلکہ یہ شرط لگائی جاتی ہے کہ جن لوگوں کو اس تبدیلی سے

نقصان پہنچنے والا ہے۔ انہیں بھی راضی کر لینا چاہیئے۔ اگر اس اصول پر عمل کیا جائے تو چند ارباب غرض جب چاہیں گے۔ اچھی سے اچھی تبدیلیوں کو جن کی ضرورت بالکل مسلّم ہو، روک دیں گے۔

دنیا کی ساری تاریخ کا خلاصہ یہ ہے کہ معاشی مفاد ہی وہ قوت ہے۔ جو جماعتوں اور طبقوں کے سیاسی خیالات کی تشکیل کرتی ہے۔ معاشی اغراض کے سامنے نہ عقلی دلائل کا زور چلتا ہے، نہ اخلاقی اصول کا۔ ممکن ہے افراد کے عقائد بدلے جا سکیں اور وہ اپنے امتیازی حقوق سے دست بردار ہو جائیں۔ اگرچہ یہ بھی شاذ و نادر ہی ہوتا ہے لیکن جماعتیں اور طبقے کبھی ایسا نہیں کرتے۔ اس لئے ایسی سب کوششیں جن کا مقصد یہ تھا، کہ امتیازی حقوق رکھنے والے طبقے کا عقیدہ بدل دیا جائے۔ تاکہ وہ اپنے اقتدار اور ناجائز حقوق سے از خود دست بردار ہو جائے ہمیشہ ناکام ثابت ہوئی ہیں اور کوئی وجہ نہیں کہ ہم یہ سمجھیں کہ آئندہ اس قسم کی کوششیں کامیاب ہوں گی۔ رائن ہولڈ نیبو راپنی کتاب(۱) میں ان معلمین اخلاق کی تردید کرتا ہے "جو یہ خیال کرتے ہیں، کہ اقلیت کی ترقی یا مذہبی ہمدردی کی نشو و نما سے لوگوں کی خود غرضی میں روز بروز کمی ہوتی جاتی ہے۔ اور انسانی جماعتوں اور گروہوں میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے بس یہی کافی ہے کہ اسی عمل ترقی کو جاری رکھا جائے" وہ کہتا ہے "یہ معلمین اخلاق اس بات کو نظر انداز کر جاتے ہیں، کہ انسانی جماعت میں انصاف قائم کرنے کے لئے سیاسی جد و جہد بھی ضروری ہے۔ کیونکہ انہیں یہ احساس نہیں کہ انسان کے مجموعی عمل میں بعض طبعی عناصر شامل ہیں، جو کسی طور پر عقل یا ضمیر کے تابع نہیں ہو سکتے وہ اسے تسلیم نہیں کرتے، کہ جب کوئی مجموعی قوت چاہے وہ شہنشاہی کی شکل میں ظاہر

---

(۱) Moral man & Immoral Society

ہو جاتا ہے۔ طبقوں کے اقتدار کی شکل میں کمزوروں سے ناجائز فائدہ اٹھانا شروع کر دیتی ہے۔ تو اسکا توڑ قوت ہی سے ہو سکتا ہے"۔ ایک جگہ اور وہ لکھتا ہے" چونکہ سماجی معاملات میں عقل ایک حد تک ہمیشہ اغراض کی تابع ہوتی ہے۔ اس لئے سماجی انصاف محض اخلاقی اور عقلی دلیلوں سے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لئے جنگ کرنا لازمی ہو جاتا ہے اور اس جنگ میں قوت کا مقابلہ قوت ہی سے کرنا پڑتا ہے"۔

اس لئے یہ امید رکھنا کہ ایک پورے طبقے یا پوری قوم کے عقائد بدلے جا سکیں گے یا اپنے حریفوں کو عقلی دلائل سے قائل کرنے یا ان کے جذبہ انصاف کو ابھارنے سے باہمی مخالفت دور ہو جائے گی۔ اپنے آپ کو دھوکا دینا ہے۔ یہ محض ایک فریب خیال ہے کہ بغیر موثر دباؤ ڈالے ہوئے یعنی بغیر جبر و تشدد سے کام لیئے ہوئے کوئی حاکم قوم محکوم ملک سے قبضہ اٹھا لے گی۔ یا کوئی طبقہ اپنے اقتدار یا امتیازی حقوق سے دست بردار ہو جائے گا۔

ظاہر ہے کہ گاندھی جی بھی موثر دباؤ ڈالنا چاہتے ہیں۔ اگرچہ وہ اسکو جبر و تشدد نہیں کہتے۔ ان کے نزدیک یہ دباؤ خود اپنی ذات پر تکلیف اٹھا کر ڈالا جا سکتا ہے۔ اس کا سمجھنا ذرا مشکل ہے۔ کیونکہ اس میں ایک مابعد الطبیعاتی عنصر شامل ہے۔ جو کسی مادی پیمانے سے نہیں ناپا جا سکتا۔ بہر حال اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ اس کا حریف پر بڑا زبردست اثر پڑتا ہے۔ اس سے اس کی اخلاقی مزاحمت کی قوت کمزور ہو جاتی ہے اس کا ارادہ متزلزل ہو جاتا ہے۔ اس میں جو بہترین صفات ہیں وہ بیدار ہو جاتی ہیں۔ اور مصالحت کے لئے دروازہ کھل جاتا ہے۔ یہ مسلمہ امر ہے کہ محبت سے پیش آنے اور اپنے اوپر تکلیف اٹھانے کا نفسیاتی اثر دشمن پر اور دیکھنے والوں پر بہت قوی ہوتا ہے۔ اکثر شکاری اس بات سے واقف ہیں کہ ایک وحشی جانور کے نزدیک پہنچنے کے مختلف طریقوں سے کس قدر فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ جانور جارحانہ انداز کو دور سے محسوس

کر لیتا ہے۔ اس کا اثر قبول کرتا ہے۔ اگر آدمی کے دل میں خوف کا شائبہ بھی پیدا ہو جسے وہ خود پوری طرح محسوس نہیں کرتا۔ تو جانور کو کسی نہ کسی طرح اس کا علم ہو جاتا ہے۔ اور وہ خوفزدہ ہو کر حملہ کر دیتا ہے۔ اگر شیر کو سدھانے والے کی ہمت ایک لمحے کے لئے بھی اس کا ساتھ چھوڑ دے، تو یہ خطرہ ہے کہ شیر فوراً حملہ کر دے گا۔ جو آدمی بالکل نڈر ہوتا ہے وحشی جانوروں سے گزند پہنچنے کا بہت کم احتمال ہوتا ہے، سوا اس کے کہ کوئی اتفاقی واقعہ پیش آجائے۔ اس لئے یہ بالکل فطری بات معلوم ہوتی ہے، کہ انسان بھی اس نفسی اثرات سے متاثر ہو، لیکن افراد پر اثر پڑنا اور چیز ہے۔ شبہ تو اس میں ہے کہ کسی طبقے یا جماعت پر اثر پڑتا ہے یا نہیں۔ جماعت من حیث الجماعت فریق مخالف سے ذاتی اور گہرے تعلقات نہیں رکھتی۔ اور اسے جو خبریں پہنچتی ہیں، وہ یک طرفہ اور مسخ شدہ ہوتی ہیں۔ بہرحال اسے دوسرے فریق پر جو اس کی قوت کو توڑنا چاہتا ہے، اس شدت سے غصہ آتا ہے کہ اور سب چھوٹے چھوٹے جذبات اس غصہ سے دب جاتے ہیں۔ وہ ایک مدت سے یہ سمجھنے کا عادی ہوتا ہے کہ اس کا اقتدار اور اس کے امتیازی حقوق سماج کے مفاد کے لئے ضروری ہیں۔ اور اگر کوئی اس سے اختلاف کرے، تو وہ اسے کفر اور الحاد معلوم ہوتا ہے۔ نظم و امن اور موجودہ حالت کا قائم رکھنا اس کی نظر میں سب سے بڑی نیکی بن جاتا ہے اور اس کی مخالفت سب سے بڑا گناہ۔

اس لئے جہاں تک فریق مخالف کا تعلق ہے عقائد کو بدلنے کی کوشش کچھ زیادہ کامیاب نہیں ہوتی۔ بلکہ بعض اوقات تو اسے دوسروں کی نیکی اور نرمی پر اور بھی غصہ آتا ہے۔ کیونکہ اس سے اس کا غلطی پر ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ اور جب آدمی کو یہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ شاید وہی غلطی پر ہے۔ تو اس کی جھنجھلاہٹ اور بڑھ جاتی ہے۔ مگر یہ ضرور ہے کہ عدم تشدد کے طریقے سے مخالفوں کے چند افراد متاثر ہوتے

ہیں۔ اور مخالفت کی مجموعی قوت کم ہو جاتی ہے۔ اور اس سے بھی زیادہ غیر جانبدار لوگوں کی ہمدردی حاصل ہوتی ہے۔ اور دنیا کی رائے عامہ پر بڑا زبردست اثر پڑتا ہے لیکن یہاں بھی اس بات کا امکان ہے کہ حکمراں طبقہ خبروں کو باہر نہ جانے دے یا ان کو مسخ کر دے۔ کیونکہ اشاعت کے جتنے ذرائع ہیں، وہ اسی کے قبضہ میں ہوتے ہیں۔ اور وہ یہ کر سکتا ہے کہ لوگوں کو صحیح واقعات کا علم نہ ہونے دے، عدم تشدد کے طریقے کا سب سے قوی اور وسیع اثر اس ملک کے بے حس لوگوں پر پڑتا ہے۔ جہاں یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ ان کے عقائد یقیناً بدل جاتے ہیں۔ اور وہ اکثر نہایت جوش و خروش کے ساتھ تائید کرنے لگتے ہیں۔ لیکن انہیں ہم خیال بنانا کوئی بڑی بات نہیں، کیونکہ جو مقصد پیش نظر ہوتا ہے، اس سے تو وہ متفق ہوتے ہیں۔ کسی نصب العین کے لئے تکلیفیں اٹھانا ہمیشہ اچھا سمجھا گیا ہے۔ اپنے مقصد کی خاطر سختیاں جھیلنے، ظلم و جور کا مقابلہ کرنے پر۔ مگر ظالم سے انتقام نہ لینے میں وہ عظمت و شان ہے۔ جو خواہ مخواہ دل پر اثر کرتی ہے۔ لیکن اس میں اور بے بسی کی مظلومی میں بہت ہی کم فرق ہے، اور یہ بے بسی کی مظلومی بہت جلد ایک مرض کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اور انسان کے لئے باعث ذلت بن جاتی ہے۔ اگر تشدد میں اس کا خوف ہے کہ انسان کو ایذا رسانی کا شوق نہ ہو جائے، تو عدم تشدد کی منفی صورتوں میں یہ اندیشہ ہے کہ کہیں اسے ایذا اٹھانے کا چسکا نہ پڑ جائے۔ اور پھر اس کا بھی امکان ہے کہ عدم تشدد اپنی کاہلی، اور بزدلی کو چھپانے اور موجودہ حالت کو قائم رکھنے کا بہانہ بنا لیا جائے۔

پچھلے چند سال سے جب سے ہندوستان میں بنیادی، معاشرتی تبدیلیوں کے خیال نے اہمیت حاصل کی ہے۔ یہ بات اکثر کہی جاتی ہے کہ اس قسم کی تبدیلی میں لازمی طور پر تشدد سے کام لینا پڑے گا۔ اس لئے اس کی حمایت جائز نہیں۔ طبقوں کی جنگ کا (چاہے وہ آج بھی موجود ہو) نام تک نہ لینا چاہئے۔ اس لئے کہ اس سے

ہمارے اس خواب میں خلل پڑتا ہے۔ کہ ہم سب طبقوں کے اتحاد عمل سے بغیر تشدّد کے رفتہ رفتہ آگے بڑھتے رہیں گے۔ اور ایک روز کسی نہ کسی منزل پر پہنچ جائیں گے۔ ممکن ہے کہ سماجی مسئلے کے حل کرنے میں کسی وقت تشدد سے کام لینا ضروری ہو جائے، کیونکہ یہ بات یقینی ہے کہ حقوق رکھنے والی جماعتیں اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے تشدد کے استعمال کرنے میں کبھی تامل نہ کریں گی، لیکن اصولاً اگر عدم تشدّد کے طریقے سے ایک زبردست سیاسی تبدیلی کا پیدا کرنا ممکن ہے۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ اس طریقے سے بنیادی، سماجی تبدیلی پیدا کرنا ناممکن سمجھا جائے۔ اگر ہم تشدد کے ذریعے سے سیاسی آزادی حاصل کر سکتے ہیں۔ اور ہندوستان میں برطانوی شہنشاہی کا خاتمہ کر سکتے ہیں، تو اسی کے ذریعے سے جاگیرداروں اور زمینداروں کا مسئلہ اور دوسرے معاشرتی مسائل بھی حل کر سکتے ہیں۔ اور اشتراکی ریاست بھی قائم کر سکتے ہیں۔ یہاں اس سے بحث نہیں، کہ واقعی یہ سب چیزیں عدم تشدد کے ذریعے حاصل کی جا سکتی ہیں یا نہیں۔ مقصد صرف یہ ہے کہ یا تو عدم تشدد کے ذریعے سے دونوں مقصد حاصل ہو سکتے ہیں، یا دونوں میں سے ایک بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ یہ تو یقیناً نہیں کہا جا سکتا کہ عدم تشدد کا طریقہ صرف ایک غیر ملکی حکمراں کے خلاف استعمال کیا جا سکتا ہے۔ صریحی بات ہے کہ ملک کے اندر خود غرض طبقوں اور ترقی کے دشمنوں کے خلاف اسے استعمال کرنا زیادہ سہل ہے۔ کیونکہ ان پر اس کا نفسیاتی اثر کہیں زیادہ قوی ہوگا۔ البتہ جو لوگ تبدیلی سے ڈرتے ہیں۔ ان پر اس کا اثر اتنا نمایاں نہیں ہوتا۔ ہندوستان میں عدم تعاون اور سول نافرمانی کے اس تیزی سے پھیل جانے سے ثابت ہو گیا، کہ کس طرح ایک بے تشدّد تحریک بے شمار آدمیوں پر زبردست اثر ڈالتی ہے۔ اور بہت سے لوگوں کو جو پہلے مذبذب تھے۔ اپنا ہم خیال بنا لیتی ہے۔ لیکن جو لوگ سرے سے اس کے مخالف تھے۔ ان کو تو یہ ہم خیال نہیں بنا سکتی۔ بلکہ اس تحریک کی کامیابی نے ان کے اندیشوں

میں اور اضافہ کر دیا۔ اور ان کی مخالفت اور بڑھ گئی۔

اگر اس بات کو ایک دفعہ تسلیم کر لیا جائے کہ ریاست کو اپنی آزادی کے تحفظ کے لئے جبر و تشدد استعمال کرنے کا حق ہے، تو کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ آزادی حاصل کرنے کے لئے جبر و تشدد سے کام لینا جائز نہ سمجھا جائے، یہ اور بات ہے کہ تشدد کا طریقہ مصلحت کے خلاف ہو، لیکن اسے ناجائز اور ممنوع نہیں کہہ سکتے محض اس سے کہ حکومت برسر اقتدار فرقے کی حیثیت رکھتی ہے، اور اس کے قبضے میں ملک کی مسلح افواج ہیں، یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اسے جبر و تشدد کے استعمال کرنے کا حق مل جاتا ہے، جس سے وہ پہلے محروم تھی، اگر اس کے اقتدار کے خلاف بغاوت کی جائے تو وہ اس کا مقابلہ کس طرح کرے گی؟ ظاہر ہے کہ وہ تشدد کے طریقے اختیار کرنے سے پرہیز کرے گی۔ اور اس کی پوری کوشش کرے گی کہ پرامن طریقے سے کام چلائے لیکن وہ تشدد کے استعمال کا حق تو نہیں چھوڑ سکتی۔ جو لوگ تبدیلی کے مخالف ہیں۔ ان میں بہت سے غیر مطمئن اور شورش پسند عناصر ہوں گے، جو پہلی حالت کی طرف لوٹنا چاہیں گے۔ اگر انہیں یہ خیال ہو گا کہ ان کے تشدد کو روکنے کے لئے نئی ریاست سختی سے کام نہیں لے گی، تو وہ اور دل کھول کر تشدد کریں گے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تشدد اور عدم تشدد (جبر سے کام لینے اور عقائد پر اثر ڈالنے) میں کوئی واضح حد فاصل مقرر نہیں کی جا سکتی یہ مشکل سیاسی تبدیلیوں کے مسئلے میں بھی ہوتی ہے۔ لیکن جب امیروں اور غریبوں کی کشمکش کا سوال ہو تو اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ ہندوستان میں آج کل یہ رجحان ہے کہ کسی مقصد یا پالیسی کو محض اس لئے برا کہا جائے کہ وہ عدم تشدد کے منافی ہے۔

میرے خیال میں مسائل پر غور کرنے کا یہ بالکل الٹا طریقہ ہے۔ ہم نے پندرہ سال ہوئے عدم تشدد کو اس لئے اختیار کیا تھا کہ وہ ہمارے مقصد کے حاصل کرنے کا سب سے مقبول اور مؤثر طریقہ معلوم ہوتا تھا۔ اس وقت ہمارا مقصد عدم تشدد

سے جدا تھا۔ صرف اس کا ضمیمہ یا نتیجہ نہ تھا۔ اس وقت کسی شخص کے منہ سے یہ بات نہیں نکلی تھی، کہ آزادی اور مکمل خود مختاری کی کوشش صرف اسی صورت میں کرنی چاہئے۔ جب یہ عدم تشدد کے طریقوں سے حاصل ہو سکیں۔ لیکن اب خود ہمارا مقصد عدم تشدد کے معیار پر رکھا جاتا ہے۔ اور اگر اس کے مطابق نہ نکلے تو رد کر دیا جاتا ہے۔ غرض عدم تشدد کا تخیل ایک عدم عقیدہ بنتا جاتا ہے جس پر کبھی کسی قسم کا اعتراض کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ اسی لئے عقل کے نزدیک اس کی روحانی کشش زائل ہوتی جاتی ہے۔ اور وہ دن دور نہیں جب یہ مذہب کی شکل میں منتج ہو کر داخل دفتر کر دیا جائے گا۔ یہی نہیں بلکہ یہ مستقل حقوق رکھنے والوں کی کشتی کے لئے لنگر کا کام دے رہا ہے۔ اس سے فائدہ اٹھا کر وہ موجودہ حالت کو قائم رکھنا چاہتے ہیں۔

یہ بات بہت قابل افسوس ہے۔ کیونکہ میرا خیال ہے کہ صرف ہندوستان بلکہ تمام دنیا کے لئے عدم تشدد کا اصول اور بے تشدد جنگ کا طریق عمل بہت مفید ہے اور گاندھی جی نے لوگوں کے خیالات اس کی طرف متوجہ کر کے زبردست خدمت انجام دی ہے مجھے یقین ہے کہ اس کا مستقبل بہت روشن ہے۔ ہو سکتا ہے کہ بنی نوع انسان انہیں مکمل طور پر اختیار کرنے کے لئے ابھی تک تیار نہ ہوا ہو۔ ای کے ڈرامے مدر آف مدر میں ایک شخص کہتا ہے کہ "تم اندھے کے ہاتھ میں شمع دیتے ہو لیکن وہ اس سے سوائے کے سوا اور کیا کام لے سکتا ہے؟" تو یہ ممکن ہے کہ ابھی اس شمع کی روشنی زیادہ نہ پھیلے لیکن تمام بڑے خیالات کی طرح اس کا اثر رفتہ رفتہ بڑھیگا اور ہمارے اعمال کو روز بروز متاثر کریگا۔ عدم تعاون یعنی اس حکومت یا جماعت سے جو بری سمجھی جاتی ہے کسی قسم کا تعاون نہ کرنا بڑا قوی اور موثر اصول ہے۔ معدودے چند اخلاقی قدر رکھنے والے اشخاص بھی عمل کریں تو اس کا اثر پھیلتا ہے۔ اور بڑھتا جاتا ہے۔ جب زیادہ تعداد میں لوگ اسے اختیار کر لیتے ہیں۔ تو اس کا ظاہری اثر اور بھی نمایاں ہو جاتا

ہے لیکن بعض خارجی چیزیں اس کے اخلاقی پہلو کو دھندلا کر دیتی ہیں۔ جب اس کا دائرہ وسیع کیا جاتا ہے، تو اس کی شدت کم ہو جاتی ہے، مجموعی ذہنیت رفتہ رفتہ شخصی ذہنیت پر غالب آجاتی ہے۔ مگر خالص عدم تشدد پر جو زور دیا جاتا ہے اس کی وجہ سے یہ چیز زندگی سے جدا اور دور ہو گئی ہے۔ اور لوگ یا تو اسے آنکھ بند کر کے مذہبی عقیدے کے طور پر قبول کر لیتے ہیں۔ یا بالکل نہیں کرتے۔ ذہنی عنصر بالکل دب کر رہ گیا ہے ۱۹۲۰ء میں اس کا اس کا تخویف پسندوں پر بڑا اثر پڑا تھا۔ ان میں سے بہت سے اس گروہ سے نکل آئے تھے۔ اور جو رہ گئے تھے وہ بھی شبہ میں پڑ جانے کی وجہ سے سست ہو گئے تھے۔ اور انہوں نے اپنے تشدد آمیز مشاغل کو روک دیا تھا۔ لیکن اب ان پر اس کا یہ اثر نہیں ہے۔ خود کانگریس کے اندر ایک اہم جماعت جس نے عدم تعاون اور سول نافرمانی کی تحریک میں نمایاں حصہ لیا۔ اور ایمانداری کے ساتھ عدم تشدد کے طریقے کی شرائط پوری کرنے کی کوشش کی، اب ملحد اور منکر سمجھی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ اسے کانگریس میں رہنے کا کوئی حق نہیں۔ کیونکہ وہ اس کے لئے تیار نہیں کہ عدم تشدد کو اپنا دین و ایمان مانے۔ اور اس مقصد کو ترک کر دے جو اسے دل سے عزیز ہے یعنی اشتراکی ریاست جس میں سب کے ساتھ یکساں انصاف کیا جائے۔ اور ہر شخص کو برابر کے حقوق دیئے جائیں۔ ایک منظم سوسائٹی جس کے قائم کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ موجودہ امتیازی حقوق اور ملکیت کے حقوق میں سے اکثر منسوخ کر دیئے جائیں۔ اس میں شک نہیں کہ ابھی تک گاندھی جی کا بہت بڑا اثر ہے۔ ان کے عدم تشدد میں حرکت اور جارحانہ کیفیت پائی جاتی ہے۔ اور کوئی نہیں کہہ سکتا، کہ کس روز وہ ملک میں برقی لہر دوڑا کر ترقی کی جدوجہد شروع کر دیں گے۔ وہ اپنی عظمت اور متضاد خصوصیات اور عوام میں حرکت پیدا کرنے کی غیر معمولی قوت کی وجہ سے عام معیاروں سے بہت بلند ہیں۔ سلان کو

ہم اس پیمانے سے نہیں ناپ سکتے جس سے دوسروں کو ناپتے ہیں۔ لیکن بہت سے لوگوں میں جو ان کے پیرو ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اس قسم کی منفی صلح پسندی اور عدم مزاحمت کی جھلک نظر آتی ہے جس کی تعلیم ٹالسٹائی نے دی ہے۔ یا وہ ایک تنگ خیال فرقے کے رکن بن کر رہ جاتے ہیں۔ جنہیں زندگی اور واقعات سے لگاؤ تک نہیں، ان لوگوں کے گرد بہت سے وہ لوگ جمع ہو جاتے ہیں جن کا مفاد موجودہ نظام کے قائم رکھنے سے وابستہ ہے۔ اور جو اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے عدم تشدد کی آڑ لیتے ہیں۔ اسی طرح زمانہ سازی اور مصلحت پرستی کا قدم درمیان میں آجاتا ہے۔ مخالف کو ہم خیال بنانے کی کوشش کا انجام عدم تشدد کی بدولت یہ ہوتا ہے کہ آدمی خود دشمن کا ہم خیال بن کر اس کی طرف سے لڑنا شروع کر دیتا ہے۔ جب ہمارا جوش گھٹتا ہے۔ اور ہم کمزور ہونے لگتے ہیں تو ہم پیچھے ہٹنے اور مصالحت کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اور اپنا جی خوش کرنے کے لئے یہ کہتے ہیں کہ ہم دشمن کو برابر ہرا رہے ہیں۔ اور بعض وقت یہ کامیابی ہم اپنے پرانے رفیقوں کو قربان کر کے حاصل کرتے ہیں۔ ہم ان کی انتہا پسندیوں اور ان کے ان بیانات کی جو ہمارے نئے دوستوں کو ناگوار ہوں۔ مذمت کرتے ہیں۔ اور ان پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ انہوں نے ہم میں تفرقہ ڈال دیا ہے۔ سماجی نظام میں بنیادی تبدیلی کی جگہ اس پر زور دیا جاتا ہے کہ موجودہ نظام میں فراخ دلی اور احسان و مروت پیدا کر کے اس کی اصلاح کی جائے۔ اور اونچے طبقوں کے مستقل حقوق بدستور قائم رہیں۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ گاندھی جی نے وسائل کی اہمیت پر زور دے کر ہماری بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔ مگر اس کے باوجود میری یہ قطعی رائے ہے کہ مقصد کو وسائل سے زیادہ اہمیت حاصل ہونی چاہیے۔ جب تک ہم اس بات کو نہیں سمجھیں گے۔ اس وقت تک اس رہرو کی طرح بھٹکتے پھریں گے جس کی کوئی منزل نہ ہو۔ اور اتنی قوتوں کو ضمنی اور غیر اہم

ممالک پر قبضہ کرتے رہیں گے لیکن ظاہر ہے کہ ذرائع کو بھی نظرانداز نہیں کیا
جا سکتا۔ کیونکہ اخلاق چیزوں سے قطع نظر ان کا ایک عملی پہلو بھی ہے۔ برے اور غیر اخلاقی
ذرائع اختیار کرنے سے اکثر اصل مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ اور نہایت زبردست نئی
پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں کسی شخص کے متعلق جو رائے اس کے مقصد کے لحاظ
سے نہیں بلکہ ذرائع کے لحاظ سے قائم کی جاتی ہے۔ جو وہ اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے
لئے اختیار کرتا ہے۔ اگر ایسے ذرائع اختیار کئے جائیں جن سے خواہ مخواہ جھگڑے پیدا
ہوں اور دلوں میں نفرت بڑھے، تو راہ کی مشکلات بڑھتی جائیں گی اور منزل مقصود
دور ہوتی جائے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ مقاصد اور ذرائع میں چولی دامن کا ساتھ ہے اور
ان کو ایک دوسرے سے جدا کرنا ممکن ہی نہیں۔ اس لئے لازمی طور پر ذرائع ایسے ہونے
چاہئیں جن سے مخالفت اور نفرت نہ پیدا ہو، یا کم سے کم ایک حد سے آگے نہ بڑھے
(کیونکہ اس کا پیدا ہونا تو ناگزیر ہے) اور باہمی محبت کو ترقی ہو۔ غرض سوال کسی خاص
طریقے کے اختیار کرنے یا نہ کرنے کا نہیں ہے۔ بلکہ محض نیت، ارادے اور
مزاج کا۔ چنانچہ گاندھی جی کا زور بھی اسی نیک نیتی پر ہے۔ اور اگر انہیں ایک
طرف انسانی فطرت کے بدلنے میں ناکامیابی ہوئی۔ تو دوسری طرف ایک ایسی بڑی
تحریک میں، جس میں لاکھوں آدمی شریک تھے۔ یہ نیک نیتی پیدا کرنے میں حیرت
انگیز کامیابی ہوئی۔ سخت اخلاقی ضبط و انضباط پر انہوں نے جو زور دیا۔ وہ
بھی بہت ضروری تھا۔ اگرچہ ان کے انفرادی ضبط کے معیار کو شاید ہر شخص
تسلیم نہ کرے۔ وہ انفرادی گناہوں اور کمزوریوں کو بہت زیادہ اور معاشرتی
گناہوں کو بہت کم اہمیت دیتے ہیں۔ اس ضبط کی ضرورت بالکل واضح ہے۔
کیونکہ مصیبت اور تکلیف کی زندگی کو چھوڑ کر ارباب اقتدار میں شامل ہونے کے
لالچ نے بہت سے کانگریسیوں کو اپنی طرف کھینچ لیا ہے۔ ہر مشہور کانگریسی کے لئے

اس دنیا وہی جنت کا دروازہ ہر وقت کھلا ہوا ہے۔

ساری دنیا آج مختلف قسم کی کشاکش میں نظر آتی ہے۔ لیکن ان میں سب سے سخت روحانی کشمکش ہے مشرق میں یہ کشمکش خاص طور پر نمایاں ہے کیونکہ ایشیا کے ملکوں میں جو تبدیلیاں حال میں ہوئی ہیں۔ ان کی رفتار دوسرے ملکوں کے مقابلے میں زیادہ تیز تھی۔ اس لیئے نئے حالات سے مطابقت پیدا کرنا یہاں اور زیادہ تکلیف دہ ہے۔ سیاسی مسئلہ جو اس وقت سب پر حاوی نظر آتا ہے۔ نسبتاً سب سے کم اہمیت رکھتا ہے۔ گو ہمارے لئے یہ مسئلہ سب سے مقدم ہے اور دوسرے اہم تر مسائل کو حل کرنے سے پہلے اسکا قابل اطمینان تصفیہ ہونا ضروری ہے گذشتہ کئی قرنوں سے ہم ایک غیر تغیر پذیر سماجی نظام کے عادی ہیں۔ ہم میں سے بہت سے لوگوں کا ابھی تک یہ عقیدہ ہے کہ صرف یہی نظام صحیح اور قابل عمل ہے۔ لیکن ماضی اور حال میں مطابقت پیدا کرنے کی جو کوشش اس طرح کی جاتی ہیں وہ لازمی طور پر ناکام رہتی ہیں۔ امریکہ کے ماہر معاشیات ویبلن نے لکھا ہے کہ "معاشی اخلاق اصل میں معاشی ضروریات کا تابع ہے"۔ موجودہ زمانے کی ضروریات ہمیں مجبور کرینگی کہ ہم ان کے مطابق ایک نیا نظام اخلاق مرتب کریں۔ اگر ہمیں اس روحانی کشمکش سے نجات پانا ہے۔ اور اس بات کو دریافت کرنا ہے کہ صحیح روحانی معیار کے مطابق آج کل کون سی قدریں زیادہ اہمیت رکھتی ہیں، تو ہمیں ان مسائل پر جرأت اور دلیری کے ساتھ غور کرنا پڑے گا۔ مذہبی عقیدوں کی آڑ میں پناہ لینے سے کام نہیں چلے گا۔ مذہب کی تعلیم اچھی ہو یا بری، لیکن اس کا طریقہ تعلیم اور اس کا یہ مطالبہ کہ ہم اس کے اصولوں کو آنکھ بند کر کے مان لیں ہمیں کسی مسئلے پر عقلی نقطۂ نظر سے غور ہی نہیں کرنے دیتا۔ بقول فرائڈ کے مذہب کے ادعائی عقائد کو مان لینا چاہیئے۔ کیونکہ اول تو ہمارے آباو اجداد انہیں ابتدا سے مانتے

آئے ہیں۔ دوسرے ہمارے پاس ایسے ثبوت موجود ہیں۔ جو اسی قدیم زمانے سے سینہ بہ سینہ چلے آرہے ہیں۔ تیسرے، ہیں ان کے بارے میں چون وچرا کرنے کی ممانعت کردی گئی ہے۔" (۱)

اگر ہم عدم تشدد اور اس کے تمام لوازمات کو مذہب کے اذعانی نقطۂ نظر سے دیکھیں تو اس میں دلیل اور بحث کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ اس کی حیثیت ایک تنگ نظر فرقے کے معتقدات کی سی ہو جاتی ہے۔ جن کا یا تو بے دلیل اقرار کیجئے ورنہ انکار کردیجئے۔ نہ اس میں کوئی زندگی باقی رہتی ہے۔ اور نہ اسے موجودہ مسائل سے تعلق رہتا ہے۔ لیکن اگر ہم موجودہ حالات کی روشنی میں اس سے بحث کرنا چاہتے ہیں، تو ہمیں دنیا کی از سر نو تشکیل کرنے میں اس سے بہت مدد ملے گی۔ اس صورت میں ہمیں ایک انسانی جماعت کی فطرت اور کمزوریوں کو پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ کوئی تحریک، جو عوام میں پھیلائی جائے، خصوصاً ایسی تحریک جس کا مقصد بنیادی اور انقلابی تبدیلیاں کرنا ہو۔ صرف لیڈروں کی ذہنیت سے متاثر نہیں ہوتی۔ بلکہ اس پر عام حالات کا اور اس سے بھی زیادہ ان لوگوں کے خیالات کا اثر پڑتا ہے۔ جن سے وہ کام لیتی ہے

تشدد کا دنیا کی تاریخ میں بہت اہم حصہ رہا ہے۔ آج بھی اس کی اہمیت کم نہیں ہوئی۔ شاید ایک عرصے تک کم نہیں ہو گی۔ ماضی کی اکثر تبدیلیاں تشدد اور جبر کے ذریعے ہوئی ہیں۔ ڈبلیو ای گلیڈاسٹون نے ایک دفعہ کہا تھا۔ "مجھے نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے۔ کہ اگر اس ملک کے لوگوں کی سیاسی بے چینی کے زمانے میں صرف یہی وعظ سنایا جاتا، کہ تشدد سے نفرت کرو۔ نظم و امن سے محبت کرو۔ اور صبر سے کام لو تو ملک کو کبھی آزادی نصیب نہ ہوئی ہوتی۔"

---

(۱) The future of an illusion

جبر و قوت کو جو اہمیت حاصل رہی ہے۔ اور اب بھی حاصل ہے۔ اس سے انکار کرنا ناممکن ہے۔ اس سے انکار کرنے کے معنی یہ ہوں گے۔ کہ ہم زندگی کی حقیقتوں کو نظرانداز کر رہے ہیں۔ تاہم تشدد بری چیز ہے۔ اور اس سے بڑی بڑی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اور تشدد سے بھی بدتر نفرت، ظلم، انتقام، اور سزا کے وہ جذبے ہیں۔ جو اکثر اس سے وابستہ ہوتے ہیں۔ سچ پوچھئے تو تشدد بجائے خود اتنی بری چیز نہیں ہے۔ جتنے اس کے یہ لوازم۔ تشدد ان جذبوں سے پاک بھی ہو سکتا ہے۔ اس کا استعمال اچھے مقصد کے لئے بھی کیا جا سکتا ہے، اور برے مقصد کے لئے بھی، لیکن اسے ان جذبوں سے پاک رکھنا سخت دشوار ہے۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ جہاں تک ہو سکے۔ اس سے پرہیز کیا جائے، مگر تشدد سے پرہیز کرنے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ آدمی اس سے بدتر چیزوں کو برداشت کر لے۔ دوسروں کے تشدد کے آگے سر جھکانا، یا کسی غیر منصفانہ نظام حکومت کو قبول کرنا جس کی بنیاد تشدد پر قائم ہے۔ عدم تشدد کے اصول کے قطعاً منافی ہے۔ عدم تشدد کا طریقہ اسی وقت جائز قرار دیا جا سکتا ہے۔ جب اس میں حرکت ہو اور غیر منصفانہ حکومت یا انتظام جماعت کو بدلنے کی قابلیت رکھتا ہو۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ عدم تشدد میں اس کی قابلیت ہے یا نہیں، میرے خیال میں یہ طریقہ ہمیں ترقی کے مرحلے طے کرنے میں بہت کچھ مدد دے سکتا ہے۔ مگر اس میں مجھے شبہ ہے کہ یہ ہمیں منزل مقصود تک پہنچا سکتا ہے۔ بہرحال جبر کی کوئی نہ کوئی شکل ناگزیر ہے۔ کیونکہ جو لوگ اقتدار اور حقوق کے مالک ہوتے ہیں۔ وہ انہیں اس وقت تک نہیں چھوڑتے۔ جب تک وہ اس پر مجبور نہ کئے جائیں۔ یا جب تک ایسے حالات نہ پیدا کر دئے جائیں۔ کہ ان کے لئے ان حقوق کا نہ چھوڑنا چھوڑنے سے زیادہ مضر ہے۔ سماج کی موجودہ کشمکش یعنی قومی جنگ اور طبقوں کی جنگ کا تصفیہ بجز جبر کے اور کسی صورت میں ممکن نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ پہلے لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانے

کا کام بہت بڑے پیمانے پر کرنا پڑے گا۔ کیونکہ جب تک بہت بڑی جماعت ہم خیال نہ ہو جائے۔ اس وقت تک معاشرتی تبدیلی کی کوئی تحریک مضبوط بنیاد پر قائم نہیں ہو سکے گی۔ لیکن اس کے بعد چند اشخاص پر جبر کرنے کی ضرورت پڑے گی ہمارے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ ہم اس بنیادی اختلاف پر پردہ ڈال دیں اور یہ ظاہر کرنے کی کوشش کریں کہ اس قسم کے اختلافات کا وجود ہی نہیں ہے۔ اس سے ہم نہ صرف حق کو چھپانے کے مجرم ہوں گے۔ بلکہ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا، کہ لوگ اصلی واقعات سے ناواقف رہیں گے۔ موجودہ نظام کو ایک سہارا مل جائیگا اور حکمراں طبقوں کو اپنے امتیازی حقوق کے لئے ایک اخلاقی بنیاد ہاتھ آجائے گی جس کی وہ ہمیشہ تلاش میں رہتے ہیں۔ ایک غیر منصفانہ نظام سے جنگ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ان غلط مفروضات کی تردید کی جائے۔ جن پر اس کا دارومدار ہے۔ اور حقیقت بے نقاب کر دی جائے۔ تحریک عدم تعاون کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ ان جھوٹے مفروضات کی قلعی کھول دیتی ہے۔ اور ہماری اس کوشش کو تقویت پہنچاتی ہے، کہ ہم انہیں تسلیم کرتے اور ان سے اشتراک عمل کرنے سے انکار کر دیں

ہمارے پیش نظر ایک ایسی سماج ہے جس میں مختلف طبقوں کا فرق مٹ جائے معاشی معاملات میں سب کے ساتھ یکساں انصاف برتا جائے اور سب کو یکساں موقع دیا جائے۔ ایک منظم سماج جس کا مقصد یہ ہو، کہ بنی نوع انسان بلند تر مادی اور تمدنی سطح پر پہنچ سکے۔ اور اس میں روحانی صفات یعنی اشتراک عمل، بے غرضی، خدمت خلق، حق پسندی، ہمدردی اور محبت نشو و نما پا سکیں ہمارا نصب العین یہ ہے کہ ایک دن اس طرح کا ایک عالمگیر نظام قائم ہو جائے اس راہ میں جو چیز حائل ہو، اسے ہٹانا پڑے گا۔ اگر ممکن ہو تو نرمی سے، ورنہ مجبوراً سختی سے۔ یہ یقینی بات ہے کہ جبر کی ضرورت اکثر پیش آئے گی۔ لیکن اگر قوت کا استعمال لیا جائے تو وہ نفرت اور

ظلم کے جذبہ کے ساتھ نہ ہونا چاہیے ۔ بلکہ ٹھنڈے دل سے محض رکاوٹ کو دور کرنے کے لیے ۔ ظاہر ہے اس میں سخت دشواری پیش آئے گی ۔ منزل بڑی کٹھن ہے اور قدم قدم پر لغزش کا اندیشہ ہے ۔ مگر ان مشکلات کا علاج یہ نہیں کہ ہم ان کو نظرانداز کر دیں ۔ بلکہ یہ ہے کہ ہم ان کی حقیقت کو سمجھیں ، اور بہادری سے ان کا مقابلہ کریں ۔ بہ ظاہر یہ تیں خیالی اور دور از کار معلوم ہوتی ہیں اور یقین نہیں آتا کہ لوگوں کی ایک بڑی جماعت میں یہ اعلیٰ جذبات پیدا ہو سکتے ہیں ، لیکن ہمیں انہیں پیش نظر رکھنا چاہیے ۔ اور ان پر زور دیتے رہنا چاہیے ۔ ممکن ہے کہ ان کی وجہ سے آہستہ آہستہ ان نفرتوں اور تلخیوں میں کمی واقع ہو جائے ۔ جن سے ہمارے دل بھرے ہوئے ہیں ۔

ہمارا طریقہ وہی ہونا چاہیے ۔ جو ہمیں اس منزل تک پہنچا سکے ۔ اور ان جذبات پر مبنی ہو ۔ لیکن ہمیں سمجھ لینا چاہیے ، کہ انسان کی فطرت اجتماعی کی موجودہ حالت کو دیکھتے ہوئے عام لوگ ہمیشہ ہماری تعلیم و تلقین پر دھیان نہیں دیں گے ۔ اور اعلیٰ اخلاقی اصول پر عمل نہ کریں گے ۔ اس لیے لوگوں کے خیالات پر اثر ڈالنے کے علاوہ ہمیں اکثر جبر سے بھی کام لینا پڑے گا ۔ زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتے ہیں کہ اس جبر کو محدود رکھیں ۔ اور اس سے اس طرح کام لیں کہ اس کی خرابیاں کم ہو جائیں ۔

(۶۴)

پھر دہرہ جیل میں

علی پور جیل میں میری صحت اچھی نہیں تھی۔ میرا وزن بہت کم ہو گیا تھا۔ اور کلکتے کی ہوا اور گرمی سے تکلیف ہو رہی تھی۔ کچھ دن سے یہ افواہیں سننے میں آتی تھیں، کہ میری بدلی کسی بہتر آب و ہوا کے مقام پر ہو جائے گی۔ ۷ مئی کو مجھے حکم دیا گیا کہ اپنا بوریا بندھنا سنبھال کر یہاں سے چل دو۔ معلوم ہوا کہ دہرہ دون جیل بھیجا جا رہا ہوں۔ کئی مہینے کال کوٹھری میں بند رہنے کے بعد شام کے ٹھنڈے وقت گاڑی میں کلکتے کی گلیوں سے گذرنا بہت بھلا معلوم ہوا اور ہوڑے کے اسٹیشن پر لوگوں کا مجمع دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔

میں اپنی بدلی سے خوش تھا۔ اور مجھے دہرہ دون پہنچنے کا اشتیاق تھا جہاں سے پہاڑ اس قدر قریب ہیں۔ وہاں آ کر معلوم ہوا کہ جو حالت اب سے نو مہینے پہلے میرے نینی جاتے وقت تھی، وہ اب نہیں ہے۔ اب میں ایک نئی جگہ رکھا گیا۔ یہ ایک مویشیوں کے باندھنے کا سائبان تھا جس کی صفائی اور درستی کر لی گئی تھی۔

جیل کی کوٹھری کی حیثیت سے یہ اچھی خاصی جگہ تھی۔ اس سے ملا ہوا کوئی پچیس فٹ لمبا صحن بھی تھا۔ یہ اس کوٹھری سے جو مجھے دہرہ دون میں پہلی بار ملی تھی، بہتر تھی۔ مگر تھوڑی ہی دیر میں مجھے معلوم ہو گیا کہ اس میں بہت سی خرابیاں بھی ہیں۔ چار دیواری جو پہلے دس فٹ اونچی تھی۔ خاص طور پر میرے لئے چار پانچ فٹ اور اونچی کر دی گئی تھی۔ پہاڑ کا منظر جس کا مجھے اسقدر اشتیاق تھا۔ بالکل چھپ گیا تھا۔ صرف چند درختوں کی

چوٹیاں نظر آتی تھیں میں تین مہینے سے زیادہ اس جیل میں رہا اور مجھے پہاڑوں کی ایک جھلک تک دیکھنی نصیب نہ ہوئی۔ پہلی بار مجھے جیل کے دروازے کے سامنے ٹہلنے کی اجازت تھی مگر اب وہ بھی نہیں رہی۔ کوٹھری کے ساتھ کا چھوٹا سا صحن میری ورزش کے لیئے کافی سمجھا گیا۔

یہ اور اسی قسم کی اور بندشیں بہت مایوس کن تھیں اور میں ان سے دق آگیا مجھے طبیعت میں ایک میٹھاپن سا پیدا ہو گیا اور جو تھوڑی بہت میرے لیئے ورزش جائز رکھی گئی تھی اس کے کرنے کو بھی جی نہیں چاہتا تھا۔ مجھے کبھی تنہائی کا اور دنیا سے بے خبر ہونے کا اس قدر احساس نہیں ہوا تھا جتنا اس مرتبہ ہو رہا تھا۔ اس قید تنہائی کا اثر میرے اعصاب پر پڑنے لگا اور میرے جسم اور دماغ کی قوت گھٹنے لگی۔ میں خوب جانتا تھا کہ دیوار کے پار صرف چند فٹ کے فاصلہ پر تازگی اور فرحت کا سماں چھایا ہوا ہوگا۔ ہری ہری گھاس اور نرم نرم مٹی کی ٹھنڈی خوشبو آ رہی ہوگی۔ دور دور تک کا منظر نظر آ رہا ہوگا۔ مگر یہ سب چیزیں میری پہنچ سے باہر تھیں۔ اور میری آنکھیں ان دیواروں کو دیکھتے دیکھتے پتھرا گئیں۔ جیل کی معمولی زندگی کی چہل پہل بھی نہیں تھی۔ اس لیئے کہ میں اور قیدیوں سے الگ رکھا گیا تھا۔

چھ ہفتے کے بعد برسات شروع ہو گئی۔ اب ہوا کچھ اور ہی ہو گئی اور اس میں نئی زندگی کی آہٹ سنائی دینے لگی۔ حرارت کے کم ہونے سے جسم کو تو آرام ملا مگر آنکھوں کو اور دل کو چین نہ آیا۔ کبھی کبھی میرے احاطے کا پھاٹک کسی پہرے والے کے آنے جانے کے لیئے کھلتا اور مجھے دم بھر کو باہر کی دنیا کی ایک جھلک نظر آ جاتی ہرے بھرے کھیتوں اور درختوں کے شوخ رنگ اور ان پر موتیوں کی طرح بکھرے ہوئے شبنم کے قطرے۔ مگر یہ صرف چند لمحے کا نظارہ ہوتا جو بجلی کی طرح کوند کر چھپ جاتا۔ پورا دروازہ شاید ہی کبھی کھلتا ہو۔ غالباً پہرے والوں کو حکم تھا کہ اگر میں

کہیں آس پاس موجود ہوں تو دروازہ ہرگز نہ کھلنے پائے اور جب کھلے بھی تو بس تھوڑا ہی سا۔ سبزی اور شادابی کی یہ جھلک دیکھ کر مجھے تسکین نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ دل میں کاٹ کا درد بن کر دل میں اٹھتا تھا یہاں تک کہ بعض اوقات دروازہ کھلتا تو اُدھر دیکھنے کی ہمت نہ پڑتی۔

اصل میں یہ ساری اُداسی جیل کی وجہ سے نہیں تھی، اگرچہ اس کا بھی اس میں کچھ حصّہ تھا۔ یہ باہر کے واقعات، کملا کی بیماری، اور میری سیاسی پریشانیوں کا ردِّ عمل تھا۔ مجھے یہ محسوس ہونے لگا تھا۔ کہ کملا کو پرانی بیماری نے آلیا ہے۔ اور میں اپنی بے بسی پر کڑھتا تھا۔ کہ اس کی کوئی خدمت نہیں کر سکتا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر میں اس کے پاس ہوتا تو اسے بہت تقویت پہنچتی۔

برخلاف علی پور کے، ڈیہرہ دون جیل میں مجھے ایک روزانہ اخبار پڑھنے کو ملتا تھا باہر کے سیاسی واقعات اور دوسرے حالات معلوم ہوتے رہتے تھے۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا جلسہ تقریباً تین سال کے بعد (اس مدّت کے بہت بڑے حصّے میں وہ خلاف قانون قرار دے گئی تھی) پٹنے میں ہوا تو اس کی کارروائی بہت مایوس کرنے والی تھی۔ مجھے سخت تعجب تھا کہ ہندوستان میں اور ساری دنیا میں اتنا کچھ ہو چکنے بعد اس پہلے جلسے میں صورت حال کا جائزہ لینے اور واقعات پر مفصل بحث کرکے پرانی لیکھ سے ہٹنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ گاندھی جی دور سے دیکھنے میں اپنی قدیم تحکمانہ شان میں نظر آرہے تھے۔ ان کا قول تھا "اگر تم میرے پیچھے چلنا چاہتے ہو تو تمہیں میری شرطیں ماننی پڑیں گی"۔ یہ مطالبہ اپنی جگہ پر بالکل ٹھیک تھا اس لیئے کہ اگر انہیں ساتھ لینا تھا تو ان سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اپنے دلی عقیدوں کےخلاف عمل کریں، مگر معلوم ہوتا تھا کہ حکم منوانے پر بہت زیادہ زور دیا جا رہا ہے اور آپس کے مشورے سے ایک پالیسی تجویز کرنے پر بہت کم توجہ کی جاتی ہے۔ یہ عجب

بات ہے کہ گاندھی جی دلوں پر اپنی مرضی کا سکہ بٹھا دیتے ہیں اور پھر شکایت کرتے ہیں کہ لوگ خود کچھ نہیں کر سکتے۔ میرے خیال میں بہت کم شخصوں کو جمہور کی عقیدت اور اطاعت اس حد تک نصیب ہوئی جتنی انہیں حاصل ہے اور لوگوں کو اس وجہ سے قصوروار ٹھہرانا کہ وہ ان کے اونچے معیار تک نہیں پہنچ سکتے بے انصافی ہے پٹنے کے جلسے میں گاندھی جی آخر تک ٹھہرے بھی نہیں اس لئے کہ انہیں اپنا ہریجنوں کی اصلاح کا دورہ جاری رکھنا تھا۔ انہوں نے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کو رائے دی کہ مستعدی سے کام کرے اور ورکنگ کمیٹی نے جو ریزولیوشن بھیجے ہیں انہیں جلدی سے نبٹا دے یہ کہہ کر وہ چلے گئے۔

مگر غالباً زیادہ طول طویل بحث سے کچھ فائدہ نہ ہوتا۔ کمیٹی کے ممبروں کے خیالات الجھے ہوئے تھے اور وہ معاملات کو وضاحت سے نہیں سوچ سکتے تھے اعتراض کرنے کو تو بہت سے لوگ تیار تھے مگر تعمیری تجویز ایک بھی پیش نہیں ہوئی اس وقت کے حالات کے لحاظ سے یہ قدرتی بات تھی اس لئے کہ تحریک نافرمانی کا سارا بوجھ انہیں لوگوں پر، جو مختلف صوبوں کے لیڈر تھے پڑا تھا اور ان کے جسم اور دماغ تھکے ہوئے تھے اس بات کا ایک دھندلا سا احساس سب کو تھا کہ سول نافرمانی کو روک دینا چاہئے مگر سوال یہ تھا کہ اس کے بعد کیا کیا جائے؟ لوگوں کے دو فریق ہو گئے تھے ایک تو یہ چاہتا تھا کہ کونسلوں کے ذریعے سے خالص آئینی جدوجہد کی جائے اور دوسرا کچھ دھندلے سے اشتراکی خیالات رکھتا تھا ممبروں کی بہت بڑی تعداد دونوں فریقوں میں سے کسی میں شریک نہیں تھی وہ آئینی طریقوں کی طرف لوٹنا پسند نہیں کرتے تھے مگر اس کے ساتھ اشتراکیت سے بھی ڈرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ یہ ان میں پھوٹ پیدا کر دیگی۔ یہ لوگ کوئی تعمیری خیالات نہیں رکھتے تھے اور انہیں جو کچھ امید تھی اور جو کچھ سہارا تھا وہ

گاندھی جی کی ذات سے تھا۔ پہلے کی طرح وہ ان کی طرف مڑ گئے اور ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگے حالانکہ وہ ان کی رائے سے پوری طرح متفق نہیں تھے۔ گاندھی جی کی مدد سے اعتدال پسند اور آئین پسند حضرات کو کمیٹی میں اور کانگریس میں غلبہ حاصل ہو گیا۔

ان سب باتوں کی پہلے ہی سے توقع تھی۔ لیکن ان کے رد عمل سے کانگریس اس قدر پیچھے ہٹ گئی جس کا مجھے خیال بھی نہ تھا۔ پچھلے پندرہ سال میں یعنی ترک موالات کی تحریک کے بعد سے کانگریس کے لیڈروں نے اس قدر آئین پسندی کا اظہار کبھی نہیں کیا تھا۔ یہاں تک کہ پرانی سوراج پارٹی بھی خود رد عمل کا نتیجہ تھی۔ ان نئے لیڈروں سے بہت آگے تھی اور پھر ان میں ایسی شخصیتیں بھی نہیں تھیں جیسی سوراج پارٹی میں تھیں۔ بہت سے لوگ جو کانگریس کی تحریک سے جب تک اس میں شریک ہونا خطرناک تھا، دوری دور رہتے تھے اب آموجود ہوئے اور انہیں بڑی اہمیت حاصل ہو گئی۔

گورنمنٹ نے کانگریس کو خلاف قانون قرار دینے کا حکم منسوخ کر دیا اور وہ ایک جائز انجمن بن گئی۔ مگر اس کی بہت سی ملحقہ اور ماتحت جماعتیں مثلاً "سیوا دل"، کسان سبھائیں اور تعلیمی ادارے اور نوجوان سبھائیں جن میں بچوں کی ایک انجمن بھی شامل تھی، بدستور خلاف قانون تھیں خصوصاً "خدائی خدمت گار" جو سرحد کے سرخ پوش کہلاتے تھے، اب تک قانون کے باغی سمجھے جاتے تھے۔ یہ انجمن ۱۹۳۱ء میں باقاعدہ کانگریس میں شامل کی جا چکی تھی اور صوبہ سرحد کی کانگریس کی شاخ قرار دی گئی تھی یعنی باوجود اس کے کہ کانگریس نے عملی احتجاج بالکل ترک کر دیا اور آئینی طریقوں کی طرف لوٹ آئی حکومت نے وہ تمام خاص قانون جو سول نافرمانی کو رد کرنے کے لئے بنے تھے اسی طرح قائم رکھے بلکہ کانگریس کی اہم ماتحت جماعتوں کو خلاف قانون رہنے دیا۔ کسانوں اور مزدوروں کی انجمنوں کو دبانے کا خاص اہتمام کیا گیا اور دلچسپ

بات یہ تھی کہ بڑے بڑے حکام نے زمینداروں کے پاس جاکر تاکید کی کہ تم اپنی تنظیم کرو۔ زمینداروں کی انجمنوں کے لیے تمام سہولتیں بہم پہنچائی گئیں چنانچہ صوبہ متحدہ کی دو بڑی انجمنوں کا چندہ سرکاری طور پر مال گذاری کے ساتھ وصول کیا جاتا ہے۔

یوں تو میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی فرقہ وارانہ انجمنوں کو ہمیشہ سے ناپسند کرتا ہوں مگر ایک واقعے کی وجہ سے خاص طور پر مجھے ہندو مہاسبھا سے سخت رنج پہنچا۔ اس کے ایک سکریٹری نے یہ غضب کیا کہ بغیر کسی تعلق کے اس حکم کی تائید کر ڈالی جو سرکار کی سرخ پوش جماعت کو خلاف قانون قرار دینے کے لیے جاری کیا گیا تھا۔ اور حکومت کو اس فعل پر شاباشی دی مجھے سخت حیرت تھی۔ کہ لوگوں سے ان کے معمولی مدنی حقوق چھیننے کی حمایت کی جارہی ہے۔ اور وہ بھی اس وقت جب کوئی جارحانہ تحریک موجود نہیں ہے اصول کے سوال کو چھوڑ کر دیکھا جائے تب بھی ہر شخص جانتا تھا کہ سرحد والوں نے تین سال کی کش مکش میں کمال کر دکھایا۔ اور ان کا لیڈر خان عبدالغفار خاں جس کا سا بہادر اور کھرا آدمی ہندوستان میں مشکل سے نکلے گا۔ اب تک جیل میں ہے جہاں وہ بغیر عدالتی تحقیقات کے شاہی قیدی کی حیثیت سے بھیجا گیا تھا۔ میرے نزدیک فرقہ وارانہ تعصب کی اس سے بدتر مثال نہیں ہو سکتی۔ اور مجھے توقع تھی کہ ہندو مہاسبھا کے بڑے بڑے لیڈر فوراً اپنے رفیق کار کی اس رائے سے بے تعلق ہونے کا اعلان کریں گے۔ مگر جہاں تک مجھے معلوم ہوا ان میں سے کسی نے اس معاملے کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں کہا۔

ہندو مہاسبھا کے سکریٹری کے اس بیان سے مجھے سخت پریشانی تھی۔ یہ بجائے خود بہت بری چیز تھی مگر میرے لیے اس وجہ سے اور زیادہ تکلیف دہ تھی کہ میں اسے ملک کی موجودہ حالت کا ایک نمونہ سمجھتا تھا۔ اس دن سہ پہر کو گرمی سے نڈھال سو گیا۔ تو ایک عجیب خواب نظر آیا۔ میں نے دیکھا۔ کہ خان عبدالغفار خان پر لوگ

ہر طرف سے حملہ کر رہے ہیں اور میں ان کو بچانے کے لیئے لڑ رہا ہوں۔ آنکھ کھلی تو طبیعت بہت پست اور اداس تھی اور سارا تکیہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ اس پر مجھے تعجب ہوا اس لیئے کہ جاگتے میں کبھی میرے جذبات کا جوش اس طرح ظاہر نہیں ہوا کرتا

بات یہ ہے کہ ان رتوں میرے اعصاب بہت ہی کمزور ہو گئے تھے۔ سوتے میں بے چینی رہتی تھی جو میرے لیئے غیر معمولی چیز تھی۔ اور طرح طرح کے بھیانک خواب نظر آتے تھے بعض وقت میں نیند میں چیخ اٹھتا تھا۔ ایک بار شاید بہت زور کی چیخ نکل گئی۔ اس لیئے کہ جب میں چونکا تو دیکھا کہ پہرے والے میرے شور و غل سے پریشان میرے پاس کھڑے ہیں۔ میں نے خواب میں یہ دیکھا تھا کہ کوئی میرا گلا گھونٹ رہا ہے۔

اسی زمانے میں کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے ایک ریزولیوشن سے بھی مجھے تکلیف ہوئی۔ اس ریزولیوشن کے پاس کرنے کی وجہ یہ بتائی گئی تھی۔ کہ ذاتی املاک کی ضبطی اور طبقوں کی جنگ کی ضرورت کے متعلق بہت سی غلط باتیں مشہور کی جا رہی ہیں" اور اس میں کانگریس والوں کو یہ یاد دلایا گیا تھا۔ کہ کراچی کے ریزولیوشن میں "نہ تو بغیر معقول وجہ اور مناسب معاوضے کے ذاتی املاک کی ضبطی کی تجویز ہے اور نہ طبقوں کی جنگ کی حمایت۔ ورکنگ کمیٹی کی رائے میں املاک کی ضبطی اور طبقوں کی جنگ، کانگریس کے عقیدہ عدم تشدد کے منافی ہے"۔ اس ریزولیوشن کے الفاظ مبہم تھے اور اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس کے ترتیب دینے والے طبقوں کی جنگ کا مفہوم پوری طرح نہیں سمجھتے تھے۔ اس کی زد صریحی طور پر کانگریس سوشلسٹ پارٹی پر تھی، جو نئی نئی قائم ہوئی تھی۔ سچ پوچھیئے تو اس جماعت کے کسی ذمہ دار رکن نے ضبطی کا ذکر تک نہیں کیا تھا۔ ہاں یہ بہت سے لوگوں نے کہا تھا کہ طبقوں کی جنگ اس وقت بھی موجود ہے۔ ورکنگ کمیٹی کے ریزولیوشن میں یہ اشارہ پایا جاتا تھا کہ کوئی شخص جو طبقوں کی نزاع کا قائل ہو، کانگریس کا معمولی ممبر بھی نہیں ہو سکتا کانگریس پر کبھی یہ الزام نہیں

لگایا تھا کہ اس نے اشتراکیت اختیار کر لی ہے۔ یا وہ ذاتی املاک کے خلاف ہے۔ البتہ اس کے بعض ممبر یہ خیالات رکھتے تھے۔ اب معلوم ہوا کہ ان لوگوں کو اس ہمہ گیر قومی انجمن کے معمولی ممبروں کی صف میں بھی جگہ نہیں مل سکتی۔

یہ بات کئی بار کہی جا چکی تھی کہ کانگریس راجا سے لے کر پرجا تک قوم کے ہر طبقے اور ہر جماعت کی نمائندگی کرتی ہے۔ قومی تحریکیں اکثر دعویٰ کرتی ہیں جس کے معنی غالباً یہ ہوتے ہیں کہ وہ بڑی اکثریت کی نمائندہ ہیں اور ان کی پالیسی سب کے فائدے کے لئے ہے مگر ظاہر ہے کہ یہ دعویٰ صحیح نہیں اس لئے کہ کوئی سیاسی انجمن متضاد اغراض رکھنے والے طبقوں کی نمائندہ نہیں ہو سکتی۔ اور اگر ہونا چاہے گی۔ تو وہ ایک بے شکل، بے رنگ اور بے معنی جماعت بن کر رہ جائے گی کانگریس یا تو ایک سیاسی پارٹی ہے جو سیاسی قوت حاصل کرنے اور اسے قوم کے فائدے کے لئے استعمال کرنے کا ایک واضح (یا دھندلا) مقصد اور اصول رکھتی ہے یا محض ایک رفاہِ عام کی انجمن ہے جو اپنے کوئی خاص خیالات نہیں رکھتی بلکہ ہر شخص کا بھلا چاہتی ہے اگر وہ سیاسی پارٹی ہے تو وہ صرف انہیں لوگوں کی نمائندہ کہلائے گی جو مجموعی طور پر اس کے مقصد اور اصول سے اتفاق رکھتے ہیں جو اس مقصد کے مخالف ہیں۔ وہ اس کے نزدیک قوم کے بدخواہ، سماج کے مخالف اور رجعت پسند قرار پائیں گے اور ان کے اثر کو روکنا یا توڑنا اس کے اصول کی کامیابی کے لئے ضروری سمجھا جائے گا۔

کانگریس کی تحریک شہنشاہی کے خلاف اٹھی ہے اور اسے سماج کی باہمی نزاع سے تعلق نہیں ہے اس لئے اس کا دائرہ بہت وسیع ہے اور اس میں بہت سے لوگوں کے اتفاق رائے کی گنجائش ہے۔ اسی لئے اسے ہندوستانیوں کی بہت بڑی اکثریت کی نمائندگی کم و بیش حد تک حاصل ہو گئی ہے اور اس میں مختلف خیالات کی جماعتیں شریک ہو گئیں جو صرف ایک چیز میں یعنی شہنشاہی کی مخالفت میں متحد تھیں اور ان کی

اس مخالفت میں بھی درجوں کا فرق تھا۔ وہ لوگ جو شہنشاہی کی مخالفت کے بنیادی مسئلے میں کانگریس کے ہم رائے نہیں تھے اس سے الگ ہو گئے اور کم وبیش برطانوی حکومت کا ساتھ دینے لگے غرض کانگریس کئی جماعتوں کی متحدہ انجمن بن گئی جن میں تھوڑا تھوڑا فرق تھا مگر سب کی سب ایک مشترک مقصد اور گاندھی جی کی بااقتدار شخصیت کے رشتے میں مربوط تھیں۔

بعد میں ورکنگ کمیٹی نے طبقوں کی جنگ کے متعلق اپنے ریزولیوشن کی تاویل کی کوشش کی۔ اس ریزولیوشن کے الفاظ کی یا اس اصول کی جو اس میں بیان کیا گیا تھا اس قدر اہمیت نہیں تھی جتنی اس بات کی کہ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ کانگریس کی پالیسی کس رخ جا رہی ہے۔ بالکل کھلی ہوئی بات تھی کہ یہ ریزولیوشن کانگریس کی نئی کونسل پارٹی کے اثر سے پاس ہوا ہے جو اسمبلی کے آئندہ انتخابات میں سرمایہ داروں کی مدد حاصل کرنا چاہتی تھی۔ ان کے کہنے سے کانگریس رفتہ رفتہ رجعت پسندی کی طرف سرکتی جاتی تھی۔ اور ملک کی اعتدال پسندوں اور قدامت پسندوں کو چلانے کی فکر کر رہی تھی۔ یہاں تک کہ جو لوگ پہلے کانگریس کے دشمن تھے اور نافرمانی کے زمانے میں حکومت کا ساتھ دے چکے تھے۔ ان سے بھی میٹھی میٹھی باتیں ہو رہی تھیں۔ شور مچانے والے اور نکتہ چینی کرنے والے انتہا پسندوں کی پارٹی اس تالیف قلوب میں سدِ راہ سمجھی جاتی تھی۔ ورکنگ کمیٹی کے ریزولیشن اور کئی حضرات کے شخصی بیانات سے یہ بات بالکل واضح ہو گئی تھی کہ کانگریس کے ارباب اختیار انتہا پسندوں کے اعتراضات کی وجہ سے اپنی راہ سے ہٹنے والے نہیں اور اگر یہ شرارت سے باز نہ آئے تو سزا پائیں گے اور کانگرس سے نکال دیئے جائیں گے۔

کانگریس کے لیڈروں میں گاندھی جی کے علاوہ اور بھی بہت سے مشہور

بزرگ تھے جنہوں نے قومی آزادی کی جنگ میں بڑے بڑے کارنامے دکھائے تھے اور اپنی دیانت داری اور بہادری کی وجہ سے سارے ملک میں عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ مگر نئی پالیسی کی وجہ سے کانگریس کی دوسری بلکہ پہلی صف میں بعض ایسے لوگ پہنچ گئے جو کسی طرح اصول پرست نہیں کہے جا سکتے۔ یوں تو کانگریس کے حلقوں میں اب بھی اصول پرستوں کی بہت بڑی تعداد موجود تھی۔ مگر اب مطلب پرستوں کے لیے اس میں داخل ہونا اتنا سہل ہوگیا جتنا پہلے کبھی نہیں تھا۔ گاندھی جی کی پراسرار شخصیت کے علاوہ جو سب پر چھائی ہوئی تھی۔ کانگریس کے دو رخ نظر آتے تھے۔ ایک تو خالص سیاسی رخ جس نے ایک خفیہ شورئے کی شکل اختیار کرلی تھی۔ (یعنی چند آدمی مل کر ہر معاملے کا فیصلہ کرلیتے تھے اور اسے کانگریس سے منوا لیتے تھے) اور دوسرا مذہبی رخ جس میں ایک پارتھنا منڈلی کی شان تھی۔ اور نہ ہو تقوے اور رقت قلب کا جوش تھا۔

حکومت کے یہاں فتح کے شادیانے بج رہے تھے کیونکہ اس کے خیال میں نافرمانی کی تحریک اور اس کی شاخوں کو کچلنے کی پالیسی پوری طرح کامیاب ہوگئی تھی۔ آپریشن بہ خیر و خوبی ہوگیا تھا۔ مریض مرتا ہے یا جیتا ہے اس سے فی الحال بحث نہیں تھی۔ اگرچہ کانگریس اس وقت کسی حد تک ہموار ہوگئی تھی۔ مگر حکومت نے تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ اپنی وہی پالیسی جاری رکھی اسے معلوم تھا کہ جب تک اصل مسئلہ طے نہ ہو قومی پالیسی میں اس طرح کے تغیرات محض عارضی ہیں اور اگر ذرا ڈھیل دی گئی تو یہ آگ پھر بھڑک اٹھے گی۔ شاید اس کے ذہن میں یہ بھی تھا کہ کانگریس کے کسانوں اور مزدوروں کی جماعت کے انتہا پسندوں پر سختی کرنے سے ان کانگریسی لیڈروں کو کچھ زیادہ شکایت نہ ہوگی جو احتیاط کی راہ پر چل رہے ہیں۔

میرے خیالات دہرہ دون جیل میں کچھ اس قسم کے تھے۔ سچی بات یہ ہے

کہ میں دور ہونے کی وجہ واقعات کی رفتار کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتا تھا۔ علی پور میں تو مجھے کسی بات کی خبر ہی نہیں ہوتی تھی۔ دہرہ دون میں حکومت کا تجویز کیا ہوا اخبار دیکھنے کو ملتا تھا جس میں خبریں ایک خاص رنگ میں پیش کی جاتی تھیں اور کبھی کبھی بالکل یک طرفہ ہوتی تھیں اگر مجھے اپنے ساتھیوں سے جو جیل کے باہر تھے ملنے کا اور واقعات کو غور سے دیکھنے کا موقع نصیب ہوتا تو شاید میری رائے تھوڑی بہت بدل جاتی۔

حال کے تصور سے مجھے تکلیف ہوتی تھی اس لیے میں ماضی کا تصور کرنے لگا اور یہ سوچنے لگا کہ جب سے میں نے قومی معاملات میں حصہ لینا شروع کیا ہندوستان میں سیاسی واقعات کی کیا رفتار رہی ہے اور ہم نے جو کچھ اب تک کیا اس میں کونسی بات بجا تھی اور کونسی بے جا تھی؟ میں نے اپنے دل میں کہا کہ میں جو کچھ سوچتا ہوں اسے لکھ ڈالوں تو میرے خیالات زیادہ باترتیب اور مفید ہوں گے۔ اور ایک معین کام میں لگ جانے سے مجھے اس پریشانی اور اداسی سے بھی نجات مل جائے گی۔ چنانچہ جون ۱۹۳۴ء میں میں نے دہرہ دون جیل کے اندر **آپ بیتی** لکھنی شروع کی اور پچھلے آٹھ مہینے برابر یہ کرتا رہا کہ جب کبھی لہر آگئی بیٹھ کر اسے لکھ ڈالا۔ بیچ میں کئی ایسے وقفے آئے۔ کہ لکھنے کو جی نہیں چاہا۔ ان میں سے تین وقفے تین تین مہینے کے گزرے مگر کسی نہ کسی طرح یہ کام چلتا ہی رہا یہاں تک کہ اب خاتمے پر آپہنچا ہے اس کا بڑا حصہ میں نے غیر معمولی پریشانی کے زمانے میں لکھا ہے جب میرے دل پر رنج اور اداسی چھائی ہوئی تھی شاید اس کی جھلک اس کتاب میں بھی آگئی ہے مگر اس کے لکھنے ہی سے مجھے ان پریشانیوں سے نجات ملی۔ لکھتے وقت میں نے پڑھنے والوں کو پیش نظر نہیں رکھا تھا میرا خطاب اپنے دل سے تھا۔ میں آپ ہی سوال کرتا تھا۔ اور آپ ہی جواب دیتا تھا۔ جس میں مجھے بعض اوقات ہنسی بھی آجاتی تھی۔ میں چاہتا تھا۔ کہ جہاں تک ممکن ہو جذبات سے الگ ہو کر بے لاگ طریقے سے غور کروں اور میں

سمجھتا تھا کہ ماضی کے اس جائزے سے مجھے اس میں مدد ملے گی۔

جولائی کے آخر میں کملا کی طبیعت بگڑنے لگی اور چند روز میں حالت نازک ہو گئی۔ ۱۱ اگست کو یکایک مجھے دہرہ دون جیل سے رخصت ہونے کا حکم دیا گیا اور اسی روز رات کو میں پولس کی حراست میں الہ آباد روانہ کر دیا گیا۔ دوسرے دن تک شام کو ہم الہ آباد کے پریاگ اسٹیشن پر پہنچے اور وہاں مجھے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے یہ اطلاع دی کہ تم اپنی بیوی کی عیادت کے لیے عارضی طور پر رہا کیے جاتے ہو۔ اس دن میری گرفتاری کو پورے چھ مہینے ہو گئے تھے

(۶۵)
گیارہ دن

تلوار اپنے نیام کو گھس ڈالتی ہے
اور روح جسم کو ریت کر رکھ دیتی ہے

(بائرن)

میری رہائی عارضی تھی۔ مجھ سے کہا گیا تھا کہ مجھے دو ایک روز کے لیے یا اتنی مُدت کیلئے متعلقہ ڈاکٹر اشد ضروری سمجھیں آزادی دی جاتی ہے اِس بے اطمینانی کی حالت میں جم کر کوئی کام کرنا ناممکن تھا۔ اگر میعاد مقرر ہوتی تو مجھے ایک اندازہ ہو جاتا اور میں اسکے لحاظ سے اپنے اوقات کا تعین کرتا۔ اب تو ہر وقت یہ خیال رہتا تھا کہ نہ جانے کب دوبارہ جیل بھیج دیا جاؤں۔

یہ تبدیلی یکایک ہوئی اور میں اِس کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔ دم بھر میں قید، تنہائی سے نکل کر بھرے گھر میں پہنچ گیا۔ جہاں ڈاکٹروں، نرسوں اور عزیزوں کا مجمع تھا میری لڑکی اندرا بھی شانتی نکیتن سے آگئی تھی دوست احباب کملا کی عیادت کیلئے برابر چلے آ رہے تھے رہنے سہنے کا ڈھنگ بالکل بدل گیا تھا۔ گھر کی آسائشیں میسر تھیں اچھا کھانا مل رہا تھا۔ میرے دل میں طرح طرح کے خیالات کا ہجوم تھا۔ مگر کملا کی علالت کی فکر سب پر غالب تھی۔

وہ نحیف و زار بستر پر پڑی تھی اور معلوم ہوتا تھا یہ کملا نہیں کملا کی پرچھائیں ہے اس میں مرض سے مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں تھی اور اسکی جدائی کا خیال میرے لئے ہان روح بن گیا تھا۔ ہماری شادی کو ساڑھے اٹھارہ برس گذر چکے تھے وہ دن اور اُس کے

بعد کا زمانہ میری آنکھوں میں پھر رہا تھا شادی کے وقت میں چھبیس برس کا تھا اور وہ کوئی سترہ برس کی دبلی پتلی بھولی بھالی لڑکی ہم دونوں کی عمر میں بہت فرق تھا۔ مگر اس سے بھی زیادہ فرق ہمارے خیالات میں تھا اسلئے کہ میں اس سے زیادہ پختہ کار تھا مگر اس عقل و بناوٹی کے دکھاوے کے باوجود مجھ میں بہت لڑکپن تھا اور مجھے یہ احساس نہ تھا کہ اس نازک حساس لڑکی کے نفس کی کلی کھل کر پھول بن رہی ہے اور اس کی پرداخت بڑی نرمی اور احتیاط سے ہونی چاہیئے ہمیں ایک دوسرے سے محبت تھی اس لئے آپس میں اچھی طرح نبھ رہی تھی مگر ہمارے خیالات کی بنیادیں الگ الگ تھیں اور ان میں میل نہ تھا اس اختلاف کی وجہ سے ان بن رہتی تھی اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھگڑے ہو جایا کرتے تھے مگر یہ بچپن کے قصے زیادہ طول نہ کھینچتے تھے اور ہم لڑ بھڑ کر پھر ایک ہو جایا کرتے تھے دونوں تیز مزاج اور حساس طبیعت کے تھے اور بچوں کی طرح اپنی آن پر جان دیتے تھے پھر بھی ہماری محبت بڑھتی گئی اگرچہ خیالات کا اختلاف بہت آہستہ آہستہ کم ہوا۔ ہماری شادی کے ۱۴ مہینے بعد ہماری اکلوتی لڑکی اندرا پیدا ہوئی

جن دنوں ہماری شادی ہوئی قریب قریب اسی زمانے میں ہندوستان کی سیاست نیا رنگ بدل رہی تھی اور میرا انہماک اس میں بڑھتا جاتا تھا یہ ہوم رول کا دور تھا اور تھوڑے دن بعد ہی پنجاب میں مارشل لا اور اسی کے ساتھ ترک موالات شروع ہو گیا اور میں روز بروز قومی کاموں کے چکر میں پڑتا گیا۔ مجھے ان چیزوں سے اتنا شغف ہو گیا کہ بالکل غیر شعوری طور پر میں اس کی طرف سے قریب قریب غافل ہو گیا اور اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا حالانکہ یہی زمانہ تھا جب اسے میری مدد کی بہت ضرورت تھی اس سے مجھے جو محبت تھی وہ قائم رہی بلکہ اور بڑھ گئی اور مجھے بڑا اطمینان رہتا تھا کہ میری تسلی کیلئے موجود ہے مجھے تو اس سے تقویت پہنچتی تھی مگر اسے میری بے پروائی سے ضرور صدمہ پہنچتا ہوگا وہ اس طبیعت کی تھی کہ اگر میں اس کے ساتھ بدسلوکی کرتا تو شاید اسے اتنی تکلیف نہ ہوتی جتنی اس غفلت اور کم التفاتی سے ہوئی ہوگی

اس کے بعد اس پر رہ رہ کر بیماری کے حملے ہونے لگے اور میں برسوں جیل میں رہنے لگا۔ اس عرصے میں ہم دونوں کا ملنا بس کبھی کبھی جیل کے دروازے پر ہو جایا کرتا تھا۔ سول نافرمانی کی تحریک کے زمانے میں وہ ہماری فوج کی صف اول میں پہنچ گئی اور جب اسے قید کی سزا ملی تو وہ بہت خوش ہوئی۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے قریب تر ہو گئے۔ ہم ملاقات کی مختصر گھڑیوں کو جو مدت کے بعد نصیب ہوتی تھیں ایک بیش بہا دولت سمجھتے تھے۔ اور فرقت کے دن گن گن کر کاٹتے تھے۔ ہم ایک دوسرے کی صحبت سے کبھی سیر نہیں ہوتے تھے کیونکہ ہماری مختصر ملاقاتوں میں ہمیشہ ایک جدت اور تازگی ہوتی تھی۔ ہم پر ایک دوسرے کی سیرت کے نئے نئے پہلوؤں کا انکشاف ہوتا تھا۔ اگرچہ بعض اوقات ہمیں یہ نئے پہلو پسند نہیں آتے تھے۔ ہماری ان جوانی کی نا اتفاقیوں میں بچپن کے جھگڑوں کا رنگ [illegible]

اٹھارہ برس کی ازدواجی زندگی کے بعد بھی اس کی صورت پر وہی لڑکپن اور نوارپن کی کیفیت تھی۔ وہ ادھیڑپن جو بیاہی عورتوں میں ہوتا ہے نام کو بھی نہ تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ ایک دلہن ہے جو ابھی بیاہ کر آئی ہے۔ مگر میں بہت بدل گیا تھا۔ اور گو اپنی عمر کے اعتبار سے خاصا چاق و چوبند تھا۔ اور لوگ کہتے تھے کہ مجھ میں اب تک لڑکپن کی بعض خصوصیات موجود ہیں۔ مگر میرا چہرہ میری عمر کا راز فاش کر دیتا تھا۔ میرے سر کے بال کچھ اڑ گئے تھے۔ اور جو بچ رہے تھے وہ سفید ہو گئے تھے۔ میرے چہرے پر جھریاں اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ پچھلے چار برس کی مصیبتیں اور پریشانیاں اپنے نقش میرے چہرے پر چھوڑ گئی تھیں۔ ان دنوں اکثر ایسا ہوا کہ کملا اور میں کسی مقام پر گئے تو لوگوں نے اسے میری لڑکی سمجھا۔ اور مجھے بڑی خفت اٹھانی پڑی۔ وہ اور اندرا بہنیں معلوم ہوتی تھیں۔

ازدواجی زندگی کے اٹھارہ برس کہنے کو تو یہ اٹھارہ برس تھے مگر ان میں سے نہ جانے کتنے میں نے جیل خانہ میں اور کملا نے اسپتالوں اور صحت گاہوں میں گزارے تھے اور اب پھر میں جیل میں سزا کاٹ رہا تھا۔ اور صرف چند روز کیلئے چھوٹ کر آیا تھا۔ دوسری بیماری کے



کملا - جواہرلال - اندرا

از شیواتن سین کاجلیہ

پُنچے میں تڑپ رہی تھی میں کسی قدر خفا تھا کہ وہ اپنی صحت کی پروا نہیں کرتی۔ مگر میں اسے کس طرح الزام دے سکتا تھا۔ اس کی من چلی طبیعت اس پر کڑھتی تھی کہ وہ بیماری سے بے بس ہے اور قومی جنگ میں پوری طرح شریک نہیں ہو سکتی۔ وہ عجیب دھندے میں رہتی تھی نہ تو کام کی طرف پوری توجہ کر سکتی تھی اور نہ علاج کی طرف۔

میں اپنے دل میں کہتا تھا کیا سچ مچ وہ ایسے وقت میں جب مجھے اس کی سب سے زیادہ ضرورت ہے مجھ سے منہ موڑ کر چلی جائے گی؟ ابھی تو ہم نے ایک دوسرے کو پہچاننا اور سمجھنا شروع کیا ہے سچ پوچھیے تو اب ہماری ازدواجی زندگی کا آغاز ہو رہا ہے ہمیں ایک دوسرے کا بڑا سہارا ہے اور بہت سے کام ساتھ ساتھ کرنے ہیں۔

یہ خیالات دل میں لیے ہوئے میں ہر روز ہر وقت اس کی حالت کو دیکھا کرتا تھا۔ میرے رفیق اور دوست مجھ سے ملنے آتے تھے۔ وہ مجھے بہت سے واقعات سنایا کرتے تھے جن کی مجھے خبر نہیں تھی۔ وہ موجودہ سیاسی مسائل پر بحث کرتے تھے اور مجھ سے طرح طرح کے سوال کرلیتے تھے میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ انہیں کیا جواب دوں میرے لیے اپنے خیال کو کملا کی بیماری سے ہٹانا آسان نہیں تھا۔ اور جیل میں اتنے عرصہ تک واقعات سے الگ اور دور رہنے کے بعد میں یکایک ایسے مسائل کو حل نہیں کر سکتا تھا جو مخصوص حالات سے تعلق رکھتے تھے۔ ایک مدت کے تجربے سے معلوم ہو گیا تھا کہ جیل میں جو محدود اطلاعات ملتی ہیں ان کی بنا پر صورت حال کا صحیح اندازہ کرنا ممکن نہیں ہے صحیح رائے قائم کرنے کے لیے لوگوں سے ملنا ضروری تھا اگر بغیر اس کے کوئی رائے ظاہر کی جاتی تو وہ اصلیت سے دور ہوتی یہ گاندھی جی اور پرانے کانگریسی رفیقوں کے ساتھ بے انصافی ہوتی اگر میں ان سے ملنے اور بحث کرنے سے پہلے کانگریس کی پالیسی کے متعلق کوئی قطعی بات کہہ دیتا۔ مجھے بہت سی کارروائی پر سخت اعتراض تھا مگر میرے ذہن میں کوئی عملی تجاویز نہیں تھیں۔ مجھے اس وقت جیل سے چھوٹنے کی مطلق توقع نہیں تھی اس لیے میں نے ان چیزوں پر اس پہلو سے غور بھی نہیں کیا تھا

پھر مجھے یہ خیال بھی تھا کہ جب حکومت نے اتنی عنایت کی کہ مجھے اپنی بیوی کے پاس پہنچنے کی اجازت دے دی تو یہ بڑی نامناسب بات ہے کہ میں اس سے فائدہ اٹھا کر سیاسی کام کروں۔ میں نے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا کہ میں اس قسم کے کام نہیں کروں گا پھر بھی یہ خیال مجھے روکتا تھا۔

میں عام بیانات شائع کرنے سے بھی احتراز کرتا رہا البتہ بعض غلط افواہوں کی تردید ضروری تھی۔ نجی گفتگو میں بھی صاف صاف کسی پالیسی کی تائید نہیں کرتا تھا۔ البتہ پچھلے واقعات پر دل کھول کر تنقید کیا کرتا تھا۔ کانگریس سوشلسٹ پارٹی ابھی حال ہی میں قائم ہوئی تھی اور میرے بہت سے گہرے رفیق اس سے تعلق رکھتے تھے۔ اس معلومات کی بنا پر جو مجھے اس کے متعلق حاصل ہو سکیں مجھے اس کی عام پالیسی سے اتفاق تھا مگر یہ ایک عجیب قسم کی بے میل جماعت تھی۔ اور اگر میں بالکل آزاد ہوتا تب بھی اس میں شریک ہونے میں تامل سے کام لیتا۔ مقامی سیاسی معاملات میں مجھے کچھ وقت صرف کرنا پڑا اس لئے کہ اور مقامات کی طرح یہاں بھی لوکل کانگریس کمیٹی کے انتخابات میں سخت کشمکش پیدا ہو گئی تھی۔ کوئی اصولی اختلاف نہیں تھا صرف ذاتیات کا معاملہ تھا۔ مجھ سے درخواست کی گئی کہ میں ان جھگڑوں کو چکانے میں امداد دوں۔

میں ان معاملات میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ اور نہ مجھے اتنی فرصت تھی۔ اس کے باوجود مجھے بعض ایسی باتیں معلوم ہوئیں جن سے سخت صدمہ ہوا۔ تعجب کی بات تھی کہ کانگریس کے مقامی انتخابات کے معاملے میں لوگوں میں اس قدر جوش کیونکر پیدا ہو گیا۔ ان میں سب سے پیش پیش وہ حضرات تھے جو لڑائی کے زمانے میں مختلف قسم کے ذاتی عذروں کی وجہ سے الگ ہو گئے تھے سول نافرمانی کے ختم ہوتے ہی یہ عذر رفع ہو گئے اور یہ حضرات پردے سے باہر نکل کر اسی میں بازاری لوگوں کی طرح لڑنے لگے یہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ کہ حریفوں کو نیچا دکھانے کے جوش نے انہیں اس قدر اندھا کر دیا تھا کہ معمولی تہذیب کی حد سے بھی گذر گئے تھے۔ مجھے اس بات سے اور بھی زیادہ صدمہ ہوا۔ کہ کملا کے نام بلکہ اس کی بیماری سے بھی ان انتخابات میں

ناجائز فائدہ اٹھایا گیا

جن وسیع تر مسائل پر گفتگو ہوتی تھی ان میں اسمبلی کے آئندہ انتخابات میں کانگریس کی شرکت کا مسئلہ بھی تھا۔ بہت سے نوجوان اس فیصلے کے مخالف تھے کیونکہ وہ اس کے معنی یہ سمجھتے تھے کہ کانگریس کونسل کے کام اور مصالحت کے چکر میں پڑ جائے گی مگر وہ کوئی اور معقول تجویز پیش کرنے سے قاصر تھے۔ تعجب ہے کہ ان حضرات میں سے جو اعلیٰ اصولوں کی بنا پر کونسل کی شرکت کے مخالف تھے بعض کو انتخاب میں دوسری انجمنوں کے حصہ لینے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ ان کا منشا یہ معلوم ہوتا تھا کہ فرقہ پرور جماعتوں کے لیے میدان خالی چھوڑ دیا جائے۔

مجھے ان نامعقول جھگڑوں سے اور اس ناپاک سیاست سے جو الہ آباد میں پیدا ہو رہی تھی کراہت آتی تھی میں ان سے اور اپنے شہر سے بیزار تھا میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ جب وہ وقت آئے گا کہ میں ان معاملات کی طرف توجہ کروں تو میں اس فضا میں کیا کر سکوں گا۔

میں نے گاندھی جی کو ایک خط لکھا جس میں کملا کی حالت کا ذکر تھا۔ چونکہ میں سمجھتا تھا کہ بہت جلد جیل بھیج دیا جاؤں گا اور مجھے پھر خط لکھنے کا موقع نہیں ملے گا اس لئے میں نے انہیں ان خیالات اور جذبات سے بھی آگاہ کر دیا جو اس وقت میرے دل میں تھے۔ حال کے واقعات سے مجھے سخت مایوسی اور صدمہ ہوا تھا اور میرے خط میں کچھ تھوڑی سی جھلک اس کی بھی تھی۔ میں نے خود کوئی تجویز پیش نہیں کی کہ کیا کرنا چاہیئے اور کیا نہیں کرنا چاہیئے۔ بلکہ صرف گذرے ہوئے واقعات کے متعلق اپنی رائے ظاہر کر دی یہ خط جذبات کے جوش سے بھرا ہوا تھا اور مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ گاندھی جی کو اس سے بڑی تکلیف ہوئی۔

دن گذرتے جاتے تھے اور میں منتظر تھا کہ جیل خانے سے طلبی یا حکومت کے

پاس سے کوئی اور اطلاع آئے۔ وقتاً فوقتاً مجھے یہ اطلاع ملتی رہتی تھی کہ مزید احکام کل پرسوں تک جاری ہو جائیں گے اس اثنا میں ڈاکٹروں کو یہ ہدایت تھی کہ میری بیوی کی صحت کی روزانہ رپورٹ حکومت کو بھیجتے رہیں۔ میرے آنے کے بعد کملا کو کچھ خفیف سا افاقہ ہوا تھا۔

یہ عام خیال تھا اور اس میں وہ حضرات بھی شریک تھے جو عموماً حکومت کے محرم راز رہا کرتے ہیں کہ میں بالکل چھوڑ دیا جاتا مگر دو باتوں کی وجہ سے نہیں چھوڑا گیا۔ ایک یہ کہ اکتوبر میں کانگریس کا پورا جلسہ بمبئی میں ہونے والا تھا دوسرے یہ کہ اسمبلی کے انتخابات نومبر میں شروع ہونے کو تھے اگر میں جیل کے باہر ہوتا تو ان موقعوں پر شورش پیدا کرتا اس لئے اغلب یہ تھا کہ میں پھر تین مہینے کے لئے جیل بھیج دیا جاؤں گا اور اس کے بعد چھوڑ دیا جاؤں گا۔ مگر اس کا بھی امکان تھا کہ شاید واپس نہ بھیجا جاؤں گا اور جوں جوں دن گذرتے جاتے تھے یہ امکان بظاہر بڑھتا جاتا تھا۔

مجھے جیل سے چھوٹے گیارھواں دن تھا یعنی اگست کی تیئسویں تاریخ تھی۔ دفعۃً پولیس کی موٹر کی آ کر رکی اور ایک پولیس افسر نے مجھ سے آ کر کہا کہ آپ کا وقت پورا ہو گیا اور آپ کو نینی واپس چلنا ہے۔ میں اپنے عزیزوں سے رخصت ہوا اور پولیس کی موٹر میں بیٹھ ہی رہا تھا کہ ماں ہاتھ پھیلائے میرے پاس دوڑی آئیں۔ ان کے چہرے کی وہ کیفیت میرے دل پر ایک عرصے تک نقش رہی۔

(۶۶)

پھر وہی کنجِ قفس پھر وہی صیّاد کا گھر

"سایہ یکساں پھیلا ہوا ہوتا ہے مگر دھوپ میں رنگ کا اتار چڑھاؤ لازمی ہے۔ اسی طرح رنج راحت سے بالکل الگ ہے مگر راحت میں گوناگوں آلام کی خلش اور کسک پوشیدہ ہے۔"

(راج ترنگنی مترجمہ رنجیت پنڈت)

میں پھر نینی جیل میں واپس آ گیا۔ اور اب معلوم ہوتا تھا کہ میری قید نئے سرے سے شروع ہوئی ہے۔ میری حالت گیند کی سی ہو گئی تھی جسے اندر سے باہر باہر سے اندر پھینکتے ہیں۔ جذبات کے مسلسل اتار چڑھاؤ نے میرے نظام عصبی کو تہ و بالا کر دیا تھا اور ان بیہودہ تغیرات سے نبھنا سہل نہ تھا۔ مجھے امید تھی کہ اپنی پرانی بارک میں رکھا جاؤں گا۔ اتنے دنوں رہتے رہتے میں اس سے کس قدر مانوس ہو گیا تھا۔ اس میں میرے برادر نسبتی رنجیت پنڈت کے لگائے ہوئے پھول اب تک موجود تھے اور اس کا برآمدہ بھی کشادہ تھا۔ مگر اب اس نمبر کی بارک میں ایک صاحب شاہی قیدی کی حیثیت سے رہتے تھے جو بغیر عدالتی تحقیقات کے نظر بند کر دیے گئے تھے۔ میرا ان کے ساتھ رہنا مناسب نہیں سمجھا گیا۔ اس لئے مجھے جیل کے ایک اور حصے میں جگہ دی گئی جہاں ہوا کم ہی ہوتی تھی اور سبزے اور پھولوں کا نام تک نہ تھا۔

مگر مجھے تو دن اور راتیں کاٹنی تھیں وہاں نہ سہی یہاں۔ میرا جسم قید میں تھا۔ مگر میرا دل کہیں اور تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ کملا کو جو ذرا افاقہ ہوا ہے وہ میرے دوبارہ گرفتار ہو جانے کے بعد بہت دیر تک قائم نہیں رہے گا اور یہی ہوا۔ کچھ عرصے تک مجھے ڈاکٹر کی رپورٹ

روزانہ پہنچتی رہی اور وہ بھی بڑے پھیر سے۔ ڈاکٹر پولیس کو ٹیلیفون کرتا تھا، پولیس جیل کے دفتر کو اطلاع دیتی تھی اور وہاں سے مجھے خبر ملتی تھی۔ ڈاکٹروں کا جیل کے عملے سے براہ راست بات چیت کرنا خلاف مصلحت سمجھا جاتا تھا۔ دو ہفتے تک سب مجھے یہ رپورٹیں پابندی سے تو نہیں مگر خیر پہنچتی رہیں۔ پھر ان کا سلسلہ بند ہو گیا۔ حالانکہ کملا کی حالت روز بروز خراب ہوتی جاتی تھی۔

پہلے بری خبریں سنکر اور پھر خبروں کے انتظار میں مجھے دن دو بھر اور راتیں پہاڑ ہو گئیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ وقت ساکن ہے یا چلتا بھی ہے تو بہیر ٹی کی چال سے ایک ایک گھڑی قیامت کی گھڑی تھی۔ مجھے یہ احساس اس شدت کے ساتھ پہلے کبھی نہیں ہوا تھا مجھے یہ توقع تھی کہ میں کوئی دو مہینے میں یعنی بمبئی کانگریس کے اجلاس کے بعد رہا کردیا جاؤں گا مگر یہ دو مہینے دو جگ کے برابر تھے۔

دوبارہ گرفتاری کے پورے ایک مہینے کے بعد میں ایک پولیس افسر کے ساتھ اپنی بیوی سے ملنے کے لئے بھیجا گیا۔ مجھ سے یہ کہا گیا کہ اب تمہیں ہفتے میں دو بار یہاں آنے کی اجازت ملا کرے گی بلکہ وقت بھی مقرر کر دیا گیا۔ چوتھے دن میں انتظار کرتا رہا۔ مگر کوئی لینے نہیں آیا۔ پانچواں، چھٹا، ساتواں دن بھی اسی طرح گذر گیا۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کیا ستم ظریفی تھی۔

خدا خدا کر کے ستمبر کا مہینہ گذرا یہ تیس دن میری زندگی کے سب سے کٹھن دن تھے۔ بیچ والوں کے ذریعے مجھ تک یہ بات پہنچائی کہ اگر تم بے ضابطہ طور پر وعدہ کر لو کہ قید کی میعاد کے ختم ہونے تک سیاست سے الگ رہو گے تو تم کملا کی تیمارداری کیلئے رہا کر دیئے جاؤ گے۔ میں اس وقت سیاست کے خیال سے کوسوں دور تھا اور گیارہ دن تک باہر رہ کر میں نے جو سیاسی حالات دیکھے تھے ان کی وجہ سے میرا دل کھٹا ہو گیا تھا۔ مگر وعدہ کرنے کے یہ معنی تھے کہ میں اپنے قول سے، اپنے مقصد سے، اپنے رفیقوں سے، اپنے آپ سے پھر جاؤں! چاہے کچھ بھی ہو یہ شرط تو میں ہرگز منظور نہیں کر سکتا تھا۔ ایسا وعدہ کرنا اپنی روح کو ہلاک

گورنمنٹ اپنے مقاصد کا کتنا ہی گہرا نقشہ سے کم نہ تھا سمجھانے والے سمجھاتے تھے کہ دیکھو کملا کی حالت بگڑتی جاتی ہے اگر تم اس کے پاس رہو تو شاید اس کی جان بچ جائے۔ کیا تمہیں اپنی آن کملا کی جان سے زیادہ پیاری ہے؟ اگر صورت حال یہ ہوتی تو واقعی میرے لئے سخت مشکل تھی مگر خوش قسمتی سے یہ مشکل مجھے درپیش نہ تھی میں اچھی طرح جانتا تھا کہ خود کملا اسے ہرگز پسند نہیں کرے گی اور اگر میں نے اس قسم کا وعدہ کر لیا تو اسے صدمہ اور ضرر پہنچے گا۔

شروع اکتوبر میں مجھے اسے دیکھنے کی اجازت ملی۔ وہ تیز بخار میں قریب بیہوش پڑی تھی۔ اسے یہ آرزو تھی کہ میں اس کے پاس رہوں مگر جب میں رخصت ہونے لگا۔ تو وہ بڑی بہادری سے مسکرائی اور مجھے جھکنے کا اشارہ کیا میں جھک گیا اور اس نے میرے کان میں کہا "یہ کیا قصہ ہے؟ کیا تم سے کہا جاتا ہے کہ تم حکومت سے کوئی وعدہ کر لو؟ دیکھو یہ ہرگز نہ کرنا"

میری گیارہ دن کی رہائی کے دوران میں یہ طے ہوا تھا کہ کملا کو ذرا افاقہ ہو تو وہ کسی بہتر مقام پر علاج کے لئے بھیج دی جائے۔ تب سے ہم برابر اس کی طبیعت کے سنبھلنے کا انتظار کر رہے تھے مگر وہ تو اور گرتی جاتی تھی اور اب چھ ہفتے کے بعد صاف نظر آ رہا تھا کہ اس کی حالت پہلے سے بدتر ہے۔ اب زیادہ انتظار کرنا فضول تھا اور یہ فیصلہ کر لیا گیا کہ وہ اسی حالت میں بھوالی بھیج دی جائے۔

اس کی روانگی سے ایک دن پہلے میں اسے رخصت کرنے کیلئے لے جایا گیا۔ میں یہ سوچتا تھا کہ دیکھئے اب مجھے اس کی صورت دیکھنا کب نصیب ہوتا ہے اور ہوتا بھی ہے یا نہیں مگر اس روز وہ بہت بشاش تھی اور مجھے ایک عرصے کے بعد اپنے دل میں کسی قدر خوشی کی جھلک نظر آئی۔

تقریباً تین ہفتے بعد میں مینی جیل سے الموڑہ کے ڈسٹرکٹ جیل میں بھیج دیا گیا تاکہ کملا سے قریب رہوں۔ بھوالی راستے میں پڑتا تھا اور میں اپنے پولیس کے نگرانوں کے

ساتھ چند گھنٹے وہاں ٹھیر سکے۔ یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ کملا کی حالت کسی قدر بہتر تھی۔ اور میں اطمینان سے المورہ سے روانہ ہوا۔ سچ پوچھیے تو کملا سے ملنے سے پہلے پہاڑ کی ہوا نے میرے دل کو مسرت سے معمور کر دیا تھا۔

میں دوبارہ پہاڑ آنے سے بہت خوش تھا۔ ہماری موٹر سڑک کے پیچ و خم کے ساتھ بل کھاتی چلی جا رہی تھی۔ صبح کی ٹھنڈی ہوا اور پہاڑ کے دلفریب مناظر سے دل کو ایک عجیب فرحت ہوتی تھی۔ ہم اونچے ہوتے چلے جاتے تھے اور کھڈ کی گہرائی بڑھتی جاتی تھی۔ رفتہ رفتہ چوٹیاں بادلوں میں چھپ گئیں۔ درخت بالکل بدل گئے۔ ہر طرف پہاڑیاں دیودار اور صنوبر سے ڈھکی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ کبھی کبھی سڑک کے موڑ سے نکل کر ایک نیا منظر سامنے آ جاتا تھا۔ پہاڑیوں اور وادیوں کی ایک وسیع فضا اور نیچے کھڈ میں زور شور سے بہتا ہوا چھوٹا سا چشمہ۔ ان نظاروں سے میرا جی کسی طرح نہیں بھرتا تھا۔ میں اسے ندیدوں کی طرح دیکھ رہا تھا اور چاہتا تھا کہ اسے سمیٹ کر حافظے کے خزانے میں بھر لوں تاکہ جب یہ نظروں سے چھپ جائے تو اس کی یاد سے دل بہلاؤں۔

پہاڑیوں کے پہلو میں چھوٹی چھوٹی جھونپڑیوں کے جھنڈ تھے اور ان کے آس پاس ذرا ذرا سے کھیت، جو بڑی محنت سے ڈھلواں زمینوں پر بنائے گئے تھے۔ دور سے یہ چوڑی چوڑی سیڑھیاں معلوم ہوتی تھیں جن کا سلسلہ بعض جگہ وادی کی تہ سے پہاڑ کی چوٹی تک پہنچتا تھا۔ کس قدر شدید مشقت سے ان بستیوں کے رہنے والے فطرت سے روزی غذا حاصل کرتے تھے! ایڑی چوٹی کا پسینہ بہا کر وہ بس اتنا پیدا کر لیتے تھے کہ دو روکھی سوکھی روٹی میسر آ جائے۔ ان چھوٹے چھوٹے کھیتوں سے اس کوہستان میں آبادی کی شان پیدا ہو گئی تھی اور کھڑی یا درختوں سے ڈھکی ہوئی پہاڑیوں کے مقابلے میں عجب لطف دیتے تھے۔

دن کو یہ منظر بڑا خوشگوار تھا جب سورج اونچا ہوا اور بڑھتی ہوئی دھوپ نے پہاڑوں میں حرارت اور زندگی پیدا کر دی۔ ان کی بیگانہ وشی کم ہو گئی اور ان میں انس اور

محبت کی شان نظر آنے لگی۔ مگر شام ہوتے ہی ان کا رنگ کچھ اور ہی ہو جاتا ہے جب رات دیو کی طرح لمبے لمبے قدم اٹھاتی دنیا سے گذرتی ہے اور زندگی وحشی فطرت کے ہاتھ میدان چھوڑ کر امن کے گوشے میں چھپ جاتی ہے تو یہی پہاڑ کس قدر سرد مہر اور وحشت ناک نظر آنے لگتے ہیں۔ چاندنی رات یا تاروں کی دھیمی روشنی میں یہ پُر اسرار مہیب طلسمی دیواریں فضا کو ہر طرف سے گھیر لیتی ہیں اور وادیوں سے ہوا کے سائیں سائیں چلنے کی آواز آنے لگتی ہے بیچارے مسافر کو جو اکیلا چلا جا رہا ہو ایک خفی احساس ہوتا ہے کہ ہر طرف دشمن ہی دشمن ہیں اور وہ خوف سے لرزنے لگتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہوا بھی اس پر ہنستی اور اسے للکارتی ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ہوا بالکل تھم جاتی ہے اور اس قدر گہرا سناٹا چھا جاتا ہے کہ اس سے سخت وحشت ہوتی ہے۔ صرف تار برقی کے تار کی خفیف سی گنگناہٹ سنائی دیتی ہے اور ستارے زیادہ روشن اور قریب معلوم ہوتے ہیں۔ پہاڑ خشمناک نظروں سے گھورتے ہیں اور انسان ایک رازِ سربستہ کے مقابل کھڑا ہوتا ہے جس کی ہیبت دل میں بیٹھ جاتی ہے وہ پسکال کا ہم زبان ہو کر بے اختیار کہہ اٹھتا ہے "ان وسیع فضاؤں کی ابدی خاموشی سے مجھے ہول آتا ہے!" میدان میں راتوں کو اس قدر سناٹا نہیں ہوتا وہاں زندگی کی بھن گن کانوں میں پہنچتی رہتی ہے اور مختلف جانوروں اور کیڑوں کی آوازیں رات کی خاموشی کو توڑتی رہتی ہیں۔

مگر جس وقت ہم موٹر پر الموڑے جا رہے تھے رات کی سردی اور بے چینی ابھی بہت دور تھی۔ ہم منزل مقصود کے قریب تھے کہ راستے کے موڑ اور بادلوں کے یکایک پھٹ جانے سے ایک نیا منظر سامنے آ گیا جسے دیکھ کر میں خوشی اور حیرت سے دم بخود رہ گیا۔ پُر اشجار پہاڑوں کی دیواروں سے اونچی بہت دور ہمالیہ کی برف آلود چوٹیاں سورج کی روشنی میں چمک رہی تھیں۔ یہ ماضی کی حکمت و دانش کے وارث، ہندوستان کے وسیع میدانوں کے زبردست محافظ کس قدر پُر وقار اور پُر اسرار نظر آتے ہیں انہیں دیکھتے ہی قلب کا ہیجان اور اضطراب دور ہو گیا اور ان کی شانِ ابدیت کے آگے میدانوں اور شہروں کی چھوٹی چھوٹی

سازشیں اور جھگڑے، حرص وہوس اور مکروفریب ہیچ نظر آنے لگے۔

المونڑے کا چھوٹا سا جیل ایک اونچی سی پہاڑی پر تھا۔ اس میں ایک شاندار پارک مجھے رہنے کے لئے ملی یعنی ایک بڑا سا ہال جو سترہ گز لمبا اور پورے چھ گز چوڑا تھا۔ اس کا فرش کچا اور ناہموار تھا، چھت کو کیڑوں نے کھا لیا تھا اور اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ٹوٹ کر گرتے رہتے تھے۔ اس میں پندرہ کھڑکیاں اور ایک دروازہ تھا یا یوں کہیے کہ دیواروں میں روزن تھے جن میں سلاخیں لگی تھیں کواڑ کسی میں بھی نہ تھے غرض تازہ ہوا کی کمی نہیں تھی جب سردی زیادہ پڑنے لگی تو ان کھڑکیوں پر موٹی چٹائی چڑھا دی گئیں۔ اس وسیع مکان میں (جو دہرہ دون جیل کے ہر احاطے سے بڑا تھا) میں اکیلا بڑی شان سے رہا کرتا تھا۔ مگر سچ پوچھیے۔ تو میں بالکل تنہا بھی نہ تھا اس لئے کہ کم سے کم چالیس چڑیوں نے ٹوٹی ہوئی چھت میں اپنے گھونسلے بنا رکھے تھے کبھی کوئی سیلانی بادل آ نکلتا اور اس کے بہت سے ٹکڑے دیوار کے روزنوں سے کمرے میں گھس آتے اور ساری فضا کو مرطوب کہر سے بھر دیتے۔

یہاں میں ساڑھے چار بجے سہ پہر کے ناشتے کے بعد جو میری آخری غذا تھی پانچ بجے مقفل کر دیا جاتا اور صبح سات بجے اس سلاخ دار دروازے کا قفل کھلتا۔ دن کو میں یا تو اپنی بارک میں بیٹھا رہتا یا ایک احاطے میں جو اس سے متصل تھا بیٹھ کر دھوپ کھایا کرتا احاطے کی دیواروں کے اوپر سے کوئی ایک میل کے فاصلے پر ایک پہاڑ کی چوٹی کی ذرا سی جھلک دکھائی دیتی تھی اور سر پر آسمان کی نیلی چادر تنی رہتی ہے جس میں جا بجا بادل بکھرے نظر آتے تھے۔ یہ بادل طرح طرح کے روپ بدلا کرتے تھے اور میں اس تماشے سے کبھی نہیں اکتاتا تھا۔ تصور کی مدد سے ان میں ہر قسم کے جانوروں کی شکلیں بن جاتی تھیں کبھی کبھی یہ بادل مل کر ایک بحر مواج معلوم ہوتے تھے یا دہ ساحل بحر سے مشابہ نظر آتے تھے اور دیودار کے درختوں میں ہوا کی سرسراہٹ پر یہ دھوکا ہوتا تھا کہ بہت فاصلے پر کہیں سمندر کی موجیں ساحل سے ٹکرا رہی ہیں۔ کبھی ایسا ہوتا کہ کوئی بادل دور سے ٹھوس نظر آیا مگر پاس آ کر گھل جاتا اور ہمیں

ہر طرف سے گھیر لیتا۔

مجھے یہ بڑی اسی بارک چھوٹی کوٹھری کے مقابلے میں پسند تھی۔ اگرچہ اس میں تنہائی کا احساس اور بھی زیادہ ہوتا تھا جب باہر بارش ہوتی تھی۔ اس وقت بھی میں اس میں ٹہلتا تھا۔ مگر جوں جوں سردی بڑھتی گئی اس کی اداسی اور زیادہ نمایاں ہوتی گئی اور جب حرارت گھٹتے گھٹتے نقطۂ انجماد تک پہنچ گئی تو میرا کھلے میدان اور تازہ ہوا کا شوق بھی کم ہو گیا۔ نئے سال کے شروع میں خوب برف گری جس سے مجھے بڑی خوشی ہوئی اور جیل کے گرد و پیش کے بے لطف منظر میں بھی ایک لطف پیدا ہو گیا۔ دیودار کے درخت جو جیل کے احاطے کے باہر تھے نہایت خوش نما معلوم ہوتے تھے جیسے برف کی پوشاک پہنے پریاں کھڑی ہوں۔

کملا کی صحت کو ایک حالت پر قرار نہ تھا اس لئے مجھے ہر وقت فکر رہا کرتی تھی بری خبر سن کر میں تھوڑی دیر کیلئے بدحواس ہو جاتا تھا۔ مگر پہاڑ کی ہوا طبیعت میں سکون پیدا کرتی تھی اور مجھے پھر رات کو اچھی طرح نیند آنے لگی تھی۔ کبھی ایسا ہوتا تھا کہ عین اس وقت جب آنکھ لگنے والی ہے میں سوچنے لگتا تھا کہ نیند بھی کس قدر عجیب و غریب اور پُر اسرار چیز ہے آخر آدمی سونے کے بعد جاگے ہی کیوں؟ کیا اچھا ہو اگر اب میں کبھی نہ جاگوں۔

ان دنوں مجھے رہائی کی آرزو اس شدت سے تھی کہ پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ بمبئی کی کانگریس ہو چکی نومبر آیا اور چلا گیا۔ اسمبلی کے انتخابات کا جوش بھی ٹھنڈا ہو گیا۔ مجھے خیال تھا کہ شاید اب میں چھوڑ دیا جاؤں۔

مگر خبر آئی تو یہ آئی کہ خان عبدالغفار خاں کو گرفتار کر کے سزا دے دی گئی اور سبھاش بوس پر ہندوستان کے مختصر قیام کے زمانے میں عجیب و غریب پابندیاں عائد کی گئیں یہ احکام بجائے خود وحشیانہ اور بیدردانہ تھے اور پھر یہ اس شخص کے خلاف جاری کئے گئے تھے جسے ملک میں کروڑوں آدمی عزت اور محبت کی نظر سے دیکھتے تھے اور جو اپنی بیماری کے باوجود اپنے باپ کے آخری دیدار کے لئے دوڑا آیا اور وقت پر نہ پہنچ سکا۔ اگر حکومت کا یہی

مجھے خوف ہوتا ہے میری قبولیت رخصت۔ اس کی کوئی امید نہیں ہو سکتی تھی لیکن جو کر کاری عدالت نے اس کی تصدیق بھی کر دی۔

الموڑہ جیل میں ایک مہینہ رہنے کے بعد مجھ کو کملا کو دیکھنے کے لئے بھوالی لے جایا گیا۔ اس کے بعد ہر تیسرے ہفتے میں اس سے ملنے [illegible] مرکزی [illegible] ہوتی تھی۔ فرمایا کہ مجھے [illegible] اپنی بیوی سے ملنے کی اجازت ہے مگر وہ مہینے میں ایک دو بار کے [illegible] ہو گی [illegible] الموڑہ سے بھوالی سا [illegible] کے لئے پہنچنے کے قیام [illegible] بار اس سے ملنے پایا۔ میں شکایت کے طور پر نہیں کہتا ہے کہ میرے خیال میں حکومت نے میرے ساتھ بڑی رعایت کی اور مجھ کو ملنے کے لئے غیر معمولی سہولتیں دیں۔ میں اس کا بہت شکر گزار ہوں۔ یہ مختصر ملاقاتیں میرے لئے نعمت غیر مترقبہ تھیں اور شاید کملا کے لئے بھی۔ جس روز میں اس سے ملنے جاتا تھا ڈاکٹر اپنے قواعد کی سختیاں کم کر دیتے تھے اور مجھے بہت دیر تک اس کے پاس رہنے کی اجازت تھی۔ ہم ایک دوسرے سے روحانی حیثیت سے بہت قریب ہو گئے تھے اور مجھے اس سے جدا ہونا بہت شاق گزرتا تھا۔ ہم ایک دوسرے کو جی بھر کے دیکھنے بھی نہیں پاتے تھے کہ جدائی کی گھڑی آ پہنچتی تھی اور میں کبھی کبھی یہ خیال کر کے تڑپ جاتا تھا کہ شاید ایک دن ہمیں ہمیشہ کے لئے جدا ہونا پڑے گا۔

میری والدہ علاج کے لئے بمبئی گئی تھیں [illegible] نہیں ابھی تک صحت نہیں ہوئی تھی۔ وہ [illegible] الہ آباد میں آ رہی تھیں کہ انہیں [illegible] جنوری میں ایک روز دفعتہ یہ خبر پہنچی [illegible] ہو گیا [illegible] جیل میں [illegible]

[illegible]

[illegible]

بلبلیں چہک رہی ہیں۔ درختوں میں پُراسرار طریقے سے کونپلیں پھوٹتی ہیں اور اس عجیب و غریب دنیا کو حیران ہو کر دیکھتی ہیں۔ پہاڑیوں کے پہلو میں سرخ پھولوں سے بھری جھاڑیاں دور سے خون کے دھبے معلوم ہوتی ہیں۔ آلوچے اور شفتالو کے شگوفے کھلے ہوئے ہیں۔ دن گذرتے جاتے ہیں اور میں ایک ایک گھڑی گن رہا ہوں کہ بھوالی جانے کا وقت آئے۔ خدا جانے یہ بات سچ ہے یا نہیں کہ مصیبت کے بعد راحت اور جدائی کے بعد وصل کے دن آتے ہیں۔ شاید ایسا نہ ہو تو ہم راحت ہی کی قدر نہ کریں۔ کہتے ہیں کہ مصیبت انسان کے دماغ کو روشن کر دیتی ہے۔ مگر حد سے زیادہ مصیبت آئے تو وہ اور دھندلا ہو جاتا ہے۔ جیل میں رہ کر مشاہدہ نفس کا بہت موقع ملتا ہے۔ اور اتنے دن قید رہنے سے مجھے اپنی نفسی زندگی کو گہری نظر سے دیکھنے کی عادت ہو گئی ہے۔ میں خلقی طور پر داخل بیں نہیں ہوں مگر قید کی زندگی میں گھونسے یا کچھلے کی طرح یہ خاصیت ہے کہ وہ انسان کو داخل بیں بنا دیتی ہے۔ بعض اوقات میں دل بہلانے کے لئے پروفیسر میک ڈوگل کے کعب کا خاکہ کھینچتا ہوں جس سے داخل بینی اور خارج بینی ناپی جاتی ہے۔ میں اسے نظر جما کر دیکھتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ شکل بڑی تیزی سے بار بار بدل رہی ہے۔

(۶۷)

حالات کے چند واقعات

"رات کے بعد صبح ہوتی ہے مگر ہماری زندگی کے گئے ہوئے
دن واپس نہیں آتے۔ آنکھ آنے والے زمانے کو دیکھتی ہے مگر
گذری ہوئی بہار کا داغ دل سے نہیں ٹلتا۔"

(لی تائی پو)

مجھے جو اخبار پڑھنے کو ملتے تھے ان سے بمبئی کی کانگریس کا حال معلوم ہوا۔ مجھے قدرتی طور پر کانگریس کی سیاست سے اور اس کے لیڈرس کی شخصیت سے دلچسپی تھی۔ بیس سال کے گہرے تعلقات کی وجہ سے میں اس سے اس قدر وابستہ ہو گیا تھا کہ میری ذات اس میں محو ہو کر رہ گئی تھی۔ یہ تعلق کچھ اس عہدے کی وجہ سے نہ تھا جو مجھے اس میں حاصل تھا۔ جذبی روحانی رشتوں نے مجھے اس عظیم الشان انجمن اور اپنے بے شمار پرانے رفیقوں سے جکڑ رکھا تھا۔ پھر بھی مجھے اس کی کارروائی پڑھ کر کچھ جوش نہیں آیا۔ بہت سے اہم فیصلوں کے باوجود مجھے یہ اجلاس پھیکا معلوم ہوا۔ جن چیزوں سے مجھے دلچسپی تھی ان کا اس میں ذکر تک نہیں آیا۔ میں سوچتا تھا کہ اگر میں وہاں ہوتا تو کیا کرتا۔ میں خود یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ نئے حالات کا اور اپنے ماحول کا مجھ پر کیا اثر پڑتا اس لئے کوئی وجہ نہ تھی کہ میں جیل میں اس مشکل مسئلے میں سر کھپاتا۔ جبکہ میرے فیصلے کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا تھا۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ جب وقت آئے گا تو میں اس وقت کی صورت حال پر غور کر کے فیصلہ کروں گا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے اس وقت کوئی فیصلہ کرنا چاہے وہ اپنے دل ہی میں کیوں نہ ہو، محض حماقت تھی اس لئے

کہ بدلنے والے واقعات کا پہلے سے کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔

جہاں تک میں اتنی دور اپنے پہاڑی مسکن میں بیٹھ کر سمجھ سکتا تھا۔ اس جلسے کے دو نمایاں پہلو تھے۔ ایک یہ کہ گاندھی جی کی شخصیت جلسے پر چھائی ہوئی تھی دوسرے یہ کہ پنڈت مدن موہن مالوی اور مسٹر انے نے باہانہ قصے چھیڑے وہ بالکل نہیں چلنے پائے۔ جو لوگ ہندوستان کے عام لوگوں اور اوسط طبقوں کے حقیقی حالات سے واقف ہیں ان کے لئے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں تھی کہ گاندھی جی کا اثر اب تک ہندوستان میں سب سے بڑھا ہوا ہے۔ سرکاری حکام اور بعض گوشہ نشین سیاست داں جو اپنی خواہش کو واقعہ سمجھ لیتے ہیں اکثر اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ گاندھی جی کا اثر سیاست کے میدان میں ختم ہو گیا ہے یا کم سے کم بہت گھٹ گیا ہے مگر جب یہ شخص پھر اسی قوت اور شان سے میدان میں آتا ہے۔ تو یہ حیرت میں رہ جاتے ہیں اور اس ظاہری تغیر کے اسباب تلاش کرنے لگتے ہیں۔ گاندھی جی کا یہ اقتدار کانگریس میں کچھ تو ان کے خیالات کی بناء پر ہے جنہیں لوگ عام طور پر مانتے ہیں مگر اس سے بڑھ کر ان کی عجیب و غریب شخصیت کی وجہ سے۔ شخصیت ہر جگہ اہمیت رکھتی ہے اور ہندوستان میں اس کی اہمیت اور سب ملکوں سے زیادہ ہے۔

ان کا کانگریس سے علیحدہ ہونا اس اجلاس کا سب سے اہم واقعہ تھا اور بظاہر اس سے کانگریس اور ہندوستان کی تاریخ کا ایک بڑا دور ختم ہو گیا۔ مگر اصل میں ان کا علیحدگی کا اعلان کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا تھا اس لئے کہ کانگریس میں جو ان کا اقتدار ہے اسے وہ چاہیں بھی تو نہیں چھوڑ سکتے اس کی بنا کسی عہدے پر یا کسی محسوس رشتے پر نہیں ہے۔ کانگریس پر ان کے خیالات آج بھی اسی طرح چھائے ہوئے ہیں جیسے پہلے تھے۔ اور اگر وہ گاندھی جی کی راہ سے الگ بھی ہو جائے تب بھی غیر شعوری طور پر اس پر اور ملک پر ان کا اثر باقی رہے گا۔ وہ اس ذمہ داری سے کسی طرح پیچھا نہیں چھڑا سکتے۔ جب ہندوستان کے واقعی حالات پر نظر ڈالی جائے تو ان کی شخصیت سب سے نمایاں دکھائی دیتی ہے

اور اس سے کسی طرح چشم پوشی نہیں کی جا سکتی۔

فی الحال وہ کانگریس سے الگ ہو گئے ہیں غالباً اس وجہ سے کہ وہ اُسے اُلجھن میں ڈالنا نہیں چاہتے۔ شاید وہ کسی قسم کی انفرادی عملی جدوجہد شروع کرنا چاہتے ہیں جس میں حکومت سے جھگڑا ہونا لازمی ہے اور وہ اسے کانگریس کا معاملہ نہیں بنانا چاہتے۔

مجھے اس سے خوشی ہوئی کہ کانگریس نے ملک کے دستور کی تشکیل کے لئے ایک مجلس اساسی قائم کرنے کی تجویز منظور کی۔ میرے خیال میں اس مسئلے کو حل کرنے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں اور کبھی نہ کبھی ایسی مجلس منعقد کرنی پڑے گی۔ ظاہر ہے کہ اس کا انعقاد برطانوی حکومت کی مرضی کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ ہاں اگر ملک میں انقلاب ہو جائے تو اور بات ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ موجودہ حالت میں حکومت اسے منظور نہیں کرے گی۔ اس لئے ایسی مجلس جو حقیقی معنی میں اساسی مجلس کہی جا سکے اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتی جب تک ملک میں اتنی قوت نہ پیدا ہو جائے کہ وہ حکومت کو اس پر مجبور کر دے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ سیاسی مسئلہ بھی اس وقت تک حل نہیں ہو سکتا۔ کانگریس کے بعض لیڈروں کی جو اساسی مجلس کے خیال سے اتفاق رکھتے ہیں۔ یہ کوشش ہے کہ وہ اسے اعتدال کے سانچے میں ڈھال کر پرانی آل پارٹیز کانفرنس کے نمونے کی چیز بنا دیں۔ اس سے مطلق کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ وہی پرانے لوگ، جو زیادہ تر خود ہی اپنے آپ کو منتخب کر لیتے ہیں۔ ایک جگہ جمع ہو جائیں گے اور آپس میں لڑیں گے۔ اساسی مجلس کا اصل اصول یہ ہے کہ اسے عام لوگوں کی بڑی سے بڑی تعداد منتخب کرے اور اس میں جمہور کی قوت اور ان کی روح کام کرتی ہو۔ ایسی مجلس فوراً حقیقی مسائل پر غور کرنا شروع کر دے گی اور وہ پہلے کی طرح فرقہ وارانہ قضیوں اور اس قسم کے اور جھگڑوں میں پھنس کر نہیں رہ جائے گی۔

اصل تجویز کا شملہ اور لندن پر جو اثر ہوا اس کا مطالعہ بہت دلچسپ تھا۔ نیم سرکاری طور پر یہ کہا گیا کہ حکومت کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہو گا یعنی اس لے مربیانہ انداز سے

پسندیدگی کا اظہار کیا۔ وہ یہ سمجھتی تھی کہ یہ پرانی آل پارٹیز کانفرنس کی قسم کی چیز ہوگی جو یقیناً ناکامیاب رہے گی اور اسے تقویت پہنچائے گی۔ آگے چل کر اسے یہ احساس ہوا کہ اس میں بڑے بڑے خطرے ہیں اور اس نے زور شور سے مخالفت شروع کر دی۔

بمبئی کانگریس کے تھوڑے ہی دن بعد اسمبلی کے انتخابات شروع ہو گئے۔ گو مجھے کانگریس کے کونسل کے پروگرام سے کوئی خاص شغف نہ تھا پھر بھی ان انتخابات سے بڑی دلچسپی تھی۔ میں کانگریس کے امیدواروں کی فتح کا، بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ ان کے حریفوں کی شکست کا متمنی تھا۔ حریفوں کی یہ جماعت عہدوں کے طلبگاروں، فرقہ پرستوں، غداروں اور حکومت کے جبر و تشدد کے حامیوں کا ایک عجیب معجون مرکب تھی۔ یہ یقین تھا کہ ان میں اکثر لوگ مقابلہ میں ہار جائیں گے مگر فرقہ وارانہ تصفیے کی وجہ سے بڑی الجھن پیدا ہو گئی تھی اور ان میں سے بہتوں نے فرقہ وارانہ جماعتوں کے وسیع دامن میں پناہ لی تھی۔ پھر بھی کانگریس کو حیرت انگیز کامیابی ہوئی اور میں بہت خوش ہوا کہ بہت سے ناپسندیدہ اشخاص کونسلوں میں نہیں جانے پائے۔

مجھے سب سے زیادہ قابلِ افسوس نام نہاد کانگریس نیشنلسٹ پارٹی کا طرزِ عمل معلوم ہوتا تھا۔ ان کا فرقہ وارانہ تصفیے کی شدید مخالفت کرنا تو سمجھ میں آتا تھا مگر انہوں نے یہ غضب کیا کہ اپنی قوت بڑھانے کے لئے انتہائی فرقہ پرست جماعتوں سے دوستی کر لی یہاں تک کہ سناتن دھرمی پنڈتوں سے بھی جن سے زیادہ رجعت پسند سیاسی اور سماجی اعتبار سے ہندوستان میں کوئی جماعت نہیں ہے اور بہت سے ایسی رجعت پسندوں سے جو سارے ملک میں بدنام ہیں۔ سوائے بنگال کے جہاں بعض خاص وجوہ سے کانگریس کی ایک طاقتور جماعت ان کی مؤید تھی اور سب کہیں ان میں سے اکثر لوگ ہر طرح کانگریس کے مخالف تھے بلکہ سچ پوچھئے تو یہی لوگ کانگریس کے سب سے بڑے حریف تھے۔ باوجود ان مختلف قوتوں کی مخالفتوں کے جن میں زمیندار، لبرل اور سرکاری ملازم شامل تھے کانگریس کے امیدواروں کو بہت بڑی کامیابی ہوئی۔

فرقہ وارانہ تصفیے کے معاملے میں کانگریس کا رویہ عجیب و غریب تھا۔ گو موجودہ حالات

میں کوئی صورت اور بھی نہ تھی۔ یہ اس کی پچھلی غیر جانب دارانہ اور کمزور پالیسی کا لازمی نتیجہ تھا۔ اگر وہ شروع سے ایک مضبوط پالیسی اختیار کرتی اور فوری نتائج کو نظرانداز کر کے اس پر قائم رہتی تو اس کی روش زیادہ باوقار اور صحیح ہوتی۔ مگر چونکہ اس نے ایسا نہیں کیا اس لئے اس کے سامنے وہی ایک راہ تھی جو اس نے اختیار کی ظاہر ہے کہ فرقہ وارانہ تصفیہ نہایت لغو اور ناقابل قبول ہے کیونکہ اس کے ہوتے ہوئے ہندوستان کو کسی قسم کی آزادی حاصل نہیں ہو سکتی۔ میں یہ اس وجہ سے نہیں کہتا کہ اس سے مسلمانوں کو بہت زیادہ حقوق مل گئے۔ غالباً یہ ممکن تھا کہ دوسرے طریقے سے ان کے سارے مطالبات پورے کر دیئے جاتے۔ موجودہ صورت میں برطانوی حکومت نے ہندوستان کو بہت سے الگ الگ خانوں میں تقسیم کر دیا تاکہ وہ ایک دوسرے کی قوت کو بیکار کر دیں اور غیر ملکی برطانوی عنصر غالب رہے۔ اس طرح سے تو ہندوستان ہمیشہ برطانوی حکومت کا محتاج رہے گا۔

خصوصاً بنگال میں، جہاں مٹھی بھر یورپین جماعت کو صحیح تناسب سے کہیں زیادہ حقوق دیئے گئے ہیں۔ ہندوؤں کے ساتھ بڑی بے انصافی ہوئی یہ تصفیہ یا فیصلہ یا اسے جو کچھ بھی کہا جائے (اسے تصفیہ کہنے پر بعض لوگوں کو اعتراض ہے) بہت سے لوگوں کو سخت ناگوار ہے۔ چاہے یہ زبردستی نافذ کر دیا جائے اور سیاسی وجوہ سے لوگ اسے عارضی طور پر برداشت بھی کر لیں مگر اس کی وجہ سے ہمیشہ فساد کی وجہ قائم رہے گی۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ اس کا برا ہونا بہت اچھا ہے کیونکہ برا ہونے کی وجہ سے یہ مستقل طور پر قائم نہیں رہ سکتا۔

نیشنلسٹ پارٹی کو اور اس سے بھی بڑھ کر ہندو سبھا اور دوسری فرقہ پرست انجمنوں کو یہ مداخلت قدرتی طور پر ناگوار ہوئی۔ مگر ان کے اور ان کے حامیوں کے اعتراضات کی بنا اصل میں یہ تھی کہ وہ برطانوی حکومت کے خیالات سے متاثر تھے اس کی وجہ سے انہوں نے ایک عجیب پالیسی اختیار کی اور کر رہے ہیں جس سے حکومت بہت خوش ہوگی۔ فرقہ وارانہ تصفیہ ان کے دماغ پر مسلط ہے اور اس کی وجہ سے وہ دوسرے اہم معاملات

ہیں حکومت کی مخالفت میں کی کر رہے ہیں۔ انھیں یہ امید ہے کہ وہ خوشامد کے ذریعہ سے حکومت
کو اپنے موافق کر لیں گے اور اس تصفیے میں اپنے حسب منشا ترمیم کرا لیں گے۔ ہندو مہاسبھا اس معاملے
میں سب سے پیش پیش ہے۔ ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ اس میں نہ صرف ان کی ذلت ہے بلکہ
اس سے فرقے وارانہ تصفیے میں ترمیم ہونا اور مشکل ہو جائے گا کیونکہ اس سے مسلمانوں میں اور بھی پیدا
ہو رہی ہے اور وہ صلح کے راستے سے ہٹتے جاتے ہیں۔ حکومت قوم پرستوں کو ہرگز نہیں توڑ سکتی دونوں کی
اغراض میں زمین آسمان کا فرق ہے اور یہ بھی کسی طرح ممکن نہیں کہ وہ فرقے وارانہ اغراض کے معاملے میں ہندوؤں
اور مسلمانوں دونوں کے فرقہ پرستوں کو راضی کر سکے۔ اسے دونوں میں سے ایک کو ترجیح دینی تھی اور اس
نے مسلم فرقہ پرستوں کو ترجیح دی جو اس کے نقطۂ نظر سے بالکل صحیح ہے۔ کیا وہ مٹھی بھر ہندو
فرقہ پرستوں کو خوش کرنے کے لئے اپنی طے شدہ اور مفید پالیسی کو بدل دے گی اور مسلمانوں کو ناراض
کر دے گی؟ خود یہ بات کہ ہندو جماعت کی حیثیت سے سیاست میں آ گئے ہیں اور قومی آزادی
کے لئے زیادہ شور مچاتے ہیں ان کے خلاف پڑتی ہے۔ حکومت سمجھتی ہے کہ چھوٹی چھوٹی فرقہ وارانہ
رعایتوں سے (ظاہر ہے کہ بڑی رعایتیں تو دی نہیں جا سکتیں) ان کی سیاسی مخالفت کم نہیں
ہونے کی، البتہ مسلمان ان رعایتوں سے کچھ دن کے لئے خوش کئے جا سکتے ہیں۔

اسمبلی کے انتخابات سے ظاہر ہو گیا کہ سب سے زیادہ رجعت پسند فرقہ پرست جماعتوں یعنی ہندو
مہاسبھا اور مسلم کانفرنس کی پشت پر کون حضرات ہیں۔ ان دونوں کے امیدوار اور مؤید بڑے
بڑے زمیندار اور مہاجن تھے۔ ہندو مہاسبھا اس چھوٹی سی جماعت پر جو ہندو سماج میں چوٹی
کی جماعت سمجھی جاتی ہے اور لبرل پارٹی کے چیدہ وکلا وغیرہ پر مشتمل ہے۔ ان کی ہندوؤں میں کوئی
اہمیت نہیں اس لئے کہ نیچے اوسط طبقے میں سیاسی بیداری پیدا ہو چکی ہے۔ کارخانوں کے مالک
بھی ان سے الگ ہیں اس لئے کہ ابھرتے ہوئے صنعتی طبقے اور زمینداروں کے طبقے میں جو
جاگیرداری نظام کی یادگار ہے ایک حد تک اغراض کا تصادم ہے۔ مالکان صنعت میں اتنی
ہمت نہیں کہ وہ عملی جد و جہد یا اور خطرناک کاموں میں شریک ہوں اور ان کی کوشش یہ ہے

کہ حکومت اور قوم پرور جماعت دونوں سے اچھے تعلقات قائم رکھیں۔ وہ لبرل یا فرقہ پرست جماعت سے کوئی سروکار نہیں رکھتے۔ ان کا مقصد صرف صنعتی ترقی اور نفع حاصل کرنا ہے

مسلمانوں کے نیچے اوسط طبقے میں ابھی تک سیاسی بیداری پیدا نہیں ہوئی ہے اور صنعت میں بھی وہ پیچھے ہیں۔ اس لئے نہ صرف ان کی انجمنوں پر سخت رجعت پسند، جاگیرداری رنگ میں ڈوبے ہوئے لوگ اور سابق سرکاری ملازم حاوی ہیں، بلکہ پوری جماعت پر ان کا اچھا خاصا اثر ہے۔ مسلم کانفرنس میں خطاب یافتوں، سابق وزیروں اور بڑے زمینداروں کا جمگھٹ نظر آتا ہے۔ پھر بھی میرے خیال میں عام مسلمان عام ہندوؤں سے زیادہ قابلیت رکھتے ہیں اس لئے کہ ان کے معاشرتی نظام میں ایک حد تک آزادی پائی جاتی ہے اور اگر ان میں ایک مرتبہ بیداری پیدا ہو جائے تو غالباً وہ اشتراکیت کی راہ میں زیادہ تیزی سے قدم بڑھائیں گے بالفعل تعلیم یافتہ مسلمانوں پر ذہنی اور جسمانی حیثیت سے ایک جمود سا چھایا ہوا ہے اور ان میں حرکت کا نام نہیں۔ وہ اپنے پہرہ داروں کو ٹوکنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔

کانگریس سیاسی اعتبار سے سب سے آگے ہے اور سب سے بڑی جماعت ہے۔ مگر اس کے رہبر بھی اس سے کہیں زیادہ احتیاط کرتے ہیں جتنی عام لوگوں کی حالت کو دیکھتے ہوئے کرنی چاہیئے۔ وہ عام لوگوں سے مدد تو چاہتے ہیں مگر یہ بہت کم کرتے ہیں کہ ان سے کسی بات میں رائے لیں۔ ان کی مصیبتوں کا سبب معلوم کریں۔ اسمبلی کے انتخابات سے پہلے انھوں نے اپنے پروگرام کو معتدل بنانے کی انتہائی کوشش کی تاکہ اعتدال پسند غیر کانگریسی جماعتوں کی مدد حاصل کر سکیں۔ یہاں تک کہ مندروں کے داخلے کے مسودہ قانون میں بھی ان کے رویے میں اختلاف تھا اور ان میں سے بعض نے مدراس کے کٹر ہندوؤں کی تالیف قلوب کے لئے انھیں بہت کچھ اطمینان دلایا۔ اگر وہ ایک سیدھا سچا جارحانہ انتخابی پروگرام پیش کرتے تو لوگوں میں زیادہ جوش ہوتا اور انہیں اچھی سیاسی ترتیب حاصل ہوتی، مگر موجودہ پروگرام کا یہ نتیجہ ہوگا کہ ان جماعتوں کو جو سیاسی اور سماجی حیثیت سے رجعت پسند ہیں بڑھ جانے کی اور زیادہ کوشش

کی جائے گی تاکہ کسی موقع پر ان کے چند ووٹ حاصل ہو سکیں اور اس سے کانگریس کے
لیڈروں اور عام لوگوں میں اور زیادہ بیگانگی پیدا ہوگی۔ دھواں دھار تقریریں کی جائیں گی،
پارلیمنٹ کے آداب کی پوری پوری پابندی ہوگی اور کبھی کبھی حکومت کو شکست ہو جایا
کرے گی جسے وہ پہلے کی طرح بے پروائی سے نظر انداز کر دے گی۔

پچھلے چند سال میں جب کانگریس کونسلوں کا بائیکاٹ کر رہی تھی اکثر یہ کہا جاتا تھا کہ
اسمبلی اور صوبوں کی کونسلیں جمہور کی حقیقی نمائندہ اور رائے عامہ کا آئینہ ہیں۔ اب یہ لطف
دیکھئے کہ جب انتہا پسند جماعت اسمبلی پر حاوی ہو گئی تو حکومت کا نقطۂ نظر بدل گیا۔ جب کبھی انتخابات
میں کانگریس کی کامیابی کا ذکر آتا ہے تو ارشاد ہوتا ہے کہ انتخاب کنندوں کا حلقہ بہت محدود
ہے تیس پینتیس کروڑ کی آبادی میں صرف تیس لاکھ آدمی رائے دہندگی کا حق رکھتے ہیں
گویا سرکاری نقطۂ نظر سے، جتنے آدمی حق رائے دہندگی سے محروم ہیں وہ سب کے سب
حکومت برطانیہ کے حامی ہیں۔ اس کا علاج تو کھلا ہوا ہے۔ کل بالغوں کو یہ حق دیدیجئے
تو آپ ہی معلوم ہو جائے گا کہ ان لوگوں کی کیا رائے ہے۔

اسمبلی کے انتخابات کے تھوڑے ہی دن بعد اس مشترکہ پارلیمنٹری کمیٹی کی رپورٹ شائع
ہوگئی جو ہندوستان کے دستور اساسی کی اصلاح کے لئے مقرر ہوئی تھی۔ اس پر ہر طرف سے مختلف
قسم کے اعتراضات ہوئے، جن میں زیادہ زور اس بات پر دیا گیا کہ اس رپورٹ سے ظاہر ہوتا
ہے کہ حکومت ہندوستانیوں کی طرف سے "بے اعتمادی" اور "شبہات" رکھتی ہے۔ مجھے بڑی حیرت
ہوئی کہ لوگ ہمارے قومی اور سماجی معاملات کو عجیب و غریب نظر سے دیکھتے ہیں، آخر برطانوی
سامراجی پالیسی اور ہمارے قومی اغراض میں بنیادی اختلاف ہے یا نہیں؟ سوال تو یہ ہے کہ
ان دونوں میں سے کس کو مقدم سمجھیں۔ کیا ہم آزادی اسی لئے چاہتے ہیں کہ اس سامراج کی
پالیسی کو قائم رکھیں؟ برطانوی حکومت کا تو صریحی طور پر یہی خیال ہے اس لئے کہ ہم سے وعدہ
کیا جاتا ہے کہ "تحفظات" سے اس وقت تک کام نہیں لیا جائے گا جب تک ہم کوئی

شرارت نہ کریں یعنی ہماری حکومت خود اختیاری کی قابلیت کا ثبوت یہ ہے کہ ہم وہی کریں جو برطانوی حکومت چاہتی ہے۔ اگر برطانوی پالیسی کو ہندوستان میں قائم رکھنا ہے تو پھر سوراج کے لیے اس قدر ہنگامے کی کیا ضرورت ہے؟

یہ بات سب کو معلوم ہے کہ اوٹاوا کے معاہدے سے انگلستان کو جو کچھ معاشی فائدہ ہوا وہ صرف ہندوستان کی تجارت(۱) کے معاملے میں ہوا۔ برطانوی تاجر جو ہندوستان سے تجارت کرتے ہیں بیشک نفع میں رہے اگرچہ ہندوستان کے سیاسی اور تجارتی حلقوں کی رائے میں یہ نفع عام ہندوستانیوں کی اغراض کو نقصان پہنچا کر حاصل کیا گیا) مگر نو آبادیات خصوصاً کینیڈا اور آسٹریلیا(۲) میں معاملہ اس کے برعکس تھا۔ انھوں نے برطانیہ سے بڑا چوکھا سودا کیا اور اس سے

---

(۱) ہندوستان کی تجارت کا ذکر کرتے ہوئے سر ولیم کری نے فرمایا کہ "اٹاوا کے معاہدے سے برطانیہ کو صرف یہی فائدہ پہنچا"۔ سر ولیم نے یہ الفاظ ۵ دسمبر ۱۹۳۴ء کو کہے جب وہ پی اینڈ او جہاز راں کمپنی کے جلسے کی صدارت کر رہے تھے۔

(۲) جون ۱۹۳۵ء کا "لندن اکنامسٹ" کہتا ہے کہ "اٹاوا کانفرنس اس وقت حق بجانب سمجھی جاتی جب اس کی وجہ سے سلطنت کی اندرونی تجارت بڑھ جاتی اور وہ تجارت جو دنیا کے دوسرے ملکوں سے ہوتی ہے گھٹنے نہ پاتی۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ صرف سلطنت کی اندرونی تجارت میں خفیف سا اضافہ ہوا جس سے اس روزافزوں کمی کی تلافی نہیں ہو سکتی جو سلطنت کی مجموعی تجارت میں ہوئی اور پھر اس اضافے سے برطانیہ کے مقابلے میں نو آبادیوں کو زیادہ فائدہ پہنچا۔ سلطنت کے دوسرے ملکوں سے ہماری درآمد ۱۹۳۱ء میں ۲۴ کروڑ ۷۰ لاکھ پونڈ تھی اور ۱۹۳۴ء میں ۲۴ کروڑ ۹۰ لاکھ پونڈ ہو گئی مگر ہماری برآمد ۱۷ کروڑ ۶ لاکھ سے ۱۲ کروڑ ۳۵ لاکھ رہ گئی۔ یہ بھی ملحوظ رہے کہ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۴ء تک اندرون سلطنت میں ہماری برآمد ۵۰٫۹ فی صدی گھٹ گئی حالانکہ درآمد میں صرف ۳۲٫۹ فی صدی کی کمی ہوئی۔ ممالک غیر میں ہماری برآمد میں تو زیادہ کمی نہیں ہوئی مگر درآمد بہت گھٹ گئی۔"

نقصان پہنچا کر خود فائدہ اٹھایا۔ پھر بھی ان کی یہ کوشش ہے کہ اٹاوا کے معاہدے کے چکر سے نکلیں تاکہ وہ خود اپنی صنعت کو اور دوسرے ملکوں سے اپنی تجارت کو ترقی دے سکیں[1]۔ کینیڈا میں لبرل پارٹی، جو ایک ممتاز سیاسی جماعت ہے اور غالباً بہت جلد برسر اقتدار آجائے گی صاف الفاظ میں اعلان کر چکی ہے کہ وہ اٹاوا کے معاہدے کو ختم کر دے گی[2]۔ آسٹریلیا میں اٹاوا کے معاہدے کی تاویلیں کر کے بعض قسم کے کپڑے اور سوت پر محصول بڑھلوا گیا ہے۔ اس پر لنکا شائر کے کارخانوں کے مالک بہت برہم ہوئے اور انھوں نے اسے معاہدے کی خلاف ورزی قرار دیا۔ احتجاج اور انتقام کے طور پر لنکا شائر میں آسٹریلیا کے مال کو بائیکاٹ کرنے کی تحریک شروع ہوئی مگر آسٹریلیا پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوا بلکہ اس نے جارحانہ رویہ اختیار کیا[3]۔

---

[1] اخبار "میلبورن ایج" اٹاوا کے معاہدے کو پسند نہیں کرتا ہے۔ اس کی رائے میں یہ معاہدہ بہت تکلیف دہ ثابت ہو رہا ہے اور روز بروز ظاہر ہوتا جاتا ہے کہ اس میں بڑی سخت غلطی کی گئی (بہ حوالہ ہفتہ وار مانچسٹر گارجین ۱۹ اکتوبر ۱۹۳۴ء)۔

[2] مسٹر بینٹ موجودہ وزیر اعظم کینیڈا قدامت پسند ہونے کے باوجود برطانوی حکومت کے لیے سوہان روح بن گئے ہیں وہ اب روسیوں کی طرح نئے معاہدوں کا ذکر کرتے ہیں۔ مسٹر لسٹی نوف، سر اسٹیفرڈ کرپس اور مسٹر جان اسٹریچی کے خطرناک اثرات کی بدولت وہ اجتماعیت پسند بن گئے ہیں۔ قدامت پسندوں، اعتدال پسندوں اور سول سروس والوں کو ان سے عبرت حاصل کرنی چاہئے اور ایسے لوگوں سے تعلق نہیں رکھنا چاہئے ورنہ وہ بھی خطرناک نظریوں کے قائل ہو جائیں گے (ان سطروں کے لکھنے کے بعد معلوم ہوا کہ لبرل پارٹی نے انتخابات میں بہت بڑی اکثریت حاصل کی اور حکومت اس کے ہاتھ میں آ گئی)

[3] "میلبورن ایج" نے لکھا کہ اگر لنکا شائر والے مجوزہ بائیکاٹ سے باز نہیں آئیں گے تو آسٹریلیا کو لنکا شائر کی رہی سہی تجارت پر اور زیادہ سختیاں کرنی پڑیں گی۔ لنکا شائر جو کچھ کر رہا ہے اس کا جواب یہی ہے کہ ہم مضبوطی سے اپنے پہلے ارادے پر قائم رہیں (بہ حوالہ ہفتہ وار مانچسٹر گارجین ۹ نومبر ۱۹۳۴ء)

ظاہر ہے کہ یہ معاشی نزاعین اس وجہ سے نہیں ہیں کہ کنیڈا اور آسٹریلیا کو برطانیہ سے کسی قسم کی پرخاش ہو البتہ آئرستان کو ضرور اس سے کد ہے۔ نزاعین اس وجہ سے ہوتی ہیں کہ اغراض میں تصادم ہوتا ہے اور ہندوستان کے "تحفظات کا مقصد یہی ہے کہ جب کبھی تصادم ہو تو برطانیہ کی اغراض مقدم رکھی جائیں۔ حال ہیں ہندوستان اور برطانیہ میں ایک تجارتی معاہدہ ہوا ہے اس میں ہندوستان کے تاجروں اور مالکان صنعت سے رائے نہیں لی گئی اور وہ چیختے ہی رہے البتہ برطانیہ کے مالکان صنعت سے برابر مشورہ ہوتا رہا۔ اسمبلی نے اس معاہدے کو مسترد کردیا مگر حکومت اسی پر اڑی رہی۔ اس سے کچھ تھوڑا سا اندازہ ہوتا ہے کہ تحفظات کا" کیا نتیجہ ہوگا۔ اس قسم کے "تحفظات" کی کنیڈا، آسٹریلیا اور جنوبی افریقہ میں بڑی ضرورت ہے تاکہ ان نوآبادیوں کے لوگ نہ صرف تجارتی معاملات میں بلکہ اور کاموں میں بھی جو سلطنت کی حفاظت اور مضبوطی کے لئے ان سے زیادہ اہم ہیں راہ راست سے بھٹکنے نہ پائیں۔[1]

کہا جاتا ہے کہ سلطنت قرضخواہ ہے اور "تحفظات" اس غرض سے وضع کیے گئے ہیں کہ سلطنت کا مہاجن بدنصیب قرض دار کا گلا دبائے رہے اور اپنی اغراض اور قوت کی

---

[1] مسٹر اوسوالڈ پیرو، وزیر فوج جنوبی افریقہ نے بیان کیا کہ ان کا ملک سلطنت کی عام حفاظت کی کسی اسکیم میں شریک نہیں ہوگا اور نہ سمندر پار کی کسی لڑائی میں شرکت کرے گا۔ خواہ برطانیہ ہی سے کیوں نہ ہو اگر حکومت نے ناعاقبت اندیشی سے جنوبی افریقہ کو سمندر پار کی لڑائی میں پھنسا دیا تو عام بدامنی پھیل جائے گی اور عجب نہیں کہ خانہ جنگی کی نوبت آجائے۔ اس لئے حکومت سلطنت کی عام حفاظت کی کسی اسکیم میں شرکت نہیں کرے گی۔"

(رائٹر کی خبر جو ۵ فروری ۱۹۳۵ء کو کیپ ٹاون سے بھیجی گئی)

وزیر اعظم جنرل ہیرتسوگ نے اس بیان کی تصدیق کی اور کہا کہ یہ حکومت کی پالیسی کو ظاہر کرتا ہے۔

حفاظت کر رہا ہے۔ ایک اور عجیب و غریب نظریہ جو سرکاری طور پر اکثر پیش کیا جاتا ہے یہ ہے کہ گاندھی جی اور کانگرس نے ان تحفظات کے اصول کو تسلیم کر لیا ہے اس لئے کہ ۱۹۳۱ء کے معاہدہ دہلی کی رو سے وہ "ایسے تحفظات جو ہندوستان کے لئے مفید ہوں" قبول کر چکے ہیں۔

اور پھر اوٹاوا کا معاہدہ اور تجارتی تحفظات تو نسبتاً چھوٹی چیزیں ہیں۔[۵] ان سے کہیں زیادہ اہم وہ شرطیں ہیں جن کا مقصد یہ ہے کہ برطانیہ کا سیاسی اور معاشی تسلط ہندوستان پر قائم رہے جس نے پہلے انہیں خوب لوٹا اور اب بھی لوٹ رہا ہے۔ جب تک یہ شرطیں اور "تحفظات" باقی ہیں نہ کسی قسم کی حقیقی ترقی ہو سکتی ہے اور نہ آئینی طریقوں سے کوئی تغیر ممکن ہے جو کوشش بھی آئینی طریقے سے کی جائے گی اس کی راہ میں "تحفظات" کی دیوار حائل ہو گی اور یہ بات ظاہر ہو جائے گی کہ صرف ایک راہ کھلی ہوئی ہے اور وہ غیر آئینی راہ ہے۔ سیاسی تغیر کے نقطہ نظر سے یہ مجوزہ دستور اور اس کا عجیب الخلقت وفاق بالکل مہمل چیز ہے اور سماجی اور معاشی نقطہ نظر سے اور بھی بدتر ہے۔ اشتراکیت کا رستہ خاص کر کے بند کر دیا گیا ہے۔ بظاہر بہت سے اختیارات منتقل کئے گئے ہیں اور وہ بھی زیادہ ان طبقوں کو جن سے کسی قسم کا خطرہ نہیں ہے مگر کوئی مفید کام کرنے کا اختیار اور وسائل نہیں دیئے گئے۔ اختیار برطانیہ کے ہاتھ میں ہے اور ذمہ داری ہندوستانیوں پر۔ استبداد کی برہنگی کو چھپانے کے لئے دستور کے مطابق انجیر کا پتہ تک بھی نہیں ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ آج کل ملکوں کے دستور اساسی میں بہت زیادہ لوچ ہونا چاہئے تا کہ وہ تیزی سے بدلتی ہوئی حالت کے مطابق بدلا جا سکے بلا تعمیلہ کرنے اور اس فیصلے

---

[۵] "لندن اکنامسٹ" (اکتوبر ۱۹۳۴ء) نے صاف کہہ دیا ہے "معلوم ہوتا ہے کہ آئندہ سے برطانوی حکومت کی برکات میں ایک مشتبہ اضافہ یہ بھی ہو جائے گا کہ دنیا کے بہت سے حصوں کے باشندے اس پر مجبور کئے جائیں گے کہ وہ زیادہ قیمت دے کر لنکا شائر کا مال خریدیں۔" اس کی سب سے نمایاں مثال سیلون ہے۔

کو نافذ کرنے کا اختیار ضروری ہے۔ آج کل خود مغربی ملکوں کی پارلیمنٹری جمہوریت بھی ان تغیرات کو عمل میں نہیں لا سکتی جو موجودہ زمانے کے لئے ضروری ہیں۔ مگر یہاں تو یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ حرکت کو روکنے کے لئے خاص کر کے ہمارے پیروں میں بھاری بیڑیاں ڈال دی گئی ہیں اور ہمارے سامنے ایک آہنی دروازہ کھڑا کر دیا گیا ہے۔ ہمیں ایک ایسی موٹر کار دی گئی ہے جس میں بریک ہی بریک ہیں انجن کوئی نہیں۔ یہ دستور اساسی ان لوگوں کا بنایا ہوا ہے جن کی نظروں میں ہمیشہ مارشل لا سمایا رہتا ہے۔ جس شخص کا دارومدار تشدد پر ہو اس کے سامنے دو ہی صورتیں ہیں یا تو مارشل لا یا تباہی۔

برطانیہ کے اس تحفے سے ہندوستان کو جس قدر آزادی دی گئی ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ملک میں جو سب سے زیادہ اعتدال پسند اور سیاسی اعتبار سے پس ماندہ جماعتیں ہیں، انھوں نے بھی اس کو رجعت پسندانہ قرار دیا ہے۔ حکومت کے پیشہ ور حامیوں نے اعتراض کے ساتھ ساتھ اپنی عادت کے مطابق تھوڑی بہت خوشامد بھی کی ہے مگر دوسرے جوش و خروش سے اس کی مخالفت کر رہے ہیں۔

مجوزہ دستور کو دیکھنے کے بعد لبرل جماعت کا یہ راسخ عقیدہ بھی متزلزل ہو گیا کہ ہندوستان کو برطانیہ کا محکوم بنانا قدرت کی عین مصلحت ہے۔ انھوں نے بڑی سختی سے اس دستور پر تنقید کی مگر چونکہ وہ حقیقت کی طرف التفات نہیں کرتے اور الفاظ اور حسن اخلاق کے عاشق ہیں اس لئے ان کا سارا زور اس بات پر تھا کہ رپورٹ میں اور مسودہ قانون میں "درجہ نو آبادیات" کے الفاظ موجود نہیں ہیں۔ اس پر بڑی چیخ و پکار ہوئی اور اب جب کہ حسب معمول ہور نے اس مسئلے کے متعلق ایک بیان دے دیا ہے غالباً ان حضرات کی خودداری کو تسکین ہو جائے گی۔ اس سے کچھ بحث نہیں کہ درجہ نو آبادیات محض انگیز پرچھائیں ہے جو نامعلوم مستقبل میں جھلکتی ہے ایک موہوم منزل ہے جسے ہم کبھی نہیں پا سکتے۔ یہی کیا کم ہے کہ ہم اس کا خواب دیکھتے رہیں اور اس کے حسن و جمال کے گیت گاتے رہیں۔ سر تیج بہادر سپرو کو شاید برطانوی پارلیمنٹ اور برطانوی

قوم کے متعلق کچھ شبہات ستا رہے تھے اس لئے انھوں نے بادشاہ کے دامن میں پناہ لی تعجب ہے کہ ان جیسے ممتاز قانون داں نے ایک نرالا دستوری نظریہ پیش کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں "چاہے برطانوی پارلیمنٹ اور برطانوی قوم ہندوستان کے لئے کچھ کرے یا نہ کرے، ان دونوں سے بالاتر بادشاہ کی ذات ہے جو ہندوستانی رعایا کے حقوق کی اور ہندوستان کے امن اور فلاح کی محافظ ہے۔" یہ بڑا تسکین دہ نظریہ ہے اس کے بعد ہمیں کوئی ضرورت نہیں رہتی کہ دستور، قوانین اور سیاسی اور سماجی تغیرات کی فکر میں سر کھپائیں۔

مگر بڑی بے انصافی ہوگی اگر یہ کہا جائے کہ لبرل جماعت نے دستور کی مخالفت کم کر دی ہے۔ ان میں سے اکثر نے صاف صاف کہا ہے کہ موجودہ حالات کو چاہے وہ کتنے ہی بُرے کیوں نہ ہوں، اس دستور پر ترجیح دیتے ہیں جو زبردستی ہندوستان کے سر منڈھا جا رہا ہے۔ اس بات پر زور دینے کے سوا وہ اپنے اصول کے مطابق اور کچھ نہیں کر سکتے اور غالباً وہ زور ہی دیتے رہیں گے۔ اس پرانی مثل میں نیا تصرف کر کے وہ اسے اپنا دستور العمل بنا سکتے ہیں۔ "اگر پہلی بار تمہیں کامیابی نہ ہو تو پھر چلاؤ۔"

لبرل لیڈر اور غالباً اور بہت سے لوگ جن میں بعض کانگریسی بھی شامل ہیں اپنی امیدیں اس سے وابستہ رکھتے ہیں کہ برطانیہ میں لیبر پارٹی کی فتح ہو اور اس کی حکومت قائم ہو جائے۔ بے شک کوئی وجہ نہیں کہ ہندوستان برطانیہ کی انتہا پسند جماعتوں کی مدد سے ترقی نہ کرے اور لیبر حکومت کے آنے سے فائدہ نہ اٹھائے مگر بے بسی کی حالت میں اس بھروسے پر بیٹھے رہنا کہ انگلستان کی حکومت بدل جائے ہرگز قومی عزت و وقار کے شایاں نہیں۔ اور عزت و وقار تو ایک طرف عقل کے بھی خلاف ہے۔ آخر ہم کیوں برطانیہ کی لیبر پارٹی سے زیادہ توقعات رکھیں؟ ہم دو بار لیبر پارٹی کی حکومت دیکھ چکے ہیں اور اس سے ہندوستان کو جو کبھی علحل

---

۵ انھوں نے یہ الفاظ ۲۹ جنوری ۱۹۳۵ء کو لکھنؤ کے ایک عام جلسے میں کہے تھے۔

ہوئیں انھیں کبھی نہیں بھولیں گے۔ مسٹر ریمزے میکڈانلڈ لیبر پارٹی سے الگ ہوگئے تو کیا ہوا۔ ان کے پرانے ساتھیوں کا قریب قریب وہی رنگ ہے۔ لیبر پارٹی کی جو کانفرنس اکتوبر ۱۹۳۴ء میں ساؤتھ پورٹ میں ہوئی تھی وہاں مسٹر وی۔ کرشنا مینن نے ایک رزولیوشن پیش کیا، جس میں اس کی اشد ضرورت ظاہر کی گئی تھی کہ قوموں کو اپنا طرزِ حکومت آپ متعین کرنے کا جو حق حاصل ہے اس کے مطابق ہندوستان میں فوراً کامل حکومت خود اختیاری قائم کر دی جائے۔" مسٹر آرتھر ہینڈرسن نے اس پر زور دیا کہ یہ رزولیوشن واپس لے لیا جائے اور مجلس منتظمہ کی طرف سے یہ وعدہ کرنے سے انکار کیا کہ وہ ہندوستان کو تعینِ حکومت کی آزادی دینے کی پالیسی پر عمل کرے گی۔ انھوں نے فرمایا "ہم صاف صاف کہہ چکے ہیں کہ جہاں تک ممکن ہوگا ہم ہندوستانی قوم کے ہر فریق سے رائے لیں گے۔ اس لیے سب کا اطمینان ہو جانا چاہیے۔" یہ اطمینان شاید اس وجہ سے کم ہو جائے کہ پچھلی لیبر حکومت نے بھی حرف بہ حرف اسی پالیسی کا اعلان کیا تھا اور گول میز کانفرنس وہائٹ پیپر، مشترکہ کمیٹی کی رپورٹ اور انڈیا ایکٹ اسی کا نتیجہ ہے۔ یہ بات بالکل صاف ہے کہ سلطنت کی بیرونی پالیسی کے معاملے میں انگلستان میں ٹوری ہوں یا لیبر پارٹی والے سب ایک سے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ لیبر پارٹی کے عام ممبر زیادہ آزاد خیال ہیں مگر ان کا اثر اپنے قدامت پسند لیڈروں پر بہت کم ہے۔ ممکن ہے کہ لیبر پارٹی میں انتہا پسند فریق زیادہ قوی ہو جائے کیونکہ آج کل حالات بہت تیزی سے بدل رہے ہیں لیکن کیا قومی اور سماجی تحریکیں دوسرے ملکوں کے موہوم تغیرات کے آسرے میں پڑ کر سو جایا کرتی ہیں؟

ہمارے یہاں کی لبرل جماعت کا برطانوی لیبر پارٹی کے بھروسے پر رہنا ایک لحاظ سے عجیب و غریب ہے۔ کوئی ان سے پوچھے کہ اگر یہ پارٹی اپنے انتہا پسند فریق کی طرف جھک گئی اور اس نے انگلستان میں اپنا اشتراکی پروگرام جاری کر دیا تو پھر آپ اور ہندوستان کے دوسرے اعتدال پسند کیا کریں گے؟ ان میں سے اکثر حضرات اجتماعی مسائل میں بڑے پکے قدامت پسند ہیں۔ وہ ان اجتماعی اور معاشی تغیرات کو جو لیبر پارٹی نے انگلستان میں کیے

ہیں ناپسند کرتے ہیں اور ہندوستان میں ان کے نافذ ہونے سے ڈرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ جب برطانیہ سے تعلق رکھنا اجتماعی حالات میں انقلاب کی علامت سمجھا جائے تو ان حضرات کو برطانوی تعلق کا یہ شوق نہ رہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میرے جیسے لوگ جو کامل آزادی اور برطانیہ سے قطع تعلق چاہتے ہیں اس وقت اپنی رائے بدل دیں اور اشتراکیت پسند برطانیہ سے گہرے تعلقات رکھنے کو ترجیح دیں ظاہر ہے کہ ہم میں سے کسی کو برطانوی قوم سے اتحاد عمل کرنے پر اعتراض نہیں ہے ہم تو اس کی شہنشاہی کی پالیسی کے مخالف ہیں اور جب وہ اس کو چھوڑ دے گی تو اتحاد عمل کی راہ خود بخود کھل جائے گی۔ اس وقت اعتدال پسند حضرات کا کیا رنگ ہوگا؟ غالباً وہ اسے بھی قدرت کی ناقابل فہم حکمت پر محمول کریں گے۔

گول میز کانفرنس اور وفاق کی تجویز کا ایک نمایاں نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستانی والیان ریاست بہت پیش پیش ہو گئے ہیں، رجعت پسند ٹوریوں کی نظر شفقت ان کے حال پر ہے اور انھیں جو "آزادی" ملی ہے اس نے ان میں ایک نئی روح پھونک دی ہے۔ اس سے پہلے کبھی انہیں زبردستی اتنی اہمیت نہیں دی گئی تھی۔ پہلے ان کی یہ مجال نہ تھی کہ جس بات کا اشارہ رزیڈنٹ کی طرف سے ہو اس سے انکار کر سکیں اور حکومت ہند ان حضرات کے ساتھ کھلم کھلا حقارت کا برتاؤ کرتی تھی۔ اکثر ان کے اندرونی معاملات میں مداخلت کی جاتی تھی اور بعض اوقات یہ مداخلت بالکل جائز ہوتی تھی۔ آج بھی بہت سی ریاستوں میں بلاواسطہ یا بالواسطہ برطانوی افسروں کی حکومت ہے جن کی خدمات انھیں مستعار دی گئی ہیں۔ مگر مسٹر چرچل اور لارڈ رودرمیر کی جد و جہد سے حکومت ہند گھبرا گئی ہے اور اب ان کے معاملوں میں دخل دینے میں بہت احتیاط کرتی ہے اور یہ لوگ بھی ذرا اکڑے ہوئے ہیں۔

میں نے ہندوستان کی سیاست کے ان سطحی معاملات کو سمجھنے کی کوشش کی ہے مگر مجھے ان میں کوئی حقیقت نظر نہیں آتی۔ میں تو اس چیز کو دیکھ کر ڈرتا ہوں جو ان کی تہ میں ہے اور وہ یہ ہے کہ ہر قسم کی آزادی سلب کی جا رہی ہے مصیبت اور تکلیف کا بازار گرم ہے۔ لوگوں

کی نیک نیتی سنخ کرکے دکھائی دیتی ہے اور بُرے رجحانات کی بہت افزائی ہوتی ہے۔ نہ جانے کتنے جیل میں پڑے ہیں اور اپنی زندگی کے ماہ و سال گھٹ گھٹ کر کاٹ رہے ہیں[1]۔ ان کے عزیزوں دوستوں اور ہزاروں اور آدمیوں کے دل میں غم و غصے کے جذبات اور وحشیانہ قوت کے آگے عجز اور بے بسی کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ اس کے زمانے میں بھی بہت سی انجمنیں خلاف قانون قرار دی جاتی ہیں اور "ہنگامی اختیارات" اور "قیام امن کے قوانین" حکومت کے سلاح خانے میں قریب قریب ہر وقت رہا کرتے ہیں۔ آزادی کو سلب کرنے کی تدبیریں جو استثنا کے طور پر شروع ہوتی ہیں بہت جلد کلیہ بن جاتی ہیں۔ صدہا کتابیں اور رسالے ممنوع قرار دئے جاتے ہیں اور ان کا داخلہ "بحری چنگی کے قانون" کی رو سے بند کردیا جاتا ہے اور جس کے پاس "خطرناک" کتابیں نکلیں اسے بعض اوقات بڑی بھاری سزا دی جاتی ہے سیاسی یا معاشی مسائل حاضرہ پر آزادی سے اظہار رائے کیا جائے یا روس کے معاشرتی اور تمدنی حالات کی تعریف کی جائے تو سنسر صاحب بہت خفا ہو جاتے ہیں۔ ماڈرن ریویو کو حکومت بنگال نے اس بات پر تنبیہہ کی تھی کہ اس نے ڈاکٹر ٹیگور کا ایک مضمون روس کے

---

[1] سر ہیری ہیگ ہوم ممبر نے ۲۲ جولائی ۱۹۳۴ء کو اسمبلی میں کہا تھا کہ ان لوگوں کی مجموعی تعداد جو جیلوں اور کیمپوں میں نظر بند ہیں حسب ذیل ہے:-

بنگال ۱۵۰۰ اور ۱۶۰۰ کے درمیان، دیولی کیمپ ۵۰۰، میزان ۲۰۰۰ اور ۲۱۰۰ کے درمیان

یہ صرف نظر بندوں یعنی ان لوگوں کی تعداد ہے جو بغیر عدالتی تحقیقات اور سزا کے قید کر دئے گئے ہیں۔ سزا یافتہ سیاسی قیدی ان کے علاوہ ہیں۔ ان کو عموماً بہت بھاری بھاری سزائیں دی گئی ہیں۔ ایسوسی ایٹڈ پریس کی ۷ دسمبر ۱۹۳۴ء کی خبر ہے کہ حال میں کلکتے کے ایک مقدمے میں ہائی کورٹ نے ایک شخص کو بغیر لائسنس اسلحہ رکھنے کے جرم میں ۹ سال قید بامشقت کی سزا دی۔ اس کے پاس سے ایک ریوالور اور ۱۶ کارتوس نکلے تھے۔

متعلق، جو انھوں نے وہاں جانے کے بعد لکھا تھا شائع کیا تھا۔ نائب وزیر ہند صاحب نے پارلیمنٹ میں فرمایا کہ اس مضمون میں وہ کارگذاریاں جو برطانوی حکومت نے ہندوستان میں کیں، مسخ کرکے دکھائی گئی ہیں" اس لئے اس پر اعتراض کیا گیا۔ ان کارگذاریوں کے متعلق صحیح رائے، وہ ہے جو سنسر کی ہو اور ہمیں کوئی حق نہیں کہ اس کے خلاف اسے رکھیں یا ظاہر کریں۔ حکومت نے اس مختصر پیام کی اشاعت پر بھی اعتراض کیا جو رابندرناتھ ٹیگور نے ڈبلن کی "سوسائٹی آف فرینڈز" کے نام بھیجا تھا۔ اگر رابندرناتھ ٹیگور کا سا شخص جو صرف ہندی مسائل سے دلچسپی رکھتا ہے اور سیاسیات سے خاص کرکے الگ رہتا ہے جس کا ہندوستان میں بڑا احترام اور دنیا میں بڑی شہرت ہے۔ اس طرح زبان بند کیا جا سکتا ہے تو چھوٹے آدمیوں کا کیا ذکر ہے۔ خود ان زبان بندیوں سے بھی بدتر وہ خوف کی فضا ہے جو ان کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ ان حالات میں نہ تو دیانتدارانہ اخبار نویسی کا امکان ہے اور نہ تاریخ، معاشیات سیاسیات اور واقعات حاضرہ کی تحقیق اور صحیح تعلیم کا۔ یہ عجیب و غریب بنیاد ہے جس پر اصلاحات ذمہ دار حکومت وغیرہ کی عمارت تعمیر کی جا رہی ہے۔[۵۲]

---

[۵۱] ۱۲؍نومبر ۱۹۳۴ء

[۵۲] ۴؍ستمبر ۱۹۳۵ء کو اسمبلی میں سرکاری طور پر پریس ایکٹ کے عمل درآمد کے متعلق ایک بیان دیا گیا اس میں یہ بتایا گیا کہ ۱۹۳۴ء سے اب تک ۳۴۸ اخبارات پر ضمانت کی طلبی اور ضبطی کا اثر پڑا۔ ان میں سے ۳۴۸ اخبارات بند ہو گئے ہیں اس لئے کہ وہ مزید ضمانتیں نہیں دے سکتے تھے اور ۱۶۶ نے ضمانتیں داخل کیں جن کی مجموعی مقدار ۲ لاکھ ۵۲ ہزار ۸۲۵ روپے تھے۔

حال میں (یعنی ۱۹۳۵ء کے نصف آخر میں) کئی اور قانون جو مدنی آزادی کو سلب کرتے ہیں ایک طویل عرصہ کے لئے وضع کئے گئے ہیں۔ ان میں سب سے اہم قانون "ضابطۂ فوجداری" ہے جس کا نفاذ سارے ہندوستان میں ہے اسے اسمبلی نے نامنظور کر دیا تھا۔ مگر گورنر جنرل نے اس کی تصدیق کر دی۔ اکثر صوبوں میں بھی اس قسم کے قانون بنائے گئے ہیں۔

ہر سمجھ دار آدمی جانتا ہے کہ آج کل دنیا سخت ذہنی کشمکش میں مبتلا ہے۔ بعض لوگوں کو موجودہ حالات سے بیزاری کا مبہم اور بعض کو واضح احساس ہو گیا ہے۔ سب شدت سے بیزار ہیں۔ ہماری آنکھوں کے سامنے بڑے بڑے تغیرات ہو رہے ہیں۔ بلوہ مستقبل خواہ وہ کوئی شکل بھی اختیار کرے اب اتنی دور کی چیز نہیں جو صرف فلسفیوں، مدبروں اور معاشیوں کے ذہن میں محض نظری دلچسپی پیدا کرتا ہو۔ یہ ایک مسئلہ ہے جو ہر شخص کی زندگی کو کسی نہ کسی طرح متاثر کرتا ہے اور ہر شہری کا فرض ہے کہ ان قوتوں کو جو دنیا میں کارفرما ہیں اچھی طرح سمجھے اور اپنے طرز عمل کے متعلق فیصلہ کرے کہ پرانی دنیا ختم ہو رہی ہے اور نئی دنیا بن رہی ہے۔ کسی مسئلے کو حل کرنے کے لئے یہ شرط ہے کہ پہلے آدمی اس مسئلہ کو سمجھ لے بلکہ اس کا سمجھنا بجائے خود اسی قدر اہم ہے جتنا اس کا حل کرنا۔

بدقسمتی سے ہمارے سیاست داں واقعات عالم سے حیرت انگیز طور پر ناواقف یا بے پرواہ ہیں۔ غالباً یہی ناواقفیت ہندوستان کے اکثر سرکاری ملازموں میں بھی پائی جاتی ہے اس لئے کہ سول سروس والے اپنی علیحدہ اور محدود دنیا میں مگن رہتے ہیں۔ صرف بڑے بڑے حکام ان مسائل پر غور کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ برطانوی حکومت واقعات عالم کو پیش نظر رکھنے پر مجبور ہے تاکہ ان کے لحاظ سے اپنی پالیسی کی تشکیل کرے۔ سب جانتے ہیں کہ برطانیہ کی خارجی پالیسی پر اس چیز کا بڑا اثر ہے کہ وہ ہندوستان پر قابض ہے اور اس کی حفاظت کرنا چاہتا ہے۔ مگر کتنے ہندوستانی سیاست داں اس پر غور کرتے ہیں کہ جاپانی شہنشاہی یا سوویٹ کی بڑھتی ہوئی قوت یا سنکیانگ میں انگریزوں، روسیوں اور جاپانیوں کی ساز شیں ہندوستان کی سیاست سے گہرا تعلق رکھتی ہیں۔ وسط ایشیا کے حالات کا اثر صریحی طور پر کشمیر پر پڑ رہا ہے اور وہ برطانیہ کی پالیسی اور مداخلت کا مرکز بن گیا ہے۔

ان سے بھی زیادہ اہم وہ معاشی تغیرات ہیں جو بڑی تیزی سے ساری دنیا میں رونما ہو رہے ہیں۔ ہمیں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ انیسویں صدی کا نظام ختم ہو گیا اور

وہ آج کل کی ضرورتوں کو پورا نہیں کر سکتا تھا قانون دانوں کا وہ اصول جو ہندوستان میں بہت
رائج ہے کہ ہر بات کی نظیریں ڈھونڈی جاتی ہیں، وہاں کیا کام دے سکتا ہے جہاں سرے سے
کوئی نظیر ہی موجود نہ ہو؟ ہم چھکڑے کو پٹری پر چلا کر اسے ریل نہیں کہہ سکتے۔ ایسے فرسودہ چیز
سمجھ کر ترک ہی کرنا پڑے گا۔ روس کے علاوہ دوسرے مقامات پر بھی "نئے معاشی انتظامات"
اور عظیم الشان تغیرات کا چرچا ہے۔ پریسیڈنٹ روزویلٹ نے جو یقیناً سرمایہ داری نظام
کو قائم رکھنا اور تقویت پہنچانا چاہتے ہیں نہایت بہادری کے ساتھ بڑی بڑی اسکیمیں جاری
کی ہیں جن سے ممکن ہے کہ امریکا کی ساری زندگی بدل جائے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ "جن
لوگوں کو حد سے زیادہ حقوق حاصل ہیں ان سے وہ چھین لئے جائیں گے اور جنہیں حد سے
کم حقوق ملے ہیں انہیں اور دئے جائیں گے"۔ ممکن ہے کہ وہ کامیاب ہوں مگر اس میں کوئی
شبہ نہیں کہ وہ ہمت رکھتے ہیں اور اپنے ملک کو پامال رستوں سے نکال کر نئی راہ پر چلانا چاہتے
ہیں، وہ اپنی پالیسی کو بدلنے یا اپنی غلطیوں کا اعتراف کرنے سے نہیں ڈرتے۔ انگلستان میں
مسٹر لائڈ جارج نے ایک "نئے معاشی انتظام" کی تجویز پیش کی ہے۔ ہندوستان میں بھی ایسے
بہت سے نئے انتظامات کی ضرورت ہے۔ یہ پرانا خیال کہ "جو کچھ جاننا تھا وہ جانا جا چکا اور
جو کچھ کرنا تھا وہ کیا جا چکا" مہمل بھی ہے اور خطرناک بھی۔

ہمیں بہت سے مسائل کا سامنا کرنا ہے اور اس کے لئے جرأت سے کام لینے کی
ضرورت ہے۔ اگر موجودہ اجتماعی اور معاشی نظام عام لوگوں کی حالت کو درست نہیں کر سکتا
تو کیا اسے باقی رہنے کا حق ہے؟ کیا کسی اور نظام سے عام فلاح کی امید ہو سکتی ہے؟ محض
سیاسی تغیر سے کہاں تک بنیادی اصلاح اور ترقی ممکن ہے؟ اگر مستقل حقوق رکھنے والوں
کی اغراض نہایت مفید تغیر کی راہ میں حائل ہوں تو کیا عقل اور اخلاق کا یہ تقاضا ہے کہ ان
اغراض کو نہ چھیڑا جائے اور عام لوگوں کو بدستور افلاس اور مصیبت میں رہنے دیا جائے؟ ظاہر
ہے کہ اصل مقصد ان حضرات کو نقصان پہنچانا نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ وہ دوسروں کو نقصان

نہ پہنچانے پائیں۔ اگر ان سے مصالحت کرنے کی کوئی صورت ہوتی تو وہ سب سے بہتر تھی ممکن ہے کہ بعض لوگ مصالحت کو خلاف انصاف سمجھیں مگر اس بنا پر کسی کو یہ نہیں ہو سکتا کہ مصلحت اسی میں ہے۔ ظاہر ہے کہ مصالحت کے یہ معنی نہیں کہ مستقل حقوق ایک طبقے سے چھین کر دوسرے لوگوں کو دے دئے جائیں جہاں کہیں ممکن اور مناسب ہو ان حقوق کے بدلے معقول معاوضہ دیا جا سکتا ہے گو کہ لڑائی کا خرچ اس سے کہیں زیادہ ہوگا مگر بدقسمتی سے تمام تاریخ شاہد ہے کہ مستقل حقوق رکھنے والے مالک اس طرح کے سمجھوتے پر راضی نہیں ہوتے۔ وہ طبقے جن کی ضرورت اور اہمیت سماج کی زندگی میں ختم ہو چکی ہے نہایت ناعاقبت اندیش ہوتے ہیں۔ وہ اب جوا کھیلتے ہیں کہ یا تو سب کچھ رہے یا سب کچھ جائے اس لئے وہ رفتہ رفتہ مٹ جاتے ہیں۔

بقول کانگریس ورکنگ کمیٹی کے لوگ املاک کی ضبطی وغیرہ کے متعلق بہت سی فضول باتیں کیا کرتے ہیں۔ اصل میں موجودہ نظام کی بنیاد املاک کی مسلسل اور مستقل ضبطی پر قائم ہے اور اسی کو ختم کرنے کے لئے اجتماعی تغیرات تجویز کئے جاتے ہیں۔ مزدور جو کچھ اپنی محنت سے پیدا کرتا ہے اس کا ایک حصہ روزمرہ ضبط ہوتا رہتا ہے۔ کسان کا کھیت اس طرح ضبط کر لیا جاتا ہے کہ لگان اتنا بڑھا دیتے ہیں جسے وہ ادا نہیں کر سکتا۔ پہلے افراد مشترک زمین کو ضبط کر کے بڑی بڑی جاگیریں بنا لیتے تھے وہ کاشتکار جو اپنی زمین کے مالک ہوتے تھے اسی طرح برباد کئے گئے۔ ضبطی موجودہ نظام کی روح رواں ہے۔

اس کی تھوڑی بہت تلافی کرنے کے لئے سوسائٹی یا سماج مختلف تدبیریں اختیار کرتی ہے جو خود ضبطی کی تعریف میں آتی ہیں۔ بھاری ٹیکس، ترکے کے محصول، زمین کو کم کرنے کے قوانین، زر کی مقدار بڑھا کر اس کی قیمت گھٹانا وغیرہ وغیرہ۔ حال میں ہم نے صرف سود بیاج دینے ہی میں نہیں بلکہ چوٹی کے سرمایہ دار ملکوں میں قومی قرضے سے انکار کی بڑی بڑی مثالیں دیکھی ہیں۔ ان میں سب سے نمایاں مثال برطانیہ کی ہے جس نے امریکہ کا قرضہ چکانے سے انکار کر دیا اور یہ مثال ہندوستان کے سامنے پیش کرنا بہت خطرناک ہے مگر ان سب ضبطیوں اور انکار دل

سے بہت کم فائدہ ہوتا ہے اور بنیادی خرابی دور نہیں ہو سکتی اور بغیر اس کو دور کئے ہوئے نیا نظام قائم کرنا ناممکن ہے۔ موجودہ نظام کو بدلنے کا جو طریقہ سوچا جائے اس میں یہ اندازہ کر لینا چاہیے کہ ہمیں اس کے لئے کتنا مادی اور روحانی نقصان اٹھانا پڑے گا اور اس سے کتنا فائدہ ہوگا۔ ناعاقبت اندیشی سے کام نہیں چل سکتا۔ ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ اس سے آخر میں انسان کی مادی اور روحانی خوشی اور ترقی میں کہاں تک مدد ملے گی۔ مگر اس کے ساتھ ہمیں اس کا بھی لحاظ رکھنا چاہیے کہ اگر موجودہ نظام نہ بدلا جائے اور اپنی ناکام اور نامراد زندگی، فاقے اور مصیبت، اخلاقی اور روحانی ذلت کا بوجھ بدستور اٹھاتے رہیں۔ تو اس سے کس قدر شدید نقصان ہوگا۔ موجودہ معاشی نظام بار بار آنے والے سیلاب کی طرح بے شمار انسانوں کو بہالے جاتا ہے اور ہلاک کر دیتا ہے۔ اگر ہم میں سے کچھ لوگ ڈول بھر بھر کے پانی نکالیں تو نہ اس سے یہ سیلاب رک سکتا ہے اور نہ لوگوں کی جانیں بچ سکتی ہیں۔ یہاں پشتے باندھنے اور نہریں بنانے کی ضرورت ہے تاکہ پانی کی مہلک قوت انسان کی فلاح کا ذریعہ بن جائے۔

یہ کھلی بات ہے کہ اشتراکیت جو عظیم الشان تبدیلیاں کرنی چاہتی ہے وہ دو چار قانون پاس کر دینے سے نہیں ہو سکتیں۔ مگر پھر بھی اس عمارت کی بنا رکھنے کے لئے کچھ بنیادی قوانین اور حقوق ضروری ہیں۔ اگر ہمیں اشتراکی نظام کی تعمیر شروع کرنی ہے تو اس سے کام نہیں چل سکتا کہ ہم اتفاقات کے بھروسے پر بیٹھے رہیں، کبھی جوش آجائے تو دیوار پر دو چار ردے رکھ کر چھوڑ دیں کہ وہ گر جائے۔ پہلے بڑی بڑی رکاوٹوں کو دور کرنا پڑے گا۔ اصل مقصد امیروں سے چھیننا نہیں بلکہ غریبوں کو دینا ہے۔ موجودہ تنگ دستی کی جگہ خوش حالی پیدا کرنا ہے، مگر اس کے حاصل کرنے کے لئے لوگوں کی ذاتی اغراض کو جو سماج کی ترقی میں حائل ہیں راہ سے ہٹانا پڑے گا۔ راہ کے انتخابات میں ہمارے پسند کرنے یا ناپسند کرنے سے بحث نہیں بلکہ یہ مجرد انصاف کا بھی سوال نہیں۔ یہاں تو یہ دیکھنا ہے کہ ایسی چیز ہو جو معاشی حیثیت سے معقول ہو، ترقی پذیر ہو، ماحول سے مطابقت رکھتی ہو اور انسانوں کی بڑی

سے بڑی جماعت کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچا سکتی ہو۔

مختلف اغراض میں تصادم ہونا ناگزیر ہے۔ مصالحت کی کوئی صورت نہیں ہم میں سے ہر شخص کو یہ فیصلہ کرنا پڑے گا کہ ہم ادھر ہوں یا اُدھر۔ مگر فیصلہ کرنے سے پہلے مسئلے کو جاننا اور سمجھنا ضروری ہے۔ اشتراکیت کو مقبول بنانے کے لئے محض جذباتی اثر ڈالنا کافی نہیں اس کے ساتھ ذہنی اور عقلی اثرات بھی ہونے چاہئیں جو واقعات اور دلائل پر مبنی ہوں۔ مغرب میں اس قسم کی بہت سی کتابیں موجود ہیں مگر ہندوستان میں ان کی بڑی کمی ہے اور بہت سی اچھی کتابیں یہاں داخل نہیں ہونے پاتیں۔ مگر دوسرے ملکوں کی کتابیں پڑھنا کافی نہیں اگر ہندوستان میں اشتراکیت قائم ہوتی ہے تو وہ یہیں کے حالات کے مطابق نشوونما پائے گی۔ اس لئے ان حالات کا مطالعہ کرنا نہایت اہم ہے ہمیں ماہرین فن کی ضرورت ہے جو مطالعہ کر کے مفصل تجویزیں پیش کریں۔ بدقسمتی سے ہمارے ماہرین فن سرکار کے یا نیم سرکاری یونیورسٹیوں کے ملازم ہیں اور وہ اس راہ میں قدم بڑھاتے ہوئے ڈرتے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ اشتراکیت کے لئے ذہنی بنیاد کافی نہیں۔ مگر یہ بھی یقینی ہے کہ اس بنیاد کے بغیر ہم معاملات پر پورا قابو حاصل نہیں کر سکتے اور کسی قومی تحریک کو نہیں چلا سکتے اس وقت زراعتی مسئلہ ہندوستان میں سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے مگر صنعت بھی اس سے کچھ کم نہیں اور یہ روز بروز بڑھ رہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہم کس قسم کی ریاست چاہتے ہیں کسان ریاست یا صنعتی ریاست؟ ظاہر ہے کہ ہمارے یہاں غالب رنگ کاشتکاری کا ہوگا مگر میرے خیال میں اس کے ساتھ ساتھ صنعت کو ترقی دینا بھی ممکن ہے۔

ہماری صنعت کے ناخدا عجیب فرسودہ خیالات رکھتے ہیں۔ وہ دوسرے سرمایہ داروں سے بھی بہت پیچھے ہیں۔ عام لوگ اس قدر مفلس ہیں کہ یہ حضرات ان سے مطلق توقع نہیں رکھتے کہ وہ آگے چل کر صنعتی پیداوار کے خریدار ہوں گے اس لئے وہ مزدوروں کی اجرت بڑھانے یا کام کا وقت کم کرنے کی تجاویز کی شدت سے مخالفت کرتے ہیں۔ حال میں

پارچہ بافی کے کارخانوں میں کام کا وقت دس گھنٹے کے بجائے نو گھنٹے کر دیا گیا ہے اس پر احمد آباد کے کارخانہ داروں نے مزدوروں کی اجرت یہاں تک کہ ٹھیکے کے کام کی اجرت بھی کم کر دی یعنی کام کا وقت کم ہونے سے ہمارے مزدوروں کی آمدنی کم ہو گئی اور ان کا معیار زندگی اور بھی گھٹ گیا۔ صنعت کی عملی تنظیم بڑھ رہی ہے جس سے مزدور پر زیادہ بوجھ پڑتا ہے اور وہ زیادہ تھکتا ہے مگر اس کی اجرت میں اس تناسب سے اضافہ نہیں ہوا۔ ہمارا باب بحث کا تحمل یہ ہے جو یورپ میں انیسویں صدی کے آغاز میں تھا۔ انھیں جب موقع ملتا ہے خوب نفع کماتے ہیں مگر مزدوری سوچ کے موقع رہتے ہیں جب مندا ہوتا ہے تو مالک شور مچاتے ہیں کہ اجرت کم کئے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ انہیں نہ صرف ریاست مدد دیتی ہے بلکہ ہمارے اوسط طبقے کے سیاست داں بھی۔

احمد آباد کے پارچہ باف مزدوروں کی حالت پھر بھی غنیمت ہے۔ بمبئی وغیرہ میں تو بہت برا حال ہے اور بنگال کے جوٹ کے یا کان کنی کے مزدور ان سے بھی گئے گذرے ہیں۔ سب سے پست درجہ چھوٹی چھوٹی غیر منظم صنعتوں میں کام کرنے والوں کا ہے اگر کوئی جوٹ اور پارچہ بافی کے کارخانوں کے کروڑپتی مالکوں کے محلوں اور ان کی شان و شوکت کا مقابلہ ان جھونپڑیوں سے کرے جن میں ان کارخانوں کے نیم برہنہ مزدور رہتے ہیں تو اسے بڑی عبرت اور بصیرت حاصل ہو مگر ہم اس تضاد کے منظر کو معمولی چیز سمجھ کر اس سے گذر جاتے ہیں اور مطلق متاثر نہیں ہوتے۔

صنعتی مزدوروں کی یہ گئی گذری حالت آمدنی کے لحاظ سے کسانوں کی حالت سے پھر بھی بہتر ہے۔ مگر کسان کو ایک فائدہ ہے۔ وہ کھلی ہوا میں رہا کرتا ہے اور شہر کے غریب پوروں کی ذلت سے محفوظ رہتا ہے۔ مگر وہ اس قدر گر گیا ہے کہ اپنے کھلے ہوا اور گائیں کو بہ قول گاندھی جی کے "گھورا" بنا دیتا ہے اس میں اتحاد عمل یعنی مل جل کر سب کے فائدے کے لئے کام کرنے کا مادہ بالکل نہیں ہے۔ اُسے اس الزام میں برا بھلا کہنا

سہل ہے مگر وہ غریب کیا کرے جب زندگی اس کے لئے ایک مسلسل اور شدید انفرادی کشمکش بن گئی ہو اور ہر شخص اس کا دشمن ہو؟ سچ پوچھئے تو یہی سخت تعجب کی بات ہے کہ وہ بسر کیوں کر کرتا ہے۔ حساب لگایا گیا ہے کہ سنہ ۲۹-۱۹۲۸ء میں پنجاب کے کاشتکار کی روزانہ آمدنی کا اوسط ۹ آنے تھا اور سنہ ۳۱-۱۹۳۰ء میں نو پائی یعنی تین پیسے رہ گیا۔ اور پھر پنجاب کے کاشتکار صوبہ متحدہ بہار اور بنگال کے کسانوں سے زیادہ خوشحال سمجھے جاتے ہیں۔ صوبہ متحدہ کے بعض مشرقی اضلاع (گورکھپور وغیرہ) میں کساد بازاری سے پہلے کھیت کے مزدور کی اجرت دو آنے روز تھی۔ یہ کہنا کہ ان افسوسناک حالات کی اصلاح خیرات و حسنات سے یا دیہی ترقی کی مقامی کوششوں سے ہو سکتی ہے کسان اور اس کی مصیبتوں کی ہنسی اڑانا ہے۔

آخر اس دلدل سے نکلنے کی کیا صورت ہے؟ کروروں آدمیوں کو اس پستی سے ابھارنا سہل نہیں پھر بھی کوئی نہ کوئی تدبیر سوچی جا سکتی ہے۔ مگر اصل مشکل یہ ہے کہ ارباب غرض ہر تبدیلی کی مخالفت کرتے ہیں اور بیرونی سلطنت کے ماتحت رہ کر کسی قسم کا تغیر ناممکن ہے اب یہ دیکھنا ہے کہ آنے والے زمانے میں ہندوستان کون سا رخ اختیار کرتا ہے زمانے کا رجحان زیادہ تر کمیونزم یعنی اشتمالیت اور فاشزم یعنی قومی اشتراکیت کی طرف ہے جو پارٹیاں ان دونوں کے بین بین ہیں وہ مٹتی جاتی ہیں۔ سر مالکم ہیلی کی پیش گوئی ہے کہ ہندوستان قومی اشتراکیت اختیار کرے گا۔ غالباً مستقبل قریب میں ایسا ہی ہوگا۔ جیسا کہ وہ کہتے ہیں ابھی سے بنگال اور ایک حد تک دوسرے صوبوں کے نوجوان مردوں اور عورتوں میں قومی اشتراکیت کے نمایاں رجحان نظر آرہے ہیں۔ چونکہ قومی اشتراکیت انتہائی تشدد سے وابستہ ہے اس لئے بزرگان کانگریس جو عدم تشدد کے پابند ہیں، قدرتی طور پر اس سے نفرت کرتے ہیں۔ مگر قومی اشتراکیت کی فلسفیانہ بنیاد یعنی ایک اجتماعی ریاست کا تصور جس میں اونچے طبقوں کے مستقل حقوق مقید اور محدود کر دئے جائیں گے مگر چھینے نہیں جائیں گے، غالباً انہیں پسند آئے گا۔ پہلی نظر میں پرانے اور نئے امتزاج کی یہ صورت بہت دلکش

علوم ہوتی ہے۔ یہ ایک دوسرا سوال ہے کہ یہ صورت جس میں سانپ مرے اور لاٹھی نہ ٹوٹے ممکن بھی ہے یا نہیں۔

ظاہر ہے کہ قومی اشتراکیت کی تائید اصل میں اوسط طبقے کے نوجوان کی طرف سے ہوگی۔ ہندوستان میں بالفعل انقلاب پسند مزدور کسان نہیں بلکہ اوسط طبقے ہی کے بعض لوگ ہیں اگرچہ آگے چل کر کارخانوں کے مزدور یقیناً ان سے کہیں زیادہ انقلاب پسند ہو جائیں گے قومیت پسند اوسط طبقے فاشزم کے خیالات پھیلنے کے لئے بہت عمدہ میدان ہے۔ مگر فاشزم مغربی معنوں میں یہاں اس وقت تک نہیں پھیل سکتا جب تک بیرونی حکومت موجود ہے ہندوستان میں فاشزم یا قومی اشتراکیت یقیناً اپنے ملک کی آزادی کی حامی ہوگی اور وہ کسی طرح برطانوی حکومت کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ اُسے جمہور سے مدد لینی پڑے گی۔ اگر برطانوی قبضہ بالکل ہٹ جائے تو غالباً قومی اشتراکیت اونچے اوسطے طبقے اور دوسرے مستقل حقوق رکھنے والے طبقوں کی مدد سے بہت جلد پھیل جائے گی۔

مگر برطانیہ کا قبضہ اس قدر جلد مٹنے والا نہیں اور اس اثنا میں حکومت کی انتہائی سختیوں کے باوجود اشتمالیت اور اشتراکیت کے خیالات بھی پھیل رہے ہیں۔ اشتمالی پارٹی ہندوستان میں خلاف قانون قرار دے دی گئی ہے اور اس میں اشتمالیت سے ہمدرد اور انتہا پسندانہ پروگرام رکھنے والی مزدوروں کی انجمنیں بھی سمیٹ لی جاتی ہیں۔

دی اشتراکیت اور اشتمالیت میں سے میری ہمدردی سراسر اشتمالیت کے حق میں ہے جیسا کہ اس کتاب کے پڑھنے سے معلوم ہو گیا ہوگا۔ میں خود اشتمالی نہیں ہوں۔ میرے خیالات کی جڑیں شاید اب بھی ایک حد تک انیسویں صدی میں پیوست ہیں اور مجھ پر "تہذیب انسانیت" کی تعلیم کا اتنا زیادہ اثر ہے کہ میں اس سے پوری طرح آزاد نہیں ہو سکتا۔ اوسط طبقے کے ہریوں کی ذہنیت میرا پیچھا نہیں چھوڑتی اور قدرتی طور پر بہت سے اشتمالی اس سے خفا ہیں۔ میں اذعانی عقائد کو پسند نہیں کرتا۔ اس لئے مجھے یہ چیز جو اشتمالیوں کی خصوصیت ہے

ناپسند ہے کہ کارل مارکس کی تصانیف یا اور کتابیں وحی آسمانی سمجھی جائیں جن میں چون وچرا کی گنجائش نہیں اور فرقہ بندی کر کے منکروں کے خلاف جہاد کیا جائے اسی طرح روس کی بہت سی کارروائیاں، خصوصاً امن کے زمانے میں تشدد سے کام لینا مجھے سخت ناپسند ہے۔
ان سب باتوں کے باوجود اشتمالی فلسفے کی طرف میرا رجحان روز بروز بڑھتا جاتا ہے۔

ممکن ہے کہ مارکس کے بعض اقوال اور اس کا اخلاقی اقدار کا نظریہ غلط ہو میں اس کا فیصلہ کرنے کا اہل نہیں ہوں مگر میرے خیال میں وہ اجتماعی امور میں گہری بصیرت رکھتا تھا، اور یہ بصیرت اس علمی طریقے پر مبنی تھی جو اس نے اختیار کیا تھا۔ یہ طریقہ تاریخ اور موجودہ حالات دونوں کے سمجھنے میں اور طریقوں سے کہیں زیادہ مفید ہے اور یہی وجہ ہے کہ دنیا میں جو تغیرات آج کل ہو رہے ہیں ان کا سب سے گہرا اور روشن مطالعہ پیروان مارکس کی تصانیف میں نظر آتا ہے۔ یہ کہہ دینا سہل ہے کہ مارکس ان رجحانات کی اہمیت کا اندازہ نہیں کر سکا جو آگے چل کر ظاہر ہوئے مثلاً اوسط طبقے میں انقلابی عنصر کا پیدا ہونا جو آج کل اس قدر نمایاں ہے مگر میرے خیال میں مارکس کے فلسفے کی اصل خوبی یہ ہے کہ اس میں ادعائیت کا نام تک نہیں بلکہ تمام مسائل کو سمجھنے کے عقلی اور علمی طریقے پر زور دیا گیا ہے اور اسی کے ساتھ عملی پہلو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا۔ یہ طریقہ ہمیں اپنے زمانے کے اجتماعی مظاہر کے سمجھنے میں مدد دیتا ہے اور عمل اور تدبیر کی راہ دکھاتا ہے۔

طریق عمل بھی اس کے یہاں معین اور محدود نہیں بلکہ حالات کے لحاظ سے بدلا جا سکتا ہے۔ کم سے کم لینن کی یہی رائے تھی اور اس نے نہایت قابلیت سے بدلتے ہوئے حالات کی مناسبت سے اپنے عمل کو بدل کر اسے صحیح ثابت کر دیا۔ وہ کہتا ہے "جدوجہد کے کسی خاص طریقے کو رد یا قبول کرنا بغیر اس کے کہ موجودہ صورت حال کی تفصیلات پر موقع اور محل کے لحاظ سے غور کیا جائے، مارکس کے اصول سے صریحی انحراف ہے۔" ایک اور جگہ اس نے کہا ہے "کوئی چیز آخری اور قطعی نہیں ہمیں ہمیشہ حالات سے سبق لینا چاہیے۔"

اس وسیع اور ہمہ گیر طرز خیال کی وجہ سے معقول پسند اشتمالیوں میں ایک حد تک اجتماعی زندگی کا ایک نامی تصور پیدا ہو گیا ہے۔ سیاست ان کے نزدیک محض بین الاقوامی یا اندرونی تو ڑ جوڑ کا نام نہیں۔ جو مقصد اور نصب العین ان کے سامنے ہے وہ ان کی جد و جہد اور قربانیوں میں ایک معنویت کی شان پیدا کر دیتا ہے۔ ایک یہ احساس ہے کہ ہم انھیں عظیم الشان فوج کے سپاہی ہیں جو نوع انسانی کی منزل مقصود کی طرف بڑھ رہی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہم تاریخ کی رفتار کے قدم بہ قدم چل رہے ہیں۔"

غالباً اکثر اشتمالی یہ احساس نہیں رکھتے۔ شاید لینن ہی ایک شخص تھا جو نامی زندگی کا کامل تصور رکھتا تھا اور اسی وجہ سے اس کا عمل اس قدر موثر تھا۔ مگر کچھ تھوڑی سی جھلک اس تصور کی ہر اشتمالی کے ذہن میں، جس نے لینن کے فلسفے کو سمجھ لیا ہے، موجود ہے۔

بہت سے اشتمالی ایسے بھی ہیں جن کے ساتھ نبھنا بہت مشکل ہے۔ انھوں نے دوسروں کو خواہ مخواہ چھیڑ کر غصہ دلانے کا ایک عجیب طرز اختیار کر لیا ہے۔ مگر ان بے چاروں نے بہت مصیبتیں اٹھائی ہیں اور سوائے سوویٹ یونین کے اور سب کہیں انھیں بڑی سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ میں ان کی بہادری اور ایثار کا ہمیشہ سے قائل ہوں۔ وہ اور کروروں آدمیوں کی طرح تکلیفیں سہتے ہیں، مگر فرق یہ ہے کہ وہ تقدیر کی زبردست قوت کے آگے سر نہیں جھکاتے۔ وہ ان تکلیفوں کا مقابلہ انسانوں کی طرح کرتے ہیں اور اس میں ایک المناک عظمت و وقار کی شان ہے۔

روس کے اجتماعی تجربات کے کامیاب یا ناکامیاب ہونے کا مارکس کے نظریے کی قدر و قیمت پر براہ راست کوئی اثر نہیں پڑتا۔ یہ بات تصور میں آ سکتی ہے، گو یہ بہت بعید از قیاس ہے، کہ بعض مخالف حالات یا بعض قوتوں کے اتحاد سے یہ تجربات ناکام رہیں پھر بھی اس زبردست انقلاب کی اہمیت باقی رہے گی۔ باوجود اس کے کہ مجھے اس کی بہت سی باتیں ناپسند ہیں میرا خیال ہے کہ اس نے دنیا کے سامنے ایک شمع امید

روشن کر دی ہے۔ میں کافی معلومات نہیں رکھتا اس لئے مجھے اس پر نکتہ چینی کرنے کا حق نہیں سب سے بڑا خوف مجھے یہ ہے کہ جو تشدد کی جو فضا قائم ہو گئی ہے اس کا انجام اچھا نہیں اور اس سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو جائے گا۔ مگر جو لوگ روس کی قسمت کے مالک ہیں ان میں یہ بہت بڑی خوبی ہے کہ وہ اپنی غلطیوں سے سبق حاصل کرنے کی جرأت رکھتے ہیں، وہ پیچھے ہٹ سکتے ہیں اور نئی راہ اختیار کر سکتے ہیں۔ یہ نصب العین ہمیشہ ان کے پیش نظر رہتا ہے۔ دوسرے ملکوں میں ان کی جدوجہد بالکل بے کار ثابت ہوئی مگر غالباً یہ اب بہت کم کر دی گئی ہے۔

جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے اشتمالیت اور اشتراکیت کا زمانہ ابھی بہت دور ہے۔ ہاں اگر خارجی واقعات کی رَو میں آگے بڑھا لے جائے تو اور بات ہے۔ ابھی تو ہمیں اشتمالیت سے نہیں بلکہ فرقہ پرستی سے نبٹنا ہے۔ فرقہ وارانہ زندگی کے لحاظ سے ہندوستان ظلمت کے دور سے گذر رہا ہے۔ ارباب عمل اپنی قوت کو چھوٹی چھوٹی چیزوں میں، سازشوں اور چالوں میں، ایک دوسرے کو زک دینے میں ضائع کر رہے ہیں۔ ان میں بہت کم ایسے ہیں جو دنیا کی ترقی اور بہتری سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ شاید یہ ایک عارضی حالت ہے جو بہت جلد گذر جائے گی۔

کانگریس نے اس تمام دور کیا کہ عموماً طور پر اس تاریک فضا سے دور رہی مگر اس کی ذہنیت چھوٹے طبقے کے شہریوں کی ہے اور اسی رنگ میں اس نے فرقہ وارانہ مسئلے اور دوسرے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی۔ اس طرح سے کامیابی ہونے کی امید نہیں آج کل وہ نیچے اوسط طبقے کے خیالات کی نمائندگی کر رہی ہے کیونکہ بالفعل یہی طبقہ سب سے زیادہ انقلاب پسند ہے اور سب سے زیادہ احتجاج کرتا ہے۔ مگر مجھ کو اس میں اتنی زندگی نہیں ہے جتنی دو مجھے نہیں معلوم ہوتی ہے۔ اس پر دونوں طرف سے دو قوتوں کا زور ہے ان میں سے ایک بہت مستحکم ہے اور دوسری کمزور ہے مگر اس کی قوت روز بروز بڑھ رہی ہے

اس میں آج کل بحران کی سی کیفیت ہے اور یہ اندازہ کرنا مشکل ہے کہ آگے چل کر اس کا کیا انجام ہوگا وہ غالب قوت کا ساتھ نہیں دے سکتی جب تک ہندوستان کو آزادی دلانے کا کام جو اس کا تاریخی مشن ہے پورا نہ کرے۔ مگر اس مقصد کے حاصل ہونے سے پہلے ممکن ہے کہ دوسری قوتیں اسے اپنی طرف کھینچ لیں یا اس کو ہٹا کر اس کی جگہ لے لیں۔ بہرحال اغلب یہی ہے کہ جب تک ہندوستان آزاد نہ ہو جائے کانگریس اس کی سیاست پر حاوی رہے گی۔

کوئی تشدد کا طریقہ اختیار کرنا بالکل خارج از بحث ہے۔ یہ محض قوت کا ضائع کرنا ہے جس سے کوئی فائدہ نہیں بلکہ نقصان کا اندیشہ ہے۔ میرے خیال میں یہ بات عام طور پر تسلیم کر لی گئی ہے۔ اگرچہ اکّا دکّا مثالیں انفرادی تشدد کی بھی نظر آجاتی ہیں۔ اس کا نتیجہ سوا اس کے کچھ نہیں ہو سکتا کہ دونوں طرف سے تشدد پر تشدد ہو اور اگر ہم اس چکر میں پھنس گئے تو پھر اس سے نکلنا بہت مشکل ہوگا۔

ہم سے اکثر کہا جاتا ہے کہ ہمیں آپس میں متحد ہو کر دشمن سے "مقابلہ" کرنا چاہیئے مسز نائیڈو شاعرانہ جوش اور طاقت سے اس کی تائید کرتی رہتی ہیں۔ وہ شاعرہ ہیں اور اتحاد اور ہم آہنگی کی خوبیاں بیان کرنا ان کا حصہ ہے ظاہر ہے کہ آپس میں متحد ہونا بڑی اچھی چیز ہے بہ شرطیکہ اس کے ساتھ "دشمن سے مقابلہ" بھی ہو۔ مگر جب اس فقرے پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مقصد صرف اتنا ہے کہ اونچے طبقے کے چند آدمیوں میں کسی قسم کا معاہدہ یا مصالحت ہو جائے۔ اس قسم کے اتحاد میں یہی ہوگا کہ جو لوگ سب سے زیادہ محتاط اور اعتدال پسند ہیں ان کا رنگ چھا جائے، متحدہ مقابلے کی جگہ متحدہ پسپائی کا منظر نظر آئے گا۔

یہ کہنا بالکل مہمل ہے کہ ہم دوسروں کے ساتھ اتحاد عمل یا مفاہمت کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ زندگی اور سیاست بڑی پیچیدہ چیز ہے۔ اس میں ہمیشہ سیدھی لکیروں کی شکلیں نہیں بن سکتیں، لیکن جیسے سخت آدمی نے کہا تھا کہ "بغیر مڑے ہوئے آگے بڑھتے چلے جانا

مصالحت کا نام نہ لینا محض بچپن ہے انقلابی طبقے کی سنجیدہ حکمت عملی نہیں۔ مصالحت تو کرنی ہی پڑتی ہے۔ ہمیں اس کی وجہ سے پریشان نہیں ہونا چاہیئے۔ مگر خواہ ہم مصالحت کریں یا نہ کریں اصل اصول یہ ہے کہ جو چیزیں مقدم ہیں وہ ہمیشہ مقدم رہیں کمتر درجے کی چیزیں اُن سے زیادہ اہمیت نہ حاصل کرنے پائیں۔ اگر ہم اپنے اصول و مقاصد پر قائم ہیں تو عارضی سمجھوتوں سے کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ خطرہ تو یہ ہے کہ کہیں ہم اپنے کمزور بھائیوں کے خفا ہو جانے کے ڈر سے اصول اور مقاصد میں ڈھیل نہ ڈال دیں۔ لوگوں کو گمراہ کرنا انہیں خفا کرنے سے بدتر ہے۔

میں نے موجودہ واقعات کا ذکر مبہم اور ایک حد تک خشک منطقی طریقے سے کیا ہے اور یہ کوشش کی ہے کہ ان چیزوں کو اس طرح دیکھوں جیسے ایک شخص دور سے تماشا دیکھتا ہے۔ عموماً جب عمل کا موقع آتا ہے تو میں تماشائیوں کی صف میں نہیں ہوتا ہوں بلکہ مجھ پر تو یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ میں بے ضرورت میدان میں کود پڑتا ہوں۔ اس وقت اگر میں آزاد ہوتا تو کیا کرتا؟ اپنے ہم وطنوں کو میں کیا مشورہ دیتا؟ شاید وہ جبلی احتیاط جو سیاسی دنیا میں ہوتی ہے مجھے اپنی رائے قبل از وقت ظاہر کرنے سے روکتی مگر سچ پوچھیے تو نہ میں نے کوئی رائے قائم کی ہے اور نہ کرنا چاہتا ہوں جب میں کچھ کر ہی نہیں سکتا تو خواہ مخواہ الجھن میں کیوں پڑوں؟ یوں تو مجھے الجھن رہتی ہے مگر جب تک جیل میں ہوں یہ کوشش کرتا ہوں کہ کم سے کم فوری جد و جہد کے مسئلے میں سر نہ کھپاؤں۔

جیل میں جد و جہد ایک دور از کار چیز معلوم ہوتی ہے، انسان عمل کا ناخدا نہیں رہتا بلکہ موج حوادث کی کشتی بن جاتا ہے، وہ ہر وقت انتظار میں رہتا ہے کہ دیکھیں اب کیا ہوتا ہے۔ گو میں ہندستان اور ساری دنیا کے سیاسی اور اجتماعی مسائل سے بحث کرتا ہوں مگر سچ پوچھیے تو یہ چیزیں جیل کی اس چھوٹی سی دنیا میں جو ایک مدت سے میرا گھر ہے کیا اہمیت رکھتی ہیں؟ قیدیوں کو تو بس ایک ہی چیز کی فکر ہوتی ہے یعنی اپنی رہائی کی تاریخ کی۔

نینی کے جیل میں اور یہاں الموڑے جیل میں بہت سے قیدی میرے پاس آکر بڑے اشتیاق سے "جبلی" کے متعلق سوال کرتے تھے۔ پہلے تو میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا چیز ہے مگر پھر معلوم ہوا کہ یہ جوبلی کی خرابی ہے انھوں نے شاہ جارج کی سلور جوبلی کے جشن کی افواہیں سنی تھیں مگر وہ اس کی حقیقت سے واقف نہ تھے۔ پہلے کی سنی سنائی باتوں کی بنا پر وہ اس کے صرف ایک ہی معنی سمجھے تھے، بعض قیدیوں کو رہائی ملنا اور بہتوں کی سزا میں تخفیف ہونا اسی وجہ سے سب قیدی خصوصاً وہ جنھیں لمبی سزائیں ملی ہیں، آنے والی "جبلی" سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ ان کے لیے "جبلی" دستور اساسی کی اصلاحات، پارلیمنٹ کے قوانین، اشتراکیت اور اشتمالیت ان سب سے کہیں زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔

(۶۸)

خاتمہ

"ہمیں سعی کی تاکید کی گئی ہے مگر سعی کا پورا کرنا ہمارے نصیب میں نہیں۔"

(تالمود)

میری کہانی ختم ہو گئی۔ سفر زندگی کے یہ حالات، جو بالکل شخصی نقطۂ نظر سے لکھے گئے ہیں، جیسے کچھ بھی ہیں، آج کی تاریخ یعنی ۱۴ فروری ۱۹۳۵ء تک الموڑے کے ڈسٹرکٹ جیل میں مکمل ہو گئے۔ تین مہینے ہوئے میں نے اسی جیل میں اپنی پینتالیسویں سالگرہ منائی تھی، اور غالباً ابھی میری زندگی کے بہت سے سال باقی ہیں۔ کبھی تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں اور تھک گیا ہوں اور کبھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ زندگی کا تازہ خون میری رگوں میں دوڑ رہا ہے۔ میرا جسم خاصہ مضبوط ہے اور میرا دماغ صدمے جھیلنے کی قوت رکھتا ہے اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ اگر کوئی اتفاقی حادثہ پیش نہ آگیا تو میں ابھی بہت دن جیوں گا۔ لیکن آنے والی زندگی جب تک بیت نہ جائے اس کا حال کیونکر لکھا جا سکتا ہے۔

شاید میری سرگذشت لوگوں کو ہیجان خیز نہ معلوم ہو جس کی عمر قید میں کٹی ہو اس کی زندگی میں ہیجان خیز واقعات کہاں سے آئیں؟ سچ پوچھیے تو میری کہانی میں کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔ جو مجھ پر گذری وہی میرے ملک کے لاکھوں مردوں عورتوں پر بھی گذری۔ بدلتی ہوئی کیفیتوں، امیدوں اور مایوسیوں، شگفتگی اور افسردگی، سخت جدوجہد اور جبری تنہائی کی یہ داستان ہم سب کی داستان ہے۔ ایک فرد قوم کی حیثیت سے میں قوم کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ کبھی اس پر اثر ڈالا کبھی اس سے متاثر ہوا۔ اس کے باوجود دوسرے افراد کی طرح

میں ایک جداگانہ شخصی زندگی رکھتا تھا اور سب کے بیچ میں رہتے ہوئے سب سے الگ رہتا تھا۔ یوں تو ہم لوگ کتر بیتے بھی تھے مگر ہمارے بہت سے کاموں میں حقیقت اور سچائی ہوتی تھی جس کی وجہ سے ہم اپنی ذات کے تنگ دائرے سے نکل کر وہ اہمیت حاصل کر لیتے تھے۔ جو ہمیں ان کاموں کے بغیر کبھی حاصل نہ ہوتی۔ کبھی کبھی ہمیں خوش قسمتی سے اس مکمل زندگی کا تجربہ ہوتا تھا جو نصب العین اور عمل کی مطابقت کا نام ہے اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ اگر ہم نصب العین کو ترک کر کے غالب قوت کے آگے چپ چاپ سر جھکا دیتے تو ہماری زندگی برباد اور ہماری اوقات تلخ ہو جاتی۔

مجھے اس زمانے میں اور بہت سی چیزوں کے ساتھ ایک بڑی نعمت یہ حاصل ہوئی کہ میں زندگی کو ایک نہایت دلچسپ سفر سمجھنے لگا جس میں انسان بہت کچھ سیکھتا ہے، بہت کچھ کرتا ہے۔ مجھے ہمیشہ محسوس ہوتا رہا کہ میں عقل اور تجربے میں ترقی کر رہا ہوں، یہ احساس اب بھی ہے اور اس سے مجھے اپنے کاموں میں اور کتابوں کے مطالعہ میں خاص لطف آتا ہے اور زندگی اچھی طرح گذرتی ہے۔

اس سرگذشت کے لکھنے میں، میں نے یہ کوشش کی ہے کہ ہر واقعے کے ساتھ ان خیالات اور جذبات کا بھی ذکر کروں جو اس وقت میرے دل میں تھے، تاکہ جہاں تک ممکن ہو میری اندرونی حالت کا اندازہ ہو جائے۔ گذری ہوئی کیفیت کی تصویر اس طرح کھینچنا کہ اس میں بعد کے واقعات کی جھلک نہ آنے پائے سہل نہیں ہے۔ اس لئے لازمی طور پر اگلے حالات کے بیان میں پچھلے خیالات کا رنگ آ گیا ہو گا مگر جو مقصد میرے پیش نظر تھا وہ یہی تھا کہ خود اپنی بصیرت کے لئے اپنی ذہنی نشو و نما کا نقشہ کھینچوں۔ شاید میں اس تحریر میں اپنے آپ کو ایسا نہیں دکھا سکا جیسا میں واقعی تھا بلکہ ایسا جیسا میں ہونا چاہتا تھا یا سمجھتا تھا کہ ہوں۔

چند مہینے ہوئے سر سی۔پی۔ راما سوامی آئر نے مجمع عام میں یہ کہا تھا کہ جواہر لال جمہور کے خیالات کا نمائندہ نہیں ہے مگر اپنی قربانی، تصور پرستی اور جوش عقیدت کی وجہ سے،

جو بقول ان کے محض "فریب نفس" ہے، اور بھی زیادہ خطرناک ہے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص "فریب نفس" میں مبتلا ہو وہ اپنی حالت کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتا۔ میں اس ذاتی معاملہ میں آپ سے بحث کرنے کی جرأت نہیں کروں گا۔ کئی سال سے مجھے ان سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ مگر اب سے بہت پہلے ایک زمانہ وہ بھی تھا جب وہ اور میں دونوں ہوم رول لیگ کے جوائنٹ سکرٹری تھے۔ اس عرصے میں دنیا بدل گئی۔ وہ ترقی کے مدارج طے کر کے آسمان پر پہنچ گئے اور میں خاک کا پتلا زمین پر پڑا رہا۔ اب مجھ میں اور ان میں اس کے سوا کوئی چیز مشترک نہیں کہ دونوں ایک ہی قوم کے افراد ہیں۔ وہ آج کل خصوصاً پچھلے چند سال سے ہندوستان کی برطانوی گورنمنٹ کے قصیدہ خواہ، ہندوستان اور دوسرے ملکوں میں حکومت مطلق کے حامی، اور خود بھی ایک دیسی ریاست کے وزیر اور استبداد کے چشم و چراغ ہیں۔ غالباً ان میں اور مجھ میں ہر معاملے میں اختلاف رائے ہے مگر ایک جزوی چیز میں ہم دونوں متفق ہیں۔ ان کا یہ ارشاد بالکل صحیح ہے کہ میں جمہور کے خیالات کا نمائندہ نہیں ہوں۔ مجھے ہرگز یہ مغالطہ نہیں ہے۔

سچ پوچھیے تو بعض وقت میں یہ سوچتا ہوں کہ کیا میں کسی کا بھی نمائندہ ہوں اور میرا دل کہتا ہے نہیں کسی کا نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ بہت سے لوگ مجھ سے انس اور محبت رکھتے ہیں۔ مشرق اور مغرب کا معجون مرکب بن کر نہ میں ادھر کا رہا نہ اُدھر کا۔ غالباً میرے خیالات اور تصور حیات میں مغربی رنگ مشرقی رنگ پر غالب ہے مگر اور ہندوستانیوں کی طرح میں بھی اپنے دیس کے بے شمار رشتوں سے وابستہ ہوں اور میرے نفس کے نیم شعوری طبقے میں برہمنوں کی سینکڑوں پشتوں کی روایات دبی ہوئی ہیں۔ نہ تو میں قدیم اثرات سے آزاد ہو سکتا ہوں نہ جدید خیالات سے۔ یہ دونوں میری سیرت کا جزو بن گئے ہیں اور اگرچہ وہ مشرق اور مغرب دونوں جگہ میرے کام آتے ہیں مگر اسی کے ساتھ انھوں نے میرے دل میں روحانی ترقی کا احساس پیدا

کردیا ہے جو نہ صرف سیاسی جدوجہد میں بلکہ ساری زندگی میں مجھ پر چھایا ہوا رہتا ہے۔ مغرب میں بالکل اجنبی معلوم ہوتا ہوں، وہاں کی زندگی میں کسی طرح نہیں کھپ سکتا مگر بعض اوقات اپنے دیس میں بھی مجھے بدیسی ہونے کا احساس ہوتا ہے۔

پہاڑ کو دور سے دیکھ کر اس پر چڑھنا سہل معلوم ہوتا ہے اور چوٹی اشارہ کرتی ہے کہ چلے آؤ مگر پاس پہنچ کر مشکل کا سامنا ہوتا ہے اور جتنا اوپر چڑھتے جائیے اتنا ہی راستہ کٹھن ہوتا جاتا ہے اور چوٹی دور ہٹتی جاتی ہے۔ مگر پھر بھی چڑھنے کی کوشش بیکار نہیں اس میں بجائے خود ایک لطف ہے۔ شاید زندگی کی قدر وقیمت سعی پر منحصر ہے انجام پر نہیں۔ اکثر راستے کا ڈھونڈنا مشکل ہوتا ہے مگر غلط راستے کا پہچان لینا آسان ہے اور اگر انسان اس سے بچ کر چلے تب بھی غنیمت ہے۔ نہایت عجز وانکسار سے میں حکیم جلیل سقراط کا یہ قول نقل کرتا ہوں "مجھے نہیں معلوم موت کیا ہے۔ ممکن ہے وہ کوئی اچھی چیز ہو اس لئے میں اس سے نہیں ڈرتا مگر یہ میں خوب جانتا ہوں کہ اپنے فرض سے منہ موڑنا برا ہے اور جس چیز میں بھلائی کا احتمال ہو اسے میں اس چیز پر ترجیح دیتا ہوں جس کی برائی کا یقین ہے۔"

نہ جانے کتنے سال میں نے جیل میں بسر کئے! کتنے موسم آئے اور چلے گئے کتنے چاند بڑھے اور گھٹے گئے ستارے بڑے ثبات اور وقار سے مسیر پر چلتے رہے اور میں تنہائی اور محویت کے عالم میں تماشے دیکھتا رہا میری جوانی کے بے شمار دن یہاں دفن ہیں۔ کبھی کبھی وہ بھوت بن کر میرے سامنے آتے ہیں گذرے ہوئے زمانے کی تلخیاں یاد دلاتے ہیں اور چپکے سے میرے کان میں کہتے ہیں "اس سے کچھ حاصل بھی ہوا؟" میں اس کا جواب دینے میں ذرا بھی نہیں ہچکچاتا۔ اگر مجھے اپنے موجودہ علم اور تجربے کے ساتھ گذری ہوئی زندگی پھر سے بسر کرنے کا موقع ملے تو بے شک میں اپنی ذاتی زندگی میں بہت سی تبدیلیاں کر دوں، اپنے پچھلے کاموں میں بہت کچھ ترمیم اور اصلاح کر دوں مگر خاص خاص قومی معاملات میں میرے فیصلے وہی ہوں گے جو

پہلے تھے۔ سچ پوچھئے تو میں ان کو بدل ہی نہیں سکتا۔ میں خود ان کے آگے بے بس ہوں یہ فیصلے میں نے نہیں کئے بلکہ ایک ایسی قوت نے مجھ سے کرائے جو میرے اختیار میں نہیں۔

مجھے سزا پائے ٹھیک ایک سال ہو گیا۔ دو برس کی میعاد میں سے ایک برس گذرا ہے اور ابھی پورے بارہ مہینے باقی ہیں۔ اس بار تخفیف کی کوئی امید نہیں قید محض میں تخفیف نہیں ہوا کرتی۔ وہ گیارہ دن جو میں نے پچھلے اگست میں جیل سے باہر گزارے تھے محسوب نہیں ہوئے بلکہ دو سال کی میعاد میں گیارہ دن اور بڑھا دیئے گئے۔ مگر یہ سال بھی کسی نہ کسی طرح گذر جائے گا۔ اور میں رہا ہو جاؤں گا پھر کیا ہوگا؟ میں ٹھیک نہیں کہہ سکتا مگر مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میری عمر کا ایک باب ختم ہو گیا اور دوسرا باب شروع ہوگا۔ اس میں کیا مضمون ہوگا۔ اس کا مجھے کوئی اندازہ نہیں۔ کتاب زندگی کے اگلے ورق سربمہر ہیں۔

تتمہ

باڈن وائلر، شوارتس والڈ (جرمنی)

۲۵ اکتوبر ۱۹۳۵ء

مئی میں میری بیوی مزید علاج کے لئے بھوالی سے یورپ روانہ ہوگئیں۔ ان کے جانے کے بعد میرا بھوالی جانا بند ہوگیا۔ اور پندرھویں دن جیل سے باہر نکل کر پہاڑی سڑکوں سے گزرنے کا جو موقع ملتا تھا وہ جاتا رہا۔ مجھے بڑا قلق ہوا اور الموڑے کا جیل اور بھی سنسان معلوم ہونے لگا۔

کوئٹے کے زلزلے کی خبر آئی اور اس نے کچھ دن کے لئے اور سب چیزوں کو بھلا دیا۔ مگر حکومت اپنی انوکھی حرکتوں کی یاد لوگوں کے دل سے محو نہیں ہونے دیتی۔ تھوڑے ہی دن کے بعد معلوم ہوا کہ کانگریس کے صدر بابو راجندر پرشاد کو، جن سے زیادہ زلزلے کے امدادی کام کی واقفیت ہندوستان میں کوئی نہیں رکھتا، اس کی اجازت نہیں دی گئی کہ کوئٹے جاکر امدادی کام میں شریک ہوں۔ اسی طرح گاندھی جی اور دوسرے مشہور لیڈر بھی وہاں جانے سے روک دیئے گئے۔ بہت سے ہندوستانی اخباروں کی ضمانت اس جرم میں ضبط کرلی گئی کہ انہوں نے کوئٹے کے متعلق مضامین لکھے۔ ہر جگہ وہی فوج اور پولیس کی ذہنیت نظر آتی ہے چاہے اسمبلی ہو، یا سول حکومت یا سرحد پر گولہ باری کرنے والا توپ خانہ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے ہندوستان کی برطانوی حکومت اور ہندوستانی قوم کی بہت بڑی جماعت میں ایک مستقل جنگ چھڑی رہتی ہو۔

اس میں شک نہیں کہ پولیس ایک مفید اور ضروری چیز ہے لیکن اگر دنیا میں پولیس کے سپاہیوں اور پولیس کے ڈنڈوں کے سوا کچھ نہ ہو تو شاید انسان کو اس میں رہنا دوبھر ہوجائے یہ ایک مشہور قول ہے کہ جو شخص دوسروں پر بے اندازہ تشدد کرے وہ صرف انہیں کو پست اور ذلیل نہیں کرتا بلکہ خود بھی پست اور ذلیل ہوتا ہے آج ہندوستان میں جو چیز سب سے

زیادہ نمایاں ہے وہ یہ ہے کہ یہاں کے حکام، خصوصاً سول سروس والوں کی اخلاقی اور ذہنی پستی روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ اس کا اثر سب سے زیادہ بڑے افسروں میں نظر آتا ہے۔ مگر ایک حد تک تمام سرکاری افسروں میں پھیل گیا ہے جب کبھی کوئی بڑی جگہ خالی ہوتی ہے۔ تو اس کے لئے ہمیشہ وہ شخص منتخب کیا جاتا ہے۔ جو سب سے زیادہ اس رنگ میں ڈوبا ہوا ہو۔

۴ ستمبر کو میں اچانک الموڑہ جیل سے رہا کر دیا گیا۔ کیونکہ یہ خبر آئی تھی۔ کہ میری بیوی کی حالت بہت نازک ہے۔ وہ جرمنی کے علاقے شوارزنس والڈ میں باڈن وائلر مقام پر زیر علاج تھیں۔ مجھ سے کہا گیا۔ کہ تمہاری سزا ملتوی کی جاتی ہے۔ اور مجھے اپنی معیاد کے ختم ہونے سے ساڑھے پانچ مہینے پہلے رہائی مل گئی۔ میں انتہائی عجلت کے ساتھ ہوائی جہاز سے یورپ روانہ ہو گیا۔

یورپ میں ہلچل مچی ہوئی ہے۔ ایک طرف جنگ اور شورش کا خوف ہے دوسری طرف معاشی تباہی کا ڈر ہے۔ حبش پر چڑھائی ہو رہی ہے، اس کے باشندوں پر گولے برسائے جا رہے ہیں۔ شہنشاہی پسند سلطنتوں میں ان بن ہے۔ اور وہ ایک دوسرے کو دھمکیاں دے رہی ہیں۔ انگلستان، جو سب سے بڑی شہنشاہی قوت ہے، ایک طرف صلح و امن اور انجمن اقوام کے قانون کی حمایت کر رہا ہے۔ اور دوسری طرف اپنی محکوم قوموں کو پیس رہا ہے۔ اور ان پر گولہ باری کر رہا ہے۔ مگر یہاں شوارزنس والڈ میں امن اور سکون چھایا ہوا ہے اور نازیوں کی سواستکا بھی بہت کم نظر آتی ہے۔ میں اس کہر کو دیکھ رہا ہوں جو آہستہ آہستہ وادی پر چھا رہا ہے سوئزرلینڈ کی سرحد، جو یہاں سے بہت دور ہے۔ نظر سے چھپتی جاتی ہے۔ اور دوسرے منظر پر ایک سیاہ پردہ پڑ جاتا ہے۔ میں دل میں سوچتا ہوں کہ خدا جانے اس کہر کے پیچھے کیا ہے۔

ضمیمہ الف

وہ حلف جو یوم آزادی کو اٹھایا گیا

۲۶ جنوری سنہ ۱۹۳۰ء

ہم یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اور قوموں کی طرح ہندوستانی قوم کا لازمی حق ہے کہ وہ آزاد ہو، اس کی محنت کا پھل اسی کے پاس رہے اور اسے وہ چیزیں میسّر ہوں جو زندگی کے لئے ضروری ہیں تاکہ اسے پنپنے اور بڑھنے کا پورا پورا موقع ملے ہمارا یہ بھی عقیدہ ہے کہ اگر کوئی حکومت کسی قوم کو ان حقوق سے محروم کرے اور اس پر ظلم کرے تو قوم کو حق ہے کہ اس حکومت کو بدل دے یا ختم کر دے۔ ہندوستان کی برطانوی حکومت نے ہندوستانی قوم کو نہ صرف آزادی سے محروم کر دیا ہے۔ بلکہ اس نے اپنی بنا اس پر قائم کی ہے۔ کہ عام لوگوں سے ناجائز فائدہ اٹھائے اور اس نے ہندوستان کو معاشی، سیاسی، تمدنی اور روحانی حیثیت سے برباد کر دیا ہے اس لئے ہم یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ ہندوستان برطانیہ سے قطع تعلق کر لے اور پورن سوراج یعنی کامل آزادی حاصل کر لے۔

معاشی حیثیت سے ہندوستان تباہ کر دیا گیا ہے۔ ہم سے جو محصول وصول کئے جاتے ہیں۔ وہ ہماری آمدنی کی نسبت سے کہیں زیادہ ہیں۔ ہماری اوسط آمدنی سات پیسے روز ہے۔ اور جو بھاری محصول ہم کو ادا کرنے پڑتے ہیں ان میں سے بیس فی صدی لگان کی صورت میں کسانوں سے وصول کئے جاتے ہیں اور تین فی صدی نمک کے محصول سے جس کا بوجھ سب سے زیادہ غریبوں پر پڑتا ہے۔

دیسی صنعتیں مثلاً ہاتھ سے سوت کا تنا مٹا دی گئی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے

کسان کم سے کم سال میں چار مہینے بیکار رہتے ہیں اور دستکاری کا شغل نہ ہونے کی وجہ سے ان کے ذہن کند ہو جاتے ہیں ہر خلاف دوسرے ملکوں کے یہاں ان برباد شدہ صنعتوں کی کسی صورت سے تلافی نہیں کی گئی۔

چنگی کی شرح اور روپے کی قیمت اس ترکیب سے مقرر کی گئی ہے کہ کسانوں پر اور زیادہ بوجھ پڑ گیا۔ ہماری درآمد کا بہت بڑا حصہ برطانیہ کے کارخانوں کا بنا ہوا مال ہے چنگی کی شرح سے برطانوی کارخانہ داروں کے ساتھ کھلم کھلا رعایت ظاہر ہوتی ہے اور اس سے جو آمدنی ہوتی ہے وہ غریبوں کا بوجھ کم کرنے کے لئے استعمال نہیں کی جاتی بلکہ مسرفانہ حکومت کے چلانے میں۔ اس سے بھی زیادہ اندھیر یہ ہے کہ شرح مبادلے میں اس ڈھب سے مداخلت کی گئی کہ کروڑوں روپیہ ملک سے کھنچ کر باہر چلا گیا۔

سیاسی اعتبار سے ہندوستان کا درجہ اتنا پست کبھی نہیں تھا۔ جتنا برطانوی حکومت میں ہے۔ اصلاحات کے ذریعہ سے لوگوں کو کوئی حقیقی سیاسی اختیارات حاصل نہیں ہوئے۔ ہمارے بڑے بڑے سے آدمی کو بدیسی حکومت کے آگے سر جھکانا پڑتا ہے۔ ہم رائے کی آزادی اور میل جول کی آزادی کے حق سے محروم رکھے گئے اور ہمارے بہت سے بھائی جلاوطن کر دیئے گئے اور انہیں اپنے گھر آنے کی اجازت نہیں۔ ہماری انتظامی قابلیت فنا کر دی گئی۔ اور یہ نوبت پہونچ گئی کہ ہم مجموعی طور پر چوکیداری اور محرّری پر قناعت کرنے لگے۔

تہذیب و تمدن کے لحاظ سے موجودہ نظام تعلیم نے ہمیں اپنے لنگر سے چھڑا کر ڈانواں ڈول کر دیا اور ہمیں یہ سکھایا کہ غلامی میں مگن رہیں۔

روحانی اعتبار سے ہتھیار چھن جانے نے ہمیں نامرد بنا دیا اور بیرونی فوج کی موجودگی نے بڑی بے دردی سے ہماری دفاعی قوت کو کچل دیا اور ہمارے دل میں یہ خیال پیدا کر دیا کہ ہم خود اپنی حفاظت اور بیرونی حملے کی مدافعت نہیں کر سکتے بلکہ

اپنے گھر بار کو چوروں، ڈاکوؤں اور بدمعاشوں کے حملے سے بھی نہیں بچا سکتے۔

ہمارا عقیدہ ہے کہ جس حکومت نے ان چار طریقوں سے ہمارے ملک کو برباد کیا اس کی اطاعت کرنا انسانیت کی ذلت اور خدا کی نافرمانی ہے۔ مگر ہم یہ جانتے ہیں کہ تشدد ہمارے لئے آزادی حاصل کرنے کا سب سے موثر ذریعہ نہیں ہے۔ اس لئے ہم یہ طریقہ اختیار کریں گے کہ جہاں تک ممکن ہے برطانوی حکومت سے بالارادہ کوئی تعلق نہ رکھیں اور سول نافرمانی کی تیاری کریں جس میں محصول ادا نہ کرنا بھی شامل ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر ہم حکومت کو بالارادہ کسی قسم کی مدد نہ دیں۔ محصول دینا بند کر دیں۔ اور خواہ کتنا ہی اشتعال ہو، تشدد سے ہرگز کام نہ لیں تو اس ظالمانہ حکومت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اس لئے ہم صدق دل سے عہد کرتے ہیں کہ کانگریس وقتاً فوقتاً پورن سوراج قائم کرنے کے لئے جو ہدایات دے گی ان پر عمل کریں گے۔

ضمیمہ ب

خط مورخہ ۱۵ اگست سنہ ۱۹۳۰ء جو کانگرس کے لیڈروں نے یراودا جیل سے سر تیج بہادر سپرو اور مسٹر ایم۔ آر۔ جیکار کو صلح کی شرائط کے متعلق بھیجا

یراودا سنٹرل جیل

۱۵ اگست سنہ ۱۹۳۰ء

صاحبان مکرم

ہم آپ کے دل سے شکرگزار ہیں کہ آپ نے برطانوی حکومت اور کانگرس میں صلح کرانے کا ذمہ لیا ہے۔ اس خط و کتابت کو پڑھکر جو آپ لوگوں میں اور ہز اکسیلنسی وائسرائے میں ہوئی ہے اور آپ سے مفصل گفتگو اور آپس میں مشورہ کرنیکے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ابھی وہ وقت نہیں آیا جب کوئی ایسی صلح ہو سکے جو ہمارے ملک کی عزت و وقار کے شایاں شان ہو۔ اگرچہ پچھلے پانچ مہینے میں جمہور میں حیرت انگیز بیداری پیدا ہو گئی ہے اور ہر طبقے اور جماعت، ہر مذہب و ملت کے لوگوں نے بڑی بڑی مصیبتیں اٹھائی ہیں۔ لیکن ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ابھی تک یہ تکلیفیں نہ [illegible] مسلسل ہیں۔ اور نہ اتنی زیادہ ہیں کہ ہمارے مقصد کے حاصل کرنیکے لئے کافی ہوں [illegible] کی ضرورت نہیں۔ کہ ہم آپ کے اور وائسرائے کے اس خیال سے متفق نہیں [illegible] قربانی سے ملک کو نقصان پہنچا۔ یہ تحریک بے وقت اور غیر آئینی ہے۔ انگلستان کی تاریخ خوں ریز شورشوں کی مثالوں

سے بھری ہوئی ہے جن کی خود انگریزوں نے دل کھول کر تعریف کی اور ہمیں بھی ان کی تعریف کرنا سکھایا۔ لہٰذا وائسرائے کے لئے یا کسی بھی سمجھدار انگریز کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ ایک ایسی تحریک کو برا کہے جو اپنے مقصد کے لحاظ سے اور بہت بڑی حد تک اپنے عمل کے لحاظ سے بھی پُرامن رہی ہے۔ مگر یہاں ہم ان الزامات کی تردید نہیں کرنا چاہتے جو سرکاری یا غیر سرکاری طور پر موجودہ سول نافرمانی کی تحریک پر لگائے گئے ہیں۔ ہمارے خیال میں اس تحریک کو جو حیرت انگیز مقبولیت عام لوگوں میں حاصل ہوئی وہ اس کے جواز کا کافی ثبوت ہے۔ اس وقت تو صرف کہنا مقصود ہے کہ ہم بھی آپ کی طرح دل سے چاہتے ہیں کہ اگر کسی طرح بھی ممکن ہو سول نافرمانی ملتوی یا ختم کر دی جائے۔ ہمیں خود یہ گوارہ نہیں کہ بلا ضرورت اپنے ملک کے مردوں، عورتوں، بچوں کو قید، لاٹھی چارج اور اس سے بھی بدتر خطروں میں ڈالیں۔ اس لئے ہم آپ کو اور وائسرائے کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم باعزت صلح کی تمام امکانی صورتیں تلاش کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھیں گے۔ مگر ہمیں یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ ابھی تک اس کے کوئی آثار معلوم نہیں ہوتے ہیں۔ اس کی کوئی علامت نظر نہیں آتی۔ کہ انگریز حکام اس کے قائل ہو گئے ہیں کہ ہندوستان کے مردوں اور عورتوں کو اپنے ملک کی قسمت کا فیصلہ کرنے کا حق حاصل ہے۔ ہمیں ان خالی خولی وعدوں پر اعتبار نہیں ہے جو حکام کی طرف سے کئے جاتے ہیں۔ اگرچہ یہ اکثر نیک نیتی پر مبنی ہوتے ہیں۔ انگریز مدتوں سے ہماری قوم سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے عادی ہیں۔ اس لیے انہیں اس اخلاقی، معاشی اور سیاسی تباہی کا احساس [illegible] رہا۔ ان کے ہاتھوں ہمارے ملک پر آئی ہے وہ کسی طرح اپنے دل کو یہ نہیں سمجھا سکے کہ ان کا ایک ہی فرض ہے اور وہ یہ ہے کہ اپنی حکومت کا جوا ہماری گردن سے اتاریں اور اپنی پچھلی زیادتیوں کی تھوڑی بہت تلافی کے لئے ہمیں اس روزافزوں تنزل سے نجات پانے میں مدد دیں۔ جو برطانوی حکومت کے ماتحت ایک صدی سے ہمارے ملک میں ہو رہا ہے۔

مگر ہمیں معلوم ہے کہ آپ کو اور ہمارے بعض فاضل ہم وطنوں کو ان خیالات سے

اتفاق نہیں۔آپ سمجھتے ہیں کہ حکومت کی ذہنیت کم سے کم اِس حد تک بدل گئی ہے کہ مجوزہ کانفرنس میں شرکت کرنے سے مفید نتیجہ نکلے گا اس لیئے باوجود ان دقتوں کے جو ہمیں درپیش ہیں۔ ہم خوشی سے تیار ہیں۔ کہ جہاں تک ہمارے امکان میں ہے آپ کے ساتھ تعاون کریں۔ اس لیئے موجودہ حالت میں آپ کی دوستانہ تجویز کے جواب میں ہم جو زیادہ سے زیادہ کہہ سکتے ہیں وہ حسب ذیل ہے:۔

(۱) ہمارا خیال ہے کہ آپ کے اس خط کے جواب میں جو مجوزہ کانفرنس کے متعلق تھا۔ وائسرائے نے مبہم لفظ استعمال کیئے ہیں کہ ہم کوئی اندازہ نہیں کر سکتے کہ وہ قومی مطالبے سے جو پچھلے سال لاہور میں پیش کیا گیا تھا۔ کس حد تک مطابقت رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہم اس وقت تک کوئی قطعی جواب نہیں دے سکتے جب تک کانگرس کی ورکنگ کمیٹی کے باضابطہ اجلاس میں اس مسئلے پر غور نہ کر لیا جائے۔ البتہ ہم اتنا کہہ سکتے ہیں۔ کہ ذاتی طور پر ہمیں وہی فیصلہ منظور ہوگا۔ جس کی رو سے:۔

(الف) صاف الفاظ میں یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ہندوستان جب چاہے برطانوی سلطنت سے علیحدہ ہو سکتا ہے۔

(ب) ہندوستان کو مکمل قومی حکومت دی جائے جو رائے عامہ کے سامنے جواب دہ ہو۔ جسے ملک کی حفاظت اور معاشی امور کے متعلق پورے پورے اختیارات حاصل ہوں۔ اور جو ان گیارہ شرطوں کو پورا کرتی ہو جو گاندھی جی نے وائسرائے کو اپنے خط میں لکھی تھیں۔

(ج) ہندوستان کو یہ حق دیا جائے کہ اگر ضرورت ہو تو ایک آزاد عدالت کے ذریعے سے ان برطانوی مطالبات (جن میں ہندوستان کا نام نہاد ملکی قرضہ بھی شامل ہے) کی تنقیح کرائی جائے جو قومی حکومت کے نزدیک غیر واجبی یا ہندوستانیوں کے مفاد کے خلاف ہوں۔

(نوٹ) انتقال حکومت کے دوران میں جو خاص انتظامات ہندوستانیوں کے مفاد کے لئے ضروری ہوں ان کا فیصلہ ہندوستان کے منتخب شدہ نمائندے کریں۔

(۲) اگر برطانوی حکومت مندرجہ بالا شرائط کو منظور کرلے اور اس کا قابل اطمینان طریقے سے اعلان کر دے تو ہم ورکنگ کمیٹی کو یہ مشورہ دیں گے کہ وہ سول نافرمانی بند کر دے یعنی بعض خاص قوانین کی نافرمانی جو محض قانون شکنی کی غرض سے کی جاتی ہے۔ مگر بدیسی کپڑے اور شراب کی باامن پکٹنگ اس وقت جاری رہے گی۔ جب تک حکومت خود شراب اور بدیسی کپڑے کی فروخت کی ممانعت نہ کردے عام لوگوں کو نمک بنانے کی اجازت ہوگی اور نمک کے قانون کی تعزیری دفعات نافذ نہ کی جائیں گی۔ حکومت کے یا نج کے نمک کے کارخانوں پر حملہ نہیں کیا جائے گا۔

(۳) سول نافرمانی کے بند کرنے کے ساتھ ساتھ:۔

(الف) تمام ستیا گرہی اور دوسرے سیاسی قیدی، خواہ وہ جیل میں ہوں یا حوالات میں جو تشدّد یا ترغیب تشدّد کے مجرم نہیں ہیں رہا کر دیئے جائیں۔

(ب) جو املاک قانون نمک، قانون مطبع، اور قانون مالگزاری وغیرہ کے ماتحت ضبطی کی گئی ہے وہ واپس کردی جائے۔

(ج) جرمانے اور ضمانت کی رقمیں جو سزا یافتہ ستیہ گرہیوں یا پریس ایکٹ کی خلاف ورزی کرنے والوں سے وصول کی گئی ہوں واپس کردی جائیں۔

(د) تمام ملازم، جن میں دیہات کے مقدم، چوکیدار وغیرہ بھی شامل ہیں، جو سول نافرمانی کی تحریک کے دوران میں مستعفی یا برطرف ہوئے ہوں اور دوبارہ حکومت کی ملازمت کرنا چاہتے ہوں بحال کر دیئے جائیں۔

(نوٹ) یہ دفعات ترک موالات کے زمانے میں بھی عائد ہوں گی۔

(۵) وائسرائے کے جاری کئے ہوئے تمام تعزیری ضابطے منسوخ کر دیئے جائیں
(۶) مجوزہ کانفرنس کی نمائندگی اور اس میں کانگریس کی شرکت کا مسئلہ اسی وقت طے ہو سکتا ہے جب مندرجہ بالا مطالبات کا قابلِ اطمینان تصفیہ ہو جائے۔

آپ کے مخلص

موتی لال نہرو

م۔ک۔ گاندھی

سروجنی نائیڈو

ولبھ بھائی پٹیل

جے رام داس دولت رام

سید محمود

جواہر لال نہرو

ضمیمہ ج

عہد آزادی کی تجدید کا رزولیوشن

۲۶ جنوری ۱۹۳۱ء

ہم باشندگان فخر و مسرت کے ساتھ اعتراف کرتے ہیں کہ ہم دل سے شکر گذار ہیں۔ ہندوستان کے ان بیٹوں اور بیٹیوں کے جنہوں نے مادر وطن کی آزادی کی خاطر تکلیفیں جھیلیں قربانیاں کیں، اپنے جلیل القدر اور محبوب رہنما مہاتما گاندھی کے جن کے فیض ہدایت نے ہمیں بلند مقصد اور برتر سعی کی راہ دکھائی، ان سینکڑوں بہادر نوجوانوں کے جنہوں نے اپنی جان آزادی کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھادی یعنی پشاور، اور کل صوبہ سرحد، شولاپور، ضلع مدناپور اور بمبئی کے شہیدوں کے ان ہزاروں لاکھوں آدمیوں کے جنہوں نے دشمنوں کے وحشیانہ لاٹھی چارج کی چوٹیں کھائیں گڑھوالی رجمنٹ اور فوج اور پولیس کے اور سپاہیوں کے جنہوں نے اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر اپنے بھائیوں پر گولی چلانے اور کسی قسم کی سختی کرنے سے انکار کر دیا، گجرات کے ان جرار کسانوں کے جنہوں نے نہایت ثابت قدمی سے ہر طرح کی تخویف اور تشدد کا مقابلہ کیا، ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے بہادر اور مظلوم کاشتکاروں کے جنہوں نے انتہائی سختیوں کے باوجود جنگ آزادی میں پورا پورا حصہ لیا، ان تاجروں اور کاروباری لوگوں کے جنہوں نے سخت نقصان اٹھا کر قومی تحریک کی خصوصاً بدیسی کپڑے اور برطانوی مال کے بائیکاٹ میں مدد دی، ان ایک لاکھ مردوں اور عورتوں کے جنہوں نے جیل جا کر ہر قسم کی تکلیفیں اٹھائیں اور کبھی کبھی جیل کے ملازموں کے ہاتھ سے مار تک کھائی خصوصاً معمولی والنٹیروں کے جنہوں نے ہندوستان کے سچے سپاہیوں کی طرح بغیر شہرت یا انعام کی امید کے محض اپنے اعلیٰ مقصد کی خاطر سخت دقتوں

کے باوجود محنت اور استقلال سے ملک وقوم کی خدمت انجام دی۔
اور ہم اعتراف کرتے ہیں انتہائی عقیدت اور احترام کا ہندوستان کی عورتوں کا
جنہوں نے مصیبت کے وقت مادر وطن کی مدد کرنے کے لئے اپنے گھروں
کے امن و آرام کو خیرباد کہا اور ہندوستان کی فوج کی صفِ اوّل میں اپنے مردوں
کے دوش بدوش جا کھڑی ہوئیں کہ جاں بازی اور فتح میں ان کے ساتھ شریک
ہوں اور ہم فخر کرتے ہیں اپنے ملک کے نوجوانوں اور وانر سینا کے بچوں پر جنہوں
نے اپنی کم سنی کے باوجود حصہ لیا اور شہادت پائی۔
اور آخر میں ہم خوشی کے ساتھ اعتراف کرتے ہیں اس بات کا کہ ہندوستان
کے سب چھوٹے بڑے فرقے اور طبقے اس عظیم الشان جنگ میں شریک ہیں اور انہوں
نے اس کے لئے بیش بہا قربانیاں کیں خصوصاً اقلیتوں یعنی مسلمانوں، سکھوں، پارسیوں
اور عیسائیوں اور دوسرے فرقوں کے جنہوں نے اپنی بہادری اور مادر وطن کی وفاداری کا
ثبوت دے کر ایک متحدہ قوم کی بنیاد ڈالی جو اپنی فتح کا یقین رکھتی ہے۔ اور اس پر تلی
ہوئی ہے کہ ہندوستان کو آزاد کرائے اور آزاد رکھے اور اس آزادی سے یہ کام لے کہ
ہندوستان کے تمام طبقوں کی بیڑیاں کٹ جائیں اور ان کے حقوق کا فرق و امتیاز مٹ
جائے جو حقیقت میں ساری نوع انسانی کی خدمت ہے۔ ہندوستان کی خاطر قربانی اور
جاں بازی کی ان شاندار اور جوش آفریں مثالوں کو سامنے رکھ کر ہم اپنے عہد آزادی
کی تجدید کرتے ہیں اور مصمم ارادہ کرتے ہیں کہ جنگ کو اس وقت تک جاری رکھیں گے
جب تک ہندوستان کو کامل آزادی حاصل نہ ہو جائے۔